



## جملہ حقوق محفوظ



نام کتاب \_\_\_\_\_ مذہبی داستانیں اور ان کی حقیقت (حصہ اول)  
 نام مؤلف \_\_\_\_\_ علامہ حبیب الرحمن صدیقی کاندھلوی؟  
 تعداد صفحات \_\_\_\_\_ ۴۶۴  
 قیمت کتاب مجلد \_\_\_\_\_ بیچاسی روپیہ صرف (= ۸۵/)  
 طباعت \_\_\_\_\_ روحانی ڈائجسٹ پریس، ناظم آباد



ناشر \_\_\_\_\_  
 الرحمن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)  
 مکان نمبر ۳-۱۰۷-۱ - بلاک نمبر ۱ - ناظم آباد، کراچی ۷۴۶۰۰  
 فون: ۶۶۰۱۴۴۶

## مختصر حالات

قاری حاتم الزمزمی صدیق کاٹھلوی

تحریر

محمد عظیم الدین محبت ایم اے (عثمانیہ)

دوبہ ۶ پلاٹ ۱۴ سیر الہی بخش کالونی کراچی ۵

بسم الله الرحمن الرحيم ط

پاکستان میں بسنے والی مذہبی شخصیتوں میں عالم و فاضل بہت سے ہیں۔  
عابد و زاہد بے شمار ہیں۔ محدث اور فقہر بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ مفسر قرآن بھی موجود  
ہیں، حافظ بھی ہیں قاری بھی ہیں اور ایسی ہستیاں بھی جن میں یہ سب خوبیاں موجود  
ہوں ڈھونڈنے سے مل جائیں گی، لیکن ایسے خاصانِ خدا جو مذکورہ بالا ساری  
صفیات کے حامل ہوتے ہوئے خدا مست بھی ہوں تو ایسی فہرست میں جناب  
علامہ حبیب الرحمن صاحب صدیقی کا: انبیاءِ طور پر نظر آتے گا۔ کاندھلوی کی رزمین  
تازہ کرتی ہو گی کہ اس نے ایسی جید شخصیت کو جنم دے کر پاکستان کے حوالے کیا  
آپ کی پہلو دار شخصیت ایک ایسا جگمگاتا ہوا ہیرا ہے جس میں متعدد مصابہ کرام کی  
شاندار پرچھائیاں جگمگ جگمگ کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔

جناب علامہ حبیب الرحمن کاندھلوی نے خود کو کلامِ الہی و حدیث  
نبوی کی نشر و اشاعت کے لئے وقت کر رکھا ہے آپ کی پوری زندگی  
اسی سے عبارت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علمِ فقہ و حدیث کا اجار آپ  
کا مقصد حیات ہے۔ آپ کی زندگی کا نصب العین ہے آپ نے اپنا آن  
من دھن سب کچھ اسی کام کے لئے بیچ دیا ہے، یہ کام یہ مشقت یہ سعادت  
ایک جگہ کے ہی نصیب میں آسکتی ہے۔ یہ اس کی دین ہے جسے پروردگار  
دے۔

حلقہ دروس میں حاضرین کے استفسارات و سوالات کے جوابات دیتے  
وقت آپ پہلے تو قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہیں پھر تائید میں احادیثِ نہدی  
پیش کرتے ہیں اس کے بعد تاریخِ اسلام کے واقعات بتاتے ہیں۔ جہاں  
کہیں اشتباہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے فوراً واضح دلیل بھی دکھائی نہیں دیتی تو  
اس وقت آپ اپنے حواصِ مصنوعی سے مدد لے کر زورِ یقین کی روشنی میں کتاب  
دل کے اوراق اُلٹیتے ہیں اور پھر خدا دادِ قابلیت کی بدولت علمِ لدنی کے خزانے  
اس طرح لٹاتے ہیں جس طرح کہ چشمے سے پانی بہتا ہو۔

آپ کا حلقہ دروس ایک علمی کتب سہ، ایک مذہبی درس گاہ ہے،

ایک دانش کدہ ہے جہاں علم و فضل کی بارش ہوتی ہے، اہل ودانش کا سینہ پرستا ہے۔ جنہوں نے آپ کی سادہ خطابت کے زمزموں سے آپ زوال پایا ہے وہ پھر کسی اور چشے کی طرف مشکل ہی سے رخ کرتے ہیں آپ کے چتر فیض سے جاری ہونے والے آپ مصفا کے چشموں سے دلوں کو تازگی اور روح کو باریدگی حاصل ہوتی ہے۔

آپ کی سحر العلوم شخصیت کا بیکار اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب کہ آپ قرآن کی تفسیر بیان کر رہے ہوتے ہیں۔ معارف قرآن آپ کچھ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ نیا اوقات ایک ہی سطر کی تفسیر میں ایک گھنٹہ صرف ہو جاتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ دوران تفسیر آپ پر شرح صدر کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور آپ کی زبان کی بجائے آپ کا دل بولنے لگتا ہے۔ احادیث میں آپ یحییٰ ابن یحییٰ، نسائی اور ابن جریر سے زیادہ متاثر ہیں اور خاص طور پر ابن جریر کے حافظ سے۔

فقہ قرآن اور فقہ حدیث میں ابن تیمیہ ان کے شاگرد ابن تیمیہ ان کے معاصر ہی سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ عصر حاضر کے مہین علماء سے آپ نے علمی و فکری دولت حاصل کی اور کئی طور پر ان سے متاثر ہوئے ان میں سب سے زیادہ آپ اپنے والد جلیل الشافعی الرحمن صاحب کا ندھلوی سے اس کے بعد علامہ شبیر احمد عثمانی سے پھر سید سلیمان صاحب ندوی سے۔

پیدائش اور حسب نسب، حضرت حافظ حبیب الرحمن صدیقی صاحب آخر دسمبر ۱۹۲۲ء میں محلہ دلی دروازہ دلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی پیدائش کا دن آپ کے خاندان کے لئے بہت ہی مبارک و منور ثابت ہوا۔ آپ کے والد حضرت مفتی اشفاق الرحمن صاحب کا ندھلوی جنہیں مدرسہ اشرفیہ کی ملازمت سے علیحدہ کر کے ان کا ذاتی کتب خانہ بھی منبہ کر لیا گیا تھا۔ من ولادت کے دن ہی والد صاحب کو نہ صرف ملازمت پر بحالی کر دیا گیا بلکہ کتب خانہ بھی واپس دے دیا گیا۔

قرآن کا حفظ مولوی حبیب الرحمن صاحب نے علم دین خاندانی ورثہ کے طور پر حاصل کیا تھا۔ علم دین ان کے خاندان کا اعزاز اور طرہ امتیاز تھا۔ یہ کسی ملازمت کی خاطر نہ تھا۔ ان کے قصے میں فرمے (۹۰) فی ہر کے قریب مرد حافظ تھے۔ ان کے خاندان کا کوئی فرد مردوں میں ایسا نہ تھا جو حافظ نہ ہو۔ ان کے تمام بھائی حافظ ہیں، عورتوں میں بھی کافی حافظات موجود تھیں مگر مولوی ماحول دینی تھا۔ ہر وقت تلاوت قرآن ہو کر سن اور تدریس اور کتب بینی۔ چنانچہ بچپن میں جب حفظ قرآن کر لیا تھا اس وقت

ان کی عمر ۹ سال تھی۔ آپ دن میں ایک قرآن ختم کر لیا کرتے تھے۔ اور بسا اوقات رمضان میں اس میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ ایک دفعہ آپ نے مسلمانوں میں ۷۲ قرآن ختم کئے تھے۔

آپ کے بڑے چچو بھی زاد بھائی حکیم محمد عمر صاحب جو نابینا بھیچکے ہیں اور سیالکوٹ میں مقیم ہیں ان کا تمام زندگی کا معمول روزانہ ایک قرآن ختم کرنا رہا ہے۔ مولوی صاحب کی وادی سرحدوں میں بیس (۲۰) پار سے تلاوت کرتیں اور وہیں پار سے تہجد میں تلاوت کرتیں یہ تھوڑا ماحول جس میں موصوف صاحب نے تربیت اور پرورش پائی۔

ایسے ماحول میں کھیل کود کی طرف توجہ نہ دینا بلکہ لازماً حیاتِ تمہی ایک لایعنی سی بات تھی۔ اگرچہ بعض اوقات بچوں کے ساتھ کھیل کود میں مشغول ہو جاتے تھے جس میں گلی، ڈنڈا، باغول کی سیر تیراکی اور چند کھیل جو اس وقت لازماً حیاتِ تمہی میں لائے جاتے، ڈنڈا، تلوار، نیزہ باری اور شہ سوار کی میں حصہ لیتے۔ ساہا سال تک چاندنی آلوں میں بنوٹ کی مشقیں ہوتیں۔ آپ کو زیادہ سے زیادہ ہتھیار جمع کرنے کا شوق تھا۔ بندوں کے مقابلے کے لئے جو تعداد میں ۹۵ فیصد تھے یہ بہر وقت استعدادِ تیار رہتے تھے اور ان پر ہمیشہ بھاری رہے۔

قرآن مجید کی فراغت کے بعد دینی اسکول اور عربی و فارسی کی تعلیم وہاں اردو اور فارسی کی ابتدا کی۔ اکثر و بیشتر کتابیں والد سے پڑھیں اور بعض کتابیں مولوی ممتاز کاندھلوی سے بھی پڑھیں جو مغل خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور نیربان اسلٹھ میلے تھے لیکن تعلیم کے معاملے میں بڑے سخت تھے۔ اس کے بعد والد نے عربی تعلیم شروع کر دی صرف و نحو منطق اور ادب کی اکثر کتابیں والد سے پڑھیں مثلاً مرقاۃ تہذیب وغیرہ۔ اس کے بعد مدرسہ فقہوری دہلی میں داخل ہوئے یہاں پانچویں جماعت تک باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران والد صاحب سے مختصر السعانی پڑھی۔ علم بیان یعنی تہذیبات، استعارات، کنایات، فصاحت، بلاغت یہ سلسلہ قرآن پڑھیں اور بہت سے مضامین اس کے آج تک ذہن میں محفوظ ہیں۔ ادب میں والد صاحب سے سیدہ سلقہ پڑھا۔

بیمار بہن کی تیمارداری اور اتفاق سے اسی دوران آپ کی بڑی بہن جو عمرہ دراز سے بیمار تھیں ان کی تعلیم میں عارضی رکاوٹ بیماری میں اضافہ ہو گیا۔ ڈاکٹروں اور حکمرانوں نے جواب دے دیا جس کے نتیجے میں ان کی تیلہ لڑی کیلئے انہیں گھر چھوڑ

دیا گیا اور تقریباً ایک سال تعلیم رک گئی۔ اس وقت آپ کی عمر ۱۷، ۱۸ سال تھی، اسی بیماری میں نہیں کہ انتقال ہو گیا۔

تعلیم میں ایک سال کے وقفے کے بعد مدرسہ صدیقیہ میں داخلہ۔ بعد مدرسہ صدیقیہ پچانکے۔ پیش خان میں ساتریں جماعت میں داخل کیا۔ اسی دوران چھٹی جماعت کی کتابیں اذکار مدرسہ کے علاوہ والد صاحب اور مولوی ممتاز صاحب سے پڑھیں۔ اور امتحان میں ۸۰ فیصد نمبر حاصل کئے۔

نذیریہ لائبریری ناول اور مدرسہ صدیقیہ کے داخلے اور تعلیم کے دوران ایک خاص صورت علامہ شبلی کی سیرت النبیؐ یہ پیش آئی کہ مدرسہ کے عین سامنے نذیریہ لائبریری واقع تھی جو رولانا نذیریہ حسین ممدت، دہلوی کی جانب منسوب تھی اور اس میں غریبی فارسی اور اردو کی کتابوں کا قلیل قدر ذخیرہ موجود تھا۔ آپ خانی گھنٹوں میں وہاں جا کر ابتدا میں ناول پڑھتے رہتے لیکن عام طور پر تاریخی ناول مثلاً عبدالعظیم نثر کے ناول، صادق حسین کے ناول وغیرہ، جس سے تاریخ کی طرف لگاؤ پیدا ہوا اور تاریخی کتابوں کا مطالعہ شروع کر دیا جس میں سب سے پہلے شبلی کی سیرت النبیؐ شامل ہے اس وقت تک صرف چار جلدیں شائع ہوئی تھیں۔ شبلی کی تاریخ سے بہت تاثر پیدا ہوا اس نے آپ کو عربی کی کتابوں کا مطالعہ کرنے پر مجبور کیا، یہ حقوق راتاً بڑھا کہ لائبریری کی کوئی تاریخی کتاب ایسی نہ تھی جو نہ پڑھی ہو۔ جہاں تاریخ کا شوق تھا وہاں حدیث، تفسیر اور فقہ سے بھی لگاؤ تھا اور ان مضامین کی اکثر کتابیں مطالعہ میں رہیں، لیکن دو نمونے سے تعلق نہ تھا اگرچہ پڑھا ضرور تھا یعنی فلسفہ اور منطق۔

ایک سال آپ نے مدرسہ صدیقیہ میں گزارا لیکن دورۂ حدیث دورۂ حدیث مدرسہ عبدالرب دہلوی سے کیا جو دہلوی کا بہت قدیم مشہور مدرسہ ہے، وہاں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، ابو داؤد، نسائی، ابی ماجہ سابقاً متفقاً پڑھیں اور ان تمام کتابوں کی عبارت آپ کو ہی پڑھنے کا شرف حاصل ہوا کیونکہ دیگر طلباء کی صرف دیکھ کر ضرورت تھی اور وہ عبارت صحیح طور سے پڑھ نہ سکتے تھے۔ نتیجہ میں کوئی استاد آپ کے علاوہ کسی اور کو عبارت پڑھنے نہ دیتا تھا۔

ان کتابوں کے علاوہ گھر پر والد علامہ شبیر احمد عثمانی کی راستے صاحب سے موطا امام مالک

مولانا امام محمد شاہی اور مولوی ممتاز صاحب سے منہن دہی پڑھی و لکھی  
کی طرف سے پابندی تھی کہ جو اسباق صبح کو پڑھیں ان کا مطالعہ روزت کو  
کیا جائے اور شروعات حدیث میں جو کتب ہیں ان کا مطالعہ کر کے جسے یہ  
بتاؤ کہ تم کیا سمجھو اور تیار سے نقطہ نگاہ سے کوئی سا مسلک چن کر اور اسے  
میں کیا سنا کہ ہے اس کے نتیجے میں مولوی جدید صاحب جو تاج صاحب کشمیری کی  
شروعات میں سے فتح آبادی تسلط لائی، کو کتب و روایاتی اعتباری اور  
انتہاء شروعات کا مطالعہ کرتے اور انہی اوقات میں مطالعے میں رہتے  
کے بہت سچ جاتے اور خیر خدایہ صاحب جوتی، چاہتے ہاتھ پیرے ہر مطالعہ کرتے  
جب مدرسہ دارالحدیث صاحب کے ساتھ جاتے تو روزت سے یہ آتے جاتے رہا لکھا  
قرآن پڑھتے ہوتے جاتے۔ سالانہ امتحان میں در کتاب میں پچاس میں سے  
پچاس کی گیسرتے صرف اردو زبان میں ایک نمر کم تھا۔

امتحان کے بعد علامہ فقیر احمد عثمانی نے تقریری امتحان لیا اور اس  
میں مولانا مرحوم نے فرمایا کہ میں نے اپنی زندگی میں حدیث میں اتنا ہوشیار  
ہو کہ دوسرا نہیں دیکھا۔

مولانا ایسا ہی کے تسلیم یعنی ایک تیسے تیسے میں مدرسہ سے فراغت  
والی طالب علمی کے زمانے میں تعلیم کے  
دستوں میں شرکت ساتھ ساتھ بیسی مشاغل بھی جاری تھے  
۱۰۔ مولانا ایسا صاحب مرحوم کے ساتھ بیسی دفتروں میں بیانات کا کئی بار  
گشت کیا۔ ریاست اور ریاست جے پور ریاست بھرت پور اور گروہ  
ہی جانے کا کئی کئی بار اتفاق ہوا۔ دلی کے بڑے بڑے علماء کے پاس بھی والد  
صاحب کے ساتھ آنا جانا رہا۔ مثلاً مفتی کفایت اللہ مرحوم، مولانا احمد سعید  
مرحوم اور مولانا رشید احمد گنگوہی کے خلفاء میں سے مولانا عاشق الہی میرٹھی  
مولانا اشرف علی تھانوی اور دیگر بڑے علماء کے پاس آتے تھے بیٹھنے کے  
بار بار مواقع ملے۔

پہلی ملازمت تعلیم سے فراغت کے چند دن ہی بعد ایک اہل حدیث  
کے مدرسہ میں جو دینی کی جلا میں مسجد کے عین سامنے واقع  
تھا عربی ادب پڑھانے پر ملازم ہوئے اس وقت آپ کی عمر صرف ۱۶ سال  
تھی۔ یہ ملازمت زیادہ دن نہ چل سکی۔ کیونکہ مسلک کے اختلاف کے باعث  
ملازمت سے دل اُچھاٹ ہو گیا۔ ملازمت بشکل ۶۰۵ روپے

مدرسہ محمودیہ چونڈہ میں ملازمت اختیار کرنے کے بعد آپ نے



مدرسہ محمودیہ جو زندہ ضلع سیالکوٹ میں تعلیم حفظ قرآن پر ملازمت اختیار کر لی۔ دونوں جگہ مشاہیرہ چالیس روپے تھا جب کہ گمانے کا خرچہ کل دس روپے بنتا تھا۔ مدرسہ محمودیہ میں متقریاً دو سو طالب علم تھے۔ ان طالب علموں میں اکثریت ان طلباء کی تھی جو دوسری جگہ تعلیم کے دوران بنگال سے نقل مقام کر کے آتے تھے۔ چونکہ میں آپ نے ۱۲ سال تک تعلیم دی۔ دیہاتی زندگی سے طبیعت گننا جات کے باعث اُسے بھی خیر باد کہہ دیا۔

مدرسہ محمودیہ جو زندہ ضلع سیالکوٹ آگئے  
سیالکوٹ میں آمد یہ سلسلہ کی بات ہے۔ یہاں لال کرئی بازار  
خطابت کی ابتدا چھاؤنی میں ایک مسجد کا امامت پر مقرر ہو گئے  
اور اسی مسجد کے منبر سے آپ کی تقریر کی ابتدا ہوئی۔ ایک ماہ بعد ہی  
اسلامیہ ہائی سکول گوجرانوالہ کے صدر مدرس جن کا نام جمال الدین صاحب  
تھا انھوں نے اپنے پاس بلا لیا۔

ایک خواب جس کی تعبیر مولوی جمال الدین صاحب کا گوجرانوالہ  
میں بلوالینا ایک ایسا عجیب اتفاق تھا  
فورا ہی مل گئے جس کا کوئی سبب اور ذریعہ بظاہر موجود

نہ تھا۔ اس واقعے چند دن قبل ہی آپ نے خواب دیکھا کہ ایک صاحب  
انھیں لینے آتے ہیں اور ایک نئی جگہ لے گئے ہیں جہاں آپ بازاروں  
میں گھوم رہے ہیں اور وہیں ملازمت بھی کر لی ہے۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا  
دو تین دن بعد جمعہ واقعہ ہوا۔ جمعہ کی نماز سے قبل جب آپ خطبہ دے رہے تھے  
تھے تو آپ نے بن صاحب کو خواب میں دیکھا تھا وہ دروازے سے مسجد  
میں داخل ہو رہے تھے۔ نماز ختم ہونے پر انھوں نے اپنا منہ بایان کیا۔  
آپ راضی ہو گئے اور گوجرانوالہ کا رخ کیا۔ جو گلیاں اور سڑکیں آپ نے  
خواب میں دیکھی تھیں وہی وہاں وجود تھیں۔ یہاں اسلامیہ ہائی سکول میں  
آپ کا تقریر عربی کے سہتم کی حیثیت سے عمل میں آیا۔ ابتداء میں ۴۵ روپے  
مشاہرہ قرار ہوا اور پورٹنگ میں رہائش کے لئے کمرہ دیا گیا۔

درس قرآن کی ابتداء بررڈنگ کے ساتھ ایک بڑی مسجد تھی اُس میں  
نماز فجر کے بعد درس قرآنی کی ابتداء کی۔ یہ

۱۹۲۶ء تک آپ نے درس قرآن کا سلسلہ جاری  
رکھا۔ سکول میں عربی تعلیم کے ساتھ ساتھ ۱۹۲۶ء میں جمال الدین صاحب  
نے فارسی بھی زور کر دی۔ چند اساتذہ وہاں کے منشی فاضل کا استعان دنیا

چاہتے تھے۔ ان کو تعلیم دینے کے دوران آپ کو خیال پیدا ہوا کہ خود بھی  
منشی فاضل کے امتحان میں بیٹھ جائیں۔ خیال کو عملی جامہ پہنایا اور آپ  
منشی فاضل ہو گئے۔ اس کے بعد مولوی فاضل کا امتحان دیا۔

۱۹۴۷ء کے سیاسی ہنگامے امتحان کے بعد ہندوستان میں ۲۴  
کے سیاسی ہنگامے شروع ہو گئے  
مسلم لیگ کی طرف سے خضر دات  
کے خلاف احتجاج میں حصہ لیتے ہوئے گرفتار ہو کر گوجرانوالہ میں داخل  
زندان ہوئے پھر وہاں سے ناہور جیل میں منتقل کر دیئے گئے۔ جیل میں  
پچوہری دین محمد سابق گورنر سندھ، صلاح الدین ایم۔ ذیل۔ رائے، میاں  
نثار دو تانہ اور مدوٹ سے اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ مدت لمبی  
۲۱ دن رہی۔ جیل سے رہا ہوتے تو اسکول کی چٹیاں ہو گئیں۔ کینیکہ بند  
مسلم فسادات شروع ہو چکے تھے۔ یہ فردری سٹریٹ کا زمانہ تھا۔ اکثر  
کرفیو لگا رہتا تھا۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ تمام تمام رات محلوں  
کی حفاظت کرتے رہتے تھے۔

ہندو مسلم فسادات میں آپ کی بنگالی میں سیالکوٹی دروازہ اندر ملے  
شیخاں تھا، آپ تمام تمام رات گشت  
مجاہدانہ سرگرمیاں کرتے اور پہرے دیتے۔ ہندو مسلم  
فسادات کے خطرے کے باعث آپ نے سیٹھ عبداللہ سے جن کا انوسیم  
کا کارخانہ تھا بتم اور خیر نیار کرواتے تیل اور ٹیرولی کا ذخیرہ جمع کیا انگریزوں  
کی نیت شبہ تھی۔ ہندوؤں پر بھروسہ نہیں تھا حالات انتہائی نازک اور  
خطرناک تھے۔ آپ نے اپنے والے خطرے کو بھانپ لیا اور مخالف گروہ سے  
بیل ہونے سے چند منٹ قبل ہی کوفیہ کے دوران ناکم پورہ اور دال بازار  
کو چھوٹک دیا۔ انگریز فوج چاروں طرف گشت پر لگی ہوئی تھی جس کے  
نتیجے میں ہندوؤں اور سکھوں سے پورا گوجرانوالہ خالی ہو گیا۔ گوجرانوالہ خالی  
کرانے کے بعد آپ تقریباً پانچ سو سیوں کے ساتھ کانوکی منڈی  
پہنچے اور اُسے بھی سکھوں سے خالی کر دیا۔ اس کے بعد سیالکوٹ شہر  
گئے اور وہاں کے مسلمانوں کی مدد کی جو انتہائی خطرات میں پھنسے ہوئے  
تھے۔

بھوپال میں آمد اور مولانا سلیمان  
ندوی کی مجلسوں میں شرکت  
اس کام سے فراغت کے بعد  
اپریل کی ابتداء میں اپنے وطن  
آگئے اور تقسیم ہند تک وطن

ہی میں رہے۔ ۲۴ اگست کے بعد پنجاب اور یوپی میں فسادات کی ابتداء ہو گئی تو آپ والدہ اور بھائیوں کو لے کر کاندھلہ سے بھوپال چلے گئے جہاں آپ کے والد صاحب ۱۹۴۵ء سے مفتی اعظم بھوپال کے عہدے پر فائز تھے اور علامہ سید سلیمان ندوی قاضی القضاۃ تھے۔ چند ماہ بھوپال میں قیام رہا۔ شام کا وقت علامہ سلیمان ندوی کی خدمت میں گزارتے رہے اور کتاب فیض کرتے رہے۔ جب تک بھوپال میں قیام رہا وقت گزارنے کے لئے مقامی ہائی اسکول میں بلا معاوضہ عربی کی تعلیم دیتے رہے۔

**پاکستان کو ہجرت** اگرچہ بھوپال کا ماحول پندار نہ تھا لیکن تقسیم ہند کے بعد ریاست بھوپال کا انڈین یونین سے الحاق کا سوال پیدا ہو چکا تھا۔ اس لئے آپ کو طبعاً یہ گوارا نہ ہوا کہ ایک کافر ملک سے وابستہ ہونے والی ریاست میں رہیں، والد صاحب نے اجازت زدہ تھی۔ لیکن ان کی اجازت کے بغیر ہجرت کر کے پاکستان آگئے آخر دسمبر ۱۹۴۷ء میں۔

بھوپال سے آپ آگرہ آئے اور خیال یہ تھا کہ پنجاب ہوتے ہوئے پاکستان جائیں۔ لیکن جب آگرہ سنٹرل ریگڈری یونیورسٹی کے مسلمانوں سے بالکل غالی ہو چکی تھی اور ایک قلمی نے اشارے سے آپ کو اتر جانے کو کہا۔ آپ نے گاڑی سے سامان اُتار لیا۔ اس قلمی سے معلوم ہوا کہ سنٹرل ریگڈری لٹ چکی ہے۔ لہذا آپ نے بیٹھی جانے کا ارادہ کر لیا۔ ریلوں کی کمی کے باعث فیصلہ کیا گیا کہ براستہ یوپی سفر کیا جائے۔ پاکستان ہجرت کر کے چلے چکے اور مسلمانوں کو بلا کر آپ نے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے پر تسبیہ کر لیا اور سیشنل ٹرین میں بیٹھی کے لئے روانہ ہوئے۔

اتفاق سے ایک ہندو بیکر آگرہ سے ڈبے میں سوار ہوا اور اس کی جراثیم آئی تو وہ۔۔۔ مسافروں سے ٹکٹ پوچھ بیٹھا۔ آپ نے اُسے پکڑ کر باندھ لیا اور سیت الخار میں بند کر دیا۔ مختصر یہ کہ جیسی نہ کسی جتن سے اس خطرے سے نکل خلاصی حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی دوران سفر آپ نے اپنی دونوں پٹیلیوں میں دو خیر باندھ رکھے تھے اور آپ کے سامنے دو ہی راستے تھے۔ پاکستان یا بیادری کی موت۔

اپنے مختصر قافلے کے ساتھ برصغیر تمام مشہور شہر گئے۔ بکری جہاز کے لئے معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ سرکاری ملازمین کے تیلوں کے باعث کسی غیر ملازم کو ٹکٹ نہیں ملتے۔ لہذا رات کو فرنیچر بیل سے سفر کرتے ہوئے یونہی ہوتے ہوئے احمد آباد پہنچ گئے۔ احمد آباد۔

نئے بی بی اینڈ سی آئی آر کے سروٹ ڈبہ پر قبضہ کیا۔ ساتھ ہی جو فرسٹ کلاس لگا ہوا تھا۔ اس میں پاکستان کا انگریز افسر کار میٹیس تھا جس کی حفاظت کے لئے بلوچ رجمنٹ کے دو سپاہی متعین تھے اس مورتحال سے آپ نے بہت اچھا فائدہ اٹھایا۔ جب کوئی ٹی ٹی آتا تو آپ فرسٹ کلاس کے ڈبے کی طرف اشارہ کر دیتے اور وہاں اس کا سنگینوں سے استقبال ہوتا تھا۔

میرپور خاص میں آمد  
راتے میں آپ کی گاڑی مارواڑ اور بیکانیر کے دور درون پڑی رہی۔ اسٹیشن پر کوئی مسلمان نظر نہ آتا تھا اور آپ احتیاطاً ہندو کے ہاتھ کی کوئی چیز نہ کھاتے تھے نہ پیتے تھے۔ بمبئی سے چلتے وقت اسٹیشن سے کیلے خرید لئے تھے صرف وہی ان کی غذا کا کام دیتے تھے جو چند دن چلے۔ آنٹھوی دن میرپور خاص پہنچے جب کہ چار دن رات بھوک پیاس سے گزار چکے تھے۔ میرپور خاص پہنچنے پر کھانے اور چائے اور مختلف چیزوں کا انتظام سندھیوں نے کر رکھا تھا۔ انھوں نے آپ کی ہر چیز کا خیال رکھا اور اس طرح سے خدمت کی جیسے کوئی مگال کی شرتلے ہے۔ پھر آپ میرپور خاص سے اچھا وارد ہوئے۔

کراچی سے گوجرانوالہ روانگی  
کراچی میں کچھ دن قیام کے بعد کوئی روزگار نہ ملا۔ اس لئے آپ نے کراچی سے لاہور عازم سفر ہو گئے۔ یہ سفر اردن میں طے ہوا۔ لاہور سے گجرات ۴۴ میل دور ہے اور بڑا اسٹیشن ہے، لیکن سڑک کی کمی کے باعث خبر میل کو اس زمانے میں ہلکا کر دیا گیا تھا۔ لہذا قبیلہ کیا گیا کہ لاہور سے بس کے ذریعے سفر کیا جائے۔ ریلوے کے بند ہونے کی وجہ سے بسوں پر اس قدر بھیر تھی کہ ایک ہفتے پہلے سیٹ بک کرانی پڑتی تھی۔ اتفاق سے آپ وہاں پہنچے تو سیٹوں کا اعلان ہو رہا تھا۔ ایک شخص عید اللہ نامی نے گجرات والے سے اپنی سیٹ بک کرانی تھی۔ لیکن وہ حاضر نہ تھا۔ اس سیٹ کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور جیسے تیسے اس کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ دورانِ سفر گجرات والے میں لوگوں نے آپ کو نہ پایا تو وہ یقین کر بیٹھے تھے کہ آپ نہیں مدھکے ہیں۔ کیونکہ آپ بلا اطلاع وطن چلے گئے تھے۔ آپ کی آمد پر اسکول کے اساتذہ نے اور گجرات والے کے دیگر باشندوں نے

خواب خوشیاں منائیں اور آپ اپنی اصلی ملازمت پر فائز ہو گئے۔

اواس سلاطین میں والدین بھی ہجرت کر کے

والدین کی ہجرت بہتان لگتے۔ آپ کے والد ماجد جناب مولوی

اشفاق الرحمن صاحب کو نواب صاحب بہادر لہور نے مدرسہ عالیہ کے

شیخ الحدیث کے عہدہ پر فائز کر دیا۔ جہاں شیخ التفسیر کے سند سے پرموادی

حبیب الرحمن صاحب کے ماموں پہلے ہی سے فائز تھے۔ غاندان کی

یکجائی کی خاطر آپ بھی گجرات والہ سے بہادر لہور آ گئے۔ یہاں ایک بات

یہ پیدا ہو گئی کہ مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب بہادر لہور پہنچ گئے اور

مولانا اشفاق الرحمن صاحب کو سند والہ یار کی ملازمت کے لیے امر کیا۔

اگرچہ آپ کی اور والدہ صاحبہ کی رائے اس ملازمت کی نہ تھی۔ لیکن والد صاحب

نے مولانا احتشام الحق صاحب کے اصرار پر نواب صاحب سے یہ عہدہ

کر کے کہ دین کے لیے ایک مدرسہ کا قیام ان کے ہاتھوں سے ہو جائے

تو آخرت کے لیے بہت بڑا ذخیرہ ہو گا۔ مولانا نے ۲۵۰ روپے کی

ملازمت کو قبول کر لیا۔

اس مدرسہ میں ان پر کئی گہری یہ ایک طویل داستان ہے۔ سلاطین

والد صاحب پر فالج کا دورہ پڑا۔ اگرچہ پہلے بھی فالج کے اثرات ہو چکے

تھے، لیکن اس سے بچل گئے تھے۔ بالآخر ماورجہ سلاطین کو والد صاحب

نے انتقال فرمایا اور مدرسہ کے حدود میں دفن ہوئے جو ان کے لیے خالی

طور پر اجازت دی گئی تھی۔ بعد میں والدہ صاحبہ بھی وہیں سند میں دفن ہوئیں۔

مولوی اشفاق الرحمن صاحب اپنے صاحبزاد

والد مرحوم کی والہانہ محبت مولوی حبیب الرحمن صاحب پر بچپن

سے بہت مہربان تھے اور ان کی محبت فرماتے تھے کہ آپ کی موجودگی

میں کبھی ان کے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے اور صاحبزادے نے بھی ان کی

زندگی میں سوائے ہجرت کے اور کوئی نافرمانی ان کی نہیں کی۔

گجرات والہ سے آپ نے بہادر لہور

سند و جام میں امامت اور تراجم کا آغاز پھر والد صاحب کے ساتھ

سند والہ یار آباد سے کے بعد چند دن وہاں قیام کیا۔ پھر کراچی آ کر ابتدا میں میرٹھ

پڑھاتے رہے۔ اس مرتبہ سند میں سند و جام کے اندر ایک مسجد میں

امامت کی۔ وہاں کی امامت کے دوران تراجم کا سلسلہ شروع ہوا۔

قرآن محل کے مالک مولوی محمد سعید کے بڑے خواجہ عبدالعزیز نے

آپ سے نسائی، ابن ماجہ، موضوعات، ملا علی قاری کا ترجمہ کروایا۔ اسی

دوران سب سے پہلی کتاب "اہمیت تبلیغ تصنیف کی۔"

آپ کی شادی ۱۹۶۲ء میں ہوئی۔ شادی کی تاخیر کی وجہ یہ  
**شادی** ہوئی کہ والدہ صاحبہ ابتداء ہی سے یہ چاہتی تھیں کہ آپ کی

شادی ہنسپال میں ہو جس کے لیے آپ تیار نہ تھے۔ چونکہ تنہا ہی سے  
 طہیت سیل نہ کھاتی تھی۔ اس لیے آپ کی شادی غیر خاندان میں مولانا  
 حامد بدایونی کی چچا زاد بہن سے ہوئی جو مسلک کے لحاظ سے بالکل  
 عین مذہب تھے۔

کراچی میں تصانیف اور تراجم کا سلسلہ آگئے اور سب سے پہلے  
 تاج کینی میں قرآن کی تصحیح پر ملازمت کی۔ ڈیڑھ سال وہاں کام انجام  
 دیا۔ اسی دوران آپ بیمار پڑ گئے، وہاں کی ملازمت چھوڑ کر پیر الہی بخش  
 کالونی میں مسجد ہاشمہ کی امامت کر لی۔ تقریباً دو سال وہاں گزارے  
 اور اسی دوران میں امر لٹنڈ "اوز امر لٹنڈ" تصنیف کیں۔ امامت  
 چھوڑنے کے بعد مہارت اسلامی کے ادارے میں کام کرتے رہے اور ان  
 کی جانب سے جصاص رازی کی "احکام القرآن" کی تین جلدوں کا ترجمہ کیا  
 اور اس پر حراشی لکھے۔ یہ تینوں جلدیں مصر کی باریک ناٹپ کے بارہ نسخہ  
 صفات سے مشتمل ہیں۔

اس کے بعد کلام کینی کے جانب سے کتاب "الاذکار" کا ترجمہ کیا،  
 حسن حبیب کی شرح رکھی۔ قرآن محل والوں کی جانب سے گلستان "د  
 "برستان" کا ترجمہ کیا اور متعدد کتابوں پر مقدمے لکھے۔

ایچ، ایم سعید کینی پاکستان جک کی جانب سے احسن "اسأل" کی اردو و تبدل  
 کی "طہادی کا عربی میں مقدمہ لکھا۔ "تفسیر بیضاوی" کا عربی میں مقدمہ لکھا اور پوری  
 کتاب پر حاشیے لکھے۔

"الغزالبکیر فی اصول التفسیر" کا ترجمہ کیا جو قرآن محل کراچی نے شائع کیا،  
 تاج کینی سے وابستگی کے زمانے میں آپ نے ۱۹۶۳ء میں شرح اسماء  
 الحسنیٰ "بکرمی" مدد سری کتاب الادبیۃ الماثورۃ (حضرت کی دعائیں) لکھی تھی۔  
 عتیق پریس میگزین رڈ کراچی کی جانب سے ناصر الدین ابانی کی کتاب "الحج" کا  
 ترجمہ کیا جو نیز نام کے شائع ہوا۔ آپ نے زیارت القبور کا بھی ترجمہ کیا جو  
 اسی شائع میں ہوا۔ پڑھنے سے متعلق بھی ایک کتاب لکھی جو متون عربیہ کی  
 خواہش پر لکھی گئی تھی مگر شائع نہیں ہوئی۔ "غنیۃ الطالبین" کا سورتہ لکھا ہوا  
 ہے۔

نہیں کیا جاوے گا۔ اس میں ۱۲۵ کتابوں کے حوالہ جات ہیں۔ صحیح مسلم پر عربی میں  
حاشیہ چڑھایا تھا۔ اس کا مسودہ کلام کہنی کو راجی کے پاس محفوظ تھا۔ مشکوٰۃ الاولیاء  
المیں اہم واحد تاج کتب جوڑیا بازار کراچی کی جانب سے شائع ہوئی ہے۔  
نقص ایڈیٹ کی گئی ہے بھی آپ کی ایک کتاب شائع کی ہے امداد ہے،  
تاریخ طبری جلد چہارم۔

شعین پریس کی جانب سے نصر الدین البانی کی متعدد عربی کتابوں کے تراجم  
کئے۔ مذکورہ بالا کتب کی تصنیف و تالیف کے دوران آپ پر یہ تلخ حقیقت  
 واضح ہوئی کہ تجارتی ادارے اور ناشرین کتب صرف دہی کتابیں شائع کرتے ہیں  
جو ان کے مفاد اور تجارت کے لیے منفعت بخش ہوں۔ اس کام سے  
دل برداشتہ ہو کر آپ نے تجارت شروع کر دی اور گریٹ ٹاؤن میں ایک  
چھوٹی سی دکان کھولی۔

ان تمام امور کے ساتھ ساتھ درس قرآن اور مذہب و جہت کا  
سلسلہ بھی جاری رہا ہے۔ اور جو تاجروں و قارئین کالونی میں تسلسل کے ساتھ جاری  
ہے۔ آج کل علامہ صاحب اردو میں موضوعات جمع فرما رہے ہیں۔ اس  
موضوع پر اردو میں تاحال کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اللہ کرے وہ جلد  
پایہ تکمیل کو پہنچ کر قارئین کے سامنے آجائے۔

یہ انہی کی ذات ہے جو انہوں نے اسے اہم موضوعات پر عمل اٹھایا ہے  
فدائے کل تراباں علم بھی اندھی تقلید میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں  
جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

## مزید حالات زندگی

آبائی وطن آپ کا آبائی قصبہ کانڈھلہ ضلع مظفرنگر یوپی ہے۔ یہاں کے علماء خاندان  
سے آپ کا تعلق ہے آپ کے خاندان نے ہر دور میں بیش بہا  
خدمات انجام دی ہیں۔ آپ کی انجیل مفتی الہی بخش صاحب مرحوم کی اولاد میں سے ہے۔  
جنہوں نے مشنری مولانا رام کا آخری دفتر مکمل کیا۔ اور جن کی اولاد میں سے مولانا محمد الیاس  
اور مولانا محمد زکریا صاحب ہیں۔ مولانا محمد الیاس صاحب کانڈھلوی فقیر کے گے ماموں  
تھے۔ مولانا محمد مالک صاحب مولوی محمد نعمان صاحب اور مولوی محمد صاحب علامہ  
کے ماموں زاد بھائی ہیں جو مختلف عہدوں پر سرفراز ہیں۔

آپ کے والد مشہور عالم دین مفتی اشفاق الرحمن کاندھلوی ہیں جو ابتداء میں مدرسہ فتحپوری دہلی کے مفتی رہے پھر مولانا سلطان محمود صاحب کے شیخ الحدیث مقرر ہوئے اس کے بعد ریاست بھوپال میں مفتی اعظم کی خدمات انجام دیتے رہے۔ بعد ازاں علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب مرحوم کی طلبی پر عازم پاکستان ہوئے لیکن اتفاق سے کراچی اس وقت پہنچے جب علامہ کی وفات کو چند روز ہو چکے تھے۔ دو ایک دن علامہ مرحوم کی جائے قیام پر ٹھہرنے کے بعد بھاولپور مولانا محمد اودیس صاحب کے پاس تشریف لے گئے۔ بعد ازاں مولانا احتشام الحق صاحب (مرحوم) بھاولپور تشریف لائے۔ ان کی طلبی پر دارالعلوم الاسلامیہ سندھ والہیا تشریف لائے اور یہاں دارالعلوم کے مفتی متعین ہوئے۔

کچھ عرصہ بعد دارالعلوم کی کمیٹی میں اختلاف ہوا اور متعدد علمائے دارالعلوم کو غیر اہلکار کہا جن میں مولانا عبدالرحمن صاحب پوری اور مولانا محمد یوسف بنوری بھی تھے آپ ہماری عبدالحق صاحب کی جگہ شیخ الحدیث متعین ہوئے لیکن اس عرصہ میں دو تین ہی سال گزرے تھے کہ آپ پر فتنہ کا حملہ ہوا۔ اگرچہ پہلے حملے کے بعد آپ کچھ سنبھل گئے۔ لیکن دوسرے حملے کے بعد مدغم آنا جانا ختم ہو گیا اور آپ کی جگہ علامہ ظفر احمد صاحب عثمانی کا تقریر ہوا اور کچھ عرصہ بعد والد صاحب رحلت فرمائی۔ اشفاق الرحمن صاحب جنہوں نے عربی میں شرح تحریر کی لیکن صرف اس کا پہلا حصہ کتب خانہ رحیمیہ لاہور نے شائع کیا نسائی کا عربی حاشیہ لکھا اور وہ بھی کتب خانہ رحیمیہ نے شائع کیا کہ کتب خانہ مفتی کچھ کفایت اور احباب مرحوم کی کفایت تیار ہو کر کے علاوہ اردو میں اور چھوٹے موٹے رسائل تحریر کیے جو اکثر ہندوستان میں رہ گئے عربی نسائی کے بعض نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ پاکستان آنے کے بعد موطا امام مالک کی عربی شرح کشف المظاہر کے نام سے تحریر کی جو کتب خانہ نور محمد کراچی نے شائع کی اور آج تک شائع ہو رہی ہے۔

تاریخ وفات : علامہ مدوح بروز پیر بتاریخ ۲۲ رمضان المبارک ۱۴۱۱ھ مطابق ۸ اپریل ۱۹۹۱ء انتقال فرما گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کو ان کی دینی خدمات عالیہ کے طفیل جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔ (ادارہ)

محمد عظیم الدین محبت  
ایم۔ اے (عثمانیہ)



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## گزارش احوال واقعی

عقائد کی غرابی مل کے بگاڑنا باعثِ ہزنی ہے، اس سے ہر مسلمان واقف ہے، لیکن اس کے باوجود وہ بد اعتقادوں کا بری طرح شکار ہو جاتا ہے، جس کی اہم وجہ یہ ہے کہ وہ خودِ علمِ دین سے واقف نہیں ہوتا اور دوسروں کے علم پر بھروسہ کرنے پر مجبور ہوتا ہے لیکن دوسرے بھی بہت سی باتوں سے خصوصاً مذہبی داستانوں اور قصوں کی حقیقت سے ناواقف اور بد اعتقادی کا شکار ہوتے ہیں۔ نتیجتاً دین کے نام سے غلط سلاط جو بات اس تک پہنچتی ہے وہ اس پر بیان لے آتا ہے اور غلط عقیدہ قائم کر کے غلط راہ پر چل پڑتا ہے یہ صورت حال عام اور کثرت سے نمایاں ہے۔

پیش کردہ تحقیقی مواد میں قرائن، احادیث اور تاریخ کی روشنی میں ان مذہبی داستانوں اور حکایتوں کا جائزہ ملیتے ہوئے ان فرب کاروں کا پردہ چاک کیا گیا ہے اور حقیقت بیان کی گئی ہے، جو کہ ہمارے عوام اور خواص میں مقبول ہیں اور ہمارے اعتقاد کا حصہ بن گئی ہیں، لیکن خلافِ عقل و نقل ہیں۔ ان غلط و فرضی داستانوں کو عوام کے ذہنوں پر سلاط کرنے کے لئے ملک کے اخبار، رسائل، جرائد، مضمون نگار و مقرر حضرات ملک گیر میاں پر سرگرم عمل نظر آتے ہیں اور بد اعتقادوں کو تقویت پہنچاتے رہتے ہیں۔ ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے حکومتی ادارے بھی ان کی تشہیر میں خاصا کردار ادا کر رہے ہیں۔ مختصراً یہ کہ ملک کے تمام ذرائع ابلاغ حکومتی ہوں یا غیر حکومتی سب ہی اس قسم کی غلط بیانیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں اور اگر کسی سمت سے کبھی تنقید کی جاتی ہے تو کوئی اثر نہیں لیا جاتا اور غلطیوں کا پردہ پیگندہ بدستور جاری رکھا جاتا ہے اور کسی کے نقصان کی پردہ نہیں کی جاتی۔ چنانچہ اسی صورت حال کے تدارک کے لئے کتاب ہذا وجود میں لائی گئی ہے تاکہ خصوصیت کے ساتھ سنی حضرات جو ان ذرائع، غواشیہ داستانوں کی سحر آفرینیوں کا شکار ہو چکے ہیں اگر نجات حاصل کرنا چاہیں اور عقائد کی درستگی کے لئے وہ

ہوں تو مستفید ہو سکیں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی عقائد کی تباہی سے محفوظ کر سکیں، جو کہ عقل مندی کے تقاضوں کے عین مطابق ہو گا۔

اس کتاب میں ایسی ہی مذہبی داستانوں سے متعلق بحث کی گئی ہے اور ان کو اغیار کا خود ساختہ و مفسدانہ کارنامہ ہونا ثابت کیا گیا ہے، جو کہ اہل سنت حضرات کے عقائد خراب کرنے کے لئے وضع کی گئی ہیں اور جن کو صحیح تسلیم کر لینے سے اکثر اوقات قرآن و احادیث صحیحہ کا انکار لازم آ جاتا ہے جو کہ شدید گناہ کا باعث بن سکتا ہے۔ ان اور ان جیسی اور دوسری داستانوں کو اتنی شہرت دے دی گئی ہے کہ ہندوپاک کے مسلمانوں کا کوئی طبقہ ان کے اثر بہ سے بچ نہیں سکا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی کم متاثر ہوا ہے اور کوئی حد سے زیادہ۔ اور جو بھی متاثر ہوا ہے وہ بد اعتقاد ہی کا شکار ضرور ہوا ہے اور اس بد اعتقاد ہی کا دور کرنا از بس ضروری ہے۔ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جب کوئی فاسق خبر لانے تو اس کی تحقیق کر لی جائے، یعنی بلا تحقیق ہر بات کو آگے بڑھا دینا درست نہیں ہوتا اس میں نقصان ہی کا اندیشہ ہے، جیسا کہ آج کل کے غیر محتاط حضرات اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ یہ تحریری کاوش اسی غرض سے پیش خدمت کی جا رہی ہے کہ آپ حضرات مروجہ مذہبی داستانوں کی حقیقت سے واقف ہو جائیں اور کتاب میں بتلائے ہوئے اصولوں کے ذریعہ خود بھی کسی روایت کی صداقت یا عدم صداقت کا پتہ چلا سکیں۔ توقع ہے کہ قارئین اس سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے۔ یہ بات انجمن کے علم میں ہے کہ اس کتاب کے مختصر پیمانے پر اجراء سے وہ بڑے پیمانے پر اعتقادات کی تبدیلی نہلا سکے گی۔ چنانچہ اس جدوجہد کو کامیاب بنانے کے سلسلہ میں وہ قارئین سے تعاون کی استدعا کرتی ہے کہ اگر وہ اس تحقیق کو صحیح اور ناقابل تردید پائیں تو وہ اپنے اپنے حلقہ اثر میں اس تحقیق کو عام کریں تاکہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہوں اور بات آگے بڑھتی چلی جائے ویسے تو یہی مسلمانوں کو اغیار کی خود ساختہ فرضی داستانوں کی نقصان رسائیوں سے محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے لیکن موجودہ جو ان نسل اور آنے والی نسلوں کو تحفظ فراہم کرنا اس سے بھی زیادہ ضروری ہے کیونکہ انہی نسلوں کے افراد آئندہ ان فرضی داستانوں کے فروغ یا عدم فروغ کا ذریعہ بننے والے ہیں۔

اگر کوئی بد اعتقادی کا درس شروع ہی سے نہ دیا جائے اور حقیقت سے روشناس کیا جاتا ہے تو ایسا کیا جاسکتا ہے کہ کسی کیسیت اس قسم کی بد اعتقادیوں پر قابو پایا جائے گا۔ اس کیسے ہم سب ہی کو ایک تحریک کی طور پر جمعہ وجہ کرنی ہوگی اور اپنی اسلامی حکومت کو بھی مجبور کرنا پڑے گا ہر طرح کی تعلیمی نصاب کی کتابوں سے ان غرضی داستانوں کو مکمل طور پر خارج کر دیا جائے۔ نیز ریڈیو اور ٹی وی کے ذریعہ صحیح کی طور پر پیش کرنا کا سلسلہ متقطع کیا جائے تاکہ مسلمانوں کے عقائد غلط طور پر متاثر نہ ہوتے ہیں اور بد اعتقادی کو سہارا نہ ملتا رہے۔ جھوٹ کی تشریر ویسے بھی جائز نہیں ہوتی اور یہ کیا جاتی ہے کہ مقتدر حضرات بالخصوص اہل علم و کرام سے جبکہ ہماری اس شخصیت سے اتفاق ہو، انہیں اس ہے کہ اس کو خلاصی کی جدوجہد میں تعاون فرمائیں اور اغیار کی ان تریشہ غرضی داستانوں کی، جبکہ ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مملوئی بھی باکرم مانع واجسطرات، تابعین و دیگر قابل قدر سستیوں سے متعلق جھوٹ بولا گیا ہو، ایسے ذریعہ کسی کے اعزاز و حرمان یا ناموس پر لایعنی ہو، جانچ پڑتال کر کے انکو تاریخ اور دینی کتب سے خارج کر دینا، ایک دوسرا مین تاکہ غلطیوں سے پاک قرار دیا جائے اور کسی کو انگشت نمائی کا موقع نہ ملے۔

آخر میں انہیں ہذا ان تمام کرم فرماؤں کا پیشگی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہے جو کسی بھی ممکنہ طریقہ سے کتاب ہذا کے مندرجات کو اگے بڑھاتے ہوئے دوسروں سے روشناس کر دیا جائے۔ نیز ایسے حضرات کی بھی بحدہ نوا ہوگی، جو ہماری اس تحقیقی کاوش میں ہماری کسی غلطی کی نشاندہی فرمایا جائے یا مقبول اعتراض وارد کر گئے، تاکہ مقبول اعتراضات کو ختمہ پیشانی سے قبول کرتے ہوئے کتاب کی آئندہ متوقع اشاعت میں حسیہ تصحیح کیا جاسکے۔ یہاں اس امر کا اظہار بھی نہایت ضروری ہے کہ اس تحقیقی مواد کے پیش کرنے سے کسی فرقہ کی بدگمانی یا خیالات و اعتقادات کی تردید مطلوب نہیں ہے، بلکہ صرف اہلسنت حضرات کو عقائد بلامراد ان سے مضمرات سے نجات دلائے مقصود ہے جو کہ دیگر مسلمانوں کی بھی دینی ذمہ داری قرار پاسکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے عدل کی گہرائیوں کیساتھ دعا کیا جاتی ہے کہ ہم سب کو حق و باطل میں تیز بینی صلاحیت باجاء فرمائے جو تسلیم کرنے اور باطل سے کنارہ کشی کی جرأت و توفیق سے نوازے۔ اس لئے کہ اسی میں ہم سب کی صلاح ہے اور یہی ہمارا مقصد اصلی ہے۔ آمین ثناء آمین۔ دواعلیٰ الاہل باغ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## حکومت اسلامیہ پاکستان کی خدمت میں

عرض ہے کہ انجمن اسوۂ حسنہ پاکستان کسی مخصوص مکتبہ فکر کی اسیر نہیں ہے بلکہ قرآن حکیم و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و عمل صحابہ کو سند دین تسلیم کرتی ہے اور صرف انہیں احادیث و روایات کو حق تصور کرتی ہے جو کہ خلاف عقل بھی نہ ہوں اور تحقیق کی سوئی پر پوری مارتی ہوں۔ کتاب ہذا اسی جانچ پڑتال اور عقل کی سوئی پر پرکھنے کے بعد وجود میں لائی گئی ہے اور ایسے اہم موضوع سے تعلق رکھتی ہے جس پر آج تک کسی نے غور کرنے اور قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس میں متعدد تاریخی مذہبی روایات سے متعلق جو مشہور عام ہو گئی ہیں اور جن کا ہر چار تقاریر، مضامین اور ٹی وی و ریڈیو جیسے حکومتی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ کیا جاتا ہے کلام کیا گیا ہے اور ان کا جھوٹا اور فرضی ہونا ثابت کیا گیا ہے تاکہ ہم عجمی مسلمانوں کو یہ احساس دلایا جاسکے کہ ہم کس خطرے میں گھر چکے ہیں اور اس سے کیونکر گلو خلاصی کی جاسکتی ہے۔ ان فرضی مذہبی داستانوں سے اہل سنت والجماعت کے اعتقادات تباہ ہو کر رہ گئے ہیں جس کے باعث وہ متعدد مواقع پر نادانستہ طور پر قرآن و احادیث کے منکر بن جاتے ہیں جو کہ بہت بڑا خسارہ ہے۔ چنانچہ دینی اعتبار سے یہ صورت حال افسوس ناک بھی ہے اور انتہائی تشویشناک بھی اور لائق اصلاح ہے۔

انجمن کی جانب سے کتاب کے قارئین کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر پیش کردہ تحقیقی امور پر معقول اعتراض دارد ہو سکتا ہو تو اس سے ضرور مطلع فرمائیں تاکہ اس کو قبول کرتے ہوئے حسب ضرورت تہہ ملی لائی جاسکے۔ اسی طرح حکومت اسلامیہ پاکستان سے بھی پُر زور مطالبہ کرتی ہے کہ اگر تحقیق ثلہ معتقد مائی جائے اور ناقابل تردید ہو تو حکومتی ذرائع ابلاغ کے ذریعہ قرآن و احادیث صحیحہ سے

مترادف اور تاریخی اعتبار سے فرضی اور ایمان میں بگاڑ پیدا کرنے والی داستانوں کی کلی و جزوی نشر و اشاعت کو غلط کر دیا جائے، نیز مذکورہ بالا قسم کے جو بھی غلط واقعات نقلی نصاب کی کتابوں میں موجود ہوں اور جن سے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، صحابہ کرام یا ازواج مطہرات وغیرہ پر کسی طور پر جھوٹ بولا گیا ہو ان کو ذمہ داری کتب سے خارج کر دیا جائے، تاکہ موجودہ نئی اور آئے والی نسلیں بد اعتقادی کا شکار ہونے سے بچ جائیں تحقیق ہذا کے ذریعہ حکومت پر یہ حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ، اور اب یہ اس کی ذمہ داری بن گئی ہے کہ حق کی اشاعت کے مواقع فراہم کرے اور باطل کے پردہ پگینڈے سے اجتناب کرے اور مسلمانوں کے ذہنوں کو مزید مسموم نہ ہونے دے۔ اسی میں تمام مسلمانوں کی بھلائی پوشیدہ ہے۔ اس قسم کے اقدام اس لئے بھی ضروری ہوں گے کہ موجودہ حکومت اسلام پسند ہے اور مکمل نظام اسلام نافذ کرنے اور معاشرے کو اسلامی بنانے کا عزم و وعدہ کر چکی ہے اور اسلامی نظام و اسلامی معاشرے میں منافی پروپیگنڈے اور دروغ بیانی کے فروغ کی کوئی گنجائش نہیں۔ بلکہ برائی کہ جبر ختم کرنے کا حکم موجود ہے اور حکومت جبر استعمال کرنے پر قدرت بھی رکھتی ہے۔

امید کی جاتی ہے کہ اس بدنام صورت حال کے خاتمے کے لئے ہماری اسلامی حکومت مناسب و ضروری اقدام کرے گی جو کہ مسلمانوں پر ایک احسانِ عظیم ہو گا اور اس اسلامی ریاست کا بہت ہی اہم کارنامہ بھی۔ و ما علینا الا البلاغ۔

## مقدمہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ  
نَحْمَدُكَ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِكَ الْکَرِیْمِ

اس کتاب میں ہم وہ روایات اور کہانیاں پیش کرنا چاہتے ہیں، جو مختلف مجوسی مورخوں اور داستان سراؤں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وغیرہ کے سلسلہ میں وضع کیں، اور بعد کے غیر محتاط ستارین علما نے بغیر سوچے سمجھے انہیں اپنی کتابوں میں جگہ دی۔ جب کہ دوسری اور تیسری صدی کی اکثر کتابوں میں ان کا وجود تک نظر نہیں آتا۔

یہی وہ روایات ہیں جو میلاد ناموں کا ماخذ ہیں۔ ان ہی داستانوں پر محافل میلاد کی ہمارا ہی اور گراماگر می موقوف ہے۔ اگر یہ داستانیں نہ ہوتیں تو محافل میلاد بھی وجود میں نہ آتیں۔ ان داستانوں کے نتیجے میں یہ ضرور ہوا کہ عوام الناس ان داستانوں میں محو ہو کر رہ گئے اور اُن کو پس پشت ڈال دیے گئے۔ اس طبقہ نے ان دیومالائی داستانوں کو اصل اسلام تصور کر لیا ہے، اور اسلام کی اصل روح سے دور ہوتے چلے گئے۔ حالانکہ ان داستانوں کی لذت میں قرآن کو بھی ترک کر بیٹھے ہیں۔

ان داستانوں کو اسلام دشمن عناصر نے وضع کر کے دنیا میں اس طرح پھیلا دیا کہ آج ہر خاص عام کے ذہنوں پر اس طرح مسلط ہیں کہ اصل حقیقت داستانوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ ان داستانوں کو وضع کرنے والے مختلف قسم کے لوگ تھے۔ جنہوں نے اپنے اپنے ذہنوں کے مطابق یہ کہانیاں وضع کیں۔ ان میں چند گروہ تو خاص طور پر پیش پیش نظر آتے ہیں۔

۱۔ یہودی جنہوں نے اسلام دشمنی میں داستانیں وضع کر کے انہیں اسلام کا بادلہ پہنایا۔ ہماری تفسیری روایات کا بیشتر حصہ انہی داستانوں پر مشتمل ہے۔

۲۔ قصہ گو داغظ اور خطیب جن کا علم سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ ان لوگوں نے عوام کو اپنا معتقد بنانے اور پھر اس ذریعے سے دنیا بٹرنے کے لئے اپنے اپنے ذہن کے مطابق روایات کو عوام میں پھیلا دیا۔ ان میں کچھ نبیؐ کی ایسی ہی تھیں جو کہ احادیث بھی وضع کرتے، اور انہیں سلسلہ آئمہ کی جانب منسوب کر کے مشہور کرتے۔ محدثین انہیں قصاص قصہ گو کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

۳۔ تیسرا طبقہ نیک اور صوفیاء حضرات کا تھا۔ یہ وہ حضرات ہیں جنہوں نے اپنے زہد و عبادت میں انہماک سے باعث حصول علم کے لئے کوئی کوشش نہیں کی۔ جیسا کہ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جس کسی نے بھی ان کے سامنے حضورؐ یا صحابہؓ کی جانب منسوب کر کے کوئی روایت بیان کی، انہوں نے بلا تحقیق بیان کرنی شروع کر دی۔ جیسا کہ آجکل ہمارے عوام الناس کی عادت ہے۔ اس طرح ان لوگوں کی زبان پر حوث چڑھ گیا۔ اور انہیں اس کی خبر تک نہ ہوئی۔

ان میں سے ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو احادیث وضع کرنے کو کار خیر تصور کرتا تھا۔ بعض صوفیاء نے اس کا اقرار بھی کیا کہ ہم نے مختلف سورتوں کے فضائل میں روایات وضع کی ہیں۔ کتب تفاسیر میں اس قسم کی جتنی روایات پائی جاتی ہیں کہ فلال سورت کی فضیلت یہ ہے اور فلال سورت پڑھنے سے یہ کام انجام پائے گا۔ اور فلال عمل سے تے فلال سورت اور فلال آیت تلاوت کی جائے، یہ روایات سب اسی طبقہ کی وضع کردہ ہیں۔ اسی طرح نقلی نمازوں کے فضائل میں بیشتر حصہ اسی طبقہ کے ذہنوں کی پیداوار ہے۔

۴۔ ایرانیوں اور مجوسیوں کا وہ طبقہ جو اپنی سلطنت اور شان و شوکت برباد ہونے کے باعث عربوں اور اسلام کے نام لیاؤں سے عداوت رکھتا تھا اور خاص طور پر ان حضرات سے تو انہیں انتہائی بغض تھا جنہوں نے سقوطِ ایران میں کسی قسم کا حصہ یا تھا۔ اس نے جہاں ان حضرات کو بدنام کیا ہو وہاں ان کے آباء اجداد، اور ان کے خاندانوں تک کو بدنام کیا۔ اور اس سلسلہ میں لاکھوں روایات وضع کی گئیں۔ اور جو صحابہ کرام جنگِ ایران میں شریک نہ تھے، انہیں بظاہر اپنا ہیر و بنا کر ان کے فضائل میں روایات وضع کیں۔ تاکہ امت دو حصوں پر منقسم ہو جائے۔

اتفاق سے عباسیوں اور علویوں نے بنو امیہ کی خلافت کا تختہ الٹنے کے لئے اسی طبقہ کا تعاون حاصل

کیا چنانچہ خلافت عباسیہ انہی مجوسیوں اور خراسانیوں کے بل بوتے پر قائم ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خلافت عباسیہ کے تمام کلیدی عہدے ان ایرانیوں کے پاس رہے۔ ان کی عورتوں نے عباسیوں کے حرم میں داخل ہو کر وہ فتنے کھیلے کہ الاماں والی تھیں۔

یہ وہ انتقامی جذبہ تھا جو عربوں کے خلاف برائے کار لایا گیا۔ ان کے مورخین نے سب سے زیادہ ہدف صحابہ کرام کی ذات کو بنایا جس کا مقصد اصلی یہ تھا کہ جب صحابہ کرام دنیا پرست اور خطا کار ثابت ہو جائیں گے۔ تو دین اسلام کی بنیادیں خود بخود کھوکھلی ہو جائیں گی۔ اس لئے کہ نہ تو وہ اسلام کا نمونہ باقی رہیں گے۔ اور نہ ان کے پیش کردہ دین کا کوئی اعتبار باقی رہے گا۔ یعنی نہ انس رہے گا نہ انسیرا بچے گی۔ افسوس تو یہ ہے کہ اہل سنت والجماعت اس چال کو سمجھ نہ سکے اور سازش کا شکار ہو گئے۔ بلکہ پاکستان میں اہل سنت والجماعت کے ایک مشہور عالم نے کتاب "خلافت و ملکیت" لکھ کر ان کی ہم نوائی کا حق ادا کیا اور اس سازش کو پروان چڑھایا۔ جس کے نتیجے میں جہاں عوام الناس گمراہی میں مبتلا ہوئے، وہاں خود وہی صاحب کے مستفیدین نے ان خرافات کو اپنے دین و ایمان کا جزو بنایا۔ کاش ہمارے علما صحابہ کرام کو تاریخ کے بجائے قرآن کی نظر سے دیکھتے تو انہیں صاف نظر آ جاتا کہ یہ گنگا تو اٹنی اوپر کو بہہ رہی ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں تصوف زدہ طبقہ قرآن نہیں سے دور بھاگتا ہے۔ بلکہ عوام کو یہ درس دیا جاتا ہے کہ قرآن کو اہل دل کے علاوہ کوئی سمجھ نہیں سکتا کچھ لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ کسی پیر کا دامن تھا تو قرآن سے کیا ملے گا۔

یہ وہ انداز فکر ہے جو ان دیومالائی داستانوں کے ذریعہ ہم میں پیدا کیا گیا ہے۔ اگر قرآن و سنت کو پھیلانے والے ہر دور میں پیدا نہ ہوتے، اور حقائق پر سے پردہ نہ ہٹاتے رہتے تو حضور کی ذات بھی ایک دیومالائی حیثیت اختیار کر لیتی، بلکہ آپ کے مقام کو پہچاننا بھی دشوار ہو جاتا۔ اسی کا اثر ہے کہ مقام نبوت کو مقام الوہیت کے دوش بدوش کھڑا کر دیا گیا ہے۔ بلکہ مقام ولایت کے ذریعہ مقام صحابیت کو فنا کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

اس تخریب کاری کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ آج روئے زمین پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا آپ کے صحابہ کی



سیرت سے متعلق ایسی کوئی کتاب موجود نہیں جس پر یقین و اعتماد کیا جاسکے کہ یہ سونی صدر دست ہوگی۔ حتیٰ کہ سید سلیمان ندوی مرحوم نے اپنی سیرت النبی میں اس کا اقرار بھی فرمایا۔ اسی لئے انہوں نے متعدد واقعات پر تنقید فرمائی۔ بلکہ سید صاحب سے صدیوں قبل حافظ عراقی نے جو حافظ ابن حجر کے استاد تھے اپنی سیرت منظوم میں فرمایا تھا۔

وَلْيَعْلَمْ الطَّالِبُ أَنَّ السِّيْرَةَ تَجْمَعُ مَا قَدْ صَحَّ وَمَا قَدْ انْكَرَا  
طالب علم کو یہ جان لینا چاہیے کہ سیرت کی کتابوں میں صحیح اور منکر ہر قسم کی روایات جمع کی جاتی ہیں اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ تاریخ اور سیرت رسول پر ابتدائی طور پر قلم اٹھانے والے مجوسی النسل اور سبائی ذہن رکھنے والے لوگ تھے۔ ان کا دل ہرگز بھی اس وقت تک مضبوط نہیں ہو سکتا تھا جب تک وہ اپنی تخریب کاری کا کوئی جوہر نہ دکھائیں۔ اور اتفاقاً یہ کہ بعد کے آنے والے علماء ان مجوسیوں کی کتابوں پر اعتماد کرتے ہوئے سیرت و تاریخ میں ان ہی باتوں کو من و عن نقل کرتے چلے گئے حتیٰ کہ ان داستانوں نے اب ایک مذہبی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

سب سے پہلا مورخ جس نے غزوات النبی پر کتاب لکھی وہ محمد بن اسحق بن یسار تھے یحییٰ بن عقبہ نے بھی ایک کتاب لکھی تھی لیکن وہ تو ابتدا ہی میں ناپید ہو گئی تھی۔ اگرچہ کتاب تو ابن اسحق کی بھی ناپید ہے۔ لیکن ابن ہشام نے اسی کی کتاب کو نئی ترتیب و تزئین کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نام تو اس کا بے شک سیرت ابن ہشام ہے لیکن دراصل وہ مغازی محمد بن اسحق ہے۔

محمد بن اسحق مجوسی النسل تھا۔ یہودیوں سے روایات لیتا، شاعروں سے اشعار لکھوا کر صحابی کی جانب منسوب کرتا تھا۔ تقدیر کا منکر اور شیعہ تھا۔ ہشام بن عروہ اور امام مالک وغیرہ اسے کذاب کہتے ہیں۔ اس سے اس کی کتاب کو نقل کرنے والے دو شخص ہیں۔ سلمۃ الارش اور زیاد البکائی اور دونوں مجوسی اور دونوں کذاب ہیں۔ ابن ہشام نے ابن اسحق کی کتاب زیاد البکائی سے نقل کی ہے۔

سلمۃ الارش رازی سے اس کتاب کو نقل کرنے والا حمید الرازی ہے۔ اسی سے طبری نے روایات لی ہیں۔ یہ سب مجوسی ہیں اور سب سبائی ذہن کے مالک تھے۔

علامہ ذاکر حیدرؒ نے اس نے اطلاع دی تھی کہ ابن اسحاق کا نسخہ مل گیا ہے جناب محمد طفیل نے اپنے رسالہ نقوش لاہور کے رسول مہر کی

دوسرا مشہور مورخ واقدی ہے جو محدثین کے نزدیک کذاب زمانہ ہے۔ اور کٹر انفیسی ہے۔ یہی حال ابو مخنف لوط بن یحییٰ، ہمدانی، یحییٰ بن یحییٰ، یحییٰ بن یحییٰ، یحییٰ بن یحییٰ اور سری بن اسمعیل کا ہے۔ یہ سب خالص سبائی ہیں۔

ان کے بعد آئے دوسرے جتنے مورخین ہیں خواہ وہ سنی ہوں یا سبائی، سب کا دار و مدار ان ہی مذکورہ افراد کی کتابوں یا روایتوں پر موقوف ہے۔ مثلاً ابن سعد اگرچہ سنی ہیں لیکن ان کی کتاب میں ستر فی صدر روایات تو واقدی سے مروی ہیں۔ ابن ہشام اگرچہ سنی ہیں لیکن ان کی کتاب دراصل بنی اسحق کی کتاب ہے۔ بلاذری کی کتابیں ان سب کی روایات کا مجموعہ ہیں۔

ان سبائی اور مجوسی مؤرخین نے جو بہرہ سرائیں کی تھیں انہیں ابن جریر طبری مجوسی نے اپنی کتاب میں نہ صرف جمع کیا بلکہ مزید اضافات بھی کئے۔ اور مسعودی تو ان سب سے ایک قدم آگے ہے۔ بعد کے سنی علماء کی اگر کتابوں کو اٹھا کر دیکھا جائے تو وہ ان کتابوں کا جبرہ بنظر آتی ہیں۔ ابن خلدون نے مقدمہ میں تاریخ کو پرکھنے کے لئے کچھ اصول وضع کئے اور کچھ خلاف عقل روایات کو خیر باد بھی کہا۔ لیکن طبری، واقدی اور ابن اسحاق سے باہر نہ جاسکے۔

اگر ان تمام امور کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو حدیث اور تاریخ میں تب بھی اصولی طور پر زبردست تضاد ہے۔ جس کے سبب تاریخ کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ محدثین نے روایت حدیث کے سلسلہ میں راوی کے لئے جو شرائط رکھی ہیں ان میں سے ہم چند قارئین کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ راوی مسلم ہو، عاقل ہو، بالغ ہو۔

۲۔ راوی معروف و مشہور شخص ہو، مجہول راوی نہ ہو۔

۳۔ اس کا حافظہ قوی ہو، بھول کا مادہ نہ ہو۔

۴۔ عادل ہو، یعنی گناہ کبیرہ کا مرتکب نہ ہو۔

۵۔ صادق ہو، یعنی جھوٹا نہ ہو، جیسی کہ دنیاوی معاملات میں بھی اس سے جھوٹ بولنا ثابت نہ ہو۔

۶۔ مصنف کتاب سے حضور تک روایت کا تسلسل برقرار رہے۔ درمیان سے کوئی راوی سا قاطع نہ ہو۔

۷۔ ایک راوی کا دوسرے راوی سے روایت سننا یا ملاقات کرنا ثابت ہو۔

۸۔ راوی ایسی روایات بیان نہ کرتا ہو جو دیگر راوی بیان نہیں کرتے۔

اس کے برعکس مؤرخین کا اصل الاصول یہ ہے کہ روایت ملنی چاہئے۔ خواہ راوی مسلم ہو یا کافر، سچا ہو یا جھوٹا۔ بائع ہو یا نابائع، عاقل ہو یا مجنون، الحواس قلیسل ہو یا قرار رہے یا نہ رہے۔ خواہ درمیان سے کئی راوی چھوٹ جائیں۔ راوی کو کوئی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو، راوی کا دوسرے راوی سے سننا ثابت ہو یا نہ ہو۔ صرف روایت کا وجود ہونا چاہیئے۔

محدثین نے راوی کے لئے وہی شرائط رکھی ہیں جو شریعت نے شہادے کے لئے رکھی ہیں اور ہر واقعہ اور ہر خبر ان کے نزدیک شہادت ہے اور جب گواہ ناقابل قبول ہو گا تو کسی واقعہ کو کیسے تسلیم کر لیا جائے گا۔

ان شاہدین کا حال معلوم کرنے کے لئے محدثین نے سینکڑوں اور ہزاروں میل کے سفر کئے اور ایک ایک راوی کا ظاہر و باطن معلوم کیا۔ حتیٰ کہ ان کا مذہب کیا تھا۔ زندگی میں کس کس سے استفادہ کیا۔ کہاں کہاں کا سفر کیا۔ کون کون سی روایت بیان کی۔ اس سے نقل کرنے والے کون کون افراد تھے۔ انہم عن اس صرح ایک ایسا فن ایجاد کیا جو آج تک روئے زمین پر کوئی دوسری قوم ایجاد نہ کر سکی۔ اور کئی لاکھ راویوں کے حالات جمع کر ڈالے۔ بلکہ اس فن کے باعث مزید فنون ایجاد ہوئے۔ مثلاً فن علل فن جرح و تعدیل۔ علم الروایۃ۔ علم الدراۃ۔ علم الاسماء والصفات۔ علم المشتبہ۔ علم الکئی۔ علم الضعفاء۔ علم الثقات۔ اور پھر ان میں سے ہر فن پر بیسیوں کتابیں تحریر میں لائی گئیں۔

اب ایسی صورت میں تاریخ کے ذریعہ حدیث کے معاملہ میں فیصلہ دینا ایسی ہی حیثیت رکھتا ہے جیسا کہ کسی کذاب زمانہ کو کسی سچے انسان کے خلاف فیصلہ دینے کے لئے حج متعین کر دیا جائے۔ تاریخ کی یہ صورت حال سمجھنے کے بعد ان لوگوں کے ذہن کا قارئین خود اندازہ کر سکتے ہیں جو حدیث کے خلاف زہر لگتے پھرتے ہیں۔ دراصل انہیں اس امر کا خوف ہے کہ کہیں استعمال کر کے ان کے جھوٹ کی پل نہ کھول دے۔ کیونکہ یہ عمارت بغیر بنیاد کے قائم ہے۔ اس کیسے

تو معمولی سا جھٹکا بھی کافی ہوگا۔ دشمنان اسلام اور سبائیوں کو تو یہی فکر لاحق ہے۔ لیکن مودودی صاحب کو اپنی سیادت کی فکر لاحق ہوئی۔ اور اس کے لئے انہوں نے آئندہ کا سدباب کرنے کے لئے یہ اصول بھی پیش کر دیا کہ اگر تاریخ میں ان معروف و مسلمہ اصولوں سے کام لیا گیا اور سادہ لوگوں پر حرج و تنقید کی گئی تو ہمارے پاس کیا بچے گا۔ ملاحظہ ہو کتنے حسین الفاظ میں کئی سو سال کے علماء کی کوششوں پر پانی پھیرا گیا ہے۔ اور کس طرح سبائیوں کی پشت پناہی کی گئی۔

لیکن قربان جائے محمود احمد عباسی کے انھوں نے ”خلافت معاویہ ویرینہ“ لکھ کر بہت سوں کو تنگ کرنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہ لوگ اپنے موقف میں اتنے آگے بڑھ گئے ہیں کہ ان غیبتی کی امامت کے گیت گانے لگے ہیں۔ جو اپنی ”ولایت فقیہ“ میں تمام انبیاء کو ناکام اور صحابہ کرام کو غاصب اور ظالم قرار دیتے ہیں۔

یہ نظریہ تو مودودی صاحب کا ہے۔ لیکن علامہ شبلی مرحوم نے سیرت النبی کی جداول میں متعدد مقامات پر اصول حدیث سے کام لیا۔ اور ان کے بعد ان کے شاگرد رشید سید سلیمان مودودی مرحوم نے اس فن کو کافی اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ ہماری اس کتاب کا مقصد بھی یہی ہے کہ ان مجوسیوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام وغیرہ کی جانب جو غلط باتیں منسوب کیں ہیں۔ ان کا پرندہ فاش کیا جائے اور حقیقت سے روشناس کر دیا جائے۔

ہماری اس تحریر کا مقصد ہرگز یہ نہیں کہ ہر تاریخی روایت کا رد کر دیا جائے بلکہ وہ تاریخی روایات جو دراول میں تواثر کے ساتھ ثابت تھیں ان پر کوئی اعتراض واقع نہ ہوگا۔ اختصار تو صرف ان کہانیوں پر ہے جنہیں ایک شخص کے علاوہ کوئی دوسرا روایت نہیں کرتا۔ اور وہ شخص سبائی یا مجوسی ہو۔ ایسی صورت میں اس کی روایت ہرگز قابل قبول نہ ہوگی۔ محدثین جب تاریخ کا حوالہ دیتے ہیں تو ان کی مراد واقعات نہیں ہوتے۔ بلکہ وہ تاریخ سے صرف اتنا کام لیتے ہیں کہ غلام شخص کب پیدا ہوا اور غلام شخص کی موت کب واقع ہوئی تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ ان دونوں کی ملاقات ممکن بھی ہے یا نہیں۔ اگر وہ ملاقات ہی ممکن

نہیں تو واقعہ کا وجود سرے سے باطل ہو جاتے گا۔ مثلاً طبری کا یہ دعویٰ کہ مجھے سری بن اسفیل نے فلاں واقعہ لکھ کر بھیجا۔ سری کا انتقال ۸۳۰ء میں ہے۔ جب کہ مورخ طبری ۲۲۰ء میں پیدا ہوا۔ تاریخ کا یہ حلقہ اسماء الرجال کا ایک اہم جز ہے۔ صرف اسی بات سے موردی صاحب کے اس دعویٰ کی حقیقت کھل جاتی ہے کہ طبری ایک محقق مورخ ہے اور اس نے چھان پھٹک کے بغیر کوئی روایت نقل نہ کی ہوگی۔ اس سے بڑھ کر اندھی دکالت اور کیا ہوگی۔ قربان جائے اس سادگی کے۔

ہمارے علماء چونکہ ان تحقیقی فنون کو اب بالائے طاق رکھ چکے ہیں۔ اسی لئے وہ مجبور ہو کر یہ کہتے ہیں کہ فلاں روایت بخاری و مسلم میں پائی جاتی ہے۔ لہذا اس پر ایمان لانا ضروری ہے کیونکہ بخاری و مسلم نے صحت کا اہتمام کیا ہے۔ اور صرف ثقہ راویوں سے روایت لی ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ بخاری و مسلم میں بعض روایات باہم متضاد ہوتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں صرف ایک ہی روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے گا۔

راہ یہ دعویٰ کہ ہر وہ راوی ثقہ ہو گا جس سے بخاری و مسلم روایت کریں۔ تو بے شک وہ ان حضرات کے نزدیک ثقہ ہے لیکن اس سے ہرگز یہ لازم نہیں آتا کہ دیگر ائمہ کے نزدیک بھی وہ راوی ثقہ ہو۔ مثلاً عمرہ مولیٰ ابن عباس، بخاری نے اس سے روایت لی ہے۔ لیکن امام سعید بن السیب، امام محمد بن سیرین، ابن عون، حماد بن زید، علی بن عبداللہ بن عباس اور امام مالک فرماتے ہیں وہ کذاب ہے۔ یا مثلاً شریک بن عبداللہ الدنی سے مالک اور بخاری وغیرہ نے روایت لی ہے۔ لیکن مسلم کا دعویٰ ہے کہ اس کا حلقہ خراب تھا۔ وہ روایت میں کبھی کی کرتا ہے، کبھی زیادتی، کبھی واقعہ کو آگے کرتا ہے اور کبھی پیچھے۔ اس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ جسے سا بڑا محدث بھی اگر کسی سے روایت کرتا ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ تمام ماہرین فن کے نزدیک بھی ثقہ ہو۔ اسی لئے یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ نہ معلوم کس جگہ روایت میں غلطی واقع ہوئی ہو۔ اور بعض اوقات غلطی کا احساس بھی ہوتا ہے لیکن یہ معلوم کرنا دشوار ہوتا ہے کہ یہ غلطی کس سے واقع ہو رہی ہے۔

اپنی وجوہات کو پیش نظر رکھتے ہوئے محدثین نے جہاں اصول روایت وضع کئے۔ وہاں اصول

درایت بھی وضع کئے۔ یعنی عقل سے کام لیتے ہوئے کن اصولوں کے ذریعہ روایت کو پرکھا جائے گا۔ ہم ذیل میں قارئین کے سامنے وہ اصول پیش کر رہے ہیں۔

## موضوع حدیث کی معرفت کے اصول

شاہ عبدالعزیز دہلوی المتوفی ۱۲۳۱ھ نے اپنے رسالہ ”عجائز نافعہ“ کے آخر میں وضع حدیث اور اس کے اسباب پر ایک مختصر مضمون قلم بند کیا ہے۔ جس کا ترجمہ ہم قارئین کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔ تاکہ قارئین کرام یہ معلوم کر لیں کہ محدثین کرام نے حدیث کی حیثیت معلوم کرنے کے لئے کیا کیا اصول وضع کئے۔ جن کو پیش نظر رکھتے ہوئے ہر روایت اور ملام کہانی پر غور کر کے اس کی حقیقت معلوم کی جاسکتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں :-

واضح رہے کہ حدیث کے موضوع اور راوی کے جھوٹے ہونے کی چند علامات ہیں۔

۱۔ راوی تاریخ مشہورہ کے خلاف روایت کرے۔ مثلاً ایسی روایت جس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ حضرت عبداللہ بن مسعود جنگ صفین میں شریک ہوئے۔ حالانکہ حضرت عبداللہ حضرت عثمان غنیؓ کے عہد خلافت میں انتقال فرما چکے تھے۔ یہ شعر بھی اسی نوعیت کا ہے :-

دردِ جمل چوں معاویہ بگرِ نیت      خونِ خلعے بسے بہ بیہیدہ رنج

یعنی جنگ جمل میں جب معاویہ نے فرار اختیار کیا تو بہت سی مخلوق کا خون بے کار ہوا۔

حالانکہ جنگ جمل میں امیر معاویہؓ یا ان کا کوئی ساتھی شریک نہ تھا، اس قسم کی سن گھڑت

روایتیں معمولی غور و فکر اور ذہنی تدریج سے سمجھ سہی جاسکتی ہیں۔

۲۔ اگر راوی رافضی ہو، اور وہ صحابہ پر طعن کے متعلق حدیث روایت کرے، یا اناصبی ہو، یعنی

دشمن علیؓ، اور وہ اہل بدعت کے طعن کے سلسلہ میں حدیث روایت کرے۔ (ایسی روایت موضوع ہوگی)

۳۔ راوی ایسی حدیث روایت کرے، جس کا جاننا اور اس پر عمل کرنا بر مسلمان پر فرض ہو۔ لیکن

اس کے باوجود اس راوی کے علاوہ کوئی دوسرا روایت نہ کرے، تو یہ حدیث کے موضوع ہونے اور

راوی کے جھوٹے ہونے کا قرینہ ہوگا۔

۴۔ وقت اور حالت ہی راوی کے جھوٹے ہونے کی دلیل ہو، جیسے غیاث بن میمون کا واقعہ کہ وہ خلیفہ مہدی عباسی کی مجلس میں حاضر ہوا، اور مہدی اس وقت کہوتر اڑا رہا تھا۔ غیاث نے یہ صورت دیکھ کر یہ حدیث بیان کی۔

لَا سَبَقَ الْإِنْفِ خَفَا وَنَصْلًا وَ  
گھڑ دوڑ، تیر اندازی، اونٹ دوڑانے اور  
حافرا و جناح پر نہ اڑنے میں کوئی گناہ نہیں۔

اس غیاث بن میمون نے خلیفہ مہدی کو خوش کرنے کے لئے او جناح کا لفظ اپنی جانب سے بڑھا دیا۔ ورنہ حدیث رسول میں پرندوں کا کوئی ذکر نہ تھا۔

۵۔ روایت عقل و شریعت کے مقتضی کے خلاف ہو۔ اور قواعد شرعیہ اس کی تکذیب کرتے ہوں۔  
جیسے قصائے عمری یا اسی قم کی اور باتیں، یا جیسے یہ روایت

لَا تَأْكُلُوا الْبَطِيخَ حَتَّى تَذْبُوْحَا تَرْبُوزَ ذِي كَلْبٍ غَيْرَ تَهَاؤَ۔

۶۔ ایسا حسنی واقعہ ہو کہ اگر فی الواقع وہ پیش آتا تو سینکڑوں اور ہزار ہا انسان اسے دیکھتے اور نقل کرتے۔ اس کے باوجود اس واقعہ کا تنہا صرف ایک راوی ہو، اور کوئی اسے روایت کرنے والا نہ ہو۔ مثال کے طور پر ایک شخص یہ روایت کرے کہ آج بروز جمعہ خطیب مسجد کو برسر منبر قتل کر کے اس کی کھال اتار لی گئی۔ اور یہ وقوعہ تمام نمازیوں کے سامنے پیش آیا۔ لیکن ایک شخص کے علاوہ کوئی شخص اسے بیان نہ کرتا ہو۔

دیا جیسے حضرت علیؑ کے لئے سورج لوٹ آئے۔ یہ ایسا واقعہ ہے جسے ہزاروں کو نقل کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اسماء بنت عمیس کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا،

۷۔ روایت کے الفاظ اور معنی رکیک ہوں۔ مثلاً ایسے الفاظ سے روایت کرے جو لمحات قواعد

عربیہ درست نہ ہوں (صوفیاء کی بیان کردہ اکثر روایات کا یہی حال ہے کہ ان کی عربی ہمک درست نہیں ہوتی، جو اس بات کی دلیل ہوتی ہے کہ یہ روایت کسی عجمی نے وضع کی ہے۔ جیسے یہ مشہور روایت

لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتَ الْاَفْلَاكَ اس کی عربیت تک درست نہیں،

۸۔ صغیرہ گاہ سے ڈرنے کے لئے حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ہو۔ یا معمولی سے عمل پر حد سے زیادہ

ثواب کا مستحق قرار دیا جائے۔ مثلاً

من صلی رکعتین فله سبعون الف      جو دو رکعتیں پڑھے گا۔ اس کیلئے ستر ہزار گھر  
دارونی کل دار سبعون الف بیت      ہر گھر میں ستر ہزار کمرے، ہر کمرے میں ستر ہزار  
فی کل بیت سبعون الف سریر و علی      تخت اور ہر تخت پر ستر ہزار فونڈیاں ہوں گی۔  
کل سریر سبعون الف جاسریۃ۔      کل سریر سبعون الف جاسریۃ۔

اس قسم کی حدیث خواہ ثواب کے متعلق ہوں یا عذاب کے، انہیں جعلی اور موضوع سمجھنا چاہیئے۔  
(اس قسم کی روایات ”غنیۃ الطالبین“ اور ”حیاء العلوم“ میں کافی تعداد میں دستیاب ہیں۔)  
۹۔ معمولی سے عمل پر حج و عمرہ وغیرہ کے ثواب کی امید دلانا۔

۱۰۔ نیک کام کرنے والوں کو یہ خوش خبری سننا۔ اور اُن سے یہ وعدہ کرنا کہ انہیں فلاں کار خیر یا دنیا پریم

السلام جیسا ثواب دیا جائے گا۔ یا ستر انبیاء کا ثواب ملے گا۔ یا اسی قسم کی اور بہت سی باتیں بیان کرنا۔

۱۱۔ راوی نے احادیث وضع کرنے کا خود اقرار کیا ہو۔ جس طرح صوفی نوح بن ابی حصہ المتوفی ۳۲۷ھ

نے تقرر کیا کہ اس نے قرآن کی ہر سورت کی فضیلت میں احادیث وضع کیں۔ اور انہیں رواج اور بہت

دی۔ جیسا کہ تفسیر رضیاء میں ہر سورت کے آخر میں اس کے فضائل کو بیان کیا ہے۔

جب نوح بن ابی حصہ کو پکڑا گیا اور اس سے سند کے سلسلہ میں پوچھ گچھ کی گئی تو اس نے اعتراف کیا

کہ ان حدیثوں کے وضع کرنے سے میرا مقصود نیک تھا کیونکہ جب میں نے یہ دیکھا کہ لوگ قرآن کو چھوڑ

کر ابو حنیفہ کی فقہ اور محمد بن اسحاق کی تاریخ میں مشغول ہیں، تو لوگوں کو ترغیب دینے کی غرض سے میں نے

یہ روایات وضع کیں، تاکہ لوگ قرآن کی طرف متوجہ ہوں۔ اور ان فرضی ثوابوں کی تمنا میں تلاوت قرآن

اور اس کے درس میں مشغول ہوں۔ حالانکہ اس کا یہ بہانہ ”عذر گناہ بدر از گناہ“ کے مترادف تھا۔ کیونکہ فضائل

قرآن کے سلسلہ میں جو صحیح احادیث پائی جاتی ہیں۔ ترغیب کے لئے وہی بہت کافی تھیں۔



اسی طرح تبا کو جتھ نوشی اور قبوہ کی ممانعت میں بہت سی روایات گھڑ لی گئیں جن کے الفاظ اور معانی کی رکاکت ظاہر و آشکارا ہے (حالانکہ یہ چیزیں حضور کے صدیوں بعد وجود میں آئیں) دھمیں حدیث کچھ کم نہیں گزرے جس طرح دافعیین بئرت میں اسی طرح وضع حدیث سے ان کی اغراض بھی مختلف ہیں۔ مثلاً فرقہ زمانہ ان کے پیش نظر شریعت کو باطل کرنا اور دین کا مذاق اڑانا تھا۔ چنانچہ ابن الروندی (جو ایک یہودی کی اولاد تھا، اور اللہ کا منکر تھا، اس نے اسلام کے رد میں متعدد کتابیں تصنیف کیں۔ جسے بعد میں صوفیاء نے تصوف کا لبادہ پہنا دیا۔ اور اس کی کتاب میں تصوف و معرفت کی کتابیں بن گئیں) اس نے یہ حدیث بھی وضع کی تھی۔

الباذنجان لما اکل لہ      سینگ ہر مرض کی شفا کے لئے کھایا جائے۔

اس روایت سے اس کی غرض شریعت کا مذاق اڑانا اور اس حدیث  
القرآن لما تری لہ      قرآن جس کام کے لئے پڑھا جائے

اور

ماء من مزمن لما شرب لہ      آپ زہم جس کام کے لئے پیا جائے۔

کا مذاق اڑانا تھا۔

علماء کا قول ہے کہ زمانہ فرقہ کی وضع کردہ چودہ ہزار احادیث مشہور ہو چکی ہیں۔ یہ خواہشات کے بندے محض اپنے مذہب کی اعانت اور مخالف کے مذہب پر طعن کرنے کے لئے اس فعل کے مرکب ہوئے ہیں۔ رافضی، صوفیاء، اور کرامیہ تو اس عمل میں سب پر سبقت لے گئے۔ خارجی، زیدی اور معتزلہ تو پھر بھی اس امزج کے اس قدر ترکب نہیں ہوئے۔

اہل علم کی ایک جماعت جو علم حدیث سے مس نہ رکھتی تھی۔ اس نے جب یہ دیکھا کہ محدثین کو نہایت قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ان کی بڑی عزت کی جاتی ہے۔ تو ان کے دل میں محدث بننے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس لئے انہوں نے احادیث وضع کرنی شروع کیں۔ تاکہ نہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی، اور رنگ چھو کھا آئے۔ جیسے ابو البختری و سہب بن القاص سلیمان بن عمرو حسین بن

علوان اور اسحاق بن یحییٰ وغیرہ۔ اس وقت کے بیشتر علماء وعظما ونبیحت میں مشغول رہے اور حالات زمانہ یکمطابق لپٹا پٹے۔ غلوں کی بے نیو میں احادیث ڈھالتے رہے۔ اور اتفاق سے یہ سب نابہ و متقی اور شب بیدار لوگ تھے۔ آج کل کے علماء کی اکثریت اسی صف میں داخل ہے۔

ایک اور فرقہ جوزہد و عبادت اور دیانت میں مشہور تھا۔ انہوں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا آنکہ کرام سے کوئی بات سنی۔ تو انہوں نے اپنے خواب پر یقین کرتے ہوئے اس بات کو مبہم روایت کر دیا اور خواب کا ذکر ترک کر دیا۔ لوگوں نے سمجھا کہ واقعاً یہ حدیث ظاہر سند کے ذریعہ ان تک پہنچی ہے۔ چنانچہ صوفی ابو عبد الرحمن سلیمی (جو صوفیاء میں بہت برے مصنف مانے جاتے ہیں) اور دوسرے صوفیاء کو جو حدیث کا ذوق نہ رکھتے تھے۔ اسی عیب سے مشہم کیا گیا ہے۔ اور ان کی روایت کو ناقابل اعتبار قرار دیا گیا ہے۔

دوسرا فرقہ خلفاء و سلاطین اور امراء کے ان مصاحبین کا ہے۔ جنہوں نے محض ان کی دلجوئی کے لئے حدیثیں وضع کیں۔ اور دین کو دنیا کے بے بیجا جیسا کہ موجودہ دور کے علماء سیاست کہہ رہا جائز کو جائز بناتے جا رہے ہیں)۔

ایک گروہ نے بلا ارادہ بھی احادیث وضع کیں، جس کی صورت یہ ہوئی کہ انہوں نے کسی تجربہ کار شخص یا کسی صوفی، یا علماء سابقین میں سے کسی کا کوئی کلام سنا۔ اور پھر اپنی غفلت اور بھول سے اسے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب کر دیا۔ یہ سوچتے ہوئے کہ ایسی حکمت کی بات سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں کہہ سکتا۔ اس فرقہ کی کوئی حد و نہایت نہیں ہے۔ بیشتر عوام اسی مرض میں مبتلا ہیں۔

اس رسالہ میں جو کچھ ذکر ہوا ہے وہ بطور نمونہ کافی ہے۔ ورنہ ان مطالب کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے۔ اس علم کی ضروریات ہر طرف اور ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ لیکن صحیح و ضعیف میں تمیز ذہن کی استقامت، طبیعت کی سلامتی اور خطا کی طرف مائل نہ ہونا۔ اور ادنیٰ ایسی تنبیہ سے راہ صواب اختیار کرنا ایک بڑی نعمت ہے۔ حق تعالیٰ ہم کو ان امور سے بہرہ مند فرمائے۔ ورنہ علم اور مواد علم تو بہت ہے۔

لیکن جو چیزیں کیاب ہیں وہ یہی امور ہیں۔

یہ تو شاہ عبد العزیزؒ کا بیان ہے جو ہم نے بعینہ نقل کر دیا ہے۔ شاہ صاحب نے حوضِ حدیث کو نیچا پننے کے لئے صرف گیارہ اصول بیان فرمائے ہیں۔ لیکن امام ابن الجوزی، حافظ ابن القیم، حافظ سخاوی اور جزیری وغیرہ نے اور بہت سے اصول تحریر کئے ہیں۔ جن کو ملا علی قاری نے اپنی موضوعات میں نقل کیا ہے۔ ہم وہ ایک فہرست کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

۱۔ جس روایت میں اس قسم کے مضامین ہوں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان سے بعید ہوں۔ مثلاً ستر ہزار حوریں، ستر ہزار خادم اور ستر ہزار دروغہ یا اسی قسم کی مہمل تعداد کا ذکر ہو۔ (جیسا کہ ”غنیۃ“ اور ”حیاء النعم“ میں پایا جاتا ہے۔)

۲۔ روایت جس اور تجربہ کے خلاف ہو۔ مثلاً بیٹنگن بر۔ بیماری کی شفا ہے و حالانکہ اگر گری کے بخاریں کھایا جائے تو مایہ نچو لیا ہو جائے گا۔ ویسے بھی ازماہ حکمت نہایت ردی غذا ہے،

۳۔ لوگوں کو اپنی جانب مائل کرنے کے لئے کوئی محال بات بیان کی جائے۔ مثلاً چاد ل اگر انسان ہو تا تو نہایت بڑا ہوتا۔

۴۔ معمولی سے عمل پر بہت بڑے اجر کا وعدہ ہو۔ جیسے صلاۃ الرغائب (یا شبِ براءت کی تلبیہ)

۵۔ چھوٹے سے گناہ پر بڑے عذاب کی وعید ہو۔

۶۔ تینوں کی فضیلت کا بیان ہو۔

۷۔ مختلف چیزوں کی فضیلت ہو۔ مثلاً گلاب حضور کے پسینہ سے پیدا ہوا۔ (احسانہ گلاب کا

وجود حضور سے قبل بھی تھا)

۸۔ کہو تر یا مرغیاں پالنے کی فضیلت ہو۔

۹۔ ہیری کے درخت کے سلسلہ میں جتنی روایات ہیں سب مونسوع ہیں۔

۱۰۔ مہندی کی فضیلت کا ذکر ہو۔

۱۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حمام میں نہانے یا نورہ لگانے کا ذکر ہو۔

۱۲۔ روایت صریح سنت کے خلاف ہو۔ مثلاً جس کا نام محمد یا احمد ہوگا۔ وہ جہنم میں نہ جائیگا۔

۱۳۔ روایت صریح قرآن کے خلاف ہو۔ مثلاً اُمّ بانی کے گھر سے معراج۔

۱۴۔ عقل صریح کے خلاف ہو۔

۱۵۔ جس حدیث میں حضرت عائشہؓ کو حمیرا کے لقب سے مخاطب کیا گیا ہو۔

۱۶۔ جس حدیث میں یا علیؓ کے لفظ سے خاص حضرت علیؓ کو مخاطب کیا گیا ہو۔ بجز ایک حدیث

یا علی انت منی بمنزلہ ہماروں من موسیٰ۔ اسے علیؓ تو میری جگہ رہا ہی جیسے ہارونؓ موسیٰؓ کی جگہ تھے۔

۱۷۔ ایسا کلام ہو جو انبیاء کرام کے کلام سے مشابہ نہ ہو۔

۱۸۔ ایسا واقعہ ہو جسے ہزاروں کو بیان کرنا چاہیے تھا۔ لیکن ایک شخص کے علاوہ کوئی روایت

نہ کرے جیسے حضرت علیؓ کے لئے سورج کا لوٹنا۔

۱۹۔ ایسی حدیث ہو جس سے کسی شے کی فرضیت یا اہمیت ثابت ہوتی ہو۔ لیکن ایک شخص کے

علاوہ کوئی روایت نہ کرتا ہو۔

۲۰۔ آئندہ پیش آنے والے واقعات کے لئے کسی سند یا تاریخ معینہ کا ذکر ہو۔

۲۱۔ مکہ و مدینہ کے علاوہ کسی اور شہر کی فضیلت ہو۔ مثلاً۔ قزوین، عسقلان اور قیروان وغیرہ

اس قسم کی موضوعات ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں۔

۲۲۔ مسجد حرام، مسجد نبوی، مسجد اقصیٰ اور مسجد قبا کے علاوہ کسی اور مسجد کی فضیلت کا ذکر ہو

مثلاً مسجد ابراہیمی، مسجد طور، یا مسجد قبلتین وغیرہ۔

۲۳۔ کسی زیارت گاہ یا مقبرہ کا بیان ہو۔

۲۴۔ حدیث میں حکمت کا کوئی اصول بیان کیا گیا ہو۔

۲۵۔ خضر دانیس کی حیات یا ان سے کسی کی ملاقات کا ذکر ہو۔

۲۶۔ ہر مرد کی نوافل کا ذکر ہو (یہ نوافل "احیاء العلوم" غنیۃ الطالبین" اور "بہار شریعت" وغیرہ

میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۷۔ رجب یا اس کے روزوں کی فضیلت ہو۔ جیسے لکھی روزہ۔

۲۸۔ رجب میں مخصوص نمازوں کا ذکر ہو۔ جیسے صلوٰۃ الرغائب۔

۲۹۔ شب برارت کی مخصوص نمازوں کا بیان ہو۔

۳۰۔ الفاظ رکبک اور عربیت سے گرے ہوئے ہوں۔

۳۱۔ حیشہ، سودان یا ترکوں کی مذمت ہو۔

۳۲۔ قیامت کے بارے میں کسی معینہ صدی کا ذکر ہو (جیسے چودھویں یا پندرھویں صدی)۔

۳۳۔ دنوں کی نحوست کا ذکر ہو (مثلاً منگل یا بدھ منحوس ہیں)۔

۳۴۔ خصیوں کی مذمت ہو۔

۳۵۔ حضور کے مقبرہ یا اس کی زیارت کی فضیلت ہو۔

۳۶۔ دیگر قرائن سے روایت کا جھوٹا ہونا ثابت ہوتا ہو۔

۳۷۔ اولاد کی پردریش کی مذمت ہو۔

۳۸۔ عقیق یا کسی اور پتھر کی فضیلت یا اس کے اثرات کا بیان ہو۔

۳۹۔ جنات سے جنگ کا بیان ہو۔ جیسا کہ حضرت علیؑ کا بدر کے کنوئیں میں جنات سے جنگ کرنا۔

۴۰۔ حضور کی پیدائش کا حال ہو۔

۴۱۔ ہر ہر سورت کی فضیلت کا جدا گانہ ذکر ہو۔

۴۲۔ چاروں آنکہ میں سے نام بنام کسی کی فضیلت یا کسی کی مذمت ہو۔

۴۳۔ حجاب گرام یا ان میں سے کسی کی مذمت ہو۔

۴۴۔ کنوارپن کی تعریف ہو۔

۴۵۔ دلہ حرام کی مذمت ہو۔ (حالانکہ اُس بے چارے کا کیا قصور)۔

۴۶۔ خرقد پوشی کا ذکر ہو۔

۴۷۔ حضرت علیؑ کے علم باطن کا ذکر ہو۔

۴۸۔ راوی خارجی یا ناصبی ہو اور حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کی مذمت کا ذکر کر رہا ہو۔

۴۹۔ راوی رافضی ہو اور حضرت علیؑ اور ان کی اولاد کی فضیلت میں روایت بیان کر رہا ہو۔

یا ایسی روایت ہو جس میں کسی صحابی یا متعدد صحابہ کی مذمت ہو۔

۵۰۔ بدعتی ہو، اور اپنی بدعت کی تائید میں حدیث روایت کر رہا ہو۔

۵۱۔ راوی قصہ گو و اغط ہو۔

۵۲۔ جس تاریخ کا واقعہ بیان کر رہا ہے۔ اور اس واقعہ میں جس شخص کی موجودگی کو بیان کر

رہا ہے۔ وہ اس وقوعہ کے پیش آنے سے قبل مرچکا ہو۔

۵۳۔ راوی کذاب یا مشہم بالکذب ہو۔

۵۴۔ راوی زندقہ، بے دین یا فاسق ہو۔

۵۵۔ راوی منکر روایات بیان کرتا ہو۔

۵۶۔ راوی کی عام روایات ثقہ راویوں کے خلاف ہوں۔

۵۷۔ قیامت کے روز سادات یا کسی خاندان کی بخشش کا ذکر ہو۔

۵۸۔ قیامت کے روز ماؤں کی جانب منسوب ہونے کا بیان ہو۔

۵۹۔ غلہ یا کسی دال کی تعریف ہو۔ (مثلاً مسور کی دال)

۶۰۔ بنو عباس کی خلافت کا بیان ہو۔

۶۱۔ بنو امیہ کی مذمت ہو۔

۶۲۔ امیر معاویہؓ کی مذمت ہو۔

۶۳۔ بنو عباس کے جنتی ہونے کا بیان ہو۔

۶۴۔ واقعہ تاریخ مشہورہ کے خلاف ہو۔

۶۵۔ کوئی ایسا قریب پایا جاتا ہو جس سے روایت کا جھوٹا ہونا معلوم ہوتا ہو۔

۶۶۔ عارِ نمر دایرِ عروجِ بنِ عتق کے غویلِ قد و قامت کا بیان ہو۔

۶۷۔ بیباکوں کی تعریف ہو۔ جیسے طورِ سینا وغیرہ دغیہ میں بیباکوں کی فضیلت میں پورا ایک

باب ہے۔

۶۸۔ غصہ رکے والدین کے دوبارہ زندہ ہونے یا جنتی ہونے کا ذکر ہو۔

۶۹۔ غصہ رکے والدین یا ابوطالب کے ایمان لانے کا ذکر ہو۔

۷۰۔ حُسن کی تعریف ہو۔

۷۱۔ جس روایت میں ظلم و فساد اور باطل کی تعریف اور حق گوئی کی مذمت کا ذکر ہو۔

۷۲۔ صلوة الادا میں کی فضیلت ہو۔

۷۳۔ عمامہ باندھ کر نماز پڑھنے کی فضیلت ہو۔

حافظ ابن القیم اور دیگر محدثین نے مختلف مقامات پر کچھ اور بھی اصول بیان کئے ہیں جو پیش خدمت ہیں۔

۱۔ حضرت اسحاقؑ کے ذیج اللہ ہونے کا ذکر ہو۔

۲۔ ابدال و اقطاب اور اولیاء کا بیان ہو۔

۳۔ دعا بالوسیلہ کا ذکر ہو۔

۴۔ حضرت علیؑ کی خلافت و امامت یا ولایت کا ذکر ہو۔

۵۔ اختلاف صحابہ کے وقت حضرت علیؑ کے حق پر ہونے کا ذکر ہو۔

۶۔ ازواجِ مطہرات میں سے کسی کی مذمت ہو۔ مثلاً حضرت عائشہؓ کے بارے میں حوَّاب

کے کتوں کا ذکر۔

۷۔ حضرت حسینؑ کی شہادت کا ذکر ہو۔

۸۔ آمین بالجہر کی تمام روایات موضوع یا منکر ہیں۔

۹۔ بسم اللہ بالجہر کی کوئی روایت صحیح نہیں۔

۱۰۔ حوض کوثر پر کسی صحابی یا کسی ولی کے ساتی ہونے کا ذکر ہو۔

۱۱۔ قیامت کے دن کسی شخص کے سایہ کا ذکر ہو۔

۱۲۔ اسم اعظم کے ذریعہ حصول دنیا کا ذکر ہو۔

۱۳۔ آصف بن برخیا کا ذکر ہو۔

۱۴۔ شداد کی جنت کا بیان ہو۔

۱۵۔ زین العابدین باقر اور جعفر کی فضیلت ہو۔

۱۶۔ واقعہ روایت مشہورہ یا متواترہ کے خلاف ہو۔

۱۷۔ ایسی روایت ہو جس پر صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا عمل نہ رہا ہو خواہ اس کے راوی ثقہ ہوں۔

۱۸۔ تصوف کا ذکر ہو۔

۱۹۔ کمالی کا ذکر ہو۔

۲۰۔ فقر و فاقہ کی فضیلت ہو۔

۲۱۔ حضرت علیؑ کے باب العلم ہونے کا ذکر۔

۲۲۔ حضرت علیؑ کے لئے خلافت کی وصیت کا ذکر ہو۔

۲۳۔ سب سے پہلے عقل کو پہنچانے کی جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔

۲۴۔ سب سے پہلے حضورؐ کے پیدا کرنے کی جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔

۲۵۔ نور الہی سے کسی انسان کی تخلیق کا ذکر ہو۔ یقیناً وہ روایت موضوع ہے۔

۲۶۔ بیچ تن سے متعلقہ جتنی روایات ہیں سب موضوع ہیں۔

یہ ننانویس اصول ہیں جو ہم نے قارئین کی خدمت میں اس لئے پیش کئے ہیں تاکہ ان اصولوں کے ذریعہ سنی سنائی کہانیوں کا فیصلہ خود بخود کر لیا کریں۔ اس طرح انہیں بہت سی الجھنوں سے نجات مل جائے گی۔

حبیب الرحمان کاندھلوی



# سرخیاں

صفحہ نمبر		صفحہ نمبر	
۶۸	نور نبی کی تخلیق	۴۴	ولادت رسول کے قصے
۷۲	نور کی منتقلی	۴۴	شام کے محلات کا نظارنا
۷۴	نور کے وسیلہ سے دعا	۴۶	گلے میں تعویذ ڈالنے کا قصہ
۷۵	عبداللہ سے ایک کاہنہ کی درخواست	۴۷	زمین پرستاروں کا جھک آنا
۷۵	(منصب رسالت کے اغوا کی کوشش)	۴۹	حالت حمل میں حمل کا محسوس نہ ہونا
۷۶	مورخ کلی	۵۰	کیا آمنہ کے کسی چمچے پیدا ہوئے؟
۷۹	مسلم بن خالد الزنجی		حضور کے سال پیدائش میں روئے زمین
۸۰	نصر بن سلمہ	۵۲	پر کسی لڑکی کا پیدا نہ ہونا
۸۰	عبداللہ کے فراق میں دو سوعورتوں کا مرجانا	۵۴	جالوروں کا کلام کرنا
۸۱	ایک کاہن کی پیش گوئی	۵۶	باطلتی
۸۲	آتش کہ دل کا بجھنا	۵۷	ابوبکر بن ابی مریم
۸۴	کیا نبی کریم مختون پیدا ہوئے	۵۸	پیدائش کے ساتھ سینہ چاک ہونا
۸۶	برکات محمدی	۶۰	کعبہ پر قبضہ
۸۷	عدل و نفاست	۶۱	تمام دنیا پر قبضہ
۸۸	بولنا اور جلنا	۶۳	گہوارے میں کلام کرنا
۸۸	واپسی مکہ	۶۴	چاند سے باتیں کرنا
۹۲	مورخ محمد بن اسحاق	۶۶	ایک یہودی کی بشارت
۹۶	مورخ واقدی	۶۷	پیدا ہوتے ہی سجدہ کرنا

صفحہ نمبر ۱۶۳	ابو جعفر رازی	صفحہ نمبر ۹۸	ابراہیم بن محمد
۱۶۴	خالد بن یزید	۱۰۰	یہودیوں کے منصوبے آپ کے قتل سے متعلق۔
۱۶۴	ابو ہارون العبدی		
۱۶۶	کیا معراج ایک خواب تھا؟	۱۰۲	اسحق بن عبد اللہ بن ابی فروہ
۱۶۶	امیر معاویہ کا قول	۱۰۴	بادلوں کا ساتھ چلنا
۱۶۷	سورخ زیاد البکائی	۱۰۵	نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت
۱۶۹	حضرت عائشہؓ پر ایک الزام		عبد المطلب کی وفات کے وقت ان کے چھ بیٹے زندہ تھے
۱۶۹	سورخ سلمہ الابرش	۱۰۷	نحیرا لاسب کی داستان
۱۷۰	سورخ ابن حمید رازی	۱۲۱	شام کا ایک اور سفر (نسطورادوں کی کہانی)
۱۷۱	سورخ علی بن مہران	۱۲۲	قریش کی دعوت
۱۷۳	ہجرت مدینہ	۱۳۶	منہال بن عمرو
۱۷۳	ہجرت کا حکم اور ہجرت نبوی	۱۳۷	عبد الغفار بن قاسم
۱۸۲	حضرت ابو بکر اور ہجرت حبشہ	۱۳۸	حضرت عمرؓ کا اسلام
۱۸۳	اسلام میں سب سے پہلی مسجد	۱۴۱	قاسم بن عثمان
۱۸۹	تغائب	۱۴۶	اسحق بن ابراہیم الحنفی
۱۹۰	پہلا اسن نامہ	۱۴۶	اسامہ بن زید بن اسلم
۱۹۲	مذنیہ آمد	۱۴۶	شعب بنی ہاشم میں محصور ہونا
۱۹۵	غار ثور پر کبوتریں کا نڈھے دنیا	۱۵۱	ابن لہیعہ
۹۹	قصہ ام معبد (بے دودھ بکری کے مقنوں میں دودھ اتر آنا)	۱۵۴	معراج رسولؐ اور ابی ہانی ٹکا گھر
۲۰۴	سولو وعبہ کون؟	۱۵۸	معراج سے متعلق چند مزید داستانیں
۲۱۵	حضرت علیؓ کے لئے سورج کا لوٹنا	۱۶۱	

صفحہ نمبر

۳۳۱

قصہ شہر بانو

۳۵۸

حضرت حسنؑ کی زہر خورانی کا قصہ

۳۸۹

قرآن نیرول پر اٹھانا

۳۹۲

ابو مخنف

۴۰۹

سیدۃ النساء کون؟

۴۱۶

فراس بن یحییٰ

۴۱۷

ذکریا بن ابی زائدہ

۴۱۸

فصل بن وکین

۴۱۸

فرقہ مرحبہ

۴۱۹

ابو عوانہ

۴۲۰

ابو کامل الحمدی

۴۵۴

جنت میں بوڑھے بھی ہوں گے

۴۶۲

حضرت معاویہؓ کے لئے بد دعا

صفحہ نمبر

۴۲۲

حضرت علیؑ کا کندھوں پر اٹھانا

۴۲۰

جگر خوارہ (حضرت ہند پر بے بنیاد)

۴۵۱

الزامات

۴۵۱

در خمیر اور فاطمہ خیر

۴۵۵

کیا حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی کو زندہ دفن

۴۵۵

کر دیا تھا؟

۴۸۱

حضرت حسنؑ کب پیدا ہوئے؟

۴۸۸

حضرت حسینؑ کی پیدائش

۴۸۸

حواہ کے کتے رام المؤمنین حضرت

۴۹۶

عائشہؓ پر تبرکات

۳۰۶

اسماعیل بن موسیٰ القزازی

۳۱۳

حضرت عمرؓ کا اپنے بیٹے کو کوڑے مارنا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## ولادت رسول کے قصے

### شام کے محلات کا نظارنا

روایت ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے تو حضرت عبدالرحمان بن عوف کی والدہ شفا بنت اوس ولادت کے وقت آسنے کے پاس موجود تھیں، وہ کہتی ہیں، کہ جب آپ پیدا ہوئے تو پہلے غیب سے ایک آواز آئی، پھر شرق و مغرب کی ساری زمین میرے سامنے روشن ہو گئی یہاں تک کہ شام کے محل مجھ کو نظر آنے لگے۔ میں نے آپ کو کپڑا پہنا کر لٹایا ہی تھا کہ اندھیرا چھا گیا اور میں ڈر کر کانپنے لگی۔ پھر دایہ کی طرف سے کچھ روشنی نکلی تو یہ آواز سننے میں آئی، کہ کہاں لے گئے تھے۔ جواب ملا کہ مغرب کی سمت، ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ پھر وہی کیفیت پیدا ہوئی۔ میں ڈر کر کانپسی۔ پھر آواز آئی کہ کہاں لے گئے تھے۔ جواب ملا کہ مشرق کی سمت۔

سیّد سلیمان ندوی لکھتے ہیں۔ یہ حکایت ابو نعیم میں ہے۔ اس کا بیج کاراوی احمد بن محمد بن عبدالغفر

الزہری نامعبر ہے۔ اور اس کے بقیہ روایت مجہول الحال ہیں۔ سیرت النبیین ج ۲، ص ۴۴

اس روایت میں ایک عجیب لطیفہ یہ ہے کہ شفا جو حضرت عبدالرحمان بن عوف کی والدہ تھیں،

اُن کے والد یعنی حضرت عبدالرحمانؓ کے نانا کا نام اوس نہیں تھا۔ بلکہ عبداللہ تھا۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ کہانی وضع کرنے والا اول درجہ کا جاہل ہے۔

پھر بھی یہ سوچنے کی ضرورت ہے کہ واقعاً حضرت عبدالرحمانؓ کی والدہ شفاؓ کی اتنی عمر بھی تھی یا نہیں۔ کیونکہ حضرت عبدالرحمانؓ جس وقت اسلام لائے اُس وقت ان کی عمر سترہ سال تھی۔ گویا جب حضورؐ کی عمر تیس سال تھی تب عبدالرحمانؓ پیدا ہوئے۔ اب عبدالرحمانؓ کی پیدائش سے تیس سال قبل شفاؓ

کی کیا عمر ہوگی؟ جب ہم سوچتے ہیں تو ہمارا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ دلچگی کے وقت کوئی کنواری لڑکی موجود نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ حضور سے انہیں کم از کم بیس سال قبل پیدا ہونا چاہیئے اور عبدالرحمان کی پیدائش کے وقت ان کی عمر تالیس سال ہونی چاہیئے۔ اس طرح یہ حضور سے عمریں کم از کم بیس سال بڑی ہوں گی۔ جب کہ تمام موشین اس پر متفق ہیں کہ صحابیات میں کوئی عورت ایسی نہیں جو حضور سے عمر میں بڑی ہو۔ اور چونکہ یہ شفا صحابیہ ہیں۔ لہذا وہ بھی لازماً حضور سے چھوٹی ہوئیں۔ اس لحاظ سے اس واقعہ کا ان کی جانب منسوب کرنا جہاں کھل جھوٹ ہے وہاں ان راویوں کی جہالت کی بھی دلیل ہے۔

یہ سب دینا جانتی ہے کہ دلچگی کے وقت عورت کو کھلے میدان میں نہیں ڈالا جاتا۔ بلکہ مکان کا ایسا گوشہ اختیار کیا جاتا ہے جہاں ہوا کا کم از کم گزر ہو، تاکہ زچہ دلچہ کو ہوانہ لگ جائے۔ درندہ زچہ کے جسم پر درم آجاتا ہے۔ اور بسا اوقات بخار پیدا ہو جاتا ہے جو انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ اب ایسی صورت میں کمرہ یا کوٹھڑی کے اندر مشرق و مغرب اور شام کے محلات کا نظرا۔ کیوں کر ممکن ہے۔ اور دلچگی کے وقت میں گھر میں اندھیرا نہیں رکھا جاتا، تو اندھیرا چھا جانے کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ اگر عارضی روشنی ختم بھی ہو جائے گی تو گھر کے چراغ کی روشنی تو قائم رہے گی۔ اور اگر ایسا واقعہ کوئی پیش آتا تو ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ شفا اس واقعہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے ابتدائی میں اسلام لے آئیں۔ حالانکہ وہ کافی تاخیر سے اسلام لائیں۔ اور اپنے بیٹے کو اسلام لانے پر اذیتیں دیتی رہیں۔

ان داستان گوؤں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ نومو لو د بچے کو کپڑے پہنائے نہیں جاتے۔ بلکہ اسے کپڑے میں لپیٹا جاتا ہے کیا حضور کی والدہ آمنہ یا حضرت عبدالرحمانؓ کی والدہ شفاؓ اتنا بھی دجانتی تھیں۔ اس کا تجربہ تو ہر صاحب اولاد کو ہوتا ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس داستان کا واضح بیوی اور بچوں کی نعمت ہی سے محروم رہا ہو۔ ورنہ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ایسی داستان بیاں کر کے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ اول کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔

## گلے میں تعویذ ڈالنے کا قصہ

روایت ہے کہ آمنہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی اُن سے کہہ رہا ہے، اے آمنہ تیرا بچہ تمام جہاں کا سردار ہوگا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام محمدؐ اور احمدؐ رکھنا۔ اور یہ تعویذ گلے میں ڈال دینا جب وہ بیدار ہوئیں تو سونے کے ایک پتھر پر کچھ اشعار لکھے ملے۔

سید صاحب فرماتے ہیں یہ قصہ ابو نعیم میں ہے۔ اس کا راوی ابو نعیم محمد بن موسیٰ الانصاری ہے۔ جس کی روایتوں کو امام بخاری منکر کہتے ہیں۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ یہ دو سرود کی حدیثیں چرایا کرتا تھا۔ اور روایات وضع کر کے فقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا۔ متاخرین میں حافظ عرقی نے اس روایت کو بے اصل اور شامی نے انتہائی ضعیف کہا ہے۔ ابن اسحاق نے بھی اس کو روایت کیا ہے۔ لیکن کوئی سند بیان نہیں کی۔ ابن سعد میں یہ روایت واقدی کے حوالہ سے مذکور ہے۔ جس کی دروغ گوئی محتاج بیان نہیں۔ سیرت النبوی ۴۳ ج ۳

محمد بن اسحاق اور واقدی پر ہم انشاء اللہ آئندہ صفحات میں تفصیلی تبصرہ کریں گے۔

ہاں یہ ذہن نشین ضرور رہنا چاہیے کہ آپؐ کا نام محمدؐ آپ کے دادا عبدالمطلب نے رکھا تھا۔ ہاں احمدؐ آپ کا یہ نام انجیل میں مذکور تھا۔ اسی لئے قرآن نے اس نام کو حضرت عیسیٰؑ کی جانب منسوب کیا ہے۔ ارشاد الہی ہے۔

مُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَأْتِي مِنْ بَعْدِ  
اسْمُهُ أَحْمَدُ۔  
ایک رسول کی بشارت دینے والا جو عیسیٰ  
کے بعد آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ روایت صرف اس لئے وضع کی گئی ہے کہ تاکہ گلے میں تعویذ ڈالنے کا تعلق حضورؐ سے پیدا کر کے اس کا جواز ثابت کیا جائے۔ حالانکہ اس وقت خواہ کسی قسم کے اشعار ہوں یقیناً وہ کسی زمانہ جاہلیت کے شاعر کے ہوں گے۔ اگر ایسا نہیں تو محمد بن اسحاق نے کسی شاعر سے نیار

کراتے ہوں گے۔ کیونکہ محدثین کہتے ہیں کہ محمد بن اسحاق جب کوئی واقعہ لکھتا تو کسی شاعر کے پاس سے جاتا اور اس سے کہتا کہ اس واقعہ کے مطابق شعر لکھ دو۔ جب شاعر وہ اشعار لکھ دیتا تو محمد بن اسحاق انہیں کسی صحابی کی جانب منسوب کر دیتا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ کوئی بھی شاعر ہو وہ ایک دو دفعہ تو ایسا کر سکتا ہے۔ اور پھر کوئی شاعر بہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کا کلام کسی اور کی جانب منسوب ہو، لہذا شاعر سے کوئی کاروباری معاملہ طے پایا ہوگا۔

پھر یہ راوی یہ بھی نہیں بتانے کہ یہ تعوید کتنی عمر تک آپ کے گلے میں پڑا رہا۔ حالانکہ انبیاء کرام کے بارے میں امت کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ بعثت سے قبل بھی گناہوں سے محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اور حضور نے گلے میں تعوید ڈالنے کو شرک فرمایا ہے۔ ارشاد رسول ہے۔

استغاثم شرک تعویذات شرک ہیں۔

اس طرح یہ نصیبت راوی اور یہ شیطان مؤرخین اس کہانی کی رو سے یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ حضور نبوت سے قبل شرک میں مبتلا رہے۔ اور جب حضور کو اس طرح مشرک مان لیا جائے گا تو نبوت کا مسئلہ ہی ختم ہو جائے گا۔ یہ ہے اس کہانی کا تمام پس منظر۔

## زمین پرستاروں کا جھک آنا

ایک روایت یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت عثمان بن ابی العاص صحابی کی والدہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے وقت موجود تھیں۔ وہ کہتی ہیں کہ جب آمنہ کو دردِ زہ پیدا ہوا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ تمام ستارے زمین پر جھکے آتے ہیں۔ یہاں تک کہ میں ڈری کہ کہیں زمین پر نہ گر پڑیں۔ اور جب آپ پیدا ہوئے تو جدھر نظر جاتی تھی۔ تمام گھر روشنی سے معمور تھا۔

یہ قصہ ابو نعیم طبرانی اور ہیثمی میں مذکور ہے۔ اس کی روایت میں یعقوب بن محمد زہری پایہ

اعتبار سے ساقط ہے، اور عبدالعزیز بن عمر بن عبدالرحمان بن عوف محض ایک داستان گو اور جھوٹا انسان تھا۔ سیرت النبی ج ۳ ص ۴۴۴

ایک بزد مقام پر ستارے نیچے بھٹکتے کیسے نظر آگئے۔ پھر یہ بھی حیرت ناک امر ہے کہ اس موضوع پر حبتی داستانیں وضع ہوئیں ان روایات میں اتنا زبردست تضاد ہے کہ اس کا رفع کرنا ممکن نہیں۔ بلکہ ان روایات میں ایسی ایک بات بھی نہیں پائی جاتی جس کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاسکے کہ فلاں بات ایسی ہے جو ان تمام روایات میں مشترک طور پر پائی جاتی ہو۔

ہم اپنے قارئین کی معلومات کیلئے یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ بن ابی العاص کا تعلق مکہ سے نہیں ہے۔ یہ طائف کے باشندہ تھے، اور قبیلہ بنی ثقیف سے تعلق رکھتے تھے۔ قبیلہ بنی ثقیف رجب ۱۰ کے بعد اسلام لایا۔ رجب ۸ سے قبل اس خاندان کے دو افراد ایمان لائے۔ ایک حضرت سفیر بن شعبہ جو صلح حدیبیہ کے قبل ایمان لائے اور ایک عروہ بن مسعود ثقفی جو شہ کے آخر میں ایمان لائے اور اسی جرم میں اہل طائف نے انہیں شہید کر دیا۔ اس قبیلے کے تمام افراد حضور کے بدترین دشمن تھے۔ جن میں عثمانؓ بن ابی العاص اور ان کی والدہ بھی شریک تھیں مگر عثمانؓ کی والدہ حضور کی ولادت کے واقعات کو دیکھے ہوتیں تو وہ بہت پہلے اسلام لاپچی ہوئیں۔ حالانکہ ان کا تو صحابی ہونا بھی شکوک ہے۔ اس لئے کہ اسلام کی خاطر اہل ثقیف نے ایک وفد بھیجا تھا جو پانچ افراد پر مشتمل تھا جن میں عثمانؓ بن ابی العاص بھی تھے۔ اور یہ سب سے کم سن تھے۔ حضور نے انہیں طائف کا امیر متعین کیا۔ بقیہ اہل طائف توان کے ماتھے پر ایمان لائے۔

ایک امکان یہ ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر اہل طائف بھی شریک ہوئے ہوں گے۔ لیکن ان میں سے کسی کے لئے فرداً فرداً یہ ثابت کہ ناہرگز ممکن نہیں کہ نام بنام شہرکائے حجۃ الوداع کا ذکر موجود ہو۔ اور پھر یہ ثابت کرنا کہ عثمانؓ بن ابی العاص کی والدہ بھی موجود تھیں۔ ایک دشوار عمل ہے۔

ایسی صورت میں عثمانؓ بن ابی العاص کی والدہ کا حضور کی ولادت کے وقت موجود ہونا یہ فن داستان گوئی کا کمال ہے۔ شاید سی فن داستان گوئی نے جو وہ زمانے کے نادلوں، ڈراموں، انساٹوں اور فلموں کو جنم دیا



ہے۔ جس طرح نادل یا ڈرامے وغیرہ میں تحقیق نونا اس کو یک۔ نقاد تصور ہے اسی طرح ان داستانوں کا حال ہے۔

## حالت حمل میں حمل کا محسوس نہ ہونا

آئندہ کہتی ہیں کہ مجھے ایام حمل میں حمل کی کوئی علامت پیدا نہیں ہوئی۔ اور عورتوں کو ان ایام میں جو گرانی اور کھینچ محسوس ہوتی ہے وہ بھی نہیں ہوئی۔ بجز اس کے کہ معمول میں کچھ فرق آگیا تھا۔

سید صاحب لکھتے ہیں کہ قسطلانی نے مواہب لدنیہ میں اس قصہ کو عبد بن اسحاق اور ابو نعیم کے حوالہ سے بیان کیا ہے۔ لیکن ابن اسحاق کی کتاب جو آج کل ابن ہشام کے نام سے مشہور اور چھپی ہوئی ہے۔ اور نیز دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں اس قسم کا کوئی واقعہ مذکور نہیں۔ قسطلانی کی پیروی میں دوسرے بے احتیاط متاخرین مثلاً سیرت جلیلیہ اور مصنف خمیس نے بھی ابن اسحاق اور ابو نعیم ہی کی طرف اس کی نسبت کی ہے۔ لیکن ابن سیدان اس نے عیون الانثر میں بجا طور سے اس روایت کے لئے واقعہ کا حوالہ دیا ہے۔

در اصل یہ قصہ ابن سعد نے نقل کیا ہے۔ اور اس روایت کے دو سلسلے لکھے ہیں۔ مگر ان میں سے ہر ایک کا ہر سلسلہ واقعی ہے۔ اور اس کی نسبت محدثین کی رائے پوشیدہ نہیں۔ علاوہ ازیں ان میں سے کوئی سلسلہ بھی مرفوع نہیں۔ پہلا سلسلہ عبداللہ بن دہب پر ختم ہوتا ہے۔ جو اپنی بھوپھی سے روایت کرتے ہیں، وہ کہتی ہیں ہم سنا کرتے تھے۔ دوسرے سلسلے کو واقعی زہری پر جا کر ختم کر دیتا ہے۔ سیرت النبی ص ۴۴، ج ۲

زہری سفر میں پیدا ہوئے۔ اور حضور کی عمر ہجرت کے وقت تریس سال تھی۔ اس لحاظ سے کم از کم درمیان میں سوا سو سال کے راوی درکار ہیں۔ رہا عبداللہ بن دہب وہ تو زہری کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کی بھوپھی کون تھی اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ اور پھر وہ کس سے سنا کرتی تھیں۔ یہ تو اسی قسم کا معاملہ ہے جسے ہم نے اپنے پچیس میں بوڑھیوں سے سنا تھا کہ چاند میں ایک بڑھیا بیٹھی چرخا کرتی ہے۔ اور چاند میں جو جھائیاں نظر آتی ہیں دراصل یہ اس کی زلف کی پرچھائیاں ہیں۔

اس قسم کی داستانوں میں ایک شخص یہ بھی ہے کہ کوئی صحابی ایسا نہیں ہے۔ و خصوصاً اسے عمر میں آتا

ہو جو اس قسم کے واقعات کو محفوظ رکھ سکے۔ اور پھر وہ حضور کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک حیات بھی رہا ہو، اور علی الخصوص اس کا تعلق نبی ہاشم سے ہو۔ ہم جب یہ حال تبارخ، عالم الانساب اور احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صرف پانچ افراد ایسے نظر آتے ہیں جو حضور سے عمر میں بڑے تھے اور اسلام سے خلیفہ ہوئے۔ ان میں ایک ابو نفیہ حضرت ابو بکرؓ والد ہیں۔ لیکن وہ خاندان نبی ہاشم سے تعلق نہیں رکھتے۔ اور ان سے کوئی روایت مرئی نہیں۔ دوسرے حکیم بن حزام ہیں جو حضور سے عمر میں چار سال بڑے تھے۔ تیسرے نکر کے ذلت ایمان لائے۔ یہ حضور کے بچپن کے دوست اور ام المومنین حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ ان کا انتقال امیر معاویہؓ کے زمانہ میں ہوا۔ لیکن ولادت کے سلسلے میں ان سے کوئی روایت مرئی نہیں۔ تیسرے قبائش بن ہاشم یہ حضور سے صرف چھ ماہ بڑے تھے۔ ان سے بھی اس سلسلے میں کوئی روایت موجود نہیں۔ چوتھے حضور کے چچا حضرت حمزہؓ یہ صرف چھ ماہ بڑے تھے۔ اور یہ حضور ہی کی حیات میں جنگ احد میں شہید ہو گئے۔ پانچویں حضرت عباسؓ یہ حضور کے چچا تھے۔ لیکن یہ بھی حضور سے صرف سال ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ بعض روایات ان سے منسوب کی جاتی ہیں۔ لیکن سال ڈیڑھ سال کی عمر میں ان واقعات کو دیکھنا اور انہیں یاد رکھنا یہ صرف سبائیوں اور مجوسیوں کا کمال ہے۔ ورنہ بقیہ دنیا میں تو اس کا کوئی امکان نہیں ملتا۔

راہل کی علامات کا ظاہر نہ ہونا یہ بھی ایک خلیفہ کا ثابت ہے۔ ان یہ نہ در تواتر ہے کہ بعض عورتوں کو دوران حمل گرانی زیادہ محسوس ہوتی ہے اور بعض عورتوں کو کم۔ اس حد تک تواتر قابلِ برائت ہو سکتی ہے۔ لیکن حمل کی کسی علامت کا ظاہر نہ ہونا یہ ایک نہن امر ہے۔ اور اگر یہ ممکن بھی ہو تو انبوت سے قبل تو آپ ایک عام انسان تھے۔ نہ ان امور کی جانب کسی نے توجہ دی ہوگی اور نہ کسی نے بیان کیا ہوگا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ یہ تمام تصورات ان لوگوں نے پیدا کئے جو یا تو سبائی ذہن رکھتے تھے۔ یا ان کا مقصود داستانِ سرائی کر کے اپنے مدح سرا پیدا کرنا تھا۔

## کیا آمنہ کے کنی بچے ہوئے؟

ایک روایت اس کے باطل برعکس ہے جو ابن سعد میں ہے کہ آمنہ کہا کرتی تھیں کہ میرے پیٹ

نہیں کیے رہے۔ لیکن اس بچے سے زیادہ بھاری اور گراں بجھے کوئی محسوس نہیں ہوا۔

سید سلیمان ندوی مرحوم تحریر فرماتے ہیں

اولاً یہ روایت معروف اور مسلم واقعہ کے خلاف ہے، آسنہ کے ایک کے سوا اور کوئی بچہ نہیں ہوا اور یہ سال ۱۰۰۰ سرے یہ کہ اس روایت کا سلسلہ ناتمام ہے۔ اسی معنی کی ایک اور روایت، شہزادین بن ابی حجاب کی رباعی غلوں ہے۔ کہ آپ نے ارشاد فرمایا۔ میں اپنے والدین کا پہلو ٹا ہوں جب میں کم عمر میں تھا تو میری ماں عام غریبوں سے زیادہ گرائی محسوس کرتی تھی۔ کنز العمال، کتاب الضعفاء

معانی بن زکریا القاضی نے اس روایت پر اتنی ہی جرح کی ہے کہ یہ منقطع ہے یعنی شہزادین اس دوران کے بعد کے راوی غلوں میں ملاقات نہیں۔ اس نتیجے میں سے ایک راوی کم ہے۔ حالانکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ اس کا پہلا راوی عمر بن نوح کذاب۔ وضاع اور مزدک تھا۔ سیرت النبی ص ۴۵ ج ۲

اس کی کیفیت ابو نعیم ہے۔ یہ خراسان کا باشندہ تھا۔ ذرا ہی کہتے ہیں یہ ثقہ اور امین نہ ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں یہ احادیث وضع کرتا تھا۔ دارقطنی وغیرہ کہتے ہیں مزدک ہے۔

امام ازدی فرماتے ہیں کذاب ہے۔ احمد بن علی السیسی کا قول ہے کہ اس نے ایک خطبہ وضع کیا تھا جس کے بارے میں اس کا دعویٰ یہ تھا کہ یہ حضور کی زندگی کا آخری خطبہ ہے۔ اس نے ایک منتر بھی وضع کر کے حضور کی جانب منسوب کیا ہے کہ اسے پڑھ کر سونے سے السان احتلام سے محفوظ رہتا ہے میزان الاعتدال

یہ بھی سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس معاملہ کا تعلق احکامات الہیہ سے نہیں ہے جو اس سلسلہ میں وحی کا نزول ہوتا۔ اور آپ کو بذریعہ وحی مطلع کیا جاتا۔ اور جب آمنہ کا انتقال ہوا تو حضور کم سن بچے تھے اور یہ بات ماں کے علاوہ کوئی دوسرا بتا نہیں سکتا۔ پھر اس روایت اور سابقہ روایت میں تضاد بھی ہے۔

حالانکہ دونوں روایات ابن سعد کی ہیں۔ دراصل یہ عجیبی صورتیں اپنے اپنے گھر بیٹھ کر داستانیں وضع کرتے رہے۔ اور اسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کی جانب منسوب کرتے رہے۔ علی الخصوص کو قد تو ابی کذاب کا مرکز تھا۔ بقول امام مالک رحمہ اللہ کوفہ میں نوٹس لیں قائم ہیں۔ جہاں شب و روز احادیث وضع ہو کر بازار میں سکے کی طرح چلتی رہتی ہیں۔ مدینہ میں ایسی کوئی ٹھکانا نہیں۔

انہی داستانوں سے قارئین اندازہ فرمائیں کہ ہمارے نام نہاد مؤرخین نے تاریخ اور سیرت رسول کے نام سے کیا کیا رطب و یابس بھرا ہے۔ حالانکہ ابن سعد کا شمار اہل سنت علماء میں ہوتا ہے۔ اور وہ مؤرخ ہونے کے علاوہ محدث بھی ہیں۔ اور رجال پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ جب انہوں کا یہ حال ہے تو اختیار سے کیا شکوہ؟ یہ بے ہماری وہ تاریخ جس کے باعث عیسائی دنیا اور مستشرقین اسلام کا مذاق اڑاتے، اور حضور کی ذات اقدس پر کجخبر اُچھالتے ہیں۔ لیکن ہم ان لغویات اور خرافات پر غور کرنے ہیں۔ حتیٰ کہ موجودہ دور کے فرضی محققین ان خرافات پر تاریخی حقائق کا لیل لگا کر حضرت عثمانؓ، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عمرؓ بن العاص، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ، حضرت زید بن عقیلہ، حضرت عبداللہؓ بن ابی سرح، حضرت عبداللہؓ بن ابی عامر اور نجاشیہ کے افراد کو بدنام کرتے اور ان پر مختلف الزامات لگاتے ہیں اور وہ طبقہ جو سیاست سے متنفر ہے۔ وہ یہی طریقہ کار خاندان بنی ہاشم سے متعلق صحابہ کرام کے ساتھ اختیار کرتا ہے۔ وہ بھی انہیں تاریخی حقائق قرار دیتا ہے۔ اتفاق سے دونوں قسم کی خرافات ہماری تاریخ میں موجود ہیں۔

اسی نے محدثین کرام اور ماہر رجال نے علمی مخصوص منقذ میں نے جہاں ان روایات پر موضوعات اور رجال کی کتابوں میں بحث کی۔ وہاں ان مؤرخین کی حقیقت کی خوب پول بھی کھول ہے۔ جس میں ہم جسہ جستہ کچھ حضرات کی پول اپنے قارئین کے سامنے پیش کریں گے۔

## حضور کے سال پیدائش میں روئے زمین پر کسی لڑکی کا پیدا نہ ہونا

بیان کیا جا چکا ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا وقت آیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آسمانوں اور جنتوں کے دروازے کھول دیئے جائیں۔ فرشتے باہم بشارت دیتے پھرتے تھے۔ سورج نے نور کا نیا جوڑا پہنا اس سال دنیا کی تمام عورتوں کو یہ رعایت ملی کہ سب فرزند مریمہ جنیں۔ درختوں میں پھل آگئے۔ (جو پہلے کبھی بھی نہ آتے تھے) آسمان میں زبرد و باقوت کے ستون کھڑے کئے گئے۔ منبر کو ٹرے کنارے شک خالص کے درخت اُگلنے لگے۔ مکہ کے بُت اوندھے ہو گئے۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ داستان مواب لذیمہ اور خصائص کبریٰ میں ابو نعیم کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ لیکن ابو نعیم کی دلائل

النبوت کے مطبوعہ فستہ میں جہاں اس کا مقدمہ مسکتہ تھا۔ وہاں یہ روایت بھی کوئٹہ میں ملے گی۔ ابونعیم نے اپنی اس روایت میں یہ روایت بھی نوید یا مطبوعہ نہ نہ مکمل ہو۔ یہ حال اس روایت کی بنا و وصف اس قدر ہے کہ ابونعیم جو تھیں صدی کے ایک باوقار و عزم و ہمت قلمبند تھے۔ ان کے والد قتیبہ جو بڑے فاضل تھے بیان کرتے تھے۔ قسطلانی نے موابہ میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ عمرو بن قتیبہ سنون ہے۔ منافقا سمجھتے تھے۔ خاصاً اس میں اس روایت کو منکر کہا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ یہ تمام قریب سترہ سو موضع ہے۔ یہ سیرت ابنی حاتم اگر یہ عمرو بن قتیبہ اور ان کے محبوب اباجان حنبل بھی ہوئے۔ قتیبہ یہ روایت مردود ہوتی اس لئے کہ یہ جو تھیں صدی کے راوی تھے۔ بقیہ ساڑھے تین سو سال۔ کے راوی کہاں ہیں جب تک تمام روایت موجود نہ ہوں، اور سب کا شہدہ ہونا اور ایک دوسرے سے روایت کا سننا ثابت نہ ہو جائے اس وقت تک کسی روایت پر غور و فکر بھی جائز نہیں۔

ابن ہم ان فضول سے فاضل قتیبہ اور ان کے صاحبزادے سے یہ ضرور عرض کریں گے۔ کہ کم از کم ہمیں وہ یہ نو بتا دیتے کہ انہوں نے سن کو کس مہینے سے شروع کیا ہے۔ اس لئے کہ محرم سے سن کی ابتدا حضرت عمرؓ سے زما سے ہوئی۔ تو ہم علم الانساب، علم الرجال اور تاریخ کے ذریعہ یہ نہر معلوم کرتے کہ اس سال مکہ میں کتنی لڑکیاں پیدا ہوئیں۔ ریالوری دنیا کا مسئلہ تو اس کا حال معلوم ہونا ہی ممکن نہ تھا۔ جو ان قتیبہ صاحب کی کوئی تردید کرتا۔ لہذا جو نہ میں آیا کہ دیا۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ مشک حاسن درختوں سے پیدا نہیں ہوتا۔ ۱۰۰۔ ۱۰۱۔ ان کے ناف سے حاصل کیا جاتا ہے۔ غالباً ان خفل کے دشمنوں کو اس کی بھی خبر نہ تھی۔ بدین حدت تو اس پر ہے کہ ہمارا مولوی میلاد کی مجلسوں میں اسے گا کہ کر پڑھتا ہے۔ درامعین صل علی خود کے لئے کہتے ہیں اور حیرت زدہ کا کورس پورا کیا جاتا ہے۔

ان فضول سے فاضل قتیبہ صاحب نے ایک نیا ٹکڑیاں کیا ہے کہ درختوں میں چھل آگئے۔ گویا اس سے قبل ماضی میں درختوں پر کبھی چھل نہ آئے تھے۔ تو لوگوں نے انہیں کیسے پہچانا ہو گا کہ یہ بھل میں۔ کیونکہ وہ چھلنے سے ابتدا سے متعارف ہی نہ تھے۔ اور پھر بھلنے کی مختلف اقسام کی معرفت کیسے ممکن ہوئی؟ غالباً قتیبہ صاحب نے اپنی بیداشت سے چار سو سال قبل اہل مکہ کو روحانی طور پر اس کی تعلیم دی ہوگی۔ اور اگر مکہ سے بت اوندھے ہو جاتے

تو پورے مکہ میں ایک تبلیغی جانا۔ اور ہزار ہا اس کے دیکھنے اور بیان کرنے والے ہوتے۔ اور جب انہیں یہ معلوم ہوتا کہ یہ سب کچھ حضور کی ولادت کے سبب ہوا ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد کوئی فرد بشر ایسا نہ جتنا جو آپ پر ایمان نہ لانا۔ اور خاص طور پر نبی ہاشم کے افراد۔ لیکن فتح مکہ کے وقت تک نبی ہاشم کے صرف چار بچے افراد نے ایمان قبول کیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ مکہ کے تمام بخت تو کیا اوندھے ہوتے۔ وہ بت بھی اوندھے نہیں ہوتے جو خاندان نبی ہاشم کے گھروں میں پائے جاتے تھے۔ بلکہ آپ کا چچا عبد مناف یعنی ابوطالب کے ذمہ مکہ کے بتوں کی دیکھ بھال تھی۔ لیکن وہ مرتے وقت تک بتوں سے چٹا رہا۔ اور اپنے آپ کو مناف بت کا بندہ سمجھتا رہا۔ حتیٰ کہ مشکل کشا بھی اس معاملہ میں اپنے باپ کی مشکل کشائی نہ کر سکے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی تبلیغ اس پر اثر انداز ہوئی۔

## جانوروں کا کلام کرنا

یہ ایک طویل داستان ہے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ اس کہانی کے الفاظ ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حمل میں آجانے کی خوشنیاں تھیں۔ ان میں سے ایک نشانی یہ ہے کہ اُس رات قریش کے سب جانور بولنے لگے۔ اور کہنے لگے کہ رب کعبہ کی قسم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شکم مادر میں آگئے۔ وہ دنیا جہاں کی امان اور اہل دنیا کے چراغ ہیں۔ قریش اور دیگر قبائل کی کاہنہ عورتوں میں کوئی ایسی نہ تھی۔ اس کا جس اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گیا ہو۔ اور ان سے کہانت کا علم چھین نہ لیا گیا ہو۔ اس روز دنیا کے تمام بادشاہوں کے تخت اوندھے ہو گئے۔ اور سلاطین اُس دن گونگے ہو گئے۔ مشرق کے وحشی جانوروں نے غرب کے وحشی جانوروں کو جا کر بشارت دی۔ اسی طرح ایک دریا نے دوسرے دریا کو خوش خبری سنائی۔ اور پورے عالم حمل میں برہما آسمان وزمین سے یہ ندا سنی جانے لگی کہ بشارت ہو کہ حقیرت ابوالفاحم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمیں پر ظاہر ہونے کا زمانہ قریب آیا۔

حالت کی دالہ دفرمائی تھیں کہ جب میرے حمل کے چھ مہینے گزرے تو خواب میں مجھے کسی نے

ٹھوکر دے کر کہا اے آمنہ تمام یہاں کا سردار تیرے بیٹے میں ہے جب وہ پیدا ہوا تو اس کا نام محمد رکھا، اور اپنی حالت کو چھپانے لگا۔ کہتی ہیں کہ جب ولادت کا زمانہ آیا تو عورتوں کو جو کچھ پیش آتا ہے، وہ مجھ کو بھی پیش آیا اور کسی کو میری اس حالت کی خبر دہشتی میں گھر میں نہ بتا تھی عبدالمطلب خانہ کعبہ کے طواف کو گئے تھے۔ تو میں نے ایک زور کی آواز سنی، جس سے میں ڈر گئی۔ میں نے دیکھا کہ ایک سپید مرغ ہے جو اپنے بازو کو میرے دل پر مل رہا ہے اس سے میری تمام دہشت دور ہو گئی۔ اور درد کی تکلیف بھی جاتی رہی۔ پھر ایک عرف دیکھا کہ سپید شربت ہے۔ پیاسی تھی، دودھ مجھ کو اس کو پی ٹی۔ اس کے پینے سے ایک نور نکل کر مجھ سے نکل ہوا، پھر میں نے دیکھا کہ چند عورتیں جن کے قد لمبے لمبے ہیں، گویا عبدالمطلب کی بیٹیاں ہیں۔ وہ مجھے غور سے دیکھ رہی ہیں۔ میں تعجب کر رہی ہوں کہ ان کو کیسے میرا حال معلوم ہوا۔

ایک اور عورت میں ہے کہ ان عورتوں نے کہا کہ ہم فرعون کی بیوی آسیہ اور عمران کی بیٹی مریم اور یحویہ بریہ اور زیادہ بڑھ گیا اور ہر گھڑی آواز اور زیادہ بلند تھی۔ اتنے میں ایک سپید دیبا کی چادر آسمان زمین کے درمیان جھیلی نظر آئی۔ اور آواز آئی کہ اس کو لوگوں کی نگاہوں سے چھپالو، میں نے دیکھا کہ چند مرد ہوا میں معلق ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں چاندی کے آفتابے ہیں، اور میرے بدن سے موتی کی طرح پسینہ کے قطرے نکل رہے ہیں جس میں شگاف لعل سے بہت خوشبو تھی۔ اور میں دل میں کہہ رہی تھی کہ کاش عبدالمطلب اس وقت میرے پاس موجود ہوتے۔ پھر میں نے پرندوں کا ایک غول دیکھا جو نہ معلوم کہ صحرے سے آئے تھے۔ وہ میرے کمرے میں گھس آئے۔ ان کی منکاریں دچو نہیں، زبرد کی اور بازو اوقات کے تھے۔ میری آنکھوں سے اس وقت پردے اٹھا دیئے گئے۔ تو اس وقت مشرق و مغرب سب میری نگاہوں کے سامنے تھے۔ تین جھنڈے نظر آئے۔ ایک مشرق میں، ایک مغرب میں اور ایک خانہ کعبہ کی چھت پر۔ اب درد زیادہ بڑھ گیا۔ تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ مجھے کچھ عورتیں ٹیک لگائے بیٹھی ہیں، اور اتنی عورتیں بہت گھسیں کہ مجھے گھر کی کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ اس آئینا پر پیدا ہوا۔ میں نے پھر کر دیکھا تو وہ سجدہ میں پڑا تھا۔ اور دو انگلیوں کو آسمان کی طرف دعا کی طرح اٹھائے ہوئے تھا۔ پھر ایک سیاہ بادل نظر آیا جو آسمان سے اتر کر نیچے آیا اور مجھ پر چھا گیا۔ اور پھر میری شہ سے چھپ گیا۔ اتنے میں ایک منادی سنی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

کوزمیں کے پورپ اور کچھ گھاؤ، اور سمندوں کے اندر لے جاؤ۔ کہ سب ان کا نام نامی اور شکل و صورت پہچان لیں، اور جان لیں کہ یہ مٹانے والے ہیں۔ یہ اپنے زمانہ میں شرک کا نشان مٹا دیں گے۔ پھر تھوڑی سی دیر میں بادل بٹ گیا۔ اور آپ دودھ سے زیادہ سپیکلے میں پٹے نظر آئے۔ جس کے نیچے ہر شے تھا۔ ہاتھوں میں سفید مٹیوں کی تین کنجیاں تھیں۔ اور ایک آواز آئی کہ محمد کو فتح و نصرت اور نبوت کی تین کنجیاں دی گئیں ہیں۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے دل پر جبر کر کے یہ حکایت نقل کی ہے۔ اس لئے کہ میلاد کے عام جلسوں کی رونق ان ہی روایتوں سے ہے۔ یہ روایت ابو نعیم میں حضرت ابن عباسؓ سے نقل کی گئی ہے۔ اور سند کا سلسلہ بننا ہر متصل بھی ہے لیکن اگر کسی کو اسماء الرجال سے آگاہی بھی نہ ہو، اور وہ صرف ادب عربی کا صحیح ذوق ہی رکھتا ہو تو وہ فقط روایت کے الفاظ اور عبارت کو دیکھ کر یہ فیصلہ کر دے گا۔ کہ یہ تیسری صدی جو تھی صدی کی بنائی ہوئی ہے۔

اس روایت میں یحییٰ بن عبد اللہ الباقلیؒ اور ابو بکر بن ابی مریمؒ ہیں۔ پہلا شخص بالکل ضعیف ہے اور دوسرا ناقابل حجت ہے۔ ان کے آگے کے راوی سعید بن عمرو الانصاری اور ان کے باپ عمرو الانصاری کا کوئی تہ نہیں۔ سیرت الباقلیؒ ۴۶۶/۳

**باقلیؒ**۔ اس کا پورا نام یحییٰ بن عبد اللہ بن الضحیٰؒ ہے۔ ابو سعید اس کی کنیت ہے۔ اس کی روایات بخاری و ترمذی میں پائی جاتی ہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں بالبت رے کا ایک مقام تھا۔ یہ وہاں کا باشندہ تھا۔ پھر حران آکر آباد ہوا۔ یہ یحییٰ بن عبد اللہ و زاعمی سے روایات نقل کرتا ہے۔ امام وزاعمی سے اس کی ماں نے شادی کر لی تھی۔ ابو زرہ رازی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کی روایت سے اس کا ضعف صاف طور پر نظر آتا ہے۔ ابن عدی نے اس کی متعدد روایتوں کو منکر قرار دیا ہے۔ ابو حاتم رازی فرماتے ہیں یہ کسی شمار میں نہیں۔

عبد اللہ بن الدوقی کا بیان ہے کہ امام یحییٰ بن معین جو فن رجال اور جرح و تعدیل کے امام تھے جب حران گئے تو باقلیؒ نے ان کو خوش کرنا چاہا۔ تاکہ وہ اس کے خلاف کوئی لفظ زبان سے نہ نکالیں۔ لہذا اس نے امام یحییٰ کی خدمت میں سودنار، کھانا اور کچھ خوشبو بھیجی۔ امام یحییٰ نے کھانا تو کھالیا، اور



دینار واپس کر دیئے۔ ایک روز کسی شخص نے یحییٰ سے سوال کیا کہ بالیٰؑ کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔  
 فرمایا کھانا تو اس کا اچھا تھا۔ لیکن اللہ کی قسم اس نے اوزاعی سے کوئی روایت نہیں سنی دینی وہ تمام روایات  
 ناقابل اعتبار ہیں جو وہ اوزاعی سے نقل کرتا ہے۔ میزان الاعتدال ص ۳۹ ج ۲

**ابو بکر بن ابی مریم:** یہ شخص قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اور حمص کا باشندہ تھا اس کے باپ کا  
 نام عبد اللہ اور ابو مریم کنیت ہے۔ خود اس کی کنیت تو ابو بکر ہے۔ لیکن اس کے  
 نام میں زبردست اختلاف ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ اس کا نام بکر ہے، ایک قول یہ ہے کہ بکر ہے۔ کوئی کہتا  
 ہے عمرو ہے۔ کوئی عامر بتاتا ہے اور کوئی کہتا ہے عبد السلام ہے۔

ذہبی کہتے ہیں کہ یہ محدثین کے نزدیک ضعیف ہے۔ اس کی روایات ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں  
 پائی جاتی ہیں۔ یہ بہت عبادت گزار شخص تھا۔ ابو الیمان، بقیہ، اور بالیٰؑ وغیرہ اس سے روایات نقل کرتے  
 ہیں۔ امام احمد وغیرہ فرماتے ہیں یہ ضعیف ہے روایت حدیث میں غلطیاں بہت کرتا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں  
 یہ جست کے قابل نہیں۔ ابن عدی نے اس کی متعدد روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں۔ اس کا  
 حافظہ نہایت ردی تھا۔ جب کوئی روایت یہ تنہا بیان کرے تو وہ قابل محبت نہیں۔

بقیہ کا بیان ہے کہ ابو بکر بن ابی مریم کے گاؤں میں زیتون کے درخت بہت تھے۔ اور کوئی درخت ایسا  
 نہ تھا۔ جس کی جانب اس نے منہ کر کے پوری رات عبادت نہ کی ہو، ہر وقت روتا رہتا تھا۔ جو رہائی کہتے  
 ہیں بہت پر سیر گزار انسان تھا۔ ۵۶۶ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان ص ۴۹ ج ۲

گویا یہ کوئی بہت ہی پیچھے ہوئے بزرگ تھے۔ لیکن یہ ہر درخت کی جانب منہ کر کے نماز پڑھنے کی  
 منقہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ بھی کوئی سلوک کی منزل ہوگی۔ کیونکہ صوفیاء کو آبادی میں سلوک کی منزل  
 حاصل نہیں ہوتی۔ اسی لئے وہ جنگلوں کا رخ کرتے ہیں۔ ہاں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ سرے سے ہی  
 سوٹ ہو، اس لئے اس واقعہ کو نقل کرنے والا ان کا شاگرد بقیہ ہے جو غالی درجہ کا شیعہ ہے۔ بلکہ ابو سعید  
 محدث نے تو بقیہ کے حال پر نہایت عمدہ تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

احادیث بقیہ، یست بقیہ، فکن بقیہ کی احادیث ابھی نہیں ہوتیں تو ان سے

منہا علی القیہ - میزان ۳۲۲/۱ ج ۱  
تقریر کے (یعنی نیک کردہ)

قارئین یہ ضرور ذہن نشین رکھیں کہ حضرت عباسؓ حضور کے چچا حضور سے صرف ڈیڑھ دو سال بڑے تھے اور ان کے بیٹے عبداللہؓ جو ابی عباس کے نام سے مشہور ہیں۔ اور خلفائے عباسیہ ان ہی کی اولاد سے ہیں۔ یہ ہجرت مدینہ سے صرف دو سال قبل پیدا ہوئے ہیں۔ لہذا ان دونوں باپ بیٹوں کے لئے حضور کی ولادت کا حال دیکھنا یا آئندہ سے ملاقات کرنا ممکن نہیں۔ لہذا اس سلسلے میں قطعی روایات ان حضرات کی جانب منسوب کی جاتی ہیں۔ وہ سب نہ صرف خالص جھوٹ ہیں۔ بلکہ ادوی کی حالت بھی ثابت کرتی ہیں۔ ایسی روایات کے رد کے لئے یہ کسی دلیل کی حاجت نہیں۔

بہیں اسی داستان میں سب سے زیادہ حیرت ناک دو باتیں خاص طور پر نظر آئیں۔

۱۔ کوئی عورت پہلی کے وقت کسی مرد کی آمد پسند نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ خاوند کی بھی۔ لہذا کہ ایسے وقت میں وہ اس بات کی خواہش کرے کہ اس کا سسر اس کے پاس ہو، حالانکہ سسر سے تو بہو کو ایک خاص قسم کا حجاب ہوتا ہے۔ سسر سے بے حجاب تو ایک بے حیا عورت ہی ہو سکتی ہے کوئی شریف عورت نہیں ہو سکتی۔

۲۔ جب حضور کی ولادت کے باعث اُس دور کے عاملوں کے جنات غائب ہو گئے۔ اور ان کی کہانت یعنی فنِ علییات سلب ہو گیا تو اُس دھندلے کو اب حضور کے ماننے والوں نے کیسے اپنا لیا، اور کاہنوں کی طرح غیب کی خبریں کس طرح بیان کرنے لگے۔ اور کس طرح انہوں نے جنات کی دوستی کو اپنے لئے جائز سمجھا؟ یہ بھی غور طلب امر ہے کہ مشرق و مغرب تو دکھا دیئے جاتے ہیں۔ اور وہاں جھنڈے بھی گاڑے جاتے ہیں۔ لیکن جنوب و شمال کا کسی روایت میں پتہ نہیں چلتا۔ کیا ان مادیوں کے نزدیک صرف دو ہی سمتیں ہوتی تھیں؟ پھر تو ان کی عقول کا اللہ ہی حافظ ہے۔

## پیدائش کے ساتھ سینہ چاک ہونا

اس قسم کی ایک اور روایت حضرت عباسؓ سے نقل کی جاتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے چچا عبداللہ جب پیدا ہوئے تو ان کے چہرے پر سورج کی سی روشنی تھی۔ اور والد نے ایک دفعہ خواب دیکھا کہ نبی

ایک کاہنہ نے یہ خواب سُن کر یہ پیشین گوئی کی کہ اس لڑکے کی پشت سے ایک ایسا کچھ پیدا ہو گا جو تمام دنیا پر حکومت کرے گا جب اُس کے شگرتہ کچھ پر یہ احوال تو میں نے اُن سے پوچھا کہ روایت کے اُشائیں تم کو کیا چھ نظر آیا۔ انہوں نے کہا جب یہ لڑکے سوئے گا تو میں نے بڑے زور سے آواز سنئی جو انسانوں کی آواز کی طرح نہ تھی۔ اور بزرگ کا پھر یہاں نہ تھا۔ میں گاہوا آسمان و زمین کے درمیان میں ترانا پڑا۔ اور میں نے دیکھ کر پچھلے سے روٹنی کی گزیر میں کل کر آسمان تک جاگئی۔ شام کے تمام سال آگ کا شعلہ معلوم ہوتے تھے۔ اور پچھلے پاس مرغایوں کا ایک بچہ نظر آیا۔ جس نے پچھلے کو دیکھا۔ پھر پچھلے پر دل کو کھول دیا۔ اور سیرہ اسید کو دیکھا کہ وہ کتبی ہوئی گزری۔ تیرے اس بچے کے نبض اور کاهنوں کو بڑا صدمہ پہنچایا۔ بائیں سیرہ ہلاک ہو گئی۔ پھر ایک بلند دلا سپید رنگ جو اُن نظر آیا۔ جس نے پچھلے سے ہاتھ سے لے لیا۔ اور اس کے منہ میں پانی لگا دیا۔ اس نے لگایا۔ اس کے ہاتھ میں سونے کا شیشہ تھا۔ اس نے بچے کے پیٹ کو پھاڑا۔ پھر اس کے دل کو نکالا۔ اس میں سے ایک سیادہ رنگ کا کچھ نکلا۔ پھر سیرہ کی پٹیل کھول لی۔ اس میں سے ایک اُلوٹھی نکالی۔ اور دھو کر دیکھنے کے برابر لگائی اور اس کو ایک رُتہ پہنا دیا۔ اسے عباس میں سے یہ لکھا۔

اس روایت کو لکھنے سے بعد سید صاحب تحریر فرماتے ہیں۔

اس روایت کے متعلق میں کچھ زیادہ کہنا نہیں ہے کہ تاہم میں نے اس سے ضعف خود تسلیم کیا ہے اور سیوطی نے لکھا ہے کہ اس روایت اور اس سے پہلے کی روایتوں میں سخت کثرت رجحان متکرات ہیں۔ اور میں نے اپنی اس کتاب جصاص میں ان باتوں سے زیادہ متکرات روایت نقل نہیں کی (یعنی ہماری کتاب میں متکرات تو بہت ہیں لیکن وہ اتنے اہم یا زیادہ متکرات نہیں ہیں) اور میرا دل ان کے لکھنے کو نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے محض ابو نعیم کی تقلید میں لکھ دیا ہے۔ (یعنی اگرچہ میں نے دیکھنے کو میں بھی دیکھا تھا)

جن روایتوں کو سیوطی لکھنے کے قابل نہ سمجھیں۔ آپ نے ضعف کے درجہ کو جو سہاڑے ہیں کہو کہ سیوطی کی کتابوں کا دار و مدار ہی ضعیف روایتوں پر ہے۔ سیوطی اس روایت کا ماخذ ابو نعیم کے کتاب میں مکرر یہ روایت مجھے دلائل ابی نعیم کے مطبوعہ نسخہ میں نہیں ملی۔

یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو سال بڑے تھے جب اُس

نے وفات پائی تو وہ سات آٹھ برس کے بچہ ہوں گے۔ سیرت النبی ص ۴۹

وہ گئے حضور کے والد عبداللہ ان کو تو حضرت عباسؓ نے دیکھا بھی نہیں۔ کجا کہ عباسؓ کا ان کو پیدا ہونے کی خبر نہ تھی۔  
تاریخین یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ ولادت کے وقت کی بیشتر کہانیاں حضرت عباسؓ اور ان کے صاحبزادے  
حضرت عید اللہؓ سے کیوں مروی ہیں۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ان روایات کے وضع کرنے والی  
عباسی دور کے افراد ہیں۔ آخر انہیں حکومت کی خوش بھلائی نہ تھی۔ لہذا انہیں ہر جگہ عباسیوں کے جدا مجہ نظر آنے ہیں۔  
اگر کسی اور خاندان کی حکومت ہو تو اس خاندان سے مواظفہ آتے۔

یہی وجہ ہے کہ ہر بلوی شام کے محبت نہ در دلتا ہے۔ تاکہ عباسی خلفاء دیوبندوں کا زوال یاد کر کے خوش  
ہوں۔ اور ممکن ہے کہ ان روایتوں کے باعث دیوبندوں کی جیب بھی گرم ہو جاتی ہو۔ ہاں اس راوی کو یہ قطعاً معلوم  
نہ تھا کہ مرغابیاں گرم ملک میں نہیں پائی جاتیں۔ مرغابی سرد ملک کا پرندہ ہے۔ صرف پانی پر اترتا ہے گھروں میں نہیں  
اترتا۔ لیکن اس بے چارے کو اتنی تحقیق نہ تھی۔ ورنہ شاید وہ کسی اور پرندے کا نام لیتا۔

## کعبہ پر قبضہ

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آمنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کا قصہ بیان میں  
میں کہ میں حیرت میں تھی کہ تین آدمی دکھائی دیئے۔ جن کے چہرے سورج کی طرح چمک رہے تھے۔ ایک  
میں چاندی کا آفتابہ تھا، جس سے مشک کی خوشبو آ رہی تھی، دوسرے کے ہاتھ میں ہنر مند کا  
تھا، جس کے چار گوشے تھے۔ اور ہر گوشہ میں سپید موتی رکھا تھا۔ ایک آواز آئی۔ اے حبیب اللہ یہ پوری  
پوربہ بچھم خشکی و تری سب مجسم ہو کر آئی ہے، اس کے جس گوشہ کو دل چاہے مٹھی میں لے لیجیے، آفتابہ  
میں کہ میں نے گھوم کر دیکھا کہ کچھ کہاں ہاتھ رکھتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ اس نے پیچ میں ہاتھ رکھا تو کہنے لے  
کی آواز سنی، کہ رب کعبہ کی قسم محمدؐ نے کعبہ پر قبضہ کر لیا ہے۔ ہاں یہ کعبہ اس کا قبلہ اور مسکن رہے گا۔ تیسرے  
کے ہاتھ میں سپید حریر تھا، اس نے اس کو کھولا تو اس میں سے ایک انگوٹھی نکلی، جس کو دیکھ کر دیکھنے والوں  
آنکھیں حیرت کرتی تھیں، پھر وہ میرے پاس آیا تو پشت والے نے اس انگوٹھی کو لے کر اس آفتابہ سے

ہمارا اس کو دھویا۔ اور بچہ کے مونڈھے پر ہر کردی، اور حریر میں اس کو لپیٹ کر شک خالص کے بانگے سے باندھ دیا اور تھوڑی دیر تک اپنے بازوؤں میں لپٹائے رکھا۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں یہ بضعہ ان جنت تھا پھر بچہ کے کان میں کچھ کہا سنہ کہتی ہیں میں اسے کچھ نہ سکی۔ اور یہ بھروسے نہ کیا۔ اے محمدؐ بشارت ہو کہ کسی نبی کو کوئی ایسا علم عطا نہیں کیا گیا۔ جو تم کو نہیں دیا گیا۔ تم سب پیغمبروں سے زیادہ شجاع بنائے گئے۔ تم کو فتح و نصرت کی کبھی دلی گئی۔ اور عرب و عاب جٹنا گیا۔ جو تمہارا نام سننے کا خواہ اس نے تم کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو تو وہ کانپ جائے گا۔ اے اللہ کے خلیفہ،

اس روایت کا ماخذ یہ ہے کہ کئی ابن عائذ المتوفیؒ نے اپنی کتاب میلاد میں اس کا ذکر کیا ہے۔ ابن حجر محدث نے بڑی جرأت کر کے اس کو غریب کہا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کو غریب کہنا بھی اس کی توثیق ہے۔ یہ تمام قبیلے اسل اور بے بنیاد ہے۔ سیرت ابنی ندیم ج ۲

یہ روایت چوتھی صدی میں وضع کی گئی۔ ان جانب اولیوں نے یہ تصور کر لیا ہے کہ نہ نبوت آپ کے ہم مبارک پر ولادت کے بعد بنائی گئی ہے۔ حالانکہ یہ گوشت کا ایک ٹکڑا تھا جو آپ کی پشت پر مونڈھے کے قریب گونٹھی کی شکل میں پیدا ہوئی تھی۔ یہ وجود تھا۔ اس کو ہر نبوت کہتے ہیں۔ بعض احمقوں نے تو اس قسم کی روایات وضع کر ڈالیں کہ اس ہر نبوت میں پورا کلمہ تحریر تھا۔ حالانکہ معاملہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد ہر کے طور پر ایک گونٹھی بنوائی تھی۔ جس میں کلمہ تحریر کیا تھا۔ جو بعد میں خلفاء کے پاس رہی، اور حضرت عثمانؓ سے پیرائیں میں گر گئی۔ اور تلاش سوار کے بعد بھی نہ مل سکی۔ ان احمقوں نے حاتم نبوت کو ہر نبوت بنا دیا۔ یحییٰ بن عائذ جیسے اشخاص سے کوئی یہ دریافت کرے کہ زچگی کے وقت عورت جس تکلیف سے گزرتی ہے۔ کیا ایسے وقت میں ان تفصیلات کی جانب اس کی توجہ ہو سکتی ہے۔ اس بے چاری کو تو اس وقت اپنا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ کجا کہ وہ موتی اور گوشے گننے بیٹھ جائے۔ بریں عقل و دانش بیاہد گر لیت۔

## تمام دنیا پر قبضہ

آمنہ کا بیان ہے کہ جب میرے یہاں حضور کی ولادت ہوئی تو ایک بڑا بڑا کلمہ نظر آیا، جس میں سے

گھوڑوں کے ہتھانے پیروں کے پھینپنا۔ نہ اور لوگوں کے بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ابر کا کھڑا بچہ کے او  
 چھا گیا۔ اور بچہ میری نگاہوں سے اجڑ چلا ہو گیا۔ البتہ منادی کی آواز سنائی دی کہ محمد کو مسکوں مسکوں پہنراؤ۔ ابو سمنہ  
 کی ہتھوں میں لے جاؤ۔ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے، اور جن و انس چترندہ پرند اور ملائکہ بلکہ ہر ذی  
 روح کے سامنے ان کو سے جاؤ۔ ان کو آدم کا خلق، شیث کی معرفت، نوح کی شجاعت، ابراہیم کی دوستی،  
 اسمعیل کی قربانیاں، اسحاق کی رضا، یسوع کی فصاحت، موسیٰ کی حکمت، الیہ کی صبر، یونس کی طاعت،  
 یوشع کا جہاد، داؤد کی آواز، دانیال کی محبت، الیاس کا دلدرد، یحییٰ کی پاکدامنی اور عیسیٰ کا زہد عطا کرو۔ اور تمام  
 بنیغیرزل کے اخلاق میں انہیں غوطہ دو،

آمنہ کہتی ہیں پھر یہ منظر بٹ گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ آپ سبز حریر میں لپیٹے ہیں۔ اور اس کے اندر سے  
 پانی ٹپک رہا ہے۔ آواز آئی۔ ہاں محمد نے تمام دنیا پر قبضہ کر لیا۔ اور کوئی مخلوق ایسی نہ رہی جو ان کے حلقہ اطاعت  
 میں نہ لگتی ہو، کہتی ہیں کہ پھر میں نے دیکھا تو نظر آیا۔ کہ آپ کا چہرہ چودھویں رات کے چاند کی طرح ہے۔ اور شک  
 خالص کی سی خوشبو آپ سے نکل رہی ہے۔ دفعہ تین آدمی نظر آئے۔ ایک کے ہاتھ میں چاندی کا آفتاب ہے۔  
 دوسرے کے ہاتھ میں سبز زرد کا طشت ہے۔ اور تیسرے کے ہاتھ میں سپید ریشم ہے۔ اس نے سپید ریشم  
 کو کھول کر اس میں سے انگوٹھی جس کو دیکھا۔ انھیں خیر و برکتی تھیں نکالی۔ پھر اس نے انگوٹھی کو سات دفعہ  
 اس آفتاب کے پانی سے دھویا۔ پھر منہ سے پر مہر کے پیکر کو تھوڑی دیر کے لئے اپنے بازوؤں میں لپیٹ  
 لیا۔ اور پھر مجھے واپس کر دیا۔

اس حکایت کی بنیاد یہ ہے کہ قسطلانی نے موابب البزہ میں السعاده والبشری نامی ایک میلاد کی کتاب  
 سے اس کو نقل کیا ہے۔ اور السعاده والبشری کا مصنف کہتا ہے کہ اس نے خطیب سے اس روایت کو سنا ہے۔  
 روایات کے لحاظ سے خطیب کی تاریخ کا جو درجہ ہے وہ کے معلوم نہیں۔ قسطلانی نے اس روایت کو ابونعیم کی طرف  
 بھی منسوب کیا ہے۔ مگر دلائل ابونعیم کے مطبوعہ نسخہ میں تو اس کا پتہ نہیں۔ بغیر یہ ہے کہ حافظ قسطلانی نے  
 خود تصریح کر دی ہے کہ اس میں سخت نکات ہے۔ سیرت النبی ص ۵۴

ہم تو صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ آمنہ نے جتنے انبیاء کرام کے نام اور ان کے اوصاف بیان کئے ہیں اتنے تو

اُس زمانہ میں پورے اہل مکہ کو بھی معلوم نہ تھے۔ وہ تو صرف ابراہیم واسماعیلؑ کو آپؐ ہونے کے ناتے جانتے تھے۔ اسی ناسے تو ائمہ بہت عالمہ و فاضلہ عورت تھیں۔

اس روایت کے جھوٹا ہونے کے ۷۱ ثبوت ہی کافی ہے کہ تمام دنیا پر آج تک حضورؐ کی اس حد کا قبضہ نہیں ہو سکا۔ اسی ناسے تو فرشتوں کا جھوٹا ہونا ثابت ہو گا۔ اور اس پر آج تک تمام امت کا اتفاق یہاں ہے کہ فرشتے گناہ پر قدرت نہیں رکھتے۔ اس پر بھی امت کا اتفاق ہے کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی کے تابع و تابعین نہیں ہوتے۔ جو تمام مخلوق کی اطاعت کا سوال پیدا ہو۔ پھر احادیث میں ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی بہت سی دعائیں نظر آتی ہیں۔ جن میں آپؐ نے مانپ، پچھو، بارے کئے، شیر اور درندوں کے پھاٹنے سے پناہ مانگی ہے۔ حتیٰ کہ ایک بار پچھو نے آپؐ کے کانا بھی ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ دوزے اور جانور آپؐ کے حلقہ اطاعت میں داخل نہیں۔ اس روایت میں اسی قسم کی اور بہت سی لغویات ہیں۔ جن کی تشبیہ کی ضرورت نہیں۔ سب سے بڑی مغویت تو یہی ہے کہ اس روایت کی کوئی سند موجود نہیں۔

## گہوارے میں کلام کرنا

حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۴ پر دہتری کی سیر کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ آپؐ نے گہوارے میں کلام کیا۔ ابن سبک کی خصائص میں ہے کہ فرشتے آپؐ کا گہوارہ بلا تھے۔ سب سے پہلا فقرہ زبان مبارک سے نکلا۔ الحمد للہ کبیرا والحمد للہ کثیرا۔ ابن عاتہ وغیرہ میلاد کی بعض اور کتابوں میں اور فقرے بھی منسوب ہیں۔ مثلاً کہ آپؐ نے لا الہ الا اللہ یا جلال ربی الرفیع پڑھا۔

واقعی کی سیر سے مراد اگر واقعی کی مغازی ہے تو اس کا کلمہ کا مطبوعہ نسخہ جو میرے پیش نظر ہے۔ اس میں یہ واقعہ مذکور نہیں۔ اور اگر ہونا بھی تو واقعی کا کیا اعتبار ہے؟ ابن سبع اور ابن عاتہ وغیرہ زمانہ متاخر کے لوگ ہیں۔ اور قدما سے روایت کی نقل میں بے احتیاط ہیں۔ کسی قدیم ماخذ سے اس روایت کا علم نہیں ہوتا۔ معلوم نہیں انہوں نے یہ روایت کہاں سے لیں۔ سیرت النبی ص ۴۵

اگر ماخذ کا علم ہو جائے تو پھر کہانی کا جو دیکھ کر باقی رہے گا کیونکہ کہانی تو وہی ہوتی ہے جو خود ساختہ ہو۔ اور ماشار اللہ ہمارے اکثر مؤرخین، صوفیاء، واعظین، اور سبائی و درو تابعین سے آج تک کہانیاں تیار کرنے

ہی میں مصروف ہیں۔ بلکہ ہر سپرد اور ہر ملاکے گھر میں ان کہانیوں کو ڈھالنے کے لئے ٹکسائیں قائم ہیں۔ جہاں سے نئی نئی قسم کی کہانیاں تیار ہو کر بازار میں آتی رہتی ہیں۔ اور جو لوگ اس کاروبار سے مستثنیٰ ہیں وہ پرانی کہانیوں کی ترویج میں مشغول ہیں۔

اس وضع روایت کی ابتداء کو فہ سے ہوئی۔ اور وہیں اس فن نے نشوونما پائی۔ بقول امام مالکؒ: "کوفہ میں تو ٹکسائیں قائم ہیں جہاں دن رات سکون کی طرح روایت ڈھل کر بازار میں آتی رہتی ہیں۔ مدینہ میں ایسی کوئی ٹکسال نہ تھی۔ اگرچہ مورخ محمد بن اسحاقؒ نے مدینہ میں بھی ٹکسائیں قائم کرنی چاہی تھیں۔ لیکن اسے کامیابی حاصل نہ ہو سکی جس کے نتیجے میں مدینہ چھوڑ کر مکہ چلا گیا۔ لیکن وہاں کا ماحول بھی اس کے لئے سازگار نہ تھا۔ لہذا حرمین کی سرزمین کو خیر باد کہہ کر بغداد کی راہ لی۔ یہاں اگر اس نے برسرِ اقتدار طبقے کو بھی اپنا ہم نوا پایا۔ کیونکہ عباسی حکومت سے بڑے بڑے مجوسی تھے۔ اور مجوسیوں کے ہی بل بوتے پر عباسی حکومت قائم ہوئی تھی۔ لہذا اس صنعت کو وہ دگنی چوٹی پر لے کر آئے۔ اور آج کل تو ہر شخص ان ہی کہانیوں کو اصل علم تصور کرتا ہے۔"

## چاند سے باتیں کرنا

بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عباسؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ یا رسول اللہ! مجھ کو جس نشانی نے آپ کے مذہب میں داخل ہونے کا خیال دلایا، وہ یہ ہے کہ جب آپؐ ہمارے میں سے تھیں تو میں نے دیکھا کہ آپ چاند سے اور چاند آپ سے باتیں کرتا تھا اور انگلی سے آپ اس کو جدھر اشارہ کرتے تھے، وہُ جہاں جھبک جاتا تھا۔ فرمایا ہاں، وہ مجھ سے باتیں کرتا تھا اور میں اس سے باتیں کرتا تھا۔ وہ مجھے رونے سے بلاتا تھا اور عرش کے نیچے جا کر جب وہ تسبیح کرتا تو میں اس کی آواز سنتا تھا۔

یہ حکایت دلائلِ معتقہ، کتاب الماتین صابونی، تاریخ خطیب اور تاریخ ابن عساکر میں ہے۔ مگر خود بی بی نے تصریح کر دی ہے کہ یہ صرف احمد بن ابراہیم حنبلیؒ کی روایت ہے، اور وہ محمول ہے۔ صابونی نے یہ روایت نقل کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ روایت سند اور متن دونوں لحاظ سے غریب ہے۔

علاوہ ازیں حضرت عباسؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک دو سال بڑے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم



کی شیر خواندگی کے زمانہ میں وہ خود شیر خواہوں گے۔ سیرت ابنی ماجہ ۴۷

اس کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ولادت کے بعد صرف ہفتہ عشرہ مکہ میں رہے ہیں، دو یا تین روز والدہ نے دودھ پلایا۔ پھر ابوہب کی باندی ثویبہ نے تقریباً ایک ہفتہ دودھ پلایا۔ پھر حلیمہ آپ کو اپنے ساتھ قبیلہ بنی سعد لگتیں جو مکہ اور طائف کے درمیان آباد تھا۔

رہ گئے چنانچہ سے باتیں کرنے کے تصورات یہ تخیل مسلمانوں میں بند و مذہب سے آیا ہے۔ کیونکہ ہندو مذہب میں چاند ایک دیوی ہے جو چندرا نامی دیوی کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اور چودھویں رات میں اس دیوی کو خوش کرنے کے لئے پوجا کی جاتی ہے۔ بلکہ ہندو مذہب میں ایسے جاپ و منتر پڑھتے جاتے ہیں جن کے ذریعہ چندا دیوی کو اپنے قابو میں کیا جاسکتا ہے۔ اور جس کے قابو میں وہ دیوی آجاتی ہے وہ اقتدار کا مالک ہو جاتا ہے۔ اسی لئے ہمارے شعراء بھی چاند کو مخاطب کرتے رہتے ہیں۔ عربی شاعری اس لغت سے پاک ہے۔ اور اب تو موجودہ سائنس نے ان تمام تخیلات پر پانی پھیر دیا ہے۔ لیکن ہمارا سیلابی ٹیلا آج تک ان ہی کبابیوں میں غرق ہے۔

یہ بھی دیکھ لیں کہ تمام مہاجر و انصاری صحابہ میں کوئی بھی ایسا صحابی نہیں جو معجزہ دیکھ کر ایمان لایا ہو۔ بلکہ یہ حضرات صحابہ صرف تین امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایمان لائے ہیں۔

۱۔ قرآن کے دلائل اور اس کا طرز بیان دیکھ کر۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و امانت، آپ کے اخلاق حسنہ اور آپ کی اصول پرستی کو دیکھتے ہوئے۔

۳۔ اسلام کی روز بروز ترقی اور شان و شوکت کو دیکھتے ہوئے۔

اہل مکہ بچے کو چاند سے باتیں کرتے دیکھ کر تو کیا ایمان لائے، وہ توشیح قرآن کے معجزے کو دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے۔ اور آپ کی شان و شوکت کو دیکھ کر فتح مکہ کے روز پورے اہل مکہ ایمان لے آئے۔ حضرت عباسؓ نے بھی فتح مکہ سے صرف ایک رات قبل ہی اپنے ایمان کا اظہار کیا تھا۔ جب کہ ان کی زرد جام الفضل شروع ہی میں ایمان لایا تھا۔

## ایک یہودی کی بشارت

بیان کیا جاتا ہے کہ جس شب آپ پیدا ہوئے، قریش کے بڑے بڑے سردار جلسہ جمائے بیٹھے تھے۔ ایک یہودی نے جو مکہ میں سوداگری کرتا تھا، ان سے آکر دریافت کیا کیا تمہارے یہاں آج کسی کے گھر بچہ پیدا ہوا ہے؟ سب نے اپنی لاعلمی ظاہر کی۔ اسی نے کہا: اللہ اکبر! تم کو نہیں معلوم تو خیر میں جو کچھ کہتا ہوں اس کو سن رکھو۔ آج شب کو اس بچہ کی امت کا بنی پیدا ہوا ہے۔ اس کے دونوں مونہ تھوں کے پیچ میں ایک نشانی ہے اس میں گھوڑے کے ایال کی طرح کچھ اوپر تلے بال ہیں۔ وہ دو دن تک دودھ نہ پئے گا کیونکہ ایک جن نے اس کے منہ میں انگلی ڈال دی ہے۔ جس سے وہ دودھ نہیں پی سکتا۔ جب جلسہ درخواست ہو گیا۔ اور لوگ گھنٹل کو بوتے تو معلوم ہوا کہ عبد اللہ بن عبد المطلب کے گھر لڑکا پیدا ہوا ہے۔ لوگ اس یہودی کو آ منہ کے گھر لائے۔ اس نے بچہ کے پیٹ پر تن دیکھا تو خوش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش آیا تو لوگوں نے سبب پوچھا۔ اس نے کہا اللہ کی قسم اسرائیل کے گھر ان سے نبوت رخصت ہو گئی۔ اسے قریش تم اس کی پیدائش سے خوش ہو، ہوشیار، اللہ کی قسم یہ ایک دن تم پر ایسا حملہ کرے گا جس کی خبر چار دہاک عالم میں پھیلے گی۔

یہ روایت حاکم کی مستدرک میں ہے، اور حاکم نے اسے صحیح کہا ہے۔ مگر اہل علم جانتے ہیں کہ حاکم کا کسی روایت کو صحیح کہنا ہمیشہ تحقیق کا محتاج رہتا ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے تلخیص مستدرک کی ج ۲ ص ۶۲ میں حاکم کی تردید کی ہے۔ اس کا سلسلہ روایت یہ ہے کہ یعقوب بن سفیان قسوی، ابو غسان محمد بن یحییٰ کنانی سے اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن علی کنانی سے اور وہ محمد بن اسحاق (مصنف سیرت) سے روایت کرتا ہے۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ابن اسحاق نے خود اپنی سیرت میں یہ روایت نہیں لی۔ ابو غسان محمد بن یحییٰ کو گو بعض محدثین (بخاری) نے ثقہ کہا ہے مگر محدث سلمان نے اس کو منکر الحدیث (ایسی باتیں بیان کرنے والا جن کی تصدیق دیگر معتبر روایات سے نہیں ہوتی) کہا ہے۔ ابن حزم نے اس کو مجہول کہا ہے۔ بہر حال اس تک غیبت ہے۔ مگر اس کے باپ یحییٰ بن علی کا کہیں کوئی ذکر نہیں۔ کہ یہ کون تھا، اور کب گزرا ہے؟ اس قسم کی ایک روایت اسی راوی کے معلق ابو جعفر بن ابی شیبہ سے مروی ہے، اور ابو نعیم نے

دلائل میں اور ابن عساکر نے تاریخ میں اس کو ذکر کیا ہے۔ لیکن زرقانی نے لکھا ہے کہ ابو جعفر بن ابی شیبہ نامعتبر ہے۔  
سیرت النبی ﷺ ج ۳

اول تو غور طلب امر یہ ہے کہ سرزمین مکہ میں یہودی کہاں سے آیا، ہمیں تو مکہ کی تاریخ میں وہاں یہودیوں کا کوئی وجود نظر نہیں آتا۔ پھر مزید یہ کہ حضور کے دہن مبارک میں جن کا انگلی دینا اس امر کی تائید ہے کہ یہ روایت وضع کرنے والا کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دشمن ہے جو بشارت کے پردے میں حضور کی ذات اقدس سے پناہ غص نکالنا چاہتا ہے۔ اب خواہ وہ یہودی ہو یا کوئی مجوسی۔

راہِ دین تک دودھ نہ پینا تو تمام مؤرخین اور اہل سیر میں پرستش میں ابن اسحاق بھی داخل ہے کہ آپ نے دو یا تین دن تک اپنی والدہ کا دودھ پیا۔ پھر آپ نے ثویبہ کا دودھ پیا۔ اس کے بعد آپ کو حکم لے کر چلی گئیں۔

یہ کتہ بھی غلط ہے کہ تل کا نبوت سے کیا تعلق ہے۔ اس سے تو بظاہر یہ محسوس ہوتا ہے کہ جس کے پیٹ پر تل پر وہ نبی ہو، اور جب پیٹ کے تل کی یہ خصوصیت ہوتی تو اور تلوں میں بھی کچھ نہ کچھ خصوصیات ہوں گی۔

## پیدا ہوتے ہی سجدہ کرنا

آمنہ کہتی ہیں کہ جب آپ پیدا ہوئے تو ایک مہینہ چکی جس سے تمام شرق و مغرب روشن ہو گئے۔ اور آپ ۱۰۰ دن ہاتھ ٹیک کر زمین پر گر پڑے۔ (شاید متعدد یہ ہے کہ آپ سجدہ میں گر گئے) پھر ٹھکی سے مٹی اٹھا لی۔ (ہاں! اس سے یہ مطلب لیتے ہیں کہ آپ نے پوری روئے زمین پر شہ کر لیا) اور آسمان کی طرف سرائٹھایا۔

یہ حکایت ابن سعد میں متعدد طریقوں سے مذکور ہے۔ مگر ان میں سے کوئی قوی نہیں اس کے قریب قریب ابن نعیم اور طبرانی میں روایتیں ہیں۔ ان کا بھی یہی حال ہے۔ سیرت النبی ﷺ ج ۳

جہاں تک تمام زمینی پرفضہ کا مسئلہ ہے تو پندرہ سو سال گزر گئے لیکن آج تک ایک روز کے لئے بھی مسلمان تمام دنیا پر قابض نہیں

## نور نبوی کی تخلیق

اس موضوع اور ولادت رسول سے متعلق جو روایات عام طور پر کتب سیرت اور میلاد ناموں میں پائی جاتی ہیں۔ ہم ان پر سید سلیمان ندوی مرحوم کی تحقیق قارئین کی خدمت میں پیش کرنا چاہتے ہیں جو انہوں نے سیرت النبی کی جلد سوئم میں فرمائی ہے۔ سید صاحب کہتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلی روایت یہ آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوح و قلم و عرش و کرسی، آسمان و زمین اور جن و انس و غرض سب سے پہلے نور محمدی کو پیدا کیا۔ اور پھر لوح و قلم و عرش و کرسی، آسمان و زمین اور ارواح و ملائکہ سب چیزیں اسی نور سے پیدا ہوئیں۔ اس کے متعلق۔

اول ما خلق الله نورى سب سے اول اللہ نے میرے نور کو پیدا کیا۔

کی روایت عام طور سے زبانوں سے جاری ہے مگر اس روایت کا احادیث کے دفتر میں مجھے کہیں کوئی پتہ نہیں ملا، البتہ ایک روایت مصنف عبد الرزاق بن ہمام میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

یا جابر اول ما خلق الله نورى اے جابر سب سے اول اللہ تعالیٰ نے

نبیك من نورى اپنے نور سے تیرے بنی کے نور کو پیدا کیا۔

اس کے بعد ذکر ہے کہ اس نور کے چار حصے ہوئے، اور ان ہی سے لوح و قلم و عرش و کرسی، آسمان و زمین اور جن و انس کی پیدائش ہوئی۔

زرقانی وغیرہ نے اس روایت کو نقل کیا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس کی سند تہیں کبھی، ہندوستان میں مصنف عبد الرزاق کی کو دوسری جلد ملتی ہے۔ مگر پہلی نہیں ملتی۔ دوسری جلد دیکھ لی گئی ہے مگر اس میں یہ حدیث مذکور نہیں اس لئے اس روایت کی تصدیق نہیں ہو سکی۔ اور چونکہ کتاب مذکور میں صحیح حدیثوں کے ساتھ ساتھ موضوع حدیثیں تک موجود ہیں۔ اور فضائل و مناقب میں اس کی روایتوں کا اعتبار کم کیا جاتا ہے۔ اس لئے اُموی

حیثیت سے اس روایت کے تسلیم کرنے میں مجھے پس و پیش ہے۔ اس تردد کو تو اس سے اور بھی زیادہ ہوتی ہے کہ صحیح احادیث میں غنوغات الہی میں سب سے پہلے تم نقہ پر کی پیدائش کا تصریحی بیان ہے کہ اول ما خلق الله انعام۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے اول ظلم کو پیدا فرمایا۔

(ترمذی کتاب القدر سیرت ابن ماجہ ۴۳۰)

عبد الرزاق بن ہمام کی مصنف اب دس جلدوں میں شائع ہو چکی ہے۔ لیکن اس میں صحیح ضعیف، مرسل منقطع منکر اور موضوع سب ہی قسم کی روایات ہیں۔

اس کے علاوہ خود عبد الرزاق کی ذات مشکوک ہے۔ محدثین کا بیشتر طبقہ انہیں رافضی قرار دیتا ہے۔ بلکہ بعض تو انہیں کذاب بھی کہتے ہیں۔ اور جو لوگ انکی روایات قبول کرتے ہیں وہ بھی چند شرائط کے ساتھ قبول کرتے ہیں۔

۱۔ چونکہ یہ شیعہ ہیں۔ لہذا فضائل و مناقب اور مسجد کی مذمت میں جو روایات ہیں وہ قبول نہیں کی جائیں گی۔

۲۔ مسئلہ سے ان کا دماغ جواب دے گیا تھا۔ اور جو شخص بھی چاہتا وہ ان سے حدیث کے نام سے جو چاہتا پہلو الیتا۔ لہذا مسئلہ کے بعد سے ان کی تمام روایات ناقابل قبول ہیں۔

۳۔ ان سے ان کا بھانجا جو روایات نقل کرتا ہے۔ وہ سب منکد ہوتی ہیں۔

۴۔ یہ معمر سے روایات غلط بیان کرتے ہیں مشہور سے۔ اور ان کی عام روایات سمر ہوتی ہیں۔

۵۔ ان عیوب سے بچنا ہونے کے بعد اس روایت کے راوی تمام تہہ ہواں و زندقہ تہل ہوتے ہیں وہ روایت قابل قبول ہوگی۔ ورنہ نہیں۔ یہ تمام شرائط حضرات کے نزدیک ہیں جو اس کی روایت قبول کرتے ہیں۔ ۱۔ رتہ محدثین کا ایک گروہ اس کے رافضی ہونے کے باعث اس کی روایت ہی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بلکہ یہ ابن المبارک تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ واقعی سے زیادہ جھوٹا ہے۔ تفصیل کے لئے کتب رجال ملاحظہ کیجئے۔

اب اس روایت کی معنوی حیثیت پر بھی غور فرمائیں۔ کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے نذر سے پیدا کیا۔ اور پھر حضور کے نور سے تمام مخلوقات پیدا ہوئیں۔ گویا اللہ تعالیٰ لامحدود اجزاء و اجسام

میں تقسیم ہو گیا اس لحاظ سے اس کی تقسیم تاقیامت جاری رہے گی۔ اس طرح زمین و آسمان کی ہر شے اللہ کا ایک جزو ہوئی، اور ہر شے میں الوہیت کا مادہ پایا گیا۔ اور کوئی شے ایسی باقی نہیں رہی جو الوہیت سے خالی ہو۔ ایسی صورت میں اگر کوئی شخص اپنے الہ ہونے یا اذالہ حق یا انارکیم الاعلیٰ کا دعویٰ کرے تو اس کا یہ دعویٰ اپنی جگہ بالکل درست ہوگا۔ اور خالق و مخلوق، عابد و معبود، اور مالک و مملوک کا وہ رشتہ جو اللہ تعالیٰ نے پورے قرآن میں بیان کیا ہے تناہو کر دیا جائے۔ یہی تو وہ کہانیاں ہیں جن پر وحدت الوجود اور ہمہ اوست کی بنیادیں قائم ہیں۔ اور جب یہ اجزاء فنا ہو جائیں گے تو اللہ تعالیٰ کی قنارہ بھی یقینی ہوگی اگر یہ کہا جائے کہ یہ اجزاء فنا نہیں ہوتے بلکہ دوبارہ اللہ کی ذات میں جا کر شامل ہو جاتے ہیں۔ تو عیسائیوں کا حضرت عیسیٰ کے بارے میں یہی تصور ہے۔ اسی سے تو تثلیث وجود میں آئی ہے۔ افسوس یہ ہے کہ عیسائیوں نے اسے صرف تین کی حد تک محدود کر دیا۔ اور ہمارے صوفیائے نامہ مخفوقات کو اس کے احاطہ میں شامل کر لیا۔

پھر غور طلب یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی ذات میں سے ایک جزو علیحدہ کر دیا گیا تو وہ امور تو پیسے بن کر تسلیم کر لئے گئے۔

۱۔ اللہ ایک ایسی شے ہے جو اجزاء پر تقسیم ہو سکتی ہے۔ اور جو شے اجزاء پر تقسیم ہوتی ہو، وہ جسم بھی ہوگی اور فنا بھی ہوگی۔ گویا اللہ تعالیٰ جسم بھی ہے اور فانی بھی ہے۔

۲۔ جب ایک جزو علیحدہ ہوا۔ تو ذات الہی میں نقص لازم آیا۔ (عیاذ باللہ)

ان روایات پر منطقی لحاظ سے آپ کسی طرح بھی غور کر لیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی ذات پر تبرائے۔ عبدالرزاق سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ افسوس تو ہمیں اپنے علماء پر ہے کہ وہ اس روایت کو حضور کی قضیت تصور کر بیٹھے۔

اس غلط فہمی کا دورزن بھی ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ بذات خود ایک نور ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ نور تو اس کی ایک مخلوق ہے۔ اور خدا اور مخلوق ایک نہیں ہوتے۔ ورنہ پھر بیانیہ وادی برداشت کی شکل پیدا کر لیں، اہم ہے۔

وحھا الظلمت و نور۔ اس سے ظلمت اور نور کو جدا کیا۔

نیز ارشاد ہے۔

وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَشِيءُ بِهِ فِي النَّاسِ - اور ہم نے انسان کے لئے نور پیدا کیا جس سے وہ انسانوں میں چلتا پھرتا ہے۔

اور ارشاد ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللَّهُ لَهُ نُورًا فَمَا لَهُ مِنْ نُّورٍ - جس کے لئے اللہ نور پیدا نہ فرمائے اسے نور کہاں سے حاصل ہوگا۔

اور جاعل و مجعول بھی ایک نہیں ہو سکتے کیونکہ جاعل یعنی خالق ہے اور مجعول بمعنی مخلوق ہے۔ اور خالق و مخلوق اور فاعل و مفعول کا ایک ہونا امر محال ہے۔ عام لوگ جو مغالطہ کھاتے ہیں وہ اس آیت کی وجہ سے سمجھتے ہیں۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ - اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے۔

حالانکہ عربی میں نور مصدر ہے۔ اور مصدر کبھی مصدری معنی دیتا ہے۔ کبھی حاصل مصدر کے معنی دیتا ہے۔ کبھی مفعول کے اور کبھی فاعل کے۔ اسی لئے عرب مفسرین اس کا ترجمہ یہ کرتے ہیں۔

اللَّهُ مُنِيرُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ - اللہ آسمانوں اور زمینوں کو منور کرنے والا ہے۔

عوام اگر دھوکا کھائیں تو اس کی کوئی ہمیت نہیں کیونکہ وہ لاعلم ہیں۔ لیکن اگر علماء بھی اس قسم کی باتیں کہنے لگیں تو اسے توجہل مرکب ہی کہا جائے گا۔ جب اللہ تعالیٰ خود نور نہیں تو اس کے نور سے کسی کی تخلیق کا کیا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ سیدھے سیدھے یہ کہا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نور سے پیدا کیا۔ جس طرح فرشتے۔ لیکن یہ سراسر قرآن کی تکذیب ہے۔ وہ تو بتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنْ طِينٍ - اور ہم نے انسان کو گارے سے پیدا کیا۔

ہمارے نظریہ میں یہ روایت شیعوں کی وضع کردہ ہے۔ اور یہ اس لئے وضع کی گئی ہے تاکہ پانچ تن

یاک کی کہانیوں کی راہ ہموار ہو سکے۔ کیونکہ ان کہانیوں کی رُو سے یہ نوپانچ حصوں میں تقسیم ہوا ہے۔ اور یہ روایت عبد الرزاق کے علاوہ کسی اور کتاب میں نہیں اور وہ رافضی ہے۔ لہذا اس نے اپنے عقیدے کی راہ ہموار

کرنے کے لئے یہ روایت وضع کی۔ کہ جب اہل سنت یہ کڑوی گولی بھگ کر لیں گے تو انہیں دوسری گولی کھلائی جائے گی اور عبدالرزاق کو اب تیرہ سو سال گزر چکے ہیں۔ اتنے طویل عرصے میں تو ہم نزار با کڑوی گولیاں نگل چکے ہیں۔ بلکہ اب ہم اہل سنت اس مار فین کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ اس کے خلاف کوئی بات بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔

## نور کی منتقلی

روایتوں میں ہے کہ یہ نور پہلے ہزاروں برس سجدے میں پڑا رہا۔ پھر حضرت آدمؑ کے تیوہ و تاریک جسم کا چراغ بنا۔ پھر آدمؑ نے مرتے وقت شیش کو اپنا دھی بنا کر یہ نور ان کے سپرد کیا۔ اسی طرح درجہ بدرجہ ایک سے دوسرے پیغمبر کو سپرد ہوتا ہوا یہ نور عبداللہ کے سپرد ہوا اور پھر عبداللہ سے آمنہ کو منتقل ہوا۔

نور کا سجدے میں پڑے رہنا، اور اس کا موجود رہنا بالکل موضوع ہے۔ اور نور کا ایک دوسرے دھی کو درجہ بدرجہ منتقل ہونا قطعاً بے سرو پل ہے۔ ابن مسعود، طبرانی، ابونعیم، اور بزار میں اس آیت پاک

الَّذِي يَرِاثُ حَيْثُ نَقُومُ  
وَتَقْلِبُكَ فِي السَّجْدِ مَيِّتَ

وہ آپ کو اس وقت بھی دیکھا جب آپ کھڑے ہوتے۔ اور سجدہ کرنے والوں میں اپنی حالت تبدیل کرتے رہتے ہیں۔

کی تفسیر میں ایک روایت یہ نقل کی گئی ہے۔ کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغمبروں کی پشت پر پشت منتقل ہوا اللہ تعالیٰ دیکھ رہا تھا۔ لیکن اول کو پوری آیت کے الفاظ اور سیاق و سباق اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے۔ اور دوسرے یہ روایت اعتبار کے قابل نہیں۔ سیرت ابنی ص ۳۲۸۔

اس آیت میں آپ کے کھڑے ہونے اور سجدہ کرنے والوں میں الٹ پیچھے سے مراد۔ قیام۔ رکوع اور سجدہ ہے۔ اور مقصود یہ ہے کہ آپ صحابہ کرام کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں۔ ساجدین سے صحابہ کرام مراد لئے گئے ہیں۔ اس تفسیر پر مجاہد، عکرمہ، قتادہ اور تمام مفسرین کا اتفاق ہے۔ رہا ابن عباسؓ کا مسئلہ تو ان کی بھی مشہور تفسیر وہی ہے جو اور حضرات کی ہے۔ یہ تفسیر تو کبھی کذاب نے نقل کی ہے۔ مجاہد اور عکرمہ بھی تو ابن عباسؓ کے شاگرد ہیں۔ انہوں نے ایسی کوئی روایت نقل نہیں کی۔



ربانیہ دعویٰ کی یہ نوزائیداری پشت در پشت منتقل ہوتا رہا تو سوال یہ ہے کہ حضرت اسمعیل علی اولاد میں حضور کے علاوہ اور کون سینہ بگذا رہے۔ اسی طرح حضرت نوح علی اولاد میں حضرت ابراہیمؑ تک کوئی نبی نہیں۔ نوید دعویٰ ہی سراسر جھوٹا ہے۔ اگر اراحد حضور کے آباؤ اجداد ہیں تو آپ کے آباؤ اجداد میں بہت سے شرک اور بت پرست گزرے۔ اس لحاظ سے بھی یہ روایت جہالت کا بہت ثبوت ہے۔

لیکن قاعدہ یہ ہے کہ ایک جھوٹ کو چھپانے کے لئے سو جھوٹ بولنے پڑتے ہیں۔ لہذا اسی لئے شیعوں نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ حضور کے تمام آباؤ اجداد مسلمان تھے۔ چنانچہ عبد المطلب کے ساتھ حضرت کا لفظ بڑھایا جاتا ہے۔ مفسرین نے تو اس واقعہ کا کلی کے نام سے سرسری طور پر ذکر کیا تھا۔ لیکن اہل سیرت نے اسے ایک نام کہانی بنا کر پیش کیا ہے۔ حتیٰ کہ عبد الحق دہلوی نے مدارج النبوۃ میں اور ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں اس کی پوری تفصیل پیش کی۔ اس کے آخر میں یہ ہے کہ عبد المطلب سے یہ نوزاد و حصوں میں منقسم ہو گیا۔ عبد اللہ اور عبد مناف (یعنی ابوطالب) عبد اللہ سے یہ نوزاد حضور کو ملا اور عبد مناف سے حضرت علی کو۔ اسی باعث حضور امام الانبیاء اور حضرت علی امام الاولیاء ہیں۔

گویا حضرت علیؑ حضور کے ساتھ ایک مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ ان کو جو کچھ حاصل ہوا حضور کے طفیل میں نہیں بلکہ فطری اور کنیتی طور پر حاصل ہوا۔ حتیٰ کہ جلاء العیون میں ہے کہ حضرت علیؑ نے نبی اللہ کے اول ہی دن کلام فرمایا۔ اور حضور سے دریافت کیا کہ کیا تم نے مجھے پہچان لیا۔ حضور نے جواب دیا ہاں پھر حضور نے حضرت علیؑ سے یہی سوال کیا۔ حضرت علیؑ نے بھی اقرار میں جواب دیا۔ اسی روز سے اس دن کا نام عرفہ ہو یعنی پہچان لینے کا دن۔

ہمارا ملا ایک جانب نومبر پر یہ کہانی بیان کرتا ہے۔ اور دوسری جانب عرفہ ۹ ذی الحجہ کو بتاتا ہے۔ اور اس کے لئے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ عبد المطلب سے اس نوزاد کو تقسیم نہیں کیا۔ سیدھے سیدھے عبد اللہ کی جانب منتقل کر دیا۔ لیکن عبد الحق نے اس تقسیم کو جاری رکھا۔ اول اس طرح حضرت علیؑ کو امام الاولیاء بنا کر نبوت کے مقابلہ میں ایک ستاری لائن ولایت و امامت کی۔ پیش کے کدھادی۔ اس کتاب ولی کے سے یہ ضروری نہیں۔ ہاں کہ وہ شریعت اسلامیہ کا بانی ہے۔ اس کا صرف اولاد علیؑ سے ہونا کافی ہے۔ اسی لئے ہمارے تمام

پیر عا جان اولاد علیؑ میں سے ہوتے رہے۔ یاز بردستی اولاد علیؑ میں گئے یا بنا دیئے گئے۔ اور اس طرح پیر پستی  
سید پرستی اور شاہ پرستی نہ صرف وجود میں آئی بلکہ ایک بلاسن کر سنیوں کے دماغوں پر مسلط ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ  
ہمیں اس کالی ماتی سے محفوظ رکھے۔

## نور کے وسیلے سے دُعا

روایت ہے کہ یہ نور جب عبد المطلب کے سپرد ہوا تو وہ ایک دن خانہ کعبہ میں سوئے ہوئے تھے۔ بوکر  
اٹھے۔ تو دیکھا کہ ان کی آنکھوں میں سُورہ اور بالوں میں تیل لگا ہے۔ اور بدن پر جمال و رونق (یا جوانی) کا خلعت ہے۔  
یہ دیکھ کر وہ ششدر رہ گئے۔ آخر کار ان کے باپ ان کو قریش کے ایک کاہن کے پاس لے گئے۔ اس نے  
کہا کہ اللہ نے اجازت دی ہے۔ کہ اس لڑکے کا نکاح کر دیا جائے۔ اس نور کے اثر سے عبد المطلب کے بدن  
سے مشک کی خوشبو آتی تھی۔ اور وہ نور ان کی پیشانی میں چمکتا تھا۔ قریش پر جب قحط وغیرہ کی کوئی مصیبت پیش  
آتی تھی تو اس نور کے وسیلے سے وہ دُعا مانگتے تھے۔ تو قبول ہوتی تھی۔

یہ روایت ابوسعید خدریؓ نے اپنی کتاب شرف المصطفیٰ میں ابو بکر بن ابی مریم کے واسطے  
سے کعب احبار (نوسلم یہودی) تابعی سے روایت کی ہے۔ اول تو یہ سلسلہ ایک تابعی تک موقوف ہے۔ آگے  
کی سند ہمیں۔ علاوہ ازیں کعب احبار کو نو مسلم اسرائیلیوں میں سب سے بہتر سمجھے جاتے ہیں۔ تاہم امام بخاری  
ان کے کذب کا تجربہ بیان کرتے ہیں۔ اسلام میں اسرائیلیات اور عجیب و غریب حوادث کی روایات کے  
سرچشمہ ہی ہیں۔

یہ کاراوی ابو بکر بن ابی مریم۔ با اتفاق محدثین ضعیف ہے۔ اس کا دماغ ایک حادثہ کے باعث ٹھیک  
نہیں رہا تھا۔ میرت البنی ص ۳۹

کعب کا انتقال حضرت عثمان کے زمانہ میں ہوا۔ یعنی ۲۵ سے قبل اور ابو بکر بن ابی مریم کی وفات ۱۵  
میں ہوئی۔ ابو بکر بن ابی مریم نہایت عابد و زاہد انسان تھا۔ اور باطنی کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کا تفصیلی  
حال پہلے گزر چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کشف قبر کے ذریعہ کعب کی روح سے ملاقات کی ہو۔ اور اس

ہے۔ روایت سنی ہو۔ درہ کعب تو اس کے وجود میں آنے سے بہت پہلے مہجکا تھا۔

عبد المطلب کا اصلی نام شیبہ ہے۔ اس کا باپ ہاشم بغرض تحدت شام گیا۔ راہ میں مدینہ میں قیام کیا۔ وہاں انہیں بنو غفار کی ایک لڑکی ملی پسند آگئی۔ انہوں نے اس سے شادی کرنی کچھ دن اس کے پاس رہ کر ہاشم شام چلا گیا۔ واپسی میں راہ میں غزوہ کے مقام پر ہاشم کا انتقال ہو گیا۔ لیکن سلی کے بیٹ میں حمل رہ گیا۔ جب بچہ پیدا ہوا تو اس کے سر کے بال سپید تھے۔ اسی لئے اس کا نام شیبہ رکھا گیا۔ اس بچہ نے آٹھ سال تک مدینہ میں پرورش پائی جب ہاشم کے بھائی مطلب لو اس و انتات کی خدمت میں آکر اپنے ساتھ مکہ لے آیا۔ اور چونکہ اس بچہ کی پرورش مطلب نے ہی تھی۔ اسی لئے لوگ اس بچہ کو عبد المطلب کہنے لگے۔

سوال یہ ہے کہ عبد المطلب کا باپ تو اس کی پیدائش سے قبل ہی مر گیا تھا۔ کیا مرے کے پندرہ سولہ سال بعد وہ زندہ ہو کر دوبارہ آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یا تو یہ کعب احبار کا بھرت ہے۔ کیونکہ وہ اہل مکہ کے حالات سے بے خبر تھا۔ یا یہ صوفی ابو جبر بن ابی مریم کی بدغلی کا نتیجہ ہے۔ ہاں ہمیں اس روایت سے چند نئے سبق ضرور حاصل ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ وسیلے اور واسطے کفار کی سنت ہیں۔ یہ ایک ایسی شے ہے جس کی قرآن بھی شہادت دے رہا ہے۔

۲۔ یہ لو اس وقت منتقل ہوتا تھا جب بچہ جوان ہو جاتا تھا۔ کہیں اس نور سے مراد جوانی کا نور تو نہیں۔

۳۔ جس لوگوں کو یہ نور حاصل ہوتا رہا۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کی۔ اور اجازت الہی معلوم کرنے کا طریقہ انہوں کے ذریعہ نال کھلوانا تھا۔

۴۔ بچوں کو چاہیے کہ جب وہ جوان ہوں تو سر پریل چڑا کریں۔ اور آنکھوں میں سرمہ لگا کر کریں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں بھی یہ نور حاصل ہو جائے۔

## عبداللہ سے ایک کاہنہ کی درخواست

(منصب رسالت کے اغوار کی پوشش)

روایت ہے کہ یہ نور جب عبداللہ کی پیشانی میں چمکا دینے سے جوانی کا جو بن آیا تو ایک عورت جو کاہنہ تھی اس نے نور کو پہنایا۔ اور چاہا کہ عبد اللہ سے ہم بستر ہو کر اس نوکیل ابن بن جائے مگر یہ سعادت اس کی قسمت میں نہ تھی اس

وقت عبداللہؑ نے عذر کیا۔ اور گھر چلے گئے۔ وہاں یہ دولت آمنہ کو نصیب ہوئی۔ عبداللہؑ نے واپس آکر اس کا بندہ سے درخواست کی۔ ثواب اس نے رد کر دی۔ کہ اب وہ نور تنہا ہی پیشانی سے منتقل ہو چکا۔

یہ روایت الفاظ اور جزئیات کے اختلاف کے ساتھ ابن سعد، خرائطی، ابن عساکر، بیہقی اور ابونعیم میں مذکور ہے۔ ابن سعد نے تین طریقوں سے اس کی روایت کی ہے۔ ایک طریقہ میں پہلا راوی واقعہ ہے، دوسرے میں گلی ہے۔ یہ دونوں مشہور دروغ گو ہیں۔ تیسرا طریقہ ابویزید مدنی تابعی پر باہر ختم ہوا ہے۔ یعنی اوپر کے راوی غائب ہیں۔

ابویزید مدنی کی اگرچہ بعض ائمہ نے توثیق کی ہے۔ مگر مدینہ کے شیخ اسحاق ابن دماک نے فرماتے ہیں کہ میں اس کو نہیں جانتا۔ ابوزر عہ کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم۔

ابونعیم نے چار طریقوں سے اس کی روایت کی ہے۔ لیکن ان میں کوئی بھی قابل وثوق نہیں۔ ایک طریقہ میں نضر بن سلمہ، احمد ابن محمد، اور عبدالعزیز بن مرداس زہری ہیں۔ اور یہ تینوں نامعتبر ہیں۔ دوسرے میں مسلم بن خالد الزنجی ہے۔ جو ضعیف سمجھا جاتا ہے۔ اور متعدد محمول راوی ہیں۔ تیسرا سلسلہ یزید بن شہاب الزہری پر جا کر ختم ہوا ہے۔ اور وہ اپنے اگے کا سلسلہ بیان نہیں کرتا۔ اور اس کا حال بھی معلوم نہیں۔ بیہقی کا سلسلہ ابی تیسرا ہے۔ خرائطی اور ابن عساکر کا سلسلہ بھی ناقابل اعتبار ہے۔ سیرت البیہقی ص ۴۱

ربیع کی مزید تفصیل ہم بعد میں عرض کریں گے۔ سب سے اول تو تابعین کو یہ بھولنا چاہیے کہ یزیدؑ شہادت یافتہ کر رہے ہیں کہ حضور کے والد عبداللہؑ ایک ہوس پرست اور بدکار شخص تھے، کہ آپ کو ایک فاشہ خطائی جانا بہانہ کرنا چاہا۔ اس وقت کسی خاص وجہ کے تحت انکار کر دیا۔ لیکن بعد میں خود اس فاشہ کے پاس ”ثبوت“ کرنے کے لئے پہنچ گئے۔ خود عقل سے سوچتے کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبت میں ہو ہی ہے۔ آپ کے والد پر تبرا ہو رہا ہے۔ اور انہیں بدکار ثابت کیا جا رہا ہے۔

ان کی کرم فرمایوں کے کئی متعدد مضامین میں تصریح ہے۔ آپ دو گئے مشہور مورخ مشہور **مورخ گلی:** ماہر انساب اور مفسر کلام تصور کئے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ان کی تفسیری کتابوں سے کوئی تفسیر خالی نہیں۔ ویسے بھی ایک تفسیر کے مصنف ہیں جو آنی تفسیر بن عباسؑ کے نام سے موسوم ہے۔ اور جو ایک عربی سے

ترجمہ ہو کر ہزاریں شائع ہو رہی ہے۔ اس فرق یہ ہے کہ آج وہ تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہے اور متقدمین میں تفسیر کلبی کے نام سے مشہور تھی۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اس نے یہ تمام تفسیر الوصال سے سنی ہے۔ اور ابو صالح نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے۔ اسی لئے یہ دونوں سے مشہور ہوئی۔ یعنی تفسیر ابن عباس اور تفسیر کلبی۔ آئیے اب حافظ ذہبی کی زبانی اس کا کچھ حال ملاحظہ کیجیے۔ حافظ صاحب لکھتے ہیں۔

اس کا نام محمد بن اسباب ہے۔ ابو انظر اس کی کنیت ہے۔ بنو کلب خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ کوہ کا باشندہ ہے۔ ماہر حساب۔ ہنس اور مورخ ہے۔ امام شعبی وغیرہ سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے اس کا بیٹا شام اور ابو معاویہ وغیرہ روایت کرتے ہیں۔ اس کی روایت جامع ترمذی میں پائی جاتی ہے۔

امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کلبی خود کہا کرتا تھا کہ مجھ سے ابو صالح نے ایک بار بطور نصیحت یہ بات فرمائی تھی۔ اے کلبی تو نے ابن عباسؓ کی حثنی روایات مجھ سے سنی ہیں انہیں کسی سے بیان نہ کرنا۔ پھر بھی اس بے حیائے سب کچھ بیان کر دیا اور پوری ایک کتاب لکھ ڈالی۔ حالانکہ استاد نے تنقید کا حکم دیا تھا۔ اور پھر معلوم اس نے نقیہ کیوں اختیار نہیں کیا۔

ابو معاویہ کہتے ہیں میں نے کلبی کو یہ کہتے سنا ہے کہ حثنی جلد میں نے قرآن حفظ کیا ہے۔ اتنی جلد کسی نے قرآن حفظ نہیں کیا۔ میں نے صرف چھ یا سات دن میں قرآن حفظ کر لیا تھا۔ اور جس طرح مجھے بھول واقع ہوئی ہے ایسی بھول کسی کو واقع نہیں ہوئی ہوگی۔ وہ اس طرح کہ میں نے اپنی داڑھی مٹھی میں لی، تاکہ داڑھی نیچے سے کاٹ کر برابر کر لیں اور اوپر سے کاٹ دی۔

امام یزید بن ہارون کا بیان ہے کہ مجھ سے خود کلبی نے یہ بیان کیا کہ میں نے جس شے کو ایک بار یاد کر لیا۔ کبھی بھولا نہیں۔ لیکن ایک بار میں نے جام کو بولایا اور اپنی داڑھی برابر کرنے کے لئے مٹھی میں لی۔ اور بجائے نیچے سے کٹوانے کے اوپر سے کٹوائی۔ (یعنی ایک بار خود کاٹی اور ایک بار جام سے کٹوائی)

یعنی بن عبید کہتے ہیں کہ امام سفیان ثوری نے لوگوں سے فرمایا اے لوگو اس کلبی کی روایتوں سے بچو۔ کسی نے ان سے عرض کیا۔ آپ بھی تو اس کی روایات نقل کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا میں تو اس کے سچ اور جھوٹ کو پہچانتا ہوں، یعنی یہ جانتا ہوں کہ اس کی کون سی روایت درست ہے اور کون سی غلط۔

امام بخاری فرماتے ہیں کہ کبھی بن سعید القطان اور عبد الرحمن بن ہدی نے میں سے بہت سُرُک کی ہے۔  
 پھر بخاری نے امام سفیان کا یہ قول باسناد نقل کیا کہ مجھ سے خود کبھی نے یہ بات نہیں سنی تھی کہ یہ سُرُک سے ابو صالح کے  
 واسطے جو بھی حدیث بیان کروں تو مجھ لے کہ وہ خالص جھوٹ ہے۔

یعنی کیا ان بے کر ہیں اس کبھی سے قرآن پڑھنے جایا کرتا تھا۔ ایک دن بوا کہ میں ایک دفعہ شدید بیمار ہوا  
 اور اس بیمار کے باعث سب کچھ بھول گیا۔ میں اب محمد کی حدیث میں گیا۔ انہوں نے میرے منہ میں تھکوا کہا تو  
 مجھے سب کچھ بھولا ہوا یاد آگیا۔ ماعنوم آل محمد میں سے کتنے افراد سے اس نے اپنے منہ میں تھکوا کہا۔  
 زید بن زریع فرماتے ہیں یہ کبھی سبائی تھا۔ امام غنم کوئی کا قول ہے۔ اے لوگوں سبائیوں سے بچو۔  
 کیونکہ بن غمار کو میں نے دیکھا ہے وہ ان سبائیوں کو کذاب کہا کرتے تھے۔

امام سفیان بن عیینہ نے کبھی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ایک بار مجھ سے ابو صالح نے یہ کہا تھا کہ مکہ میں ایک  
 شخص بھی ایسا نہیں ہے جس سے میں واقف نہ ہوں بلکہ میں تو ہر ایک کے باپ سے بھی واقف ہوں۔  
 ابن حبان کہتے ہیں یہ کبھی سبائیوں کے اس گروہ سے تعلق رکھتا تھا جو اس امر کا مدعی تھا کہ حضرت علی رضی  
 موت واقع نہیں ہوئی۔ وہ دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے اور دنیا کو عدل سے اسی طرح بھر دیں گے جیسے  
 وہ ظلم سے بھری ہوگی۔ یہ لوگ جب بھی بادل کا کوئی ٹکڑا دیکھتے تو کہتے کہ امیر المؤمنین اس میں تشریف ہے چاہے  
 ہیں۔ سبائیوں کے اس گروہ کا نام فرقہ رجمیہ ہے،

امام کا بیان ہے کہ کبھی تو ہر ملا کہا کرتا تھا کہ میں سبائی ہوں۔

ابو حازم کہتے ہیں کہ میں نے خود کبھی کو یہ کہتے سنا ہے کہ جبریلؑ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آتے۔  
 لیکن جب حضور بیت الخلا تشریف لے جاتے تو وہ حضرت علیؑ پر وحی شروع کر دیتے۔ یعنی وہ چالیس یا دل  
 کا قرآن اسی فریب کا یہ نتیجہ ہے۔ جب ہی تواج تک وہ غائب ہے۔

احمد بن زبیر کا قول ہے کہ میں نے امام احمد بن حنبل سے دریافت کیا کہ کبھی کی تفسیر کا مطالعہ کرنا کیا حلال  
 ہے؟ انہوں نے فرمایا نہیں۔

یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ کبھی ثقہ نہیں ہے۔ دار قطنی اور ایک جماعت کہتی ہے کہ نہ تو اس سے بڑا باری

مذکورہ کہتے ہیں یہ کذاب ہے۔

امام ابن حبان فرماتے ہیں۔ اس کا مذہب بھی ظاہر ہے۔ اور اس کا جھوٹ بھی اتنا اظہر من الشمس ہے کہ شراج آعارف نہیں۔ یہ ابو صالح سے واسطہ سے ابن عباس سے تفسیر نقل کرتا ہے۔ حالانکہ ابو صالح نے ابن عباسؓ کو کچھ نہ کہا تھا۔ اور اس نے ابو صالح سے صرف ایک روایت سنی تھیں۔ اب جب بھی اسے جھوٹ بولنا ہوتا ہے تو ابو صالح کو یہ زمیں کی گہرائیوں اور تاریکیوں سے باہر نکال لاتا ہے۔ اس کا اور اس کی روایت کا کسی کتاب میں کوئی نام بھی نکلنا نہیں۔ لہذا کسی کی روایت کو مہرور میں پیش کیا جائے۔ میزان الاعتدال ص ۵۵۶

اس کا ایک شاگرد رشید عطیتہ بن سعد العونی ہے۔ وہ اس کی روایات کی اشاعت کا ذریعہ تھا۔ اس کتاب کی کینیت جس طرح ابو الغضریہ، اسی طرح ایک کینیت ابو سعید بھی ہے۔ عطیتہ جب بھی اس کی روایت بیان کرتا تو بتاتا کہ ابو سعید سے یہ روایت بیان کی ہے۔ جس سے لوگ یہ دھوکہ کھاتے کہ ابو سعید سے مراد حضرت ابو سعید خدریؓ صحابی ہیں۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔ عطیتہ کلبی کے پاس جایا کرتا تھا اور اس سے تفسیر پڑھا کرتا تھا۔ اور اس کلبی کی ایک کینیت ابو سعید بھی۔ عطیتہ دھوکہ دینے کے لئے اس کینیت کو استعمال کرتا تاکہ لوگ اس دھوکہ میں مبتلا ہو جائیں کہ ابو سعید خدریؓ مراد ہیں۔ میزان ص ۵۵۶

یہاں سے یہ اصول واضح ہوا کہ جس روایت کو عطیتہ ابو سعید سے نقل کرے۔ وہ کلبی کذاب کا جھوٹ ہے۔ حضرت ابو سعید خدریؓ کی حدیث نہیں اتفاق سے ترمذی اور ابی ماجہ وغیرہ اس قسم کی متعدد روایات بتاتی ہیں۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہو گئی کہ واقعی اور کلبی نے یہ روایت کس سبب کے تحت بیان کی ہوگی۔ جو طبقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے کے لئے تیار نہیں۔ وہ آپ کے والد عبد اللہ کو کیسے معاف کر سکتے ہیں۔ اب بقیہ دیگر راویوں کا مختصر حال معلوم کر لیں۔ ان کے تفصیلی حال کی اس نے ضرورت نہیں کہ بقیہ راوی فریب کار نہیں، بلکہ فریب خوردہ اشخاص ہیں۔ اس لئے ان کا مختصر سا جائزہ ہی کافی ہے۔

یہ تبع تابعی ہیں۔ بنو مخزوم کے غلام تھے۔ ان کی کینیت ابو خالد ہے۔ مکہ کے فقیہ مسلم بن خالد الزنجی: تھے۔ ابو داؤد اور ابن ماجہ میں ان کی روایات پائی جاتی ہیں۔ امام شافعی، حمید اور

سعد وغیرہ نے ان سے روایات لی ہیں۔

بخاری کہتے ہیں منکر الحدیث ہیں ابو حاتم کہتے ہیں حجت نہیں۔ ساجی کہتے ہیں بہت غلطیاں کرتے ہیں۔  
تقدیر کے منکر تھے۔ علی بن المدینی کہتے ہیں کچھ نہیں۔ ابو داؤد کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ازرقی کا بیان ہے کہ یہ فقہ  
تھے، بہت عبادت گزار تھے اور ہمیشہ روزے رکھا کرتے تھے۔ یعنی غلبہ زہد میں حفظ حدیث کی جانب توجہ نہیں  
تھی۔ نشانہ میں اسی سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ میزان الاعتدال ص ۲۸۱۔  
یہ شاذان الروزی کے لقب سے مشہور ہے۔

**نضر بن سلمہ :** ابو حاتم رازی فرماتے ہیں۔ یہ احادیث تیار کیا کرتا تھا۔ یعنی دماغ کی بھٹی میں۔ ابن عدی  
کہتے ہیں یہ مدینۃ الرسول میں مقیم تھا۔ اس کی کنیت ابو محمد تھی۔

عبدان کا بیان ہے کہ میں نے عبدالرحمان بن خراش سے دریافت کیا۔ کہ غلام حلیل مدینہ کے علماء کی جو  
احادیث بیان کرتا ہے وہ کسی ہیں۔ انہوں نے جواب دیا کہ اس نے عبداللہ بن شعیب سے چوری کی ہیں۔  
اور عبداللہ بن شعیب نے شاذان سے۔ اور شاذان نے انہیں خود وضع کیا ہے۔ اور اس شاذان کا نام نضر بن  
سلمہ ہے۔ میزان ص ۲۵۶۔

## عبداللہ کے فراق میں دو سو عورتوں کا مرجان

حضرت عباسؓ سے روایت کی گئی ہے کہ عبدالمناف اولیٰ قبیلہ خزیم کی دو سو عورتیں گئیں جنہوں نے  
اس غم میں کہ عبداللہ سے ان کو یہ دولت حاصل نہیں ہوئی۔ مگر گئیں، لیکن انہوں نے شادی نہیں کی۔ اور قریش  
کی کوئی عورت ایسی نہ تھی جو اس غم میں بیماری نہ پڑ گئی ہو۔

یہی حکایت ہے جس کا غلط ترجمہ اردو مؤلفین میلاد نے یہ کیا ہے کہ اس رات دو سو عورتیں رشک و  
حسرت سے مر گئیں۔ یہ روایت سند کے بغیر زرقانی شرح مواہب لدینہ میں بصیغہ ثروئی بیان کی گئی ہے جس  
سے ثابت ہوتا ہے کہ خود مصنف کو بھی اس کی صحت میں کلام ہے۔ درحقیقت یہ روایت بالکل بے سند اور  
بے اصل ہے کسی معتبر کتاب میں اس کا پتہ نہیں۔ سیرت النبی ص ۴۲۲۔

ہمارے ذہن نار سائیں تو صرف سیدھی سیدھی چند باتیں آئی ہیں جو ہم بدیہ ناظرین کرتے ہیں۔



۱۔ میلادیوں سے ہماری درخواست ہے کہ بنو عبد مناف اور بنو مخزوم کی دوسو عورتوں کی فہرست پیش کریں۔ ہماری جانب سے انہیں یہ اجازت ہے کہ شادی شدہ لڑکیوں کو بھی وہ اس میں داخل کر سکتے ہیں؟

۲۔ ہمیں بنو مخزوم اور بنو عبد مناف کی صرف دس دس لڑکیوں کے نام بتادیں جنہوں نے زندگی بھر شادی نہ کی ہو۔ چلتے پانچ پانچ عورتوں ہی کے نام لگادیں؟

۳۔ یہ غم صرف ان دو خاندانوں کی لڑکیوں کو کیوں ہوا۔ آخر بنو زہرہ، بنو جمح، بنو اسد، بنو خلیلہ، بنو تمیم، بنو عدی اور بنو غالب کی لڑکیوں کو کیوں نہیں ہوا؟

۴۔ ولید بن مغیرہ اور ابوجہل وغیرہ جو بنو مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اور آپ کے پکے دشمن تھے، کہیں ان کو اسی بات کی عداوت تو دیکھی کہ ان کی ماؤں اور بہنوں نے فراقِ عبداللہ میں جان دیدی تھی؟

۵۔ عبد مناف کے ایک بیٹے کا نام ہاشم تھا جس کی اولاد بنو ہاشم کہلاتی ہے۔ ہمیں یہ بتایا جائے کہ بنو ہاشم کی کتنی عورتوں نے جان دی یا وہ کنوارے بیٹھے ہیں؟

۶۔ اس کہانی سے تو رہنمائی ہوگا کہ عبداللہ کی شب وصال بل مکہ کے لئے غم کی رات تھی۔ اس بات کو تو وہ محرم کی طرح غم مناتے ہوں گے۔ اور عبداللہ پر تبرائے ہوں گے۔ اس سے حضور کی فضیلت ثابت ہوگی۔ یا حسین الفاظ میں حضور اور آپ کے والد پر تبرایوگا۔ نہ معلوم ہمارے ان ملاؤں نے اپنی عقل کو کہاں گڑھی رکھ دیا ہے۔

## ایک کاہن کی پیش گوئی

ابونعیم، حاکم و بیہقی اور طبرانی میں ایک روایت ہے کہ ایک بار عبد المطلب یمن گئے۔ وہاں ایک کاہن اُن کے پاس آیا اور اُن کی اجازت سے ان کے ہاتھوں کو دیکھ کر بتایا کہ ایک ہاتھ میں نبوت اور دوسرے میں بادشاہی کی علامت ہے۔ تم نورہ کی بی بی ہوؤ گے جا کر شادی کرو۔

یہ نام مصطفیٰؐ ہے۔ یہی محمدؐ ہے۔ یہی خیر البرکات ہے۔ اس کی نسبت میزان میں ہے کہ اس کا نام محمدؐ ہے۔ اس کی کنیت ہے ابو القاسم۔ اس کی کنیت ہے ابو القاسم۔ اس کی کنیت ہے ابو القاسم۔

عبدالعزیز کے بعد کاراوی یعقوب بن محمد الزہری ہے جس کی نسبت یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ اگر ثقہ راوی سے روایت کرے تو لکھو، ابو زرعہ نے کہا وہ کچھ نہیں، وہ واقفی کے قریب ہے۔ امام احمد نے کہا وہ کچھ نہیں۔ اس کی حدیث لاشعے کے برابر ہے۔ ساجی نے کہا وہ منکر الحدیث ہے۔ علاوہ ازیں اس روایت میں بعض اور مجہول راوی ہیں۔ حاکم نے مستدرک میں اس کو روایت کیا ہے۔ لیکن امام ذہبی نے ثقہ مستدرک میں یعقوب اور عبدالعزیز دونوں کو ضعیف کہا ہے۔ سیرت النبی ص ۴۳

دینا جاتی ہے کہ حضور کی والدہ آمنہ بنو زہرہ خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہ بھی دینا جاتی ہے کہ آپ کے والد کا نام عبد اللہ اور دادا کا نام عبد المطلب ہے۔ اگر یہ بات عبد اللہ سے ہی جاتی تو خلاف واقعہ ہوتی لیکن اس روایت کے راوی باپ کے بچائے دادا کی بنو زہرہ میں شادی کر رہے ہیں۔ جس سے یہ بات ثابت ہوگی کہ باو شاہت و نبوت اس لئے یا اس لئے کہ اس کے اولاد کے حصہ میں آئے گی جس کی مال بنو زہرہ سے تعلق رکھتی ہو۔ یعنی نہ صرف حضور کی ناندہ بلکہ حضور کی دادی کا تعلق بھی بنو زہرہ سے ہو۔

عبد المطلب نے اپنی زندگی میں متعدد شادیاں کیں، جن میں سے ایک لڑکی بنو زہرہ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس لڑکی کا نام ہالہ بنت اسیب تھا۔ یہ آمنہ کی حجازی اور بہن تھیں۔ عبد المطلب نے جس روز اپنے بیٹے عبد اللہ کا نکاح آمنہ سے کیا اسی روز اپنا نکاح ہالہ سے کیا۔ اس طرح باپ بیٹے دونوں نے ایک دن شادی رچائی۔ عبد المطلب کے یہاں ہالہ سے جو لڑکے پیدا ہوئے اس کا نام حمزہ ہے۔ اس طرح حضرت حمزہ آپ کے عمالہ زاد بھائی بھی ہوئے۔ یہ تمام تفصیل علامہ ابن حزم نے اپنی الجہرۃ الانساب میں بیان کی ہے۔ اور نبوت و بادشاہت عبد اللہ کی اولاد کو ملی۔ نہ کہ حمزہ اور ان کی اولاد کو۔ کیا یہ جاہل راوی حضور سے یہ نسبتیں چھین کر حضرت حمزہ کے سپرد کرنا چاہتے ہیں حیرت تو ہمیں سمیٹی، حاکم مابو نعیم، طبرانی اور ابن سعد جیسے لوگوں پر ہے کہ یہ حضرات روایت بدرستی کے مرض میں مبتلا ہو کر عقل کو بھی غیر باد کہہ دیتے ہیں۔

## آتش کہوں کا بجھنا

روایت ہے کہ ولادت کی رات کسری کے محل میں زلزلہ پڑ گیا۔ اور اس کے چودہ گنگوڑے گر پڑے۔

اور سادہ کی ہنر (واقع فارس) اور بعض روایتوں میں طبریہ کی ہنر واقع شام) خشک ہو گئی۔ اور فارس کا آتش کدہ جو ہزاروں برس سے روشن تھا بجھ گیا۔ اور کسری نے ایک ہولناک خواب دیکھا جس کی تعبیر میں کے ایک کا بن سطح سے دریافت کی گئی۔

یہ قصہ یحییٰ بن خرقہ اعلیٰ ماہن عساکر اور ابو نعیم میں سند اور سلسلہ روایت کے ساتھ مذکور ہے۔ ان سب کا مرکزی راوی مخزوم بن بانی ہے۔ جو اپنے باپ ہانی مخزومی سے جس کی عمر ڈیڑھ سو برس کی تھی نقل کرتا ہے۔ ہانی نام کا کوئی صحابی جو مخزومی تہذیبی ہوا اور جو ڈیڑھ سو برس کی عمر رکھتا ہو معلوم نہیں۔ (بلکہ اس نام کا جو مخزوم میں کوئی صحابی نہیں گزرا) اصحاب وغیرہ میں اسی روایت کے سلسلے میں ان کا نام مشکوک طور پر آیا ہے۔ ان کے صاحبزادے مخزوم بن بانی سے محدثین میں کوئی بھی شتا سا نہیں۔ نیچے کے راویوں کا بھی یہی حال ہے۔

میان تک کہ ابن عساکر جیسے ضعیف روایتوں کے سرپرست بھی اس روایت کو غریب کہیں کی جرات کرتے ہیں۔ اور ابن حجر جیسے کمزور روایتوں کے سہارا اور پشت پناہ بھی اس کو مرسل ماننے کو تیار ہیں۔ ابو نعیم کی روایت میں محمد بن جعفر بن اعین مشہور دضاع ہے۔ سیرت النبی ص ۴۳۲  
یہ روایت تو خیر سراسر داستان ہے لیکن ابن ہشام نے محمد بن اسماعیل سے نقل کیا ہے کہ یہ ایک خواب تھا جو آپ کی والدہ نے دیکھا تھا۔ اولیٰک حدیث سے خواب کی جانب اشارہ بھی ملتا ہے مگر چہ اس میں خواب بیان نہیں کیا گیا اس کے الفاظ ہیں۔

انادعاء ابی ابراہیم و بشارة  
انہ عینی و رؤیا امی۔  
میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا اپنے بھائی عینی کی شہادت اور اپنی ماں کا خواب ہوں۔

اگر اس خواب سے مراد یہی خواب ہے۔ تو خواب کا ہرگز مستقصو یہ نہیں ہوتا کہ اسی وقت تعبیر سامنے آجائے بلکہ بعض اوقات ایک عرصہ دراز کے بعد تعبیر سامنے آتی ہے۔ مثلاً حضور نے اپنی امت کے دو لشکروں کو سندھ میں جہاد کی غرض سے سفر کرتے دیکھا۔ پہلا بحری جہاد حضرت عثمان غنی کے زمانہ میں امیر معاویہ کی ماتحتی میں ہوا۔ اور دوسرا بحری جہاد امیر معاویہ کے دور میں یزید کی ماتحتی میں ہوا۔



سید سلیمان ندوی اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ روایت متعدد طریقوں سے مردی ہے۔ مگر ان میں کوئی طریقہ بھی ایسا نہیں جو ضعیف نہ ہو۔  
حاکم نے مستدرک میں لکھا ہے کہ آپ کا مخطون پیدا ہونا ستواتر روایتوں سے ثابت ہے۔ اس پر علامہ  
ذہبی نے تنقید کی ہے کہ تو اتر کجا صحیح طریقہ سے ثابت نہیں۔ (مستدرک ج ۲ باب اخبار البنی) اور بقول  
علامہ ابن القیم اگر یہ ثابت بھی ہو تو اس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی فضیلت نہیں کیونکہ ایسے  
بچے اکثر پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ سیرت البنی ص ۲۵/۲۶

ہم نے زاد المعاد کا مطالعہ کیا تو معلوم ہوا کہ علامہ ابن القیم نے ایک روایت یہ بھی نقل کی ہے کہ  
آپ کے دادا عبد المطلب نے ساتویں دن آپ کی فتنہ کرائی اور تمام اہل مکہ کی دعوت کی۔ جس پر قریش  
کے متعدد شعرا نے قہقہے کئے۔ پھر امام ابن القیم نے اس قصیدہ کے چند اشعار بھی نقل کئے ہیں۔  
امام ابن القیم نے اپنے زمانہ کے کئی افراد کے نام لکھ کر یہ بیان کیا ہے کہ یہ حضرات مخطون پیدا  
ہوئے تھے۔ اور یہ حضرات کی کوئی تخصیص نہیں۔

## برکات محمدی

یہ وہ سرخی ہے جو قاری احمد علی بھٹی نے اپنی کتاب تاریخ مسلمانان عالم کی جلد دوم میں جو تاریخ مصطفیٰ کے نام سے موسوم ہے، قلم کی ہے، اس سرخی کے تحت وہ تاریخی برکات اور معجزات بیان کئے گئے ہیں جو آپ کی ولادت کے باعث حلیمہ کے ساتھ راہ میں یان کے یہاں قیام کے دوران پیش آئے۔ ہم یہ تمام داستان قاری احمد علی بھٹی کی زبانی قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔ قاری صاحب تاریخ اسلام کے مصنف ہیں انہوں نے یہ کتاب تاریخی کتب کو پیش نظر رکھتے ہوئے لکھی ہے، انہوں نے جن واقعات کا ذکر کیا ہے۔ ہم نے انہیں خود متعدد کتابوں مثلاً ابن سعد، ابن اثیر، ابن ہشام، مدارج النبوت اور مواہب لدنیہ وغیرہ میں دیکھا ہے۔ اس لحاظ سے یہ بیان صرف قاری صاحب کا نہیں بلکہ ان تمام افراد کا طبع نظر ہے جن کا تعلق تاریخ سے ہے۔ اور ان علماء کا بھی جو ان کہانیوں کے ہم لڑائی ہیں اور جو اس امر کے خواہاں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح حضور کے معجزات اور کرامات میں اضافہ کیا جائے، بخود وہ واقعہ فرضی ہی کیوں نہ ہو، اور خواہ وہ کسی صورت میں ہمیں حاصل ہوا ہو۔ اس طرح وہ ملا بھی ان کہانیوں کا شکار ہیں جن کا فن خطابت ان ہی کہانیوں کا مہر ہونے مست ہے، ان کی ذات سے اگر ان کہانیوں کو جدا کر دیا جائے، تو ان کی روٹیاں کلنے کا دھند ختم ہو جائے۔ اور اگر مساجد بے رونق ہو جائیں۔

افرض قاری صاحب فرماتے ہیں، حلیمہ کا بیان ہے کہ جب میں سیدہ آمنہ کے گھر اس دور میں گئی تھی، تو آپ سو رہے تھے، ماں نے اشارے سے بتایا، میں قریب گئی، چہرہ مبارک کی تابانی دیکھی، تو جگانے کی ہمت نہ ہوئی، محبت سے پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ آپ نے آنکھیں کھول دیں، مجھے دیکھا اور مسکرائے، آنکھوں کا نور اور معصوم مسکراہٹ دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا، کہ اگرچہ یہ بچہ یتیم ہے، مگر اپنی عظمت و شرافت میں مکہ کے بچوں کا سردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کی برکتوں سے نہ صرف میری پریشانیاں دور ہوں گی، بلکہ بہت سے یتیم بچے اور نادار انسان فیض حاصل کر لیں گے (گویا اس وقت حالت کفر میں بھی حلیمہ صاحبہ الہامِ ولیدہ اور کشف کی مالک تھیں) مجھے ضبط نہ ہو سکا، فرط محبت سے جھکی، پیشانی کو چوما، اور گود میں اٹھایا، تھوڑی دیر سیدہ آمنہ کے پاس بیٹھی، پھر ان کی اعجازت سے موند مسودہ کو گود میں لے کر اپنے خیمہ میں آئی، شوہر نے جمالِ جہاں آرا کو دیکھا، اور کہا حلیمہ یہ تو اللہ

کی بڑی نعمت ہے، مجھے امید ہے کہ یہ بچہ ہمارے حق میں فرشتہ رحمت ثابت ہوگا (مواہب لدینہ، مدارج النبوت)  
 حلیمہ کہتی ہیں کہ میں نے سیدھی طرف سے آپ کو دودھ پلایا، آپ نے خوب سیر ہو کر پیا، اور پھر آرام سے  
 گہوارے میں سو گئے، اس کے بعد میں نے عبداللہ رضاعی بھائی کو پلایا، اس نے بھی خوب سیر ہو کر پیا، اور اسے  
 بھی نیند آگئی، قدم محمدی کی یہ پہلی برکت تھی، کہ میرے سوکھے ہوئے سینے میں دودھ کی فراوانی ہو گئی۔ وہ عبداللہ  
 جو بھوک سے بلکارتا تھا۔ آج آرام سے سو رہا ہے۔ صرف یہی نہیں۔ بلکہ اب ہماری اونٹنی کے نقص بھی دودھ  
 سے بھر گئے تھے، ہم دو آدمیوں نے خوب پیٹ بھر کر پیا۔ اور پھر بھی برتن میں دودھ بچ رہا۔ اس دور قحط سال  
 میں یہ پہلی رات تھی کہ ہم کھالی کرا سودہ ہوتے، اور عین کی نیند سوتے۔

جناب حلیمہ کہتی ہیں کہ صبح کو کم لے سیدہ آمنہ اور عبدالطلب کو رخصتی سلام کیا، تو زعفر کو گود میں لے کر اس خیف  
 ولاغر سواری پر بیٹھے، مگر اب حالت ہی بدل چکی تھی، جس دراز گوش اونٹنی سے قدم اٹھاتے نہیں جانتے تھے۔  
 اور جو اتنے وقت قافلہ سے پیچھے رہی تھی۔ اور آخر میں مکہ پہنچی تھی۔ اب اس کی رفتار اتنی تیز تھی کہ قافلہ سے آگے چل  
 رہی تھی۔ ساتھ حیران تھے کہ حلیمہ کی سواری کے جانوروں میں یہ توانائی اور قوت کہاں سے اتنی جلدی آگئی (کیا  
 حلیمہ متعدد سواریوں پر سوار ہو کر آئی تھیں۔ اور جب اتنے جانوران کے پاس موجود تھے تو وہ غریب اور ناتواست  
 کیسے ہوتیں)، وہ نہیں جانتی تھی کہ راکب براق حلیمہ کی گود میں رونق افزہ ہیں۔ یہ تمام برکتیں اُسی درتیم کی ذات سے  
 وابستہ ہیں، جن کو قبیلے کی تمام عورتوں نے متم خیال کر کے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ (ابن بشام، روض الانف)  
 حلیمہ کہتی ہیں کہ آپ کی برکتیں صرف مکہ میں یا راستہ تک محدود نہیں رہیں، بلکہ جب ہم اپنے گاؤں میں پہنچے  
 تو وہاں بھی برکات محمدی کے بے شمار نظارے آنکھوں کے سامنے آتے رہے، وہ جنگل جو قحط زدہ ہو رہا تھا۔  
 جہاں کی گھاس خشک ہو چکی تھی، اب اس سرسبز و شاداب ہونے لگا، بکریاں جو بھوک سے بے حال ہو چکی تھیں،  
 پیٹ بھر کر جنگل سے شام کو گھر واپس آنے لگیں، قبیلے کے لوگوں نے اپنے بچوں اور چرواہے سے کہا کہ تم بھی  
 اسی جنگل میں بکریاں چرایا کرو، جہاں حلیمہ کی بکریاں چرا کرتی ہیں۔ (ابن سعد)

حلیمہ کا بیان ہے کہ آپ گہوارہ میں بھی عدل و انصاف پر اس درجہ عمل پیرا تھے کہ  
 عدل و انصاف: میں آپ کو کبھی دوسری سمت سے دودھ پلانا چاہتی تھی تو آپ نہ پیتے تھے، اس

کی وجہ صرف ایک ہی ہو سکتی تھی کہ آپ اپنے رضاعی بھائی عبد اللہ کے حق کا لحاظ رکھتے تھے ماسی طرح مزاج میں شروع ہی سے اس قدر نفاست اور شرم تھی کہ آپ نے کبھی کپڑوں میں پیشاب پاخانہ نہیں فرمایا اگر حاجت ہوتی تو روتے تھے جب میں کپڑا اوڑھنا دیا کرتی تھی تو خاموش ہو جاتے تھے۔ حلیمہ بھی کہتی ہیں کہ اگر میں کسی کام میں مصروف ہوتی تھی تو عیسائیسوس ہوتا تھا کہ کوئی آپ کو پہلا رہا ہے اور آپ اطمینان سے لیٹے ہوئے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ قدرت نے آپ کی فطرت میں شرم و حیا اور عدل و انصاف کو ودیعت فرمایا تھا۔

دوہینے کی عمر میں آپ بیٹھنے لگے تھے۔ اور پانچ مہینے کی عمر میں بیروں چلنے لگے تھے۔ اور سات بولنا اور چلنا۔ ماد کی عمر میں تیز چلتے تھے۔ آٹھ مہینے کی عمر میں موٹی تو آپ اچھی طرح بولنے لگے تھے آپ کا پہلا کلام لا الہ الا اللہ تھا۔

آپ کبھی بچوں کے ساتھ نہیں کھیلے، بلکہ رضاعی بھائی کو کھیلتے ہوئے دیکھتے تو ان کو منع فرماتے تھے بعض تاریخوں میں بچوں کے ساتھ کھیلنے کا ذکر پایا جاتا ہے مگر شاہ عبد الحق محدث دہلوی نے اسے غلط قرار دیا ہے آپ کی ذات فیض و برکت کا ایسا منبع تھی کہ جو بیمار بچے پاس آکر بیٹھ جاتے تھے تندرست ہو جاتے تھے بیمار بکریوں پر اگر آپ ہاتھ پھیرتے تھے تو شفا مل جاتی تھی۔ حلیمہ کہتی ہیں آپ دیکھتے تھے تو مرے اور ایک قسم کی سیبت طاری ہو جاتی تھی۔ اور یہ کیفیت مجھ پر اس درجہ غالب تھی کہ میں آپ کی موجودگی میں کبھی اپنے شوہر سے بھی ملاقات نہ کر سکتی۔

سرکارِ عالم جب پورے دو سال کے ہوئے تو حلیمہ نے آپ کا دودھ چھڑا دیا آپ نے اس وقت والہی مکہ: زبان مبارک سے یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ اللہ اکبر کیسے راہ الحمد للہ کثیرا و سبحان اللہ بکثرتا و اصیلا۔

سہتی نے حضرت عباسؓ سے روایت کی ہے کہ آپ کا پہلا کلام یہ تھا (حیرت ہے کہ حضرت عباسؓ اپنی والدہ کا دودھ چھوڑ کر دو سال کی عمر میں یہ تماشا دیکھنے کے لئے قبیلہ بنی سعد پہنچ گئے، یعنی اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنے کے سلسلہ میں یہ پہلا کلام تھا، ورنہ بولنے کی ابتدا تو لا الہ الا اللہ سے ہوتی تھی۔ حلیمہ کہتی ہیں جب آپ دو سال کے تھے تو اچھے خاصے بڑے علوم ہوتے تھے۔ میرا دل نہیں چاہتا تھا کہ آپ کو اپنے



گھر سے جدا کیا جاتے۔ اور ماں کو واپس کیا جاتے۔ مگر دستور کے مطابق مجھے دودھ چھڑانے کے بعد آپ کو مکہ لے جانا پڑا۔ تاکہ میں آپ کو آپ کی والدہ کے سپرد کر دوں، مگر اتفاق سے جب مکہ پہنچی تو وہاں طاعون کی وبا پھیلی ہوئی تھی۔ لوگ پریشان تھے۔ مجھے آپ کو واپس لانے کے لئے ایک اچھا موقعہ ہاتھ آگیا۔ چنانچہ میں نے آپ کے دادا اور والدہ سے کہا کہ مکہ میں طاعون کی وبا کے زمانہ میں آپ کا رہنا مناسب معلوم نہیں ہوتا، اگر آپ کہیں تو میں اپنے ہمراہ واپس سے جاؤں، اللہ کی عنایت کہ میرا مشورہ قبول ہوا۔ سب راضی ہو گئے۔ اور میں آپ کو اپنے ساتھ واپس لے آئی۔ مال کا دلی نہیں چاہتا تھا کہ اب بچہ کو علیحدہ رکھا جاتے۔ مگر حلیمہ کے اصرار اور وبا کے زور نے واپس کرنا ہی مناسب سمجھا۔ آپ جا لے گئے تو ماں نے پیار کیا۔ اور فرمایا: "میتھوڑے دلی کے لئے ابھی اپنی مشفقہ دانی حلیمہ کے پاس اور رہو، پھر ہم ملا لیں گے۔" آنحضرت نے محبت سے ماں کو دیکھا، اور دباؤ قبیلہ بنی سعد میں واپس آگئے۔ تاریخ مسلمانان عالم ص ۸۶

یہ وہ داستان ہے جو تاریخ و سیر کی عام کتابوں میں کہیں تفصیلاً اور کہیں اجمالاً مذکور ہے۔ حتیٰ کہ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی مدارج النبوت میں معارج النبوت کے حوالے سے اس داستان کو نقل کر کے اپنی نظر میں بہت بڑا تاریخی اور مذہبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ شکر ہے کہ علامہ شبلی نے اپنی سیرت النبیؐ کو اس قسم کی لغویات سے محفوظ رکھا، لیکن افسوس یہ ہے کہ انہوں نے ان روایات پر کوئی کلام بھی نہیں کیا۔

علامہ شبلی کے شاگرد رشید جناب سید سلیمان ندوی مرحوم جو مؤرخ، ہونے کے ساتھ ساتھ محدث، محقق اور ماہر رجال بھی تھے، انہوں نے سیرت النبیؐ کی جلد سوئم میں ان تمام داستانوں پر عقائد بحث فرمائی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے تحقیق لائق ادا کر دیا۔ اس لئے ہم بہتر یہ سمجھتے ہیں کہ بجائے اس کے خود ہم اس داستان پر کوئی کلام کریں، کیوں نہ سید صاحب مرحوم کی تحقیق تاریخی کے سامنے پیش کر دیں۔ سید صاحب تحریر فرماتے ہیں:-

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رضاعت اور شیر خوارگی کے زمانہ کے فضائل اور معجزات جب آپ کو حلیمہ سعدیہ اپنے گھر لے جاتی ہیں، ماہن اسحاق، ابن رابوہ، ابوہامی، ہزالی، یحییٰ، ابو نعیم، ابن عساکر اور ابن سعد میں یہ تفصیل مذکور ہے۔

حلیمہ سعدیہ کا آنا، آپ کا ان کو دیکھ کر مسکرنا، حلیمہ کے خشک سینوں میں دودھ بھرا نا، آپ کا صرف ایک طرف کے سینہ سے سیر ہو جانا، اور دوسری طرف کا اپنے رضاعی بھائی کے لئے نظر انصاف چھوڑ دینا، آپ کے سوار ہوتے ہی حلیمہ کی گزند اور دہلی تپ کی گدھی کا تیز رو، طاقت ور اور نرم ہو جانا، اور حلیمہ کے قبیلہ کی قحط زدہ زمین کا سرسبز و شاداب اور ہر اچھا ہو جانا۔ حلیمہ کی بکریوں کا موٹا ہونا اور سب سے زیادہ دودھ دینا۔ آپ کا غیر معمولی نشوونما پانا۔ دو برس کی عمر میں آپ کا سینہ چاک ہونا، حلیمہ کا اس واقعہ سے ڈر کر آپ کو آمنہ کے پاس واپس لانا۔ اور آمنہ کا حلیمہ کو تسلی دینا۔ یہ تمام واقعات ان کتابوں میں بہ تفصیل مذکور ہیں۔

لیکن یہ تمام واقعات دو طریقوں سے مروی ہیں۔ ایک طریقہ کا مشترک راوی جم بن ابی جم ایک مجہول شخص ہے۔ اور دوسرے کا مشترک راوی واقفی ہے۔ جس کا کوئی اعتبار نہیں۔

پہلے طریقہ سے اس کو ابن اسحاق، ابن راہویہ، البیہقی، طبرانی اور ابو نعیم نے روایت کیا ہے۔ اس کا سلسلہ سند یہ ہے کہ ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے جم بن ابی جم مولیٰ حارث بن عاصب حمی نے بیان کیا۔ اور وہ کہتا ہے کہ مجھ سے عبداللہ بن جعفر بن ابی طالب نے خود بیان کیا یا کسی ایسے شخص نے بیان کیا۔ جس نے عبداللہ بن جعفر سے سنا۔ اور عبداللہ بن جعفر نے حلیمہ سعدیہ سے سنا۔

اس روایت میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ جم اس روایت کا خود عبداللہ بن جعفر سے سنا، یقینی نہیں بتاتا۔ بلکہ وہ کہتا ہے کہ عبداللہ بن جعفر یا کسی نے اُن سے سن کر کہا۔ معلوم نہیں وہ کون تھا، اور کیسا شخص تھا، البتہ وہ غیر متاخرین نے اس روایت کو اس طرح بیان کیا ہے کہ یہ شک سرے سے نظر انداز ہو گیا ہے۔ (یا عدا گرا دیا گیا ہے) اگر بالفرض جم نے عبداللہ بن جعفر سے سنا تو عبداللہ بن جعفر جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آٹھ نو برس کے تھے، اور مکہ میں ملک حبش سے مدینہ آئے تھے۔ ان کا حلیمہ سے ملنا، اور ان سے نقل روایت کرنا محتاج ثبوت ہے۔

بلکہ علمائے سیر و رجال میں خود حلیمہ کے اسلام یا نبوت کے بعد آپ سے ملاقات میں اختلاف ہے۔ صرف ایک دفعہ غزوہ ہوازن کے موقع پر ان کا آنا کسی کسی نے بیان کیا ہے۔ (حالانکہ صحیح یہ ہے کہ وہ حلیمہ کی بیٹی شیماء اور ان کا خاندان حالت کفر میں گرفتار ہو کر آیا تھا۔ کیونکہ جنگ نبی ہوازن حلیمہ کے خاندان ہی سے

ہوئی تھی) مگر اس موقع پر عبداللہ بن جعفرؓ کا جو کس تھے۔ موجود ہونا اور ان سے نقل روایت کرنا محتاج ثبوت ہے۔ (بلکہ فتح مکہ اور اس کے بعد کے غزوات میں کوئی پچہ آپ کے ہمراہ نہ تھا)

جہم بن ابی جہم جو اس روایت کا سرنیاو ہے۔ ذہبی نے میزان الاعتدال میں اسی روایت کی تقریب سے اس کا نام لکھ کر لکھا ہے لایعرف۔ یعنی معلوم نہیں یہ کون شخص تھا؟

دوسرا طریقہ وہ ہے جس کا کرتی راوی واقدی ہے، اس سلسلہ سے ابن سعد البو نعیم اور ابن عساکر نے اس واقعہ کو لکھا ہے۔ یہ سلسلہ علاوہ ازیں کہ واقدی کے سلسلہ سے موقوف ہے۔ یعنی یہ سلسلہ کسی صحابی تک نہیں پہنچتا۔ اس کو واقدی ذکر یا بن یحییٰ بن یزید سعدی سے اور وہ اپنے باپ یحییٰ بن یزید سعدی سے نقل کرتا ہے۔ ابن سعد نے دوسری جگہ پر ایک اور سلسلہ سے اس کو واقدی سے روایت کیا ہے۔ اور واقدی عبداللہ بن زید بن اسلم سے، اور عبداللہ اپنے باپ زید بن اسلم تابعی سے نقل کرتا ہے۔ یہ سلسلہ بھی علاوہ ازیں کہ اس کا پہلا راوی واقدی ہے۔ اور روایت بھی موقوف ہے۔ زید مذکور کی نسبت اہل مدینہ کلام کرتے تھے، اور ان کے بیٹے عبداللہ کو اکثر محدثین نے ضعیف کہا ہے۔ اس لئے یہ سلسلہ بھی استناد کے قابل نہیں۔ ابو نعیم نے تیسری روایت میں واقدی کے سلسلہ سے ان واقعات کو بے سند لکھا ہے۔ سیرت النبی ص ۵۵

ہمارے نزدیک پہلے سلسلہ کی بنیادیں دو ہیں۔ ایک جہم بن ابی جہم۔ اور دوسرا محمد بن اسحاق۔ حافظ ابن حجر لسان میزان میں لکھتے ہیں۔

جہم بن ابی جہم عبداللہ بن جعفر سے روایت کرتا ہے۔ اور اس سے محمد بن اسحاق۔ اسے کوئی نہیں جانتا۔ اس نے علیمہ سعدیہ والا قصہ بیان کیا ہے۔ لسان میزان ص ۱۴۲

تقریباً ہی الفاظ حافظ ہی نے میزان الاعتدال ص ۲۱۶ پر ذکر کئے ہیں۔

گویا یہ روایت دراصل جہم پر موقوف ہے۔ اور جہم کو کوئی نہیں جانتا کہ کون ہے اور اس سے محمد بن اسحاق علاوہ کوئی روایت بھی نہیں کرتا۔ اور محمد بن اسحاق نے بھی اس سے صرف یہی داستان کی نقل ہے۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ محمد بن اسحاق نے صرف اسی داستان سرائی کے لئے جہم بن ابی جہم کو فرضی سرور بنا کر پیش کیا ہے۔ ورنہ جہم کی نہ کوئی حقیقت ہے اور نہ کوئی وجود ہے۔ اس طرح اس روایت میں چار غریب پیدا ہو گئے۔

۱۔ عبداللہ بن جعفر نے علم سے کوئی روایت نہیں سنی۔

۲۔ خود جہم نے عبداللہ سے کوئی روایت نہیں سنی۔

۳۔ جہم سے کوئی شخص واقف نہیں۔

۴۔ علم کا سلام لانا خود شکوک ہے۔ کیا کہ عبداللہ بن جعفر کا من سے حدیث سننا۔

بارے نزدیک اس روایت میں یا نچواں عیب محمد بن اسحاق کی ذات ہے۔ لہذا اس پر کلام کرنا اور اس کی شخصیت کو ظاہر کرنا بھی ضروری ہے۔

**مورخ محمد بن اسحاق:** یہ رئیس التورخین تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور تادمخ پر سب سے اول اسی نے کتاب لکھی جو البخاری کے نام سے مشہور ہوئی۔ تورخین کے نزدیک اس کا قول حسن و آخر کا درجہ رکھتا ہے۔ کتب احادیث میں بھی اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ اسی نے محدثین اور ماہر رجال نے اس پر خوب کلام کیا ہے۔ اور اس کی ذات کے بارے میں تین آراء ہیں۔

۱۔ یہ ثقہ اور قابل قبول ہے۔ لیکن جب یہ کسی روایت کو تنہا نقل کرے تو ناقابل قبول ہے۔ جیسا کہ یہ روایت۔

۲۔ تادمخ میں قابل قبول ہے۔ لیکن حدیث میں قابل قبول نہیں۔

۳۔ ہر صورت میں ناقابل قبول ہے۔

امام ذہبی نے میزان الاعتدال میں تینوں طبقوں کی آراء جمع کر دی ہیں۔ ہم انہیں قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ ان میں سے کس کی رائے بہتر ہے۔ اور کس کے قول میں دخل ہے۔ امام ذہبی لکھتے ہیں۔

محمد بن اسحاق کے دادا کا نام یسار ہے۔ اس کی کنیت ابو بکر ہے۔ اس کا دادا یسار عین امترک جنگ میں قید ہو کر آیا تھا۔ اور قیس بن خضر بن عبد المطلب بن عبد مناف کی غلامی میں دیا گیا تھا۔ چونکہ محمد بن اسحاق اور اس کے باپ دادا کے مالک مدینہ میں رہتے تھے۔ اس لئے یہ مدنی کہلاتا تھا۔ اس نے صحابہ میں سے حضرت انس الترنیؓ کو دیکھا ہے۔

یہ سعید بن ابی بندہ سعید القبری، عطار، اعرج، نافع اور ملان کے ہم عصر لوگوں سے روایات نقل کرتا ہے۔

اس سے روایات و احادیث نقل کرنے والے حماد بن زید، حماد بن سلمہ، ابراہیم بن سعد، یزید بن ہارون، سلیمان بن اوزید، یزید بن ابی ریحان وغیرہ ہیں۔ کچھ لوگوں نے اسے ثقہ قرار دیا ہے۔ اور کچھ نے اسے رذی اور دابی کہا ہے۔ نبی فرماتے ہیں۔ اس کی حدیث اچھی ہوتی ہے میرے نزدیک اس کی حدیث میں کوئی عیب نہیں۔۔۔۔۔ مگر سیرت میں منکر اور منقطع روایات اور جھوٹے اشعار نقل کرتا ہے۔

خدا ش کا بیان ہے کہ میں نے امام الرجال رحمی بن سعید القفطان کو کہتے سنا ہے کہ انہوں نے عبد اللہ بن القوارب سے دریافت کیا۔ کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے جواب دیا وہب بن جریر کے پاس تاکہ ان سے سن کر سیرت انہوں۔ امام رحمی نے فرمایا۔ پھر تو توبہ پناہ جھوٹ لکھے گا۔ (یعنی سیرت جھوٹ سے پاک نہیں ہو سکتی۔ یا اس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہب بن جریر نے جو منکر سیرت کی روایات محمد بن اسحاق سے نقل کی ہیں۔ لہذا امام رحمی ان تمام روایات کو جھوٹا قرار دے رہے ہیں)

امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں ابن اسحاق کی حدیث اچھی ہے۔ لیکن یحییٰ بن سعیدؒ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ ثقہ ہے لیکن اس کی حدیث اچھی نہیں۔ علی بن الدین کا بیان ہے۔ میرے نزدیک اس کی حدیث صحیح ہے۔ اور مجھے تو دو احادیث کے علاوہ کوئی منکر نظر نہیں آئی۔

امام نسائی فرماتے ہیں یہ قوی نہیں۔ دارقطنی کہنے لیں اس کی حدیث حجت نہیں ہے۔ شعبہ نے ایک بار فرمایا کہ یہ سچا ہے۔ اور دوسری بار فرمایا کہ یہ حدیث میں مسلمانوں کا ایر ہے۔ محمد بن عبد اللہ بن فیر کا بیان ہے اس پر قعدی ہونے کا الزام ہے۔ اسی نے لوگ اس سے دور بھاگتے تھے۔ امام ابو داؤد فرماتے ہیں یہ قدری بھی اور معزلی بھی ہے۔

فرقہ قدریہ تقدیر الہی کا منکر تھا اور وہ کہتا تھا کہ ہر شے انسان کے قبضہ میں ہے۔ اور معزلی فرقہ صفات باری، معجزات، اور بشرتوں وغیرہ کا منکر تھا۔ گویا ابن اسحاق قدری بھی ہے اور صفات باری کا منکر بھی کیونکہ نسائی بھی بخوشی تھا۔

امام سلیمان رحمی فرماتے ہیں کہ ابیہ۔ وہب بن جریر کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن عمرو سے سنا۔ وہ اسے کہتا ہے کہ میں نے اس کے بارے میں امام مالک سے دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ قوی ہے۔

عبدالرحمن بن ہمدی کا بیان ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان اور امام مالک دونوں بن اسحاق کو مجروح قرار دیتے تھے۔  
ابن اودیس کا بیان ہے کہ میں ایک روز امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا۔ کسی نے اُن سے کہا کہ ابن اسحاق کہتا ہے کہ مالک کا علم میرے سامنے پیش کیا کرو، میں ان کے علم کی کسوٹی ہوں۔ امام مالک نے فرمایا۔ اے لوگو دو جالوں میں سے اس دجال کو دیکھو کہ کیا کہتا ہے۔

امام سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں میں نے مسجد خیف میں ابن اسحاق کو دیکھا تھا۔ مجھے تو اس کے پاس جاتے بھی ڈر محسوس ہوا کہ میں لوگ مجھے بھی قدری نہ کہنے لگیں۔ حماد بن سلمہ کا بیان ہے کہ میں ابن اسحاق کی روایات بحالت مجبوری لیتا ہوں۔

امام یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں کہ کسی نے ابن اسحاق سے دریافت کیا کہ شرح جلیل بن سہم کی حدیث کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ کہنے لگا کہ اس سے تو صرف ایک شخص روایت کرتا ہے۔ یہ شرح جلیل حضرت سہم بن عبادہ صحابی کے بیٹے تھے، امام یحییٰ فرماتے ہیں اس ابن اسحاق پر حیرت ہے کہ شرح جلیل کی حدیث تو قبول نہیں کرتا۔ اور اہل کتاب کی روایت قبول کرتا ہے۔

ابن ابی ذئب کا بیان ہے کہ میں نے خود اسے بودیل سے روایات لکھتے دیکھا ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ بہت زیادہ تدلیس کے کام لیتا ہے (یعنی درمیان سے راوی گرا دیتا ہے)۔

ابن عدی لکھتے ہیں کہ یہ سرغے اڑایا کرتا تھا۔ امام یحییٰ بن سعید القطان کہتے ہیں میں گراہی دیتا ہوں کہ محمد بن اسحاق کذاب ہے۔

ابو عمرو الشیبانی کا بیان ہے کہ میں نے ابن اسحاق کو دیکھا ہے کہ وہ احادیث و روایات لکھ کر شمر اس کے پاس لیجا یا کرتا۔ اور ان سے کہتا کہ ان مضامین پر اشعار لکھ دو۔ پھر ان اشعار کو صحابہ کی جانب منسوب کر دیتا۔ یہی ابو بکر الخطیب نے اپنی تاریخ بغداد میں لکھا ہے۔

ابوداؤد طیالسی کا بیان ہے کہ ایک مدنی ابن اسحاق نے کہا کہ مجھ سے ایک ثقہ راوی نے روایت کیا ہے جو مجھٹ ایک شخص نے سوال کیا۔ اس کا نام کیا ہے؟ جواب دیا یعقوب بودی۔ یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ میں نے یحییٰ بن معین سے ابن اسحاق کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا کچھ نہیں ہے۔

دراوردی کا بیان ہے کہ ہم ابن اسحاق کی مجلس میں اس سے علم حاصل کر رہے تھے۔ اچانک وہ اٹھ گئے  
 لگا۔ جب نیند دور ہوئی تو کہنے لگا کہ میں نے ابھی خواب دیکھا ہے کہ ایک انسان مسجد میں داخل ہوا۔ اس کے پاس  
 ایک رسی ہے۔ اس نے وہ رسی ایک گھمے کے گلے میں ڈالی جو مسجد میں گھس آیا تھا۔ پھر اسے گھسیٹ کر باہر لے  
 گیا۔ ابھی کچھ وقفہ نہ تھا کہ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اس کے پاس ایک رسی تھی اس نے وہ رسی ابن اسحاق  
 کے گلے میں ڈالی۔ اور باہر گھسیٹا ہوا لے گیا۔ راوی کے سامنے پیش کیا۔ اور قدری ہونے کے باعث اس کے کونے  
 نکلے گئے۔

حمید بن حبیب کا بیان ہے کہ ابراہیم بن ہشام الاہیری نے اس کے کونے نکلے تھے۔ اور میں اس وقت ہاں  
 موجود تھا۔

مکی بن ابراہیم کا بیان ہے کہ ابن اسحاق صفات الہی کے بارے میں بہت سیودہ قسم کی روایات بیان کرتا  
 ہے۔ میں اس کے پاس ایک بار گیا تھا۔ لیکن اس نے جب اس قسم کی روایات بیان کیں تو میں اٹھ کر چلا آیا اور پھر کبھی نہیں  
 گیا۔ آیتے ہم ان میں سے ایک اپنے قارئین کو بھی سنا دیں۔ کیونکہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ بال قارئین سے یہ ضرور غلط  
 کریں گے کہ روایت پڑھنے کے بعد استغفار ضرور فرمائیں۔

کتاب ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس کسی کو بھیجا کہ کیا محمد صلی اللہ علیہ وسلم  
 نے اپنے رب کو دیکھا تھا۔ انہوں نے جواب دیا ہاں۔ اللہ تعالیٰ ایک کرسی پر بیٹھا تھا جو سونے کی بنی ہوئی تھی۔ جسے  
 چار فرشتے اٹھائے ہوئے تھے ایک فرشتہ انسانی صورت کا تھا۔ ایک شیر کی صورت کا، ایک بیل کی اور ایک گدھ  
 کی۔ اللہ تعالیٰ سبز رنگ کے خمیر میں بیٹھا تھا۔ اس کے ارد گرد سونے کی مڈیاں تھیں اللہم انی اعوذ بک من  
 هذا بلعکن العظیم۔

اس کا انتقال ۱۵۸ھ میں ہوا۔ میزان الاحتمال ج ۳ ص ۴۶۸ تا ۴۷۵

اب قارئین خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ اس روایت کا کیا حال ہوگا۔ اور یہ بھی سوچ لیں کہ جو شخص اسلام لے کر آیا  
 کے باوجود وقفہ زیادہ صفات الہی کا منکر ہو، اور اللہ کو مجسم قرار دیتا ہو۔ اس کا ایمان کس قسم کا ہوگا۔  
 اس کہانی کو وادی نے بھی نقل کیا ہے۔ جیسا کہ سید صاحب نے سطور بالا میں اس کا ذکر فرمایا۔ اور یہاں





اسحاق بن الطباع کا بیان ہے کہ میں نے مکہ کے راستہ میں واقدی کو دیکھا ہے۔ یہ تو نماز بھی بُری طرح ادا کیا کرتا تھا۔ اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں۔ میرے نزدیک تو یہ احادیث وضع کرتا ہے۔ امام ذہبی فرماتے ہیں اس کے ضعف پر اجماع ہے۔ میزان الاعتدال ص ۳۴۲

سید مہدی علی خاں جو پہلے ایک شیخ کٹر مجتہد تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں مشرف بایمان کیا۔ ایمان لانے کے بعد انہوں نے روایت میں آیاتِ نبیات تحریر فرمائی۔ جس کا آج تک یہ مجوسی برادری جواب نہ دے سکا۔ وہ شیعوں کی کتاب منہی المقال فی اسماء الرجال سے ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ البوسحاق المدنی کے حال میں نقل کرتے ہیں۔

ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ البوسحاق المدنی ابو جعفر وغیرہ سے روایت کرتا ہے۔ یہ ہمارا مخصوص آدمی ہے۔ اسی لئے عام لوگ (یعنی اہل سنت) اس کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ اور ہمارے بعض ساتھیوں نے مخالفین سے یہ بات نقل کی ہے کہ واقدی کی تمام کتابیں اسی ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ کی کتابیں ہیں۔ جنہیں واقدی نے نقل کر کے اپنے مصنف ہونے کا دجوی کر دیا۔ منہی المقال ص ۲۵

شیخ اپنی قبرستان میں لکھتے ہیں کہ واقدی نے ابراہیم کی کتابیں نقل کر کے اپنی جانب منسوب کیں۔ اسی باعث عام لوگ اس ابراہیم کو ضعیف کہتے ہیں اسی لئے میزان الاعتدال کا مصنف لکھتا ہے کہ یہ ابراہیم کذاب ہے رافضی ہے۔ آیاتِ نبیات ص ۲۱۹

یعنی واقدی جو کچھ بھی بیان کرتا ہے اور لکھتا ہے۔ ان کا عوام الناس (اہل سنت) سے کوئی تعلق نہیں وہ تو درپردہ مخصوص آدمی ہے جو بطور ترقیہ سنیت اختیار کئے ہوئے تھا۔ اور علمِ سینہ بسینہ یعنی آئمہ کا علمِ سینوں میں پھیلا رہا تھا۔ اسی لئے مہدی علی خاں ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

واقدی ان بزرگوار مصنفوں میں ہیں کہ ان کی کتابیں نہ صرف ضعیف روایتوں بلکہ موضوع اور غلط اور جھوٹی خبروں سے بھری ہوئی ہیں۔ اور ان کے غیر معتبر ہونے پر اکثر محققین اور علماء کا اتفاق ہے۔ آیاتِ نبیات ص ۲۵

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اول تو واقدی خود ناقابلِ اعتبار اور جھوٹا ہے۔ ثانیاً اس کی حیثیت تو صرف ایک مہرہ کی ہے اس نے جو کچھ بھی لکھا ہے۔ وہ اس کا تحریر کردہ نہیں بلکہ اس نے سب کچھ ابراہیم بن محمد بن ابی یحییٰ

سے نقل کیا ہے۔ لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس ابراہیم کی تصویر بھی قارئین کو دکھادی جائے۔ کیونکہ اصل دُور اس کے قبضہ میں ہے۔

اس کی روایت بھی ابن ماجہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کے دادا کا نام سحان اور ابو محی کثیت ابراہیم بن محمد ہے۔ ۱۸۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔

امام محی بن سعید القفطان فرماتے ہیں کہ میں نے امام مالک سے دریافت کیا۔ کیا یہ ابراہیم حدیث میں ثقہ ہے۔ فرمایا نہیں۔ بلکہ یہ تو دین میں بھی ثقہ نہیں۔ خود امام محی بن سعید القفطان کا قول یہ ہے کہ یہ کذاب ہے۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں۔ محدثین نے اس کی روایت ترک کر دی ہے۔ یہ قدسی ہے۔ معتزلی ہے۔ ایسی روایات بیان کرتا ہے جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا امام بخاری فرماتے۔ ابن البارک اور دیگر لوگوں نے اس کی روایت ترک کر دی ہے۔ یہ قدسی تھا، جہمی تھا۔

عبداللہ بن احمد کا بیان ہے کہ میرے والد امام احمد فرمایا کرتے تھے۔ یہ قدسی جہمی ہے۔ ہر قسم کی بلا اس میں پائی جاتی ہے۔ محدثین نے اس کی حدیث ترک کر دی ہے۔ محی بن معین کا قول ہے کہ یہ ابراہیم کذاب ہے۔ رافضی ہے۔ علی بن المدنی کہتے ہیں یہ قدسی تھا کذاب ہے۔

نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں۔ متروک ہے۔ سعید بن ابی مریم کہتے ہیں اس کا دعویٰ تھا کہ میں نے عطا سے سات ہزار مسالے سنے ہیں۔ اس نے ایک موطا بھی تعینف کی تھی جو امام مالک کی موطا سے کئی گنا بڑی تھی۔ حلال و حرام پر بھی اس کی ایک کتاب تھی۔

ابن حبان کہتے ہیں یہ قدسی تھا۔ اور جہمی تھا۔ اور حدیث میں جھوٹ بولتا تھا امام شافعی بچپن میں اس کے پاس جا کر بیٹھا کرتے تھے۔ اس نے بہت سی باتیں سنیں کہ امام شافعی کے ذہن میں بیٹھ گئی تھیں۔ جب آخر عمر میں امام شافعی مصر پہنچے اور اپنی مسبوط کتاب (کتاب الامام) کی تعینف شروع کی تو متعدد احادیث اور تاریخی واقعات کی انہیں فرودت پیش آئی اور ان کے پاس اس وقت کتابیں نہ تھیں۔ لہذا اپنے حافظہ سے کام لیتے ہوئے انہیں جو کچھ یاد تھا۔ تحریر کیا۔ اسی باعث ان کی کتاب میں اس ابراہیم کی روایات پائی جاتی ہیں۔ کبھی دوسرے کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی نام لے

ابراہیم بن سعد الدہلی کا بیان ہے کہ جب ہم حدیث کی تلاش میں مختلف علماء کے پاس جایا کرتے تھے تو اس زمانہ میں ہم اس ابراہیم کو خرافہ کہہ کر یا دیکھا کرتے تھے۔

بجلی الاسدی کہتے ہیں کہ اس ابراہیم نے ایک روز ایک مسافر کے سامنے تیس احادیث بیان کیں جو اس کے نظریہ میں بہت عمدہ تھیں۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ سننے والا کچھ خوش نہیں ہوا۔ تو کہنے لگا۔ اگر تو اس گدھے کے پاس جاتا اور وہ تجھ سے صرف تین احادیث بھی بیان کر دیتا تو خوش ہو جاتا۔ گدھے سے اس کی مراد امام مالک بن انس تھے۔

یزید بن ہارون کہتے ہیں۔ یہ ابراہیم کذاب ہے۔ نعیم بن حماد کا بیان ہے کہ میں نے اس کی کتابیں پانچ دینار میں حاصل کی تھیں۔ ایک روز اس نے مجھے ایک کتاب نکال کر دکھائی جس میں قدریہ کے مسائل تھے، پھر دوسری کتاب دکھائی اس میں جمہیہ کے خیالات کا تذکرہ تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا کہ کیا تمہاری اپنی رائے بھی یہی ہے؟ اس نے اقرار کیا۔ میں نے اس کی کتابیں دی ہیں پھاڑ کر بھینک دیں۔ <sup>۵۶</sup> یزید بن ہارون ان تمام تفصیلات سے قارئین کو یہ بھی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اس شخص میں فرقہ مقبرلہ، فرقہ جمہیہ، فرقہ قدریہ اور دیگر فرقے جو عالم وجود میں آئے۔ ان کے درپردہ شیعہ اور جو کسی ذہن کا فرما تھا۔ اور اصل مقصود اسلام کو باطل قرار دینا اور اس کی اصل صودت کو مٹانا تھا۔ تاکہ مسلمان اپنی مسائل میں الجھ کر ایک دوسرے سے دست و گریباں ہو جائیں۔ اور اسلام کی شان و شوکت ختم ہو کر رہ جائے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ وہ اپنی اس فریب کاری میں کامیاب رہے۔ لیکن آج بھی وہ خواہ کیسا ہی رنگ اختیار کریں۔ بہتے وہ شیعہ ہی ہیں۔

بات چل رہی تھی طبر کے گھر کے قصہ کی کہ اس کہانی کو واقدی نے بھی روایت کیا ہے۔ وہ اس کہانی کو عبد اللہ بن زید بن اسلم سے روایت کر لکھے۔ امام بخاری بن معین، ابو زرعہ، ہامی اور نسائی کہتے ہیں یہ ضعیف ہے۔ دراصل زید بن اسلم کے عین بیٹے ہیں۔ عبد اللہ، عبد الرحمن اور اسامہ۔ محدثین کی ایک جماعت عبد اللہ کو ضعیف اور دوسروں کو معتبر قرار دیتی ہے۔ کچھ ہی عین عبد الرحمن کو ضعیف اور بقیہ دونوں کو معتبر کہتے ہیں۔ اگر وہ اسرار کے ساتھ لکھتے ہیں تو یہ حقائق کہتے ہیں کہ یہ حقائق کہتے ہیں کہ یہ حقائق کہتے ہیں۔

## یہودیوں کے منصوبے آپ کے قتل سے متعلق

حلیمہ کے پاس قیام کے زمانہ میں ایک اور واقعہ بھی راویوں نے بیان کیا ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر بعض یہودیوں نے یا عرب قیافہ شناسوں نے (روایت میں اختلاف ہے) یہ معلوم کر لیا کہ آپ بنی نضیر النضیر ہیں۔ اور یہی ہمارے آبائی کیش اور مذہب کو دینا سے مٹائیں گے۔ یہ سمجھ کر انہوں نے خود آپ کو قتل کرنا چاہا یا دوسروں کو آپ کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا۔ (روایت میں اختلاف ہے) ایک روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حلیمہ آپ کو پہلے پہل مکہ معظمہ سے لے کر عکاظ کے میلہ میں لائیں وہاں قبیلہ بڈیل کا ایک قیافہ شناس بڑھا تھا۔ عورتیں اپنے اپنے بچوں کو لے کر اس کے پاس آئی تھیں، اور فال نکھواتی تھیں۔ اس کی نظر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑی تو وہ چلا اٹھا کہ اسے قتل کر ڈالو، مگر آپ لوگوں کی نظروں سے غائب ہو چکے تھے۔ حلیمہ آپ کو لے کر چل دی تھیں لوگوں نے بڑھے سے واقعہ پوچھا تو اس نے کہا کہ میں نے ابھی وہ بچہ دیکھا جو تمہارے اہل مذہب کو قتل کرے گا۔ اور تمہارے بچوں کو توڑے گا۔ اور کامیاب ہو گا۔ اس کے بعد لوگوں نے آپ کو بہت ڈھونڈا مگر آپ نہ ملے حلیمہ نے اس کے بعد آپ کو پھر کسی قیافہ شناس اور فال دیکھنے والے کے سامنے پیش نہیں کیا۔

ایک اور روایت میں ہے کہ اس بڑھے کی عقل جاتی رہی، اور وہ حالت کفر میں مر گیا۔ دوسری روایت میں یہ واقعہ اس طرح ہے کہ آمنہ نے حلیمہ کو کہہ دیا تھا کہ میرے بچہ کو یہودیوں سے بچائے رکھنا۔ اتفاق سے جب وہ آپ کو لے کر حلیں تو کچھ یہودی راستہ میں مل گئے۔ انہوں نے آپ کا حال سُنی کہ ایک دوسرے سے کہا کہ اس کو مار ڈالو، پھر انہوں نے دریافت کیا کہ کیا یہ بچہ تم ہے؟ حلیمہ نے کہا نہیں۔ میں اس کی ماں ہوں۔ اور اپنے شوہر کو بتایا کہ وہ اس کا باپ ہے۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ تم ہو تو ہم اس کو قتل کر ڈالتے۔ اور چونکہ ان کو یہ معلوم ہوا کہ یہ بچہ تمہاری علامت پچھ میں نہیں پائی جاتی تھی۔ اس سے ان کا یقین جانا ہوا۔

سید سلیمان ندوی مرحوم اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ روایتیں ابن سعد ج ۱ و ۲ میں ہیں۔ مگر حالت یہ ہے کہ پہلی روایتوں کا ماخذ واقدی کی داستانیں ہیں۔ اور اس پر بھی ان کے سلسلے ناقص ہیں۔ آخری روایت کا سلسلہ یہ ہے۔ عمرو بن عاصم کلابی، ہمام بن یحییٰ اور اسحاق بن عبداللہ۔ گویہ تینوں عموماً ثقہ اصحاب ہیں مگر ان کی روایت موقوف ہے۔ یعنی آخری راوی اسحاق بن عبداللہ کو تابعی ہیں۔ مگر وہ کسی صحابی سے اس کا مستناظر نہیں کرتے۔ معلوم نہیں یہ روایت کہاں سے پہنچی۔

سیرت النبی ص ۴۵ ج ۲

یہاں ہمیں سید صاحب مرحوم کی اس رائے سے کہ یہ تینوں عموماً ثقہ راوی ہیں کچھ اختلاف ہے۔ جہاں تک ہمام بن یحییٰ البصری کا تعلق ہے۔ بے شک وہ بصرہ کے مشہور ثقہ علماء میں شمار ہوتے ہیں۔ لیکن ان میں کچھ خامیاں بھی ہیں۔ حافظ ذہبی ان کے تذکرہ میں فرماتے ہیں۔

حافظ ابو حاتم کہتے ہیں یہ ثقہ ہیں لیکن ان کا حافظ کچھ خراب ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان ان کے حافظ کے باعث ان سے قطعاً راضی نہ تھے۔ امام احمد فرماتے ہیں۔ میں نے یحییٰ بن سعید القطان کو دیکھا ہے کہ وہ تین افراد کے بارے میں بہت بری رائے رکھتے تھے۔ ایک حجاج بن اظہات، دوسرے محمد بن اسحق اور تیسرے یہ ہمام۔ حتیٰ کہ وہ ان تینوں کے سلسلہ میں کسی کے گفتگو کرنے سے بھی تیار نہ تھے۔

عمرو بن علی کا بیان ہے کہ عبدالرحمان بن ہمدانی تو اس ہمام سے روایت کرتے، لیکن یحییٰ نہ اس سے کوئی روایت لیتے اور نہ وہ اس کے حافظ سے خوش تھے۔ اور اس کی لکھی ہوئی احادیث سے۔

عغان کا بیان ہے کہ ہمام اپنی لکھی ہوئی یادداشت کو دیکھنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ کیونکہ وہ اسے عیب تصور کرتا۔ اور پھر اگر کسی وقت اچانک مسودہ پر نظر پڑتی تو کہتا، اے اللہ سے استغفار چاہتے ہیں۔ ہم تو بہت سے غلطیاں کرتے رہے ہیں۔ ۱۹۵ میں اس کا انتقال ہوا۔ مجموعی طور پر ہمام کا حافظہ خراب تھا۔ اس لئے اس کی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ میزان ص ۲۰۹ ج ۴

ہمام سے یہ روایت عمرو بن عاصم کلابی نقل کرتا ہے۔ یہ بھی مشہور کچھ عالم ہیں۔ یحییٰ بن معین نے انہیں ثقہ کہا ہے۔ نسائی کہتے ہیں ان کی روایت میں کوئی حرج نہیں۔ ابو داؤد کہتے ہیں اس کی روایت سے خوش نہیں۔ اگر ہمارے اس سے روایت نہ لیتے تو میں اس کی روایت ترک کر دیتا۔ ابو حاتم اس کی روایت کو حجت نہ سمجھتے

تھے۔ اس کا انتقال ۱۳۰ھ میں ہوا۔

رہا اسحاق بن عبداللہ کا معاملہ تو اسحاق بن عبداللہ نامی تو متعدد افراد میں سید صاحب نے اس کا اپنے تحریر نہیں کیا۔ صرف یہ لکھا کہ وہ تابعی ہے۔ تو تابعین میں پانچ اسحاق بن عبداللہ نامی موجود ہیں۔ ایک اسحق بن عبداللہ بن جعفر الباشمی میں جن کا کچھ حال معلوم نہیں۔ ایک اسحاق بن عبداللہ بن الحارث بن نوفل الباشمی میں جو ثقہ ہیں۔ ایک اسحق بن عبداللہ بن الحارث بن کنانہ العامری میں یہ کام چلاؤ ہیں۔ ایک اسحق بن عبداللہ بن ابی طلحہ الانصاری المدنی میں یہ ثقہ ہیں حجت میں اور ایک اسحق بن عبداللہ بن ابی فردۃ المدنی ہے یہ ناقابل اعتبار ہے۔ ہمارے نزدیک یہ روایت اسی آخری شخص سے مروی ہے۔

یہ حضرت عثمانؓ کی اولاد کا غلام تھا۔ بلا سند روایات نقل کرنے میں اسحق بن عبداللہ بن ابی فروہ: مشہور تھا۔ ایک بار امام زہریؒ نے اس کو بلا سند حدیث بیان کرتے دیکھا تو فرمایا اے ابن ابی فروہ اللہ تجھے قتل کرے۔ تو اللہ کے معاملہ میں کتابے خوف ہے۔ تو حدیث کی سند کیوں بیان نہیں کرتا۔ ایسی روایات کیوں بیان کرتا ہے۔ جن کی نہ کوئی مہار موتی ہے اور نہ لگام۔ بخاری کہتے ہیں محدثین نے اس کی روایت کو ترک کر دیا ہے۔ اور امام احمد اس کی حدیث سے منع کرتے تھے۔ بلکہ جو زبانی تو یہ کہتے ہیں کہ امام احمد بن حنبل فرمایا کرتے تھے کہ میرے نزدیک اس اسحاق کی روایت بیان کرنا بھی حلال نہیں۔ ابو زرعہ کہتے ہیں یہ متروک ہے۔ یحییٰ بن معین وغیرہ کہتے ہیں اس کی روایت نہ لکھی جلتے۔ ابن عدی نے اس کی کئی روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ اور خاص طور پر اہل حجاز سے جتنی بھی روایات نقل کرتا ہے۔ وہ منکر ہوتی ہیں۔ اس کا انتقال ۱۸۳ھ میں ہوا۔ میزان ص ۱۹۳۔ اس کی روایات ابوداؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں باقی جاتی ہیں۔ سید صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں۔

تقریباً اس واقعہ کو ابونعیم نے دلائل میں اس طرح بیان کیا ہے کہ عظیمہ جب آپ کو مکہ سے لے کر روانہ ہوئیں تو ایک وادی میں پہنچ کر ان کو حبش کے کچھ لوگ ملے۔ عظیمہ ان کے ساتھ ہو گئیں۔ انہوں نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا تو آپ کی نسبت کچھ دریافت کیا۔ اس کے بعد آپ کو خوب غور سے دیکھا شروع کیا۔ دونوں مونہوں کے بیچ میں ہر نبوت تھی۔ وہ دیکھی۔ آپ کی آنکھوں میں تھوڑی سرخی تھی اس کو دیکھتے

رہے۔ پھر پوچھا کہ کیا بچہ کی آنکھوں میں یہ سرخی کسی بیماری سے ہے یا ہمیشہ سے اسی طرح کی ہے۔ حلیمہ نے کہا نہیں ہمیشہ سے اسی طرح ہے انہوں نے کہا اللہ کی قسم یہ پیغمبر ہے۔ یہ کہہ کر انہوں نے بچہ کو حلیمہ سے چھین لیا۔ لیکن اللہ نے آپ کی حفاظت کی۔

ابو نعیم کی اس روایت کا سلسلہ نہایت ضعیف اور کمزور ہے اور اس کی روایت مجہول الحال لوگ ہیں۔

سیرت النبی ص ۵۸ ج ۳

ہم تو ان تمام روایات کو پڑھنے کے بعد صرف اس نتیجے پر پہنچے کہ ان مجوسی مؤرخین کے دلوں میں حضور کی جانب سے بغض بھرا ہوا ہے۔ اسی لئے کبھی وہ یہودیوں سے آپ کو قتل کر دینا چاہتے ہیں کبھی عیسائیوں سے کبھی عربوں کو سامنے لاتے ہیں اور کبھی قیافہ شناسوں اور کاتبوں کو۔ وہ اس قسم کے واقعات بیان کر کے اپنے دور کے یہودیوں، عیسائیوں اور قریش کے علاوہ دیگر عربوں کو اسلام کے خلاف اکسا رہے ہیں۔ اور چونکہ حضور قریش سے تعلق رکھتے تھے۔ لہذا اس طرح قریش سے نفرت خود خود وجود میں آجاتی ہے۔ جب ہم تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں صاف نظر آتا ہے کہ نبو عباس اور ابو مسلم خراسانی نے اہل یمن اور قحطانی عربوں میں قریش کی دشمنی پیدا کی۔ اور ان دونوں کی شکمش میں نبو عباس کی حکومت ختم ہوئی۔ اور ان روایات کا مقصد واضح ہو کر سامنے آگیا۔ اور یہ تمام مؤرخین نبو عباس کے پیچھے گرتے تھے۔ اور چونکہ اس وقت ایسا ماحول پیدا نہیں ہوا تھا کہ کوئی مسلمان حضور کی ذات اقدس پر حملہ برداشت کر لیتا۔ لہذا اپنی دیو مالائی داستانوں کو حضور سے فضائل کے رنگ میں پیش کیا گیا تاکہ اُمت کے ذہن سے آپ کی ذات کے بارے میں وہ تاثر ختم ہو جائے جو قرآن نے قائم کیا تھا۔ اور حقیقت یہ ہے قرآن نے حضور کی جو شخصیت بیان کی ہے آج اس سے کوئی مسلم واقف نہیں۔ بلکہ ہم حضور کو ان عجمی داستانوں کے ایک ہیرو کے روپ ہی میں دیکھتے ہیں۔

اگر واقعہ یہ نہیں ہے تو پھر یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ جب حضور پیدا ہوئے تو دنیا کا کوئی فرد بشر ایسا نہ تھا جو حضور کی آمد اور نبوت کے مقصد سے واقف نہ ہو۔ پھر پیدائش کے بعد نبوت تک مختلف فرضی معجزات بھی ظاہر ہوتے رہے۔ لیکن تب بھی نبوت کے بعد مخصوص افراد کے علاوہ کسی نے ایمان قبول نہیں کیا۔ اور کسی نے ایمان لانے کے بعد کبھی یہ بیان نہیں کیا کہ یا رسول اللہ ہم نے ایسا واقعہ دیکھا تھا یا سنا تھا جو ہم ایمان لائے ہیں۔

اگر ان روایات کا بغیر غائر مطالعہ کیا جائے تو ان میں اور بھی بہت سے عیوب نظر آئیں گے مثلاً جب پہلے پہل حلیمہؓ آپ کو لے کر مکہ سے چلیں تو عکاظ کے میلے میں پہنچ گئیں۔ آپ کی پیدائش ربیع الاول میں ہوئی۔ دو یا تین روز والدہ کا دودھ پیا۔ پھر سات روز ثوبہ کا دودھ پیا۔ پھر آپ کو حلیمہؓ لے کر چلی گئیں۔ اور عکاظ کا میلہ ذی الحجہ میں حج کے بعد لگا کر اتھا۔ کیا وہ دس ماہ تک مکہ ہی میں ٹھہری رہیں اور اس کے بعد سفر شروع کیا یا اس طویل عرصہ میں مسلسل سفر میں رہیں؟ حالانکہ پہلی روایات اس کی تردید کر رہی ہیں۔

ان متعدد روایات میں یہ پایا جاتا ہے کہ حضور کی آنکھوں میں سرخی تھی۔ حالانکہ کتب احادیث میں صحابہ کرام جو حلیمہ بیان کر رہے ہیں اس میں ایک صفت یہ بھی ہے کہ آپ اکمل العینین تھے، اکمل العینین اس شخص کو کہا جاتا ہے جس کی آنکھوں میں پسیدی کی جگہ خوب گہری پسیدی اور سیاہی کی جگہ خوب گہری سیاہی ہو، اور ایسی آنکھیں حسین تصور کی جاتی ہیں۔ آنکھوں میں سرخی ہونا حسن کی علامت نہیں اور حضور سب سے زیادہ حسین تھے۔ یہ آپ کے اصل حلیمہ مبارک کو تبدیل کیا گیا ہے اسی سے آپ ان روایات کا اندازہ فرمائیں۔

## بادلوں کا ساتھ چلنا

بیان کیا جاتا ہے کہ حلیمہؓ پیار و محبت کی وجہ سے آپ کو دھوپ میں نکلنے نہیں دیتی تھیں۔ ایک دن آپ اپنی رضاعی بہن کے ساتھ دھوپ میں نکل پڑے۔ حلیمہؓ نے دیکھا تو لڑکی پر خفا ہو گئیں۔ کہ تم دھوپ میں کیوں لے گئیں۔ لڑکی نے کہا اماں جان میرے بھائی کو دھوپ نہیں لگتی۔ میں نے دیکھا کہ اس پر بادل سایہ کئے تھے۔ جدھر یہ بچہ جاتا تھا اُدھر وہ بھی چلتے تھے۔ اور جہاں یہ رک جاتا تھا وہ بھی رک جلتے تھے۔ اس کیفیت سے دو مہاں تک پہنچا ہے۔

ابن سعد نے اس واقعہ کو دو طریقوں سے نقل کیا ہے۔ ایک میں صرف واقدی کا حوالہ ہے۔ اور اس کے آگے کوئی نام نہیں دیا۔ ص ۱۷۱ ج ۱ اور دوسرے میں ہے کہ واقدی نے معاذ بن محمد سے اور اس نے عطاء سے اور عطاء نے ابن عباسؓ سے سنا۔ ابن سعد کے علاوہ ابونعیم، ابن عساکر، ابن طبرانی نے بھی اسی سلسلہ سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ مگر اس سلسلہ میں واقدی کے علاوہ معاذ بن محمد، مہول اور ناسع بن عبد اللہ (اور ابن عباسؓ ہجرت مدینہ سے دو سال قبل پیدا ہوئے تھے) سیرت ابنی ص ۱۷۱ ج ۲۔



## نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت

آج کل تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ سوال بڑی شد و مد سے کیا جاتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کس نے کی؟ اردو زبان میں تمام مصنفین سیرت، تمام مؤرخین، اور تمام علماء و صوفیاء بلکہ سابقہ ادوار میں بھی اکثر یہی کہتے آئے ہیں کہ عبدالمطلب کے مرنے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت آپ کے حقیقی چچا ابوطالب نے کی۔

پاک و ہند میں تقسیم ہند سے قبل یہ ایک امر مسلمہ تسلیم کیا جاتا تھا۔ جس میں کسی قسم کے شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ بلکہ یہ تمام تاریخی داستانیں ایمانیات کا درجہ رکھتی تھیں، لیکن جب پاکستان میں محمود احمد عباسی مرحوم نے خلافت معاویہ و یزید لکھ کر شیعیت کو چیلنج کیا تو متعدد حضرات کی رگ شیعیت پھر کھل گئی۔ قاری طیب صاحب مرحوم نے ایک کتاب لکھ کر اپنی حسینیت کا ثبوت دیا۔ اور مودودی صاحب نے خلافت و ملکیت لکھ کر شیعیت کا پرچار کیا اور متعدد صحابہ پر تنقید کی۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ سیلاب جو محمود احمد عباسی کی جانب نہ صرف بڑھ رہا تھا بلکہ لپیٹ میں لے چکا تھا۔ اس کا رخ مودودی صاحب کی جانب مڑ گیا۔ اور ان کی کتاب کے رد میں متعدد تحقیقی تصانیف وجود میں آئیں۔ اور جواب الجواب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جس کا ایک بہتر تحریر سامنے آیا کہ کچھ لوگ ایسے پیدا ہو گئے۔ جنہوں نے تاریخ کی تحقیق شروع کر دی جس کی وجہ سے جہاں بہت سے حقائق کھل کر سامنے آئے۔ وہاں بطور رد عمل ایک ایسا طبقہ بھی وجود میں آیا جس نے حضرت علیؑ کی ذات کو اپنا ہدف بنا لیا اس طبقہ نے ہر اس واقعہ کا رد ضروری تصور کیا۔ جس کا تعلق حضرت علیؑ کی ذات سے ہو۔ کیونکہ انہیں ہر واقعہ کے پس پردہ شیعیت کا رد نظر آتی تھی۔ انکا مقصود بغض علیؑ نہ تھا بلکہ بغض شیعیت تھا۔ اگرچہ بعض حضرات اس سلسلہ میں حوصلہ شکنی سے آگے بڑھ گئے۔

دوسری جانب ان حضرات نے جو ان داستانوں پر آنکھیں بند کر کے ایمان لائے تھے ان داستانوں کا دفاع

کیا اور ان لوگوں پر خارجیت کے فتوے صادر کئے جو ان داستانوں پر ایمان نہ رکھتے تھے۔ اس مقابلہ بازی کے نتیجہ میں کچھ علماء تو خارجیت کی جانب مائل ہو گئے۔ اور کچھ مئے اپنے آپ کو شیعہ عقائد میں رنگ لیا اس طرح علماء دیوبند اور علماء اہل حدیث تین حصوں میں تقسیم ہو گئے۔

۱۔ وہ ٹولہ جو ان داستانوں کا دفاع کرنا اپنا دینی فریضہ تصور کرتا ہے۔ اور میر معادیہ وغیرہ پر تنقید کرنا

اپنے لئے لازم سمجھتا ہے۔

۲۔ دوسرا وہ ٹولہ جسے خاندان نبی ہاشم یا اس خاندان کے کسی صحابی میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

۳۔ وہ علماء جو تمام صحابی کی محبت داخل دین تصور کرتے ہیں۔ اور ایسی تاریخی داستانوں کو جس سے کسی صحابی کی عظمت میں فرق آتا ہو، انہیں خاص جھوٹ سمجھتے ہیں۔ اتفاق سے حضور کی کفالت کے مسئلہ میں بھی یہ علماء متعدد حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اکثر یہ تو وہی اپنا صدیوں پرانا راگ الاپ رہی ہے۔ اس کے سامنے بس یہی ایک جواب ہے کہ صاحب لوگ یہی کہتے اور لکھتے چلے آئے ہیں جب کہ دوسرا طبقہ اتنے زبردست دلائل پیش کرتا ہے کہ پہلا طبقہ لا جواب ہو کر فتوے بازی کا سہارا لیتا ہے لیکن اس فتویٰ بازی سے عوام پر اچھا اثر پیدا نہیں ہو رہا ہے۔ بلکہ اب یہی امور شیعیت اور سنیت کی پہچان بن گئے ہیں۔ لہذا کفالت رسول کے معاملہ میں ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔

جو طبقہ ابوطالب کی کفالت کا منکر ہے۔ ہم اس کے دلائل اسی طبقہ کے ایک نمائندہ اور مشہور اہل حدیث عالم حکیم فیض عالم شہید صدیقی کی "حقیقت شیعہ" نامی کتاب سے قارئین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

ہماری تمام مروجہ تاریخیں، ہمارے تمام علماء اور پیران عظام، ہمارے سب کے سب واعظ اور خطیب ہماری تمام مجالس اور محافل، غرضیکہ ہمارا تمام معاشرہ الاما شاء اللہ بری طرح اس غلط فہمی کا شکار ہے کہ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد ابوطالب جس کا اصل نام عبدمناف (مناف بت کا بندہ) تھا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کفیل ہوا، حالانکہ یہ واقعہ صریحاً غلط اور بالکل بے بنیاد ہے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ عبدالمطلب کے انتقال کے بعد آپ کی پرورش آپ کے بڑے چچا زبیر بن عبدالمطلب نے کی مگر شیعہ پروپیگنڈے نے اس حقیقت کے جبر سے کو نہایت چالاکی

سے مسخ کر کے ابوطالب (عبد مناف) کا مقام بلند کر کے دکھانے کے لئے تمام واقعہ کو اس طرح سوڑ توڑ کر تمام معاشرہ کے ذہنوں میں اس طرح راسخ اور پختہ کر دیا ہے۔ کہ آج بڑے بڑے عالم اور فاضل بھی اس حقیقت سے واقف نہیں۔ اس ایک واقعہ ہی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شیعہ تصورات نے اپنے پروپیگنڈے کے بل بوتے پر حقائق کو کس طرح پوری قوم کے ذہنوں کو اپنے مزعومہ تصورات میں کس طرح جکڑ رکھا ہے۔ یزید کو اللہ تعالیٰ نے بخش دیا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور سنیکڑوں اجل صحابہ اس امر کے گواہ ہیں کہ شیعہ پروپیگنڈے نے اپنے جالوں میں اس طرح سے پوری ملت کو جکڑ لیا۔ کہ وہ آج تک اسے بخشے کو تیار نہیں۔ ذرا ابوطالب کے اسی ایک واقعہ سے دوسری باتوں کا اندازہ کیجئے۔ ع

قیاس کن زنگستان من بہار مرا

**عبد المطلب کی وفات کے وقت**  
**ان کے چھ بیٹے زندہ تھے :**  
 زیر، حارث، عبد مناف (ابوطالب)، عبد العزی (ابولہب)، عباس اور حمزہ۔ ان میں سے زیر، عبد اللہ، عبد مناف تینوں ایک ماں سے لگے بھائی تھے۔ زیر سب سے بڑے تھے۔ طبقات ابن سعد میں زیر کے متعلق لکھا ہوا ہے۔

۱۔ والزیبیر وکان شاعرا شریفا والیہ زیر شاعر اور باعزت شخص تھے۔ اور ان ہی

اوضی عبد المطلب طبقات ابن سعد ص ۱۶ کو عبد المطلب نے اپنا دھبی کیا تھا۔

۲۔ فاما الزبیر بن عبد المطلب فکان لیکن زیر بن عبد المطلب تو وہ قریش کے معزز

اشراف و جودھا۔ شرح ابن ابی الحدید اور باوقار سرداروں میں سے تھا۔

۳۔ مؤلف کتاب المجر یعنی قدیم ترین مؤرخ ابو جعفر محمد بن حبیب المتوفی ۲۴۵ھ نے۔ الحکام من قریش ثم من

نبی ہاشم کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ نبی ہاشم میں سے عبد المطلب کے بعد زیر اور ان کے بعد ابوطالب سردار

ہوئے۔ کتاب المجر ص ۱۳۲

۴۔ اشراف قریش میں ہے کہ حرب بن امیہ کے مرنے کے بعد جب عہدوں کی تقسیم ہوئی تو ہاشمی خاندان

میں بالترتیب، زیر، ابوطالب، حمزہ اور عباس سردار ہوئے۔

۱۵۵ شمس (عیسوی) میں فجار کی جنگ لڑی گئی۔ یہ جنگ قبیلہ ہوازن اور قبیلہ قریش کے درمیان لڑی گئی۔ اس جنگ میں نبی ہاشم کے سردار زبیر تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر اس وقت بیس سال تھی۔ آپ اس جنگ میں مسلح شامل ہوئے۔ مگر عملاً جنگ میں حصہ نہیں لیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ۱۵۵ شمس کو ہوئی۔ حرب فجار ۱۵۵ شمس کو لڑی گئی۔ اس حساب سے اس وقت عمر شریف بیس سال کے کچھ کم یا زیادہ تھی۔ اور آپ تیراٹھا اٹھا کر اپنے چچا زبیر کو دیتے رہے۔ ابو طالب کا اس طوائف میں کہیں ذکر نہیں آتا۔ تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں ۱۹۵۔ اشراف قریش ۱۹۵۔

۵۔ کتاب الحجر میں مرقوم ہے ہوفقیان قریش۔ زبیر قریش کے جوان مردوں میں سے تھے ۱۶۹

۶۔ شرح ابن ابی الحدید میں ہے کہ زبیر، رحیم، کریم اور انصاف پرورد تھے۔ مظلوموں کی دادرسی کے متعلق آپ کے کئی واقعات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ عبد المطلب کی زندگی میں آپ ایک مظلوم کے سلسلہ میں حرب بن اُمیہ سے الجھ پڑے۔ معاملہ نے طویل کھینچا تو آپ اپنے بھائی العیداق کی ہمرای میں اس مظلوم کو لے کر کعبہ میں جا پہنچے۔ مگر معاملہ اور بڑھ گیا تو تمام بنو عبد المطلب تواریس سونت کر آپ کی مدد کے لئے پہنچ گئے۔

۷۔ اپنے زمانہ کے تاجدار و صاحب ثروت شخص تھے۔

۸۔ کسی زمانہ میں عرب میں چند لوگوں نے عہد کیا تھا۔ جو مظلوموں کی اعانت وغیرہ کی دفعات پر مبنی تھا۔ اس عہد نامہ پر عمل وغیرہ متروک ہو چکا تھا۔ مگر اس کی یاد بھی تک لوگوں کے دلوں میں موجود تھی۔ زبیر بن عبد المطلب نے حرب فجار کے بعد اس کی تجدید کی۔ یعنی عبد اللہ بن جدعان کے مکان پر تمام قبائل کے سرداروں کو اکٹھا کیا اور اس واقعہ کی یاد دلا کر از سر نو تجدید کی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف اس وقت اکیس بائیس سال کی تھی۔ اور آپ اپنے چچا زبیر کے ساتھ تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں اسی کو حلف الفضول کہا جاتا ہے۔ شرح ابن ابی الحدید۔ تاریخ اسلام اکبر شاہ خاں ۹۶ ج ۱

۱۰۔ آج عمر کو حضرت حسینؑ کی شہادت کی وجہ سے تبرک سمجھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ محرم کا بیعتہ زمانہ کفر میں بھی حرمت کا بیعتہ تھا۔ اس جنگ کو حرب فجار اس لئے کہتے ہیں کہ یہ محرم الحرام میں لڑی گئی۔ سیدہ فاطمہؑ کا نکاح ۱۱ محرم کو ہوا۔ روانہ ہو کر چاہیے کہ وہ حضرت علیؑ کی اس سنت کو زندہ کریں۔

۹۔ زبیر کے مرنے پر ان کی بہن حضرت صفیہؓ نے ایک بڑا زوردار مرثیہ کہا تھا۔ فرماتی ہیں۔

(۱) تو روئے نیک ذاتِ زبیر پر۔ اُن پر رونے سے یہ بات جاتی رہی کہ کسی کریم پر روتی۔

(۲) یا زبیر من کسی کریم و شریف کو پھینک دیتی۔ تو میں ملامت نہ کرتی۔ یا زبیر من کسی کے مرنے پر بھائی اور بھائی ہو جاتی تب بھی میں پر واہ نہ کرتی۔

(۳) اور میرے جی میں تو یہ بات تھی کہ میں مرنے والوں کو چھوڑ دوں۔ اور ان کے پیچھے کوئی مرثیہ نہ کہوں۔

(۴) مگر زبیر کے مرنے کو میں کیسے بھول جاؤں۔ اس کے مرنے پر صبر نہ کر سکی۔ کیونکہ میں نے اپنے سب بھائیوں میں زبیر کو کریم قرار دیا۔

(۵) اگر میں اپنی زبان سے اس کا مرثیہ نہ کہتی تو آنسو بہ بہ کر میری پسلیوں کو چور چور کر دیتے۔

سوائے زبیر کے ہمیں کسی تاریخ میں نظر نہیں آتا کہ حضرت صفیہؓ نے کسی بھائی کے مرنے پر مرثیہ کہا ہو۔ حضرت حمزہؓ کی شہادت کا آپ کو بہت صدمہ ہوا۔ مگر مرثیہ ان پر بھی نہیں کہا اور ابوطالب کا تو ذکر ہی نہیں۔

زبیر کی وفات کا صحیح سن نہیں ملتا۔ مگر حلف الفضول کے تھوڑے عرصہ بعد معلوم ہوتا ہے کہ آپ مر گئے۔ اور بنی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت کسی کی کفالت کی ضرورت نہ تھی۔ آپ بھر پور جوان تھے۔ اور آزادانہ تجارت کرتے تھے۔

اب تصویر کا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ زبیر کے مرنے کے بعد عبد مناف (ابوطالب) عائدان کا سردار ہوا۔ اس کی مالی حالت بہت کمزور تھی۔

۲۔ عبد مناف غریب تھا۔ اس لئے اپنے اس خاندانی عہدے کو نبھا نہیں سکتا تھا۔ اور اس کی جگہ اس کے بھائی عباسؓ سقایہ اور نفادہ وغیرہ کے امور انجام دیتے تھے۔

۳۔ قریش کا ذریعہ معاش تجارت تھا۔ اور تجارت کے لئے شام اور یمن کی طرف سفر کرنے پڑتے تھے۔

اس زمانہ میں عرب جیسے ملک میں جہاں چوری، لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کو ایک کھیل سمجھا جاتا تھا۔ وہی لوگ سفر کر سکتے تھے۔ جو صحت مند اور صحیح الاعضاء ہوتے تھے۔ مگر ابوطالب جو صحت کے لحاظ سے کمزور اور ایک ٹانگ سے نکلے تھے۔ اور صحت سفر برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ اس لئے ان کی مالی حالت بہت پستی تھی۔

العارف میں اس بقیۂ مئے قریش کے مختلف حامدانوں کے جسمانی نقائص والوں کی ایک فہرست دی ہے۔  
 (العرج (النگڑے) کے عنوان کے تحت سرفہرست ابوطالب کا نام ہے۔ العارف ص ۲۵۲)

۴۔ چونکہ لمبے سفر سے معذور تھے۔ اس لئے گھریب ہی کوئی چھوٹا موٹا کام کر کے گزراوقات کر لیا کرتے تھے۔  
 ابن قتیبہ لکھتے ہیں کہ گھریب ہی خوشبوئیں بنا کر بیچ پتے تھے۔

۵۔ ان کی یہ حالت باپ کی زندگی ہی میں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ عبد المطلب کی سرداری یا زیر کی سرداری کے زمانہ میں ان کا نام کہیں نہیں ملتا۔ اور نہ ہی عبد جاہلیت کے کسی اہم واقعہ میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

اب عبد المطلب کی بصیرت، معاملہ فہمی، وجاہت اور فراست کو دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے وفات کے وقت نبی علیہ السلام کی کفالت کا بوجھ یقیناً اس بیٹے کے سپرد کیا ہو گا جو غریبوں کا ہمدرد، مظلوموں کا مددگار، صاحب فراست، نیکی اور پارسانی کا مجسمہ، قبیلہ کا سردار، ذی عزت، ذی وجاہت، صاحب حوصلہ اور جرأت مند شخص تھا۔ نہ کہ اس بیٹے پر تنہا پوتے کی کفالت کا بوجھ ڈالا ہو گا جو معمولی حیثیت کا ایک پانچ اور کثیر العیال انسان تھا اس مقام پر یہ بیان طریقت نے پہلے تو قرعہ اندازی کا مفروضہ کھڑا کیا۔ کہ عبد المطلب نے کفالت پرورش کے لئے زیر اور عبد مناف اپنے دو بیٹوں کے درمیان قرعہ ڈالا جو ابوطالب کے نام نکل آیا۔ اس لئے انہوں نے آنحضور کی پرورش کی۔

اس قرعہ اندازی کے خالق کی نظر اس طرف کیوں دوگئی کہ عبد المطلب کے پانچ صاحب حیثیت بیٹے اور بھی موجود تھے۔ صرف ان دو کے درمیان قرعہ اندازی کیوں ہوئی؟ اصل بات یہ ہے کہ آپ کی کفالت کی ذمہ داری تو عبد المطلب نے زیر کے کندھوں پر ڈالی تھی۔ اب چونکہ اس سعادت کا سہرا ابوطالب کے سر باندھنا مقصود تھا، اذہر کا نام یہ بیان سے نکالنا مقصود تھا اس لئے دو ہی کا نام لیا گیا۔

پھر دوسرا شوشہ یہ چھوڑا کہ حضور علیہ السلام کی پرورش نذیر ابوطالب نے کی۔  
 اس دو وزن کے فلسفے کے خالق کو اتنا نظر آیا کہ زیر تو ایک رئیس تھے اور ابوطالب ایک غریب آدمی۔  
 ایک امیر کے گھر رہنے والے بچے کو غریبانہ قسم کے ماحول میں بچپانے کی آوردہ بھی شرکت میں اس کی کیا ضرورت محسوس ہوتی؟ پھر یہ ہم قریشی تھے کہ زیر کی وفات کے بعد جب ابوطالب نے پرورش کی۔

صفحات بالا میں بدلائل یہ ثابت کیا گیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف حلف الفضول کے وقت بیس سال سے زیادہ تھی۔ اور زبیر کی وفات اس کے بعد ہوتی ہے۔ اور اس وقت آپؐ آزادانہ تجارت کا شغل اپنا چکے تھے۔ پھر ابوطالب کی پرورش چہ معنی دارو؟ درایات سے آگے بڑھ کر اب روایات کو دیکھئے۔

اصل بات یہ ہے کہ عبدالمطلب نے مرتے وقت اپنے یتیم پوتے کی کفالت کی ذمہ داری زبیر کے سپرد کی تھی۔ عبدالمطلب اپنی آنکھوں سے زبیر کی بلند کرداری اور غربا پروری کے مظاہرے دیکھ چکے تھے۔ اور انہیں یقین تھا کہ زبیر ہی اس بوجھ کے اٹھانے کا اہل ہے۔ اور زبیر کو اپنے یتیم بھتیجے سے بے پناہ محبت اور غیر معمولی انس تھا۔ چہنیں میں انہیں گودوں میں اٹھائے پھرتے، ہاتھوں پر جھلاتے اور لوریاں گنگناتے۔ چنانچہ الاصابہ میں ہے کہ زبیر بن عبدالمطلب بنی علیہ الصلاۃ والسلام کو جب وہ چھوٹے تھے، بھلایا کرتے تھے۔ اور کہتے جلاتے تھے۔ یہ عمریرے بھائی عبداللہ کی نشانی ہے۔ بڑے عیش و آرام سے جئے، اور بڑی اعلیٰ عزت اور توقیر پائے۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۵۸۔ زبیر کے ایک بیٹے کا نام عبداللہ تھا۔ عہد رسالت میں جوان تھے۔ جب کبھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے تو آپؐ اپنے پہلو میں بٹھاتے۔ نہایت محبت سے پریش آتے۔ اور فرماتے یہ میرا بھائی اور میری سال (دادی) کا بیٹا ہے اس کا باپ مجھ سے بڑا نیک سلوک کرتا تھا۔ الاصابہ ج ۲ ص ۲۶۲۔ زبیر کے ایک بیٹے طاہر کے نام پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک بیٹے کا نام طاہر رکھا (شرح ابن ابی الحدید) حضرت صفیہؓ نے اپنے بھائی زبیر کے نام پر اپنے بیٹے کا نام زبیر رکھا۔

زبیر کی چار بیٹیاں تھیں۔ چاروں اسلام لائیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بچپن اور آغاز و شباب ان کے ساتھ گزرا تھا۔ اس لئے آپؐ ان کی بڑی عزت فرمایا کرتے تھے۔ ان فرض زبیری عبدالمطلب اپنی نیک خصلتوں اور اعلیٰ صفتوں کی وجہ سے تمام خاندان میں اعلیٰ مقام رکھتے تھے اور تمام خاندان میں نہایت عزیز اور محبوب تھے۔

لیکن اس باب میں شیعیت نے اس جاہک دستی کے ساتھ زبیر کی بجائے عبد مناف کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا قریبی بنا کر پیش کیا ہے کہ مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی جیسا باطنی نظر مودعہ، اور مولانا شبلی جیسا تجربہ کار نقاد اور سید الشہداء مودعہ بھی حکم لگا گیا کہ شاہ عبدالمطلب کی ولادت کے بعد ان کی شہادت کی روایت صحیح زبیر کے





ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ممکن ہے کہ چچا ہونے کے ناطے آپ ابو طالب کے گھر آتے جاتے رہتے ہوں، جیسا کہ  
 بچوں کی عام عادت ہوتی ہے۔ اور وہ کھانے پر روک لیتے ہوں۔ درہ حضور ابو طالب کے گھر رہنے تو لازمی  
 بات تھی کہ مستقل طور پر کھانا بھی وہیں کھائے تو ابو طالب کے گھر والوں کو کبھی بھی فائدہ کی نوبت نہ آتی۔ اور داس  
 کہانی کی پھر کوئی ضرورت ہوتی۔ یہ کہانی تو خود یہ ثابت کر رہی ہے کہ آپ ابو طالب کے گھر نہیں رہتے تھے۔ اسی  
 لئے جب آپ تشریف لاتے اور ان کے ساتھ کھانا کھاتے تو اس وقت ان کا پیٹ بھی بھر جاتا تھا، جن میں  
 نبی علیہ السلام کی کرامات کی آڑ میں ابو طالب کے مقام کو بلند کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور بعد میں آنے والوں  
 نے ان کو بعینہ قبول کر لیا۔ یہ سوچنے کی ذمہ داری کسی نے گوارا نہ کی کہ سردار قید نہ رہیں۔ ان کی غریب پروری اور  
 اقربا تواری کی داستانوں سے تاریخوں کے صفحات کے صفحات پر ہیں۔ یتیم بھتیجے کو لوریاں دیتے اور ہاتھوں پر  
 اچھالتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ مگر ایسے محبوب اور پیارے بھتیجے کو ناقوں کا شکار ہونے کے لئے ابو طا  
 کے پاس چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر باپ کے حکم کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔ جو مرتے وقت یتیم پوتے کے حق میں  
 مرد بزرگ فرما گئے تھے۔

اگے چلتے اوتنا سب کا ذرا وقت نظری سے مطالعہ کیجئے۔ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ زمانہ دیکھئے۔  
 جب تبلیغ کے سلسلہ میں آپ کو قریش مکہ سے اذیتیں پہنچتی ہیں۔ مگر میں کسی تاریخ میں اشارہ بھی لکھا ہوا نہیں  
 ملتا کہ ابو طالب نے یا اس کی اولاد میں سے کسی ایک نے ایک بار بھی آپ کی معاونت یا مدد کے لئے ہاتھ  
 بڑھایا ہو۔ ہمیں اگر نظر آتا ہے تو حضرت ابو بکر صدیق کا اسم گرامی نظر آتا ہے اور یا حضرت خزیمہ کا نام چند سال  
 بعد ابو جہل کی بدکاری کے سلسلہ میں نظر آتا ہے۔

اس سے اگے بڑھ کر دیکھئے کہ زیر کے مرنے کے بعد آپ کو اپنی متاہل زندگی کا خیال آیا۔ آپ نے  
 ابو طالب کو ام بانی کے لئے پیغام بھیجا۔ مگر اس شفیق مایانے اپنے ماموں کے بیٹے ہیرہ بن ابی وہب سے  
 نکاح کر دیا۔ اور بھتیجے کو جواب دے دیا۔ (طبقات ابن سعد ص ۱۵۲ ج ۲۔ تاریخ خطری۔ کتاب الحجۃ الامصاب)  
 نبی علیہ السلام نے جب اس بات کا نایا سے تنکوہ کیا تو اس شفیق مایا نے جو جواب دیا۔ وہ آج بھی  
 تاریخ کے صفحات پر موجود ہے۔

بھیجتے ان لوگوں سے تو ہماری قرابتیں پہلے سے ہوتی آئی ہیں۔ اور اشراف کا میل اشراف سے ہی ہوتا ہے مگر تو تو ایک محتاج آدمی ہے۔ (تاریخ طبری۔ الاصابہ۔ طبقات ابن سعد)۔ خود تو فقر و فاقہ میں مبتلا ہونے اور محتاج ہونے کے باوجود شریف بن رہا ہے۔ اور بھتیجے کو دائرہ شرافت سے خارج کر رہا ہے۔ ایسا کم ظرف انسان حضور کی کیا کفالت کرتا۔ اور جس نے اپنے کسی بیٹے کی بھی پرورش نہ کی ہو۔ اور تمام بچوں کو دوسروں کے گھر والے پر ڈالے رکھا ہو وہ شریف ہے۔

اس ایک واقعہ سے ہی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ابوطالب کی کفالت کی تمام روایات محض وضعی ہیں گھڑت اور کذب و افتراء کے پلندے ہیں۔ ابوطالب کا یہی اشراف خاندانی و امارد نبوت کے بعد ان حضور کی شان میں بخوبی بکٹا رہا۔ اور برغزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابل آتا رہا۔ آخر فتح مکہ کے روز خیران کی طرف بھاگ گیا اور مخالفت کفر کہیں مر گیا۔ حقیقت مذہب شیعہ از ۱۳۸ تا ۱۵۶

حکیم فیض عالم صاحب مرحوم نے جو تاریخی مواد پیش کیا ہے۔ اس سے چند امور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ ۱۔ ابوطالب فقیر و محتاج تھا۔ اس کے پاس کوئی ذریعہ معاش نہ تھا، اور لنگڑے ہونے کے باعث تجارتی سفر کرنے پر بھی قدرت نہ رکھتا تھا۔ اس کے اہل و عیال کو کبھی پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہیں ہوا۔ اس نے کسی نصیب کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدد نہیں کی (یعنی جسمانی مدد)۔ بلکہ اپنی اغانت کو زبانی اعانت تک محدود رکھا، حتیٰ کہ آپ کو رشتہ دینے سے انکار کیا۔ آپ کو فقر کا طعنہ دیا۔ اور آپ کو سیرہ کے مقابلہ میں غیر شریف قرار دیا۔ اور اس کا داماد ہمیشہ حضور کا دشمن رہا۔

۲۔ عبد المطلب کے مرنے کے بعد زبیر بن عتہ کا سردار ہوا۔ یہ بہت بہادر سنی، فیاض اور سرمایہ دار تھا۔ بھتیجے سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ حضور مختلف مقامات پر اس کے ساتھ رہے۔ اور حضور کی جوانی تک یہ زندہ رہا۔ یعنی بیس سال کی عمر تک اور حضور اس وقت تجارت فرماتے لگے تھے۔

حکیم صاحب مرحوم نے جو جزئیات پیش کئے ہیں۔ اور زبیر و ابوطالب کی جو حالت بیان کی ہے۔ بیس اس سے قطعاً انکار نہیں۔ لیکن کسی صحیح روایت میں یہ بالضرورت کہیں نہیں پایا جاتا کہ زبیر نے آپ کی غالت کی ہو، یا صاف ایک جھوٹے ہیں، اور نفس واقعہ کا خیرت یا انکار ایک جھوٹا نہ ہے۔ رہا یہ تخمینہ کہ ایک

سرمایہ دار کسے ہوتے ہوئے ایک فقیر کے ذمہ یتیم کی کفالت کا بار کیسے ڈالا جاسکتا ہے لیکن ہم دنیا میں دیکھتے سنتے اور پڑھتے آئے ہیں کہ بسا اوقات پیسے والے کچھ کام نہیں آتے بلکہ غریب کام آجاتے ہیں۔ اگر زیرِ وقتاً ایسے ہی بحیرہ اوصاف تھے تو عبد المطلب کے مرنے کے بعد جہاں حضور کی کفالت کا مسئلہ پیش نظر تھا۔ وہاں حمزہ و عباسؓ بھی یتیم ہوئے تھے۔ حمزہؓ آپ سے صرف چھ ماہ اور عباسؓ ڈیڑھ سال بڑے تھے۔ تو کیا زیرِ سیرنے ان کی کفالت کی؟

ہم جب اس نظر سے تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تاکہ ذہن کسی نتیجہ پر پہنچ سکے تو آج تک ہمیں کسی تاریخِ نسب کی کتاب میں یہ نظر نہیں آیا کہ عباسؓ کی پرورش فلاں شخص نے کی۔ لیکن حضرت حمزہؓ کے سلسلہ میں بن حزم جہرۃ الانساب میں لکھتے ہیں کہ ان کی پرورش ان کی مانی نے کی جو حضور کی بھی مانی تھیں۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ زیرِ اور ابوالبہب ہیے سرمایہ داروں نے اپنے بھائی کی پرورش بھی گوارا نہیں اور جو لوگ اپنے بھائی کی پرورش نہ کر سکیں وہ بھتیجے کی پرورش کیسے کریں گے؟ کسی وقت خونی نسبت پیش آجانی یا بظاہر محبت جتنا اور شے ہے اور دس بارہ سال کی ذمہ داری اٹھانا ایک جدائشے ہے۔

اسی لئے آج کل ایک نیا تخیل ابھر کر سامنے آ رہا ہے اور وہ یہ کہ کسی نے بھی آپ کی کفالت نہیں کی۔ لیکن ایسی صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے زندگی کے دس بارہ سال پھر کیسے گزارے۔ اور اس کے سہارے زندگی کے یہ دن پورے کئے۔

اس سلسلہ میں شاہ یحییٰ الدین صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ چونکہ آپ کے والد ایک تاجر تھے اور بہت بڑے سرمایہ دار تھے۔ اور انہوں نے اتنا ترکہ چھوڑا تھا کہ آپ نے اس کی بل بوتے پر عیش کے ساتھ اپنی زندگی کا یہ وقت گزارا لیکن اس تخیل پر بھی متعدد اعتراضات واقع ہوتے ہیں۔

۱۔ عبد اللہؐ نے اپنے ترکہ میں ایک مکان اور کچھ بکریاں چھوڑی تھیں۔ جو ازر وئے تاریخ آپ کو ملی تھیں۔ عبد اللہؐ نے کوئی بڑا سرمایہ نہیں چھوڑا، اور نہ وہ اپنے وقت کے ولیک یا بادانی تھے۔

۲۔ اگر بالفرض اتنی دولت چھوڑی بھی تھی تو اتنی کم سنی کی عمر میں یہ کہاں احساس ہوتا ہے کہ اس دولت کو کیسے خرچ کرنا ہے۔ اور کس طرح سنبھال کر رکھنا ہے۔ پھر درجہ جاہلیت میں وراثت کے سلسلہ میں جو قانون رائج

تھا۔ وہ سراسر اس تخیل کی نفی کر رہے۔ اس قانون وراثت کو مفسر قرطبی نے ایک آیت کا شان نزول بیان کرتے ہوئے لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

کرجب حضرت اوس بن ثابت الانصاری کا انتقال ہوا۔ تو انہوں نے ایک بیوی چھوڑی جس کا نام ام مکتہ تھا۔ اور تین بیٹیاں چھوڑیں۔ حضرت اوس کے چچا زاد بھائی حن کے نام حضرت اوس نے وصیت کی تھی۔ جن کا نام سوید اور عرفہ تھا۔ انہوں نے تمام مال پر قبضہ کر لیا۔ پورے چھوٹیوں کو کچھ نہیں دیا۔ کیونکہ اصول یہ تھا۔

وكانوا في الجاهلية لا يرثون  
النساء ولا الصغیر وان  
كان ذكرا۔  
زمانہ جاہلیت میں اہل عرب نہ تو عورتوں کو  
وراثت دیتے تھے۔ اور نہ چھوٹے بچے کو  
خواہ وہ لڑکا ہی کیوں نہ ہو۔

یہ لوگ اس کی دلیل میں اپنا یہ قانون پیش کیا کرتے تھے۔

لا يعطى الامن قاتل على  
ظهور الخيل، وطاعن بالرمح،  
وضارب بالسيف وحارز الغنمة  
قرطبی ص ۱۶۱ ج ۲۔  
مال وراثت اس شخص کے علاوہ کسی کو نہیں  
دیا جاسکتا۔ جو گھوڑے کی پشت پر سوار ہو  
کر جنگ کرے۔ نیزے سے کھمی کو زخمی کرے  
تو اسے لڑے اور مال غنیمت حاصل کرے۔

ام مکتہ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئیں، اور تمام وقوعہ عرض کیا۔ آپ نے ان دونوں کو طلب کیا۔ ان سے سوال کیا۔ تو انہوں نے جواب میں عرض کیا۔

ولد هلالا يركب فرسا،  
ولا حي يحمل كلا، ولا  
ينكح عداوا۔  
اس کا لڑکا گھوڑے پر سوار ہو سکتا ہے۔ نہ  
کرنی مارا ٹھاسکتا ہے۔ اور نہ کسی دشمن کو  
مقابلہ کر کے ذلیل کر سکتا ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اس وقت اس قبضہ سے رو، جب تک اللہ تعالیٰ کا کوئی حکم نہ آئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لِللّٰهِ حَالُ نَصِيبٍ مِّمَّا تَرَكَ  
ماں باپ اور اقربا جو کچھ چھوڑیں اس

النَّوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ  
لِصِّبِّ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ  
وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَدْ مَلَكَ أَوَّلُ ذُرِّيَّتِهِ  
نِصِّبًا مَّفْرُوضًا ۝ النِّسَاءِ ۱۱

میں مردوں کا بھی حصہ ہے۔ اور ماں باپ اور  
رشتہ دار جو کچھ چھوڑا کریں اس میں عورتوں کا بھی  
حصہ ہے۔ یہ مال چھوڑا ہوا زیادہ۔ ہر ایک کا حصہ  
متعین کر دیا گیا ہے۔

سیوطی: باب النقول فی اسباب النفل میں اسی واقعہ کو ابن جریر کے حوالہ سے سند ہی سے نقل کرتے ہوئے  
لکھتے ہیں۔

كان اهل الجاهلية لا يورثون  
الجواری ولا الضعفاء من العلمان  
لا يرث الرجل من ولده الامن  
اطاق القتال۔

اہل جاہلیت نہ تو لڑکی کو ورثہ دیدیتے تھے۔  
اور نہ کمزور لڑکے کو کسی کی اولاد میں سے وہ  
ہی شخص وارث ہو سکتا تھا جو جنگ و جدل کی  
طاقت رکھتا ہو۔

باب النقول مع جلالین معری ص ۶۹

اس روایت میں اس کی بھی تشریح ہے کہ مرنے والے کا نام عبدالرحمن تھا جو حسان بن ثابت کے بھائی تھے۔  
ابو شیخ اور ابن حبان نے کتاب الفرائض میں تفسیر ابن عباس کے حوالہ سے ابن عباسؓ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

كان اهل الجاهلية لا يورثون  
البنات ولا الصغار الذکور۔

اہل جاہلیت نہ تو لڑکیوں کو ترکہ دیتے تھے۔  
اور نہ چھوٹے لڑکوں کو۔

باب النقول مع جلالین معری ص ۶۹

پھر کہتے ہیں کہ اوس بن ثابت کا انتقال ہوا۔ اور انہوں نے دو بیٹیاں اور ایک چھوٹا بچہ چھوڑا۔ اوسؓ کے  
بیچا زاد بھائی خالدؓ اور عرفہؓ نے اوسؓ کے چھوڑے ہوئے مال پر قبضہ کر لیا۔

ان حوالہ جات سے یہ بات تو ثابت ہو گئی کہ عبداللہؓ نے اگر کوئی سرمایہ چھوڑا تھا تو وہ کسی ایسے ہی شخص  
کے قبضہ میں گیا جو اوسؓ کی طاقت رکھتا ہو۔ اس صورت میں جہاں حضور اپنے باپ کے مال سے محروم رہے۔  
وہاں ابوطالب اپنے لنگڑے ہونے کے باعث اور حمزہؓ و عباسؓ بچہ ہونے کی وجہ سے محروم رہے۔ اس طرح

اس مال پر صرف دو ہی شخصوں نے قبضہ کیا ہوگا۔ ابولہب یا زبیر بن عبدالمطلب۔

حضرت اوسؓ کے واقعہ سے اشارۃً یہ بات بھی ثابت ہوتی کہ اہل عرب عام طور پر مکان پر قبضہ نہیں کیا کرتے تھے۔ ورنہ ام کثر رہائش کا مسئلہ بھی پیش کرتیں۔ لہٰذا عبداللہ کا چھوڑا ہوا مکان حضور کو ملا۔

اس امر کا ثبوت کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت کسی نے نہیں کی۔ اور نہ آپ کی ذات اقدس پر کسی کا احسان ہے۔ قرآن کا یہ فرمان ہے۔

أَلَمْ يَجْعَلْكَ يَتِيمًا فَادْعُ ۝  
کیا اللہ نے آپ کو یتیم نہیں پایا تو پھر آپ کو  
ٹھکانہ دیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ٹھکانہ دینے کا ذکر فرمایا۔ کفالت کا ذکر نہیں کیا۔ اور ٹھکانہ جہاں البوطاب کا گھر ہو سکتا ہے، وہاں زبیر کا گھر بھی ہو سکتا ہے۔ اور اپنے باپ کا گھر بھی۔ لیکن طرزِ بیاں سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ ٹھکانہ اللہ تعالیٰ نے دیا تھا۔ یعنی یہ کسی غیر کی ملکیت نہ تھا۔

اس موقع پر مفسر قرطبی نے جعفر بن محمد کا ایک قول نقل کیا ہے کہ ان سے دریافت کیا گیا کہ اس کی کیا وجہ کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو باپ اور ماں دونوں کی جانب سے یتیم و سیر کیا۔ انہوں نے جواب دیا۔ لَئَلَا يَكُونَ لِمَخْلُوقٍ عَلَيْهِ حَقٌّ۔ قرطبی راجع ۹۱  
تاکہ آپ کی ذات پر مخلوق میں سے کسی کا حق نہ ہو  
جب اللہ تعالیٰ نے یہ گوارا نہ کیا کہ آپ پر آپ کے ملل باپ کا احسان ہو تو چچاؤں کا احسان کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ ان الفاظ کے ذریعہ جعفر بن محمد نے اس بات کو قبول کر لیا ہے۔ کہ ان کے پڑدادا البوطاب کا حضور کی ذات پر کوئی احسان نہیں۔

اب رہا یہ تخمیل کہ آپ کی پرورش زبیر نے کی اور آپ اس طرح عیش کے ساتھ زندگی گزارتے رہے۔ آپ کے والد نے اتنا سرمایہ چھوڑا تھا۔ اور وہ آپ کو حاصل بھی گیا تھا۔ اور آپ اس کے بل بوتے پر آرام کی زندگی گزارتے رہے تو قرآن اس کی بھی تردید کر رہا ہے۔ اگے ارشاد ہوتا ہے۔

وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَأَغْنَى ۝  
اور اللہ نے آپ کو محتاج پایا تو غنی کیا۔

غنی یعنی کفایت میں کرتے ہوئے ملے ہیں۔

اے فقیر الامال لک اے فاغناک  
 بخدیجۃ مرضی اللہ عنہا، یقال  
 عال الرجل یعیل عیلة، اذا افتقر  
 قال احيیة بن الجلاح  
 فما یدری الفقیر متى غناہ،  
 وما یدری الغنی متى یعیل،  
 قرطبی ص ۸۹ ج ۸  
 یعنی آپ فقیر تھے آپ کے پاس کوئی مال  
 نہ تھا۔ تو آپ کو حضرت خدیجہؓ کے ذریعہ  
 کیا عربی میں عال، یعیل، عیلة اس وقت بولا  
 جاتا ہے جب انسان فقر میں مبتلا ہو۔ احيیة بن  
 الجلاح کا شعر ہے۔ کوئی فقیر نہیں جانتا کہ اسے  
 غنا کب حاصل ہوگا۔ اور کوئی غنی نہیں جانتا کہ  
 وہ فقیر کب ہو جائے گا۔

قرآن اس امر کی شہادت دے رہا ہے کہ آپ پر ایسا وقت بھی گزر رہا ہے کہ آپ نے تنگ دستی اور فقر و فاقہ  
 میں بھی وقت گزار رہا ہے۔ اور یہ دور اس وقت تک رہا ہے جب تک آپ نے حضرت خدیجہؓ کے مال سے  
 تجارت شروع نہیں فرمادی۔ گویا عبدالمطلب کی وفات کے بعد آپ تنگ دستی میں مبتلا رہے۔ اور زبیر جیسے  
 سرمایہ دار نے آپ کی کوئی مدد نہیں کی۔ اور نہ آپ کے پاس باپ کا چھوڑا ہوا اتنا مال تھا کہ جس پر آپ گزر  
 اوقات کر سکتے۔ یا تو آپ کے باپ نے مال چھوڑا نہیں۔ یا آپ کے سرمایہ دار چچا ہضم کر گئے۔ لہذا اب دہی  
 صورتیں ممکن ہیں۔

۱۔ آپ کی پرورش اور کفالت ابو طالب نے کی۔ لیکن اس کا غلط ہونا تو ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں۔  
 ۲۔ آپ نے کسی کا احسان اٹھانا گوارا نہیں کیا۔ اور اپنا پیٹ پالنے کا ذریعہ خود پیدا کیا۔ لیکن آخر وہ ذریعہ  
 کیا تھا تو ہمیں صحیح بخاری کتاب الامارہ میں حضرت ابو ہریرہؓ سے یہ حدیث ملتی ہے کہ آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ  
 کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں۔ صحابہ نے دریافت کیا اور یا رسول اللہ کیا آپ نے بھی؟  
 قال نعم کنت امرعھا لاهل  
 مکة علی قمار سبط۔ بخاری ص ۱۱ ج ۱  
 آپ نے فرمایا ہاں۔ میں اہل مکہ کی سکوتوں  
 کے عوض بکریاں چرایا کرتا تھا۔

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ آپ اہل مکہ کی بطور معاد قہ بکریاں چراتے اور اس پر اپنی گزراؤ تھا  
 کرتے۔ لیکن متاخرین علماء میں سے وہ حضرات جن کے ذہنوں پر ابو طالب کے سلسلہ کی فرضی روایات پھائی

ہوئی تھیں۔ انہوں نے اس حدیث کا یہ جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ قرابطہ سے مراد سکتے نہیں۔ یہ ایک جگہ کا نام ہے۔ لیکن اول تو امام بخاری اسے اُجرت کے بیان میں لے کر آئے ہیں جس سے اس دھاندلی کا رد ہو جاتا ہے۔ دوئم پھر اہل مکہ کی بکریاں چرانے کا کیا سوال تھا۔ آپ اپنی ذاتی بکریوں کا ذکر نہیں فرما رہے ہیں، اہل مکہ کی بکریوں کا ذکر کر رہے ہیں، مگر پھر بھی یہ کوئی کتنا ہے کہ آپ کی کفالت ابو طالب نے کی تو میرا جواب یہ ہو گا کہ ہاں، لیکن آپ سے اہل مکہ کی بکریاں زبردستی چروا کر اپنا پیٹ بھرتا رہا۔ اسی حدیث کو دیکھتے ہوئے بعض حضرات تو یہ بھی لکھ گئے کہ آپ بکریاں چرا کر جہاں اپنی گزراوقات کرتے رہے۔ وہاں ابو طالب اور اس کے بچوں کا پیٹ بھی بھرتے رہے۔ اس طرح ابو طالب پر حضور کا احسان ہو گا۔ نہ کہ حضور پر ابو طالب کا۔ اور ہمارا مقصود بھی یہی ہے۔ بلکہ اس کی اس طرح سے بھی تائید ہوتی ہے کہ حضرت علیؓ کی پیدائش کے ایک روز بعد آپ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ سے فرمایا۔ چچا آپ تو جانتے ہیں کہ میرا چچا ابو طالب تنگ دست ہے۔ کیوں نہ ہم اس سے ایک ایک بٹیا لیکر اس بیٹے کی ذمہ داری اپنے سر لے لیں۔ عباسؓ اس پر تیار ہو گئے۔ اور انہوں نے جعفر کو لے لیا۔ اور حضور نے علیؓ کو۔ اور یہ وہ وقت تھا جب حضور کی شادی ہو چکی تھی۔ اور آپ کا بار خدیجہؓ اٹھا رہی تھیں۔ ایسی صورت میں آپ چچا کے ساتھ اس کے علاوہ کوئی اور سلوک نہ کر سکتے تھے۔ شادی سے قبل تو ابو طالب اور اس کی اولاد کی ذمہ داری آپ نے خود اٹھا رکھی تھی۔ اب آپ نے اس کا یہ ذریعہ تلاش کیا۔ بقیہ دو بیٹے طالب اور عقیل اس وقت خود جوان تھے۔ اس طرح ابو طالب پر صرف بیوی کی ذمہ داری رہ گئی تھی۔ ذمہ داریوں سے وہ مسکدوش ہو گیا۔ ہمارے مورخین کو چاہیے کہ اب وہ تاریخ میں یہ تلاش نہ کریں کہ حضور کا کفیل کون تھا۔ بلکہ یہ تلاش کریں کہ ابو طالب اور اس کے دو بیٹوں عقیل اور طالب کا کفیل کون تھا؟ اگر وہ ایسا کریں گے تو بہت بڑا تحقیقی کام انجام دیں گے۔



## بحیرا راسب کی داستان

ان مشہور عام مذہبی داستانوں میں ایک بحیرا نامی راسب کی داستان بھی ہے، جو تمام کتب تاریخ و سیر میں مختلف انداز میں کئی بیشی کے ساتھ پائی جاتی ہے۔ اتفاق سے یہ قصہ حدیث کی مشہور و معروف کتاب ترمذی میں بھی پایا جاتا ہے۔ جس کے سبب علمائے کلام نے اسے ایمانیات کا درجہ دے دیا۔ لیکن ترمذی کی روایت میں چند ایسے امور بھی آگئے ہیں جو قطعاً خلاف عقل ہیں۔ جس کے باعث متعدد چوٹی کے علماء نے اس سلسلہ میں قلابازیاں کھائیں، حتیٰ کہ حافظ ابن حجر نے نفس واقعہ کو تو صحیح قرار دیا۔ لیکن کچھ اجترار کو باطل تسلیم کیا۔ اور کچھ محدثین نے سرے سے اس واقعہ کا انکار کیا۔

ہم سب سے پہلے اس قصہ کو سیرت کی ایک مشہور کتاب اصح السیر سے نقل کرتے ہیں جو حکیم عبدالرؤف دانا پوری کی تصنیف ہے۔ حکیم صاحب اپنی کتاب کے ص ۱۵ پر رقم طراز ہیں۔

حضور کی عرب بارہ سال دو ماہ ہوئی۔ اس وقت خواجہ ابوالطیب نے تجارت کی غرض سے شام کا سفر کیا۔ اور حضور کو بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ جب مقام تیما میں پہنچے تو وہاں بحیرا راسب ملا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یہ یہود عالم تھا۔ اور بعض روایتوں میں ہے کہ یہ نصرانی عالم تھا۔ واللہ اعلم۔ اس نے کتب قدیمہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق آپ میں نبوت کی کچھ علامات دیکھیں، اور خواجہ ابوطالب سے پوچھا کہ یہ لڑکا جو تمہارے ساتھ ہے کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ یہ میرا بھتیجا ہے۔ بحیرا نے کہا کہ کیا آپ کو اس کے ساتھ محبت ہے؟ انہوں نے کہا بے شک۔ بحیرا نے کہا کہ میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں۔ بخدا آپ انہیں اگر شام لے گئے تو یہود ان کے دشمن ہو جائیں گے۔ اور قتل کرنا چاہیں گے۔ آپ ان کو واپس لے جائیے۔ چنانچہ خواجہ ابوطالب وہیں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ساتھ لے کر واپس چلے آئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ آپ کو کسی غلام کے ساتھ واپس کیا۔ اصح السیر ص ۱۵

حکیم عبدالرؤف صاحب نے جہاں واقعہ کو انتہائی اختصار کے ساتھ بیان کیا۔ وہاں اپنی جانب سے حتی الامکان یہ کوشش بھی کی کہ اس واقعہ میں جو خرافات پائی جاتی ہیں اور جو جو اس واقعہ پر اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔ ان کا حتی الامکان دفاع کیا جائے۔ اور اس کی انجام دہی کے لئے انہوں نے اصل واقعہ میں دل کھولی کہ تحریف کی۔ اور دیانت و امانت کے تمام اصولوں کو خیر باد کہہ دیا۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو عبد ستاف (ابوطالب) کی خواجگیست کیسے پروان چڑھتی۔ کیونکہ وہ امام الادلیار کے والد محترم ہیں۔ اسی لئے صوفیا شیعوں کی ہم نوائی میں ان کی خواجگیست کی کہانیاں تراشتے رہتے ہیں۔

ہمارے نزدیک اصل مسئلہ یہ ہے کہ تمام محدثین، مفسرین اور تمام قہقہائے اہل سنت اس پر متفق ہیں کہ ابوطالب کافر اور جہنم رسید ہوا۔ جب کہ مجوسی طبقہ انہیں مقام نبوت تک پہنچا دیتا ہے۔ صوفیاء جو ہمیشہ شیعوں میں پاؤں رکھے رہے، اور اپنے عقائد و نظریات میں ہمیشہ شیعوں کی کاسہ گدائی کرتے رہے اور انہیں مسائل میں سنیت کا ڈھونگ پچلتے رہے۔ ان کے لئے امام الادلیار کے باپ کو کافر کہنا ایک دشوار عمل ہے۔ اسی لئے عبدالحق محدث دہلوی نے اسے مؤمن قرار دیا۔ اور حکیم عبدالرؤف دانیلوری قادری نے ہر جگہ اس کے نام کے ساتھ خواجہ کے خطاب کا اضافہ کیا۔ کیونکہ وہ تمام خواجگان کا جادہ امجد تھا۔ حالانکہ یہ لفظ خواجہ فارسی ہے۔ اور کوئی عرب اس لفظ کے معنی سے شناسا نہیں۔ اور نہ پانچویں صدی تک ہم نے کہیں کسی کے ساتھ خواجہ کا لفظ دیکھا۔ ہاں بیس مغلیہ دور میں محلات شاہی میں خواجہ سرا ہر روز نظر آتے ہیں۔ جو غلام کی طرح ہوشیار باش کی آوازیں لگاتے پھرتے تھے۔ کیونکہ احادیث کی رو سے ابوطالب کو جہنم کے کنارے پیراگ کے جوتے پہنا کر کھڑا کر دیا جائے گا۔ لیکن ہے کہ بقیہ جنہی سے اپنا خواجہ سرا بنا کر کھڑا کر دیں۔ اور اس کے ذریعہ کام سپرد کر دیں کہ کسی جنہی کو ادھر نہ آنے دینا۔ اور جو خواجہ نظر آئے اسے بتا دینا کہ خواجگان کا اصل مقام یہ ہے۔

اب قاری احمد علی بھٹی قادی کی بھی سنتے۔ وہ اپنی کتاب تاریخ مسلمانان عالم میں لکھتے ہیں۔ ابوطالب کی آخری منزل وہ جگہ تھی جسے بصری کہتے تھے۔ آج کل اس جگہ کو حوران کہتے ہیں۔ عرب سے شام کو آنے والے تجارتی قافلے اسی شہر بصری میں ٹھہرے ہوتے تھے۔ قیام گاہ سے تھوڑے فاصلہ

بزرگواراہب کی مشہور خانقاہ تھی۔ بحیرہ دین سیح کا بہت بڑا متقی (بلکہ سچا ہوا ولی) اور عبادت گزار شخص تھا۔  
توریت انجیل اور دیگر آسمانی کتابیں اس کے ذہن میں محفوظ تھیں۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ نبی آخر الزماں کے  
پیدا ہونے کی علامتیں کیا ہیں۔ وہ اکثر قریش کے تجارتی قافلوں کو خانقاہ سے دیکھنے کے لئے آتا تھا۔ کہ یہ معلوم  
کر سکے کہ نبی آخر الزماں اس میں موجود ہیں یا نہیں۔

اتفاق کی بات کہ ابوطالب کا قافلہ گھاٹی سے اتر کر قیام کرنا چاہتا ہی تھا۔ کہ حیرا کی نظرس پڑ گئیں۔ اور  
وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ایک ابر کا قافلہ کے ایک بچہ پر سایہ کئے ہوئے ہے۔ اور تمام حجر و شجر سجدے کے  
لئے جھک رہے ہیں۔ اور اسلام علیک یا رسول اللہ کہہ رہے ہیں۔ ابھی قافلہ والے ابھی طرح سے دم بھی نہ  
لینے پائے تھے۔ کہ حیرا خانقاہ سے ابوطالب کے قریب آگیا۔ اور آنحضرت کا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگا کہ یہ بچہ سید  
العالمین اور رسول پروردگار ہے۔

مورخین کا بیان ہے کہ حیرا نے اہل قافلہ کی اپنی خانقاہ میں دعوت بھی کی تھی۔ جب سب لوگ بیٹھ  
گئے تو وہ آنحضرت کو بڑے غور سے دیکھتا رہا۔ کھانے سے فارغ ہو کر سب کو زحمت کر دیا۔ مگر ابوطالب اور  
آنحضرت کو روک لیا۔ اور ابوطالب سے آنحضرت کے متعلق بہت سے سوالات کئے۔ خوب دیرداری کے  
حالات پوچھے، رشتہ دریافت کیا۔ ابوطالب نے والد کی وفات کا حال بتایا۔ شانہ مبارک کو دیکھا۔ اور مہرِ نبوت  
کو کتبِ سماویہ کے مطابق پاکر ابوطالب سے کہا کہ میں آپ کو ہمدانہ مشورہ دیتا ہوں کہ آپ جلدی واپس  
گھر چلے جائیں۔ یہودی کو نبی عربی سے سخت عداوت ہے۔ مجھے اُن کی طرف سے اندیشہ ہے کہ وہ ان کو دیکھیں  
گئے تو ضرور نقصان پہنچانے کی تدبیریں کریں گے۔ ابوطالب نے حیرا کے مشورے کو قبول کیا۔ اور بصری ہی میں  
خرید و فروخت کر کے واپس آگئے۔

طبری وغیرہ کا بیان ہے کہ حیرا نے آپ کے ہاتھ چومے، اور نبوت کی تصدیق کی۔ یعنی قبل از نبوت آپ  
پر ایمان لائے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ حیرا جس وقت آپ کو خانقاہ میں دیکھ رہا تھا، ابوطالب سے  
کہہ رہا تھا کہ ان کو یہود سے بچانا۔ اس وقت سات رومی عیسائی اڑ میں کھڑے ہوئے سُن رہے تھے۔ حیرا نے  
اُن سے معلوم کیا کہ تم لوگ یہاں کیوں آئے؛ تو انہوں نے کہا کہ ہم کو اطلاع ملی تھی کہ نبی عربی اس ماہ میں یہاں

آنے والے ہیں۔ پھر لے کر کئی دن تک ان کو اپنی خانقاہ ہی میں ٹھہراتے رکھا۔ تاریخ مسلمانان عالم ۱۹ ج ۲  
 ان ہردو مصنفین نے واقعہ کے آخری جزئیہ کو قطعاً تبدیل کر دیا ہے۔ ورنہ مستندین و مؤرخین کا بیان تو یہ ہے  
 کہ ابو طالب نے آپ کو بلال اور ابو بکر کے ساتھ واپس کر دیا۔ اور بعض روایات میں ہے کہ ابو بکر نے بلال کے ساتھ  
 واپس کر دیا۔

اصل یہی وہ جملہ ہے جس سے اس واقعہ کی تمام عمارت منہدم ہوتی ہے۔ اور شبلی مرحوم نے سیرت النبی  
 میں اسی پر کاری دار کیا تھا۔ لہذا بعد کے اردو مصنفین نے اس جملہ کو صاف اڑا دیا۔ حالانکہ دیانت و صداقت کا  
 تقاضا تو یہ تھا کہ ایک غلط شے کو غلط تسلیم کر لیتے۔ لیکن زمیں جبندہ زمان جبندہ عمل محمد خاں کے مصداق کسی  
 تصوف کے مرید سے یہ بات کیسے ممکن ہو سکتی تھی کیونکہ پھر ابو طالب کی خواہشیت، کفالت اور سیادت سب  
 ہوا ہو جاتی ہے۔

اصل جملہ اور اصل واقعہ پر تو ہم علامہ شبلی مرحوم اور علامہ سیّد سلیمان ندوی مرحوم وغیرہ کی زبانی بحث کر چکے  
 گئے۔ انہوں نے جو کچھ بحث کی ہے اور انہوں نے جو اعتراضات کئے ہیں ان کے علاوہ ہمارے ذہن میں مزید  
 نئے سوالات پیدا ہو رہے ہیں۔ لہذا ہم پہلے انہیں پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ شام میں حضور کی زندگی گویہودیوں سے کیا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا؟ اس لئے کہ شام میں اس وقت عیسائیوں  
 کی حکومت تھی۔ اور یہودی وہاں غلامانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اگر کوئی خطرہ پیدا ہو سکتا تھا تو وہ عیسائیوں  
 سے ہو سکتا تھا۔ اور قاری احمد صاحب نے پھر ا کے ذریعہ خطرہ یہودیوں کا بیان کیا۔ اور تلاش کے لئے عیسائیوں  
 کو کھینچ لائے، یہ عجیب دوغلی بالیسی ہے۔ پھر یہ دونوں مصنفین غزوہ موتہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ حضور نے  
 دعوت اسلام کے لئے خط دے کر حارث بن عمر ازدی کو حاکم بصری کی جانب روانہ کیا۔ لیکن اس عیسائی عالم  
 نے انہیں شہید کر دیا۔ جس کی وجہ سے غزوہ موتہ واقع ہوا۔ اور صحیح بخاری کی حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی  
 ہے۔ تو اس حال میں خطرہ یہودیوں کی جانب سے ہوا یا عیسائیوں کی طرف سے گویا یہ بات تو سرسری جھوٹ ہوئی۔

اصل امر یہ ہے کہ جب ان حضرات نے پھر ا کو ایک متقی اور عابد ولی تصور کرتے ہوئے اسے پہلا نمونہ  
 تسلیم کر لیا تھا تو اب یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی قوم کا دفاع نہ کیا جائے۔ لہذا یہ الزام یہودیوں کے سر تھوپا۔ لیکن

ابھی ایک ہی طائفہ تحریر کی تھی کہ اپنی اس تحریر کی کو قطعاً بھول بیٹھے۔ اور دوسروں کا شمار کرتے کرتے خود شکا ہو گئے۔

۲۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ یہ عربی زبانوں سے خطرہ تھا تو آپ نے جملہ کے سلسلہ میں حضرت خدیجہؓ کا مال لے کر شام کے متعدد سفر کئے۔ بین میں سے ایک سفر کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ آخر عالم شباب میں یہ خطرات کیا ایک کیسے دفع ہو گئے؟ اور یہ تمام علامات نبوت کہاں چلی گئیں جو عیسائی دنیا کا ایک ایک پتہ جانتا تھا؟

۳۔ تمام نو مسلمین اس پر متفق ہیں کہ عبد مناف کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ اور باپوں سے منگوائے ہوئے کے باعث سفر وغیرہ سے بھی معذور تھا۔ گھر پر بی بی عطرینا کی بیچ لیا کرتا تھا۔ اس کی تمام زندگی فقر و فاقہ میں گزری۔ حتیٰ کہ اپنی بیوی کو بھی دوسروں کے مکمل پر چھوڑ دیا۔ ایسی صورت میں شام کا یہ تجارتی سفر کیا اس لئے تو وضع نہیں کیا آیا کہ ابوطالب کی خواجگیست ثابت کی جائے۔ اور اسے مومن ثابت کرنے کے لئے راہ ہموار کی جائے۔

۴۔ اگر ابوطالب تاجر تھا۔ اور تجارت کی غرض سے اتنے طویل سفر کیا کرتا تھا۔ تو پھر اپنی اولاد کو دوسروں کے مکمل پر کیوں چھوڑا؟ کیا تعجب۔

۵۔ جب حجاز ارباب نے آپ کی نبوت کو قبول کر لیا۔ اور نبل از نبوت ہی آپ پر ایمان لے آیا تو گویا سب سے پہلا صاحب ایمان وہی ہوا۔ تو حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت خدیجہؓ اور حضرت زید بن حارثہؓ اور دیگر سابقین اسلام کس درجہ میں شامل ہوتے ہیں۔ کیا یہ ان صحابہ کرام پر نفعی تبار نہیں ہے؟ کیونکہ اُسے بھی ایک اور عیسائی ولی کا تذکرہ آ رہا ہے۔ کاش کوئی عالم اور مورخ اس بات کو سوچے کہ کس عمدہ طریقے سے سابقین اہلین کو عیسائیوں سے بھی پیچھے دھکیل دیا گیا ہے۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب و اتوب الیہ۔

۶۔ جب راہ میں شجر و حجر آپ کو سجدہ کر رہے تھے۔ باول سانے کر رہے تھے۔ اور درخت سیالوں کے لئے جھک رہے تھے۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ تمام امور سب اہل قافلہ نے اپنے سانے ہوتے ہوتے دیکھے تھے۔ یا صرف اس واقعہ کے ریلوی کو اپنی تختی سے قبل نظر آتے تھے، اگر سب نے دیکھے تھے تو بعد از نبوت ان میں سے کتنے افراد ایمان لائے۔ اور کون کون اس قافلہ میں شریک تھا؟ اور تو کوئی کیا ایمان لاتا جب وہی شخص ایمان نہ لایا جس کے پیچھے کے لئے یہ تمام کرامات ظاہر ہو رہی تھیں۔ اور اگر پھر ابوطالب کے علاوہ ان مقامات کو کسی اور نے دیکھا تھا تو ابوطالب تو کافر مرا۔ اور پھر اس واقعہ کے بعد پوری تاریخ اسلام میں کہیں تذکرہ

نظر نہیں آتا۔ تو پھر یہ واقعہ راویوں سے کس نے بیان کیا؟

یہ تو وہ چند اعتراضات ہیں جو عقلی طور پر پیدا ہو رہے تھے۔ لیکن علامہ شبلی رحمہ کو اس روایت کی سند پر بھی کچھ اعتراضات ہیں۔ لیکن ہم یہ اعتراضات پیش کرنے سے قبل ضروری تصور کرتے ہیں کہ ترمذی کی روایت کو بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔

ترمذی نے حضرت ابو موسیٰ اشعرمیؓ سے نقل کیا ہے کہ ابو طالب قریش کے سرداروں کے ساتھ شام گیا۔ آپ کے ساتھ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی تھے۔ یہ لوگ جب راسب کے قریب پہنچے۔ تو اس جگہ ان لوگوں نے منزلی کی۔ اور اپنے کجاوے کھول دیئے۔ راسب انہیں دیکھ کر نیچے اترا۔ اس سے قبل یہ لوگ جب اُدھر سے گزرتے تو وہ قطعاً نیچے نہ اترتا اور نہ ان لوگوں کی جانب کوئی توجہ دیتا۔ یہ لوگ تو کجاوے کھولنے میں مشغول تھے۔ اور وہ راسب ان کے درمیان سے گزرتا ہوا۔ حضورؐ کو سیدہ سنیچا۔ اور آپؐ کا ہاتھ ختم کر بولا۔ یہ سیدہ العالمین ہیں۔ رب العالمین کے رسول میں۔ انہیں اللہ تعالیٰ رحمت للعالمین بنا کر بھیجے گا۔ سرداران قریش نے استفادہ کیا کہ انہیں یہ بات کیسے معلوم ہوئی؟ کہنے لگا جب تم گھاٹی سے اتر رہے تھے تو کوئی پتھر اور کوئی درخت ایسا نہ تھا جو سجدہ میں نہ گر گیا ہو۔ اور یہ چیزیں نبی کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتیں۔ اور میں ختم نبوت کو پہچانتا ہوں۔ اور جو سب کی طرح مونڈھے پر ہوگی۔ پھر واپس لوٹ گیا۔ اور ان کے لئے کھانا تیار کیا۔ جب وہ کھانے کر ان لوگوں کے پاس آیا تو اونٹوں کے گلہ میں پہنچے ہی اس نے لوگوں سے کہا کہ اس لڑکے کو بلاؤ۔ آپؐ جب آئے تو آپؐ پر انہیں سایہ کئے ہوئے تھا۔ جب آپؐ لوگوں کے قریب پہنچے تو آپؐ نے دیکھا کہ لوگ درخت کے سایہ میں بیٹھ چکے تھے۔ جب آپؐ بیٹھے تو سایہ نے اُدھر ہی رخ کر لیا۔ راسب یہ دیکھ کر بولا۔ دیکھو سایہ اُدھر ہی ہو گیا ہے۔ ابھی وہ درمیان میں کھڑا نہیں تھیں دے رہا تھا کہ اس بچہ کو روم دے جاؤ کیونکہ اگر رومی اسے دیکھیں گے تو اسے صفات سے پہچان لیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔

چنانکہ روم کی جانب سے سات آدمی آتے نظر آتے۔ وہ ان کی جانب متوجہ ہوا۔ اور ان سے دریافت کیا کس لئے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہونے والا نبی اس شہر میں آیا ہے۔ بلند ہر طرف آدمی اس کی تلاش میں روانہ کئے گئے ہیں۔ ہمیں اس کی آمد کو کہاں خبر ملی تھی تو ہمیں اس جانب روانہ کیا گیا۔ اس نے سوال کیا کہ کیا

تہارے پیچھے تم سے بہتر کوئی فرد نہیں ہے۔ وہ بولے ہمیں تو اس راہ کی جانب بھیجا گیا تھا۔ اس نے سوال کیا اگر اللہ کسی کام کے کرنے کا ارادہ کر لے کیا کوئی شخص اسے روک سکتا ہے؟ وہ بولے نہیں۔ راہب نے کہا اچھا تو لوٹ جاؤ۔ اور خود بھی ان کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اور جاتے جلتے بولا۔ میں تمہیں اللہ کی قسم دیتا ہوں کہ اس کا ولی کون ہے۔ ابوطالب نے کہا میں۔ وہ ابوطالب کو قسمیں دیتا رہا۔ حتیٰ کہ ابوطالب نے آپ کو مکہ لوٹا دیا۔ اور آپ کے ساتھ ابوبکر اور بلال کو بھیج دیا اس راہب نے آپ کے زاد راہ کے لئے ٹیکہ اور زمین دی۔ ترمذی کہتے ہیں یہ حدیث حسن غریب ہے۔ اور ہمیں اس سند سے علاوہ اس کی کوئی اور سند معلوم نہیں۔ ترمذی ص ۱۱۵ ج ۲

ترمذی کی اس روایت سے یہ بات تو ظاہر ہو گئی کہ دشمنی کا خطرہ یہودیوں سے نہ تھا۔ رہا عیسائیوں کا مسئلہ تو جب آپ نے صلح حدیبیہ کے بعد مختلف بادشاہوں کے نام دعوت اسلام کے خطوط لکھے۔ تو شاہ مصر مقوقس، شاہ روم قیصر اور شاہ حبش نجاشی نے اور خیران کے اس وفد نے جو مدینہ آیا تھا۔ اس بات کا اقرار کیا تھا کہ ہم یہ تو جانتے تھے کہ ایب نبی آنے والا ہے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ تھا کہ وہ عرب کی سرزمین سے ہوگا۔ اور ان واقعات کو یہ توفیق خود نقل کرتے ہیں کہ کیا اس قسم کی تمام روایات جھوٹی ہوں جن کی رو سے حضور کی تمام علما کا ان کو علم تھا۔

ربا یہ سوال کہ شجر و حجر نبی کے علاوہ کسی کو سجدہ نہیں کرتے۔ تو وہ نبی کو بھی سجدہ نہیں کرتے۔ وہ تو ان کو سجدہ کرتے ہیں۔ ارشاد الہی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَجْعَلُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُومُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَابُّ الْاٰیۃ۔  
اسے نبی کیا آپ نہیں دیکھتے کہ آسمانوں و زمینوں میں جتنی چیزیں ہیں۔ اور سورج اور چاند اور ستارے اور درخت اور چوہے اُس ذات الہی کو سجدہ کرتے ہیں۔

ایسی صورت میں یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ شجر و حجر حضور کو سجدہ کر رہے تھے۔ اور اتفاق سے اس تمام صورت حال کو دیکھنے اور بیان کرنے والا کافر تھا۔ اور چچا کی یہ اچھی محبت تھی کہ ایسے خطرات کے باوجود آپ کو ابوبکرؓ کے ساتھ واپس کر دیا جو آپ سے سوادہ سال چھوٹے تھے۔ اب یا تو ابوطالب کی عقل ماری گئی تھی یا اس قصے کے

واقعیین کی یہ ابوطالب بھی ان رویوں کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔

عبدالحق محدث دہلوی اپنی شکوہ کی شرح الامعات میں لکھتے ہیں کہ محدثین کہتے ہیں یہ واقعہ کچھ ممکن ہو سکتا ہے اس لئے کہ بلالؓ تو اس وقت تک پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور ابو بکرؓ آپ سے دو سال چھوٹے تھے۔ لہذا یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور بعض محدثین کہتے ہیں یہ روایت باطل ہے۔ حاشیہ ترمذی۔

اب ہم اس روایت پر وہ اعتراضات پیش کرنا چاہتے ہیں جو علامہ شبلی نے سیرت النبیؐ میں کہتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ روایت ناقابل اعتبار ہے۔ اس روایت کے جس قدر طریقے ہیں وہ سب مرسل ہیں۔ یعنی راوی اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا۔ اور اس راوی کا نام بیان نہیں کرنا جو شریک واقعہ تھا۔

اس روایت کا سب سے مستند طریقہ وہ ہے جو ترمذی میں مذکور ہے۔ اس کے متعلق تین باتیں قابل لحاظ ہیں۔

۱۔ ترمذی نے اس روایت کے متعلق لکھا ہے کہ یہ حسن غریب ہے۔ اور ہم اس حدیث کو اس طریقہ کے علاوہ کسی اور طریقے سے نہیں جانتے۔ حسن کا مرتبہ صحیح سے کم ہوتا ہے۔ اور جب غریب بھی ہو تو اس کا مرتبہ اور گھٹ جاتا ہے۔

۲۔ اس حدیث کا ایک راوی عبدالرحمان بن عروان ہے۔ اس کو بہت سے لوگوں نے اگرچہ ثقہ بھی کہا ہے۔ لیکن اکثر اہل فن نے اس کی نسبت بے اعتباری ظاہر کی ہے۔ علامہ ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں کہ عبدالرحمان منکر حدیثیں بیان کرتا ہے۔ جن میں سب سے بڑھ کر منکر روایت وہ ہے۔ جس میں خیر کا واقعہ مذکور ہے۔

۳۔ حاکم نے مستدرک میں اس روایت کی نسبت لکھا ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرائط کے مطابق ہے۔ لیکن علامہ ذہبی نے تخریص المستدرک میں حاکم کا یہ قول نقل کر کے لکھا ہے کہ میں اس حدیث کے بعض واقعات کو موضوع بھٹوٹا اور بنایا ہوا خیال کرتا ہوں۔

۴۔ اس روایت میں مذکور ہے کہ حضرت بلالؓ اور حضرت ابو بکرؓ بھی اس سفر میں شریک تھے۔ حالانکہ اس وقت بلالؓ کا وجود بھی نہ تھا اور حضرت ابو بکرؓ بھی تھے۔



۵۔ اس روایت کے آخری راوی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ ہیں۔ وہ شریک واقعہ نہ تھے۔ اور اوپر کے راوی کا نام نہیں بتاتے۔ ترمذی کے علاوہ طبقات ابن سعد میں جو سلسلہ سند مذکور ہے وہ مرسل یا معضل ہے۔ یعنی جو روایت مرسل ہے اس میں تابعی جو ظاہر ہے کہ شریک واقعہ نہیں ہے کسی صحابی کا نام نہیں لیتا ہے۔ اور جو روایت معضل ہے۔ اس میں راوی اپنے داد پر کے دو راوی جو تابعی اور صحابی ہیں ان کا نام نہیں لیتا ہے۔

۶۔ حافظ ابن حجر روایت پرستی کی بنا پر اس حدیث کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ حضرت ابو بکرؓ اور بلالؓ کی شرکت مباشرت غلط ہے۔ اس لئے مجبوراً اقرار کرتے ہیں کہ اس قدر حصہ غلط ہے۔ جو غلطی سے روایت میں شامل ہو گیا ہے۔ لیکن حافظ ابن حجر کا یہ دعویٰ بھی صحیح نہیں کہ اس روایت کے تمام رواۃ قابل سند ہیں۔ عبد الرحمن بن غزوان کی نسبت خود ان ہی حافظ ابن حجر نے تہذیب التہذیب میں لکھا ہے کہ وہ خطا کرتا تھا۔ اس کی طرف سے اس وجہ سے بھی شبہ پیدا ہوتا ہے کہ اس نے مالک کی روایت نقل کی ہے۔ مالک کی ایک روایت ہے جس کو محدثین جھوٹ اور موضوع خیال کرتے ہیں۔ سیرت النبی ص ۱۸۷ ج ۱

یہ وہ اعتراضات ہیں جو علامہ شبلی نعمانی نے اپنی سیرت النبی جلد اول میں کئے ہیں۔ لیکن اس قصہ پر ابھی اعتراضات کا سلسلہ ختم نہیں ہوا۔ بلکہ شبلی کے شاگرد خاص یعنی سید سلیمان ندوی مرحوم جنہوں نے سیرت النبی کی تکمیل فرمائی ہے۔ تیسری جلد میں موضوع روایات کے ذیل میں اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ یہ روایت اختصار اور تفصیل کے ساتھ سیرت کی اکثر کتابوں میں اور بعض حدیثوں میں مذکور ہے۔ مگر ابن اسحاق اور ابن سعد وغیرہ کتب سیر میں اس کے متعلق جس قدر روایتیں ہیں ان سب کے سلسلہ کزور اور ٹوٹے ہوئے ہیں۔ اس قصہ کا سب سے محفوظ طریقہ سند وہ ہے جس میں عبد الرحمن بن غزوان جو ابو لؤح قزاد کے نام سے مشہور ہے یونس بن ابی اسحاق سے اور وہ ابو جبر بن ابی موسیٰ سے اور وہ اپنے باپ ابو موسیٰ اشعریؓ سے اس کی روایت کرتے ہیں۔

یہ قصہ اس سلسلہ سند کے ساتھ جامع ترمذی، مستدرک حاکم، مصنف ابن ابی شیبہ، دلائل بیہقی اور دلائل ابی نعیم میں مذکور ہے۔ ترمذی نے اس کو حسن غریب اور حاکم نے صحیح کہا ہے۔ استاد مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد طبع اول ص ۱۸۷ ج ۱ طبع دوم ص ۱۸۷ ج ۱ اس روایت پر پوری تفتیش کی ہے۔ اور عبد الرحمن بن غزوان کو

اس سلسلہ میں بحر صرح قرار دیا ہے۔ اور حافظ ذہبی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ اس روایت کو موقوف سمجھتے ہیں۔

۱۔ سب سے اول یہ کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری مسلمان ہو کر کثہ میں ماریہ آئے تھے۔ اور یہ واقعہ اس سے پچاس برس پہلے کا ہے۔ حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ خود انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے ابرار کئی اور شریک واقعہ کی زبان سے اپنا سنایا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ روایت مرسل ہے۔

۲۔ اس واقعہ کو حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ سے ان کے صاحبزادے ابو بکر روایت کرتے ہیں۔ ترمذی کی نسبت کلام ہے کہ انہوں نے اپنے باپ سے کوئی روایت سنی نہیں ہے یا نہیں چنانچہ تدین فن کو اس باب میں بہت کچھ شک ہے۔ امام احمد بن حنبل نے تو اس سے قطع انکار کیا ہے۔ بنا بریں یہ روایت مشغط ہے۔ اس کے سوا ابن سعد نے لکھا ہے کہ وہ ضعیف سمجھے جاتے ہیں۔

۳۔ ابو بکر بن یونس بن ابی اسحاق اس واقعہ کو نقل کرتے ہیں۔ گو متعدد محدثین نے ان کی توثیق کی ہے۔ تاہم عام فیصلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف ہیں، یہی کہتے ہیں کہ ان میں سخت بے پردائی تھی۔ شعبہ نے ان پر تردید لیس کا الزام قائم کیا ہے۔ امام احمد ان کی اپنے باپ سے روایت کو ضعیف اور عام روایتوں کو مضطرب اور اسی ویسی کہتے ہیں۔

ابو حاتم کی مائتے ہے کہ گو وہ راست گو ہیں لیکن ان کی اپنے باپ سے حدیث حجت نہیں۔ ساجی کا قول ہے کہ وہ پکے ہیں۔ اور بعض محدثین نے ان کو ضعیف کہا ہے۔ ابو حاکم کا بیان ہے کہ ان کو اکثر اپنی روایتوں میں وہم ہو جاتا تھا۔

۴۔ چوتھا داؤدی عبد الرحمن بن غردان ہے۔ جس کا نام مستدرک اور البو نعیم میں البو نوح قرار ہے۔ اس کو اگرچہ بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے۔ تاہم وہ متعدد منکر روایتوں کا داوی ہے۔ ہمالیک دالی جھوٹی حدیث اسی نے روایت کی ہے۔ ابو احمد حاکم کا بیان ہے کہ اس نے امام لیث سے ایک منکر روایت نقل کی ہے بلکہ حبان نے لکھا ہے کہ وہ غلطیل کرتا تھا اور امام مالک اور لیث کی طرف سے ہمالیک دالی حدیث نقل کرنے کی وجہ سے اس کی طرف سے دل میں خلجان ہے۔

۵۔ حافظ ذہبی میزان میں لکھتے ہیں کہ عبد الرحمن بن غردان کی منکر روایتوں میں سب سے زیادہ منکر علاء کا قصہ ہے۔ اس قصہ کے غلط ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کی روایت میں ہے کہ ابو بکر رضی اللہ عنہ نے بلال رضی اللہ عنہ کے ساتھ کر دیا۔ حالانکہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اس وقت بچہ تھے۔ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی نہ ہوئے تھے۔

۶۔ حاکم نے مستدرک میں اس واقعہ کو نقل کر کے لکھا ہے۔ کہ یہ بخاری و مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔  
حافظ ذہبی مستدرک کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ میں اس روایت کو بتایا ہوا خیال کرتا ہوں کہ چونکہ اس میں بعض  
واقعات غلط ہیں۔

۷۔ امام سیوطی اس کی صحت کو صرف اس حد تک تسلیم کرتے ہیں کہ یہ قصہ ابن سیر میں مشہور ہے۔ سیوطی نے قصہ اس  
میں امام موصوف کے کسی فقرہ سے یہ لکھا ہے کہ وہ بھی اس سے ضعف کے قائل ہیں۔ اس لئے اہل روایت میں  
اس حد و غیرہ سے چند اور سلسلے نقل کئے ہیں۔ مگر قابل ہیں۔ اسے کوئی ہم انصاف نہیں۔

ہمارے نزدیک اس روایت میں ایک بڑھاپہ اور بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ کسی کتاب میں تو یہ ہے کہ ابوطالب  
نے آپ کو ابو بکرؓ اور بلالؓ کے ساتھ واپس کر دیا۔ اور کسی روایت میں ہے کہ ابو بکرؓ نے آپ کو واپس کر دیا۔  
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ کو اس سفر میں کون ایسے ساتھ لے گیا تھا اگر کیسے ہو کہ ابوطالب سے گریا تو  
ہمارے نزدیک پھر اس سے زیادہ احمق کوئی انسان نہ تھا جس نے ایسے بے طہارت کے باوجود اور اتنے طویل سفر میں  
جو تقریباً ایک ماہ کا تھا ایک ایسے بچہ کو آپ کی حفاظت کے لئے ساتھ کیا جو خود آپ سے دو سال چھوٹا تھا۔ اور  
اگر یہ کہتے ہو کہ آپ ابو بکرؓ کے ساتھ گئے تھے۔ لہذا ابو بکرؓ نے آپ کو واپس کر دیا تو گویا سالار قافلہ ابو بکرؓ ہوئے جو  
خود بچہ تھے پھر اس واقعہ میں ابوطالب جیسے لنگڑے کو گھسیٹ لے کر کیا ضرورت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بچوں کا  
کوئی تقریبی پردہ گرام ہو۔ کیونکہ یہ قصہ خود ایک تفریح سے زیادہ نہیں۔ ہمیں تو افسوس اس کا ہے کہ ہمارا قیمتی وقت  
اس نوعیت کے پیچھے برباد ہوا۔ اور دماغ سوزن علیحدہ رہی۔ لہذا اب ہم اس قصہ کو حکیم فیض عالم شہید کے چند  
الفاظ پر ختم کرتے ہیں حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

وضاعین نے ابوطالب کی داستان اس چابک دستی سے تیار کی کہ ابوطالب کی ہمراہی میں نبی علیہ السلام کا  
سفر شام تک تخلیق کر لیا۔ اور پھر عیڑا اسب کا قصہ گھر گھر عجیب گل نشانیوں کیس۔ حالانکہ ابوطالب بے چارے سفر  
کے قابل ہی نہ تھے۔ حقیقت مذہب شیعہ ص ۱۵۵

## شام کا ایک اور سفر نسٹورا ولی کی کہانی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت خدیجہ کا مال تجارت لے کر متعدد بار شام اور یمن تشریف لے گئے مگر نسٹورا کا بیان ہے کہ آپ ایک بار مصری بھی تشریف لے گئے تھے۔ لیکن اب وہاں ایک نیا ولی گدی نشین تھا۔ جس کا نام نسٹورا تھا۔ اب یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ پہلا موتس ولی بخیرہاں زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ اور نسٹورا نامی ولی نے بخیرہاں کی جگہ سنبھال لی تھی۔ یا اس کی کوئی ہی گدی تھی جس پر یہ براجمان تھا۔ ہم تو بہر صورت صرف اتنی بات جانتے ہیں کہ عیسائی متبعین ان ہی دو واقعات کو پیش کر کے یہ کہا کرتے ہیں کہ محمدؐ نے دنیا کو جو کچھ بھی تعلیم دی اور قرآن کی صورت میں جو کتاب پیش کی وہ ہمارے ان دیوں سے سیکھ کر دی تھی۔ گویا وہ ایسے صاحب کرامات بزرگ تھے کہ ایک ہی نظر میں انہوں نے سب کچھ سکھا دیا۔ خیر یہ باتیں تو ہمارے موضوع سے علیحدہ ہیں ہمارے نزدیک تو نفسِ ناقصہ ہی کا کوئی وجود نہیں۔ آئے پہلے اصل کہانی قاری احمد علی بھٹی کی زبانی سُن لیجئے۔ قاری صاحب لکھتے ہیں۔

آپ کے ساتھ اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کا غلام میسرہ بھی تھا۔ اُس کی زبانی روایت ہے کہ ہر جگہ آپ پر ابرساہ انگن رہتا کبھی فرشتے اپنے پروں کا سایہ کرتے تھے۔ ایک عیسائی خانقاہ کے قریب جہاں نسٹورا نامی نائب رہتا تھا۔ آپ نے ایک درخت کے نیچے آرام کیا۔ رابب نے یہ دیکھا تو میسرہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اس نے نام و نشان بتلایا۔ رابب نے کہا کہ اس درخت کے نیچے پیٹر کے سوا اور کوئی نہیں ٹھہرا ہے۔ پھر دریافت کیا کہ کیا ان کی آنکھوں میں ہمیشہ یہ سرخی رہتی ہے۔ غلام نے اثبات میں جواب دیا۔ رابب نے کہا تو یقیناً یہ آخری زمانہ کا یغیر ہے۔ تم کبھی اس کی رفاقت نہ چھوڑنا۔ اسی درمیان میں ایک شخص سے خرید و فروخت میں کوئی جھگڑا پیش آیا۔ خریدار نے آپ سے کہا کہ اس کی قسم کھاؤ۔ آخر حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں ان

کی قسم نہیں کھاتا۔ راہب نے میسرہ سے کہا کہ قسم یہ مغیرہ ہے۔ اس کی صفیں ہماری کتابوں میں لکھی ہیں۔  
 میسرہ کا بیان ہے کہ جب درپہر کی سخت دھوپ پڑتی تو وہ فرشتے آپ پر سایہ کرتے۔ جب آپ تجارت سے فارغ ہو کر میکہ آ رہے تھے۔ اتفاق سے حضرت خدیجہؓ اُس وقت چند ہیلیوں کے ساتھ کوٹھے پر تھیں حضرت خدیجہؓ کی آپ پر نظر پڑی کہ آپ اونٹ پر سوار ہیں۔ اور وہ فرشتے آپ پر سایہ افکن ہیں۔ انہوں نے یہ نظر اپنی ہیلیوں کو دکھایا۔ اور میسرہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ میسرہؓ نے بجا پورے سفر میں یہی تماشا دیکھا آیا ہوں۔ اور اس کے بعد اُس نے سطورا راہب کی گفتگو بھی خدیجہ سے دہرائی۔ مدارع النبوت۔ تاریخ مسلمانان عالم ص ۱۲۲ ج ۲

اس واقعہ سے یہ بات تو پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ شام میں آپ کو کسی سے کوئی خطرہ نہیں تھا۔ نہ یہود کی جانب سے اور نہ عیسائیوں سے۔ گویا پہلا واقعہ تو سراسر جھوٹ تھا۔ کہ آپ کو شام میں کوئی خطرہ ہے۔ سچ کہتے ہیں کہ دروغ گور حافظہ نباشد۔

دوئم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جب کوئی فرشتہ آتا تو آواز انسانی صورت میں آتا۔ یا نظر آئے بغیر پس سے اس کی آواز آتی۔ عام دستور وحی یہی تھا۔ لیکن یہ میسرہ نامی سرد و تمام سفر میں بر ملا اپنی آنکھوں سے فرشتوں کو دیکھتا رہا۔ حالانکہ غیر نبی کو فرشتہ نظر نہیں آتا۔ ہاں غیر نبی کو سوت کا فرشتہ ضرور نظر آتا ہے چنانچہ اس لحاظ سے تو اس کا مقام نبوت سے بھی بالاتر ہوا۔ اور یہ کیسے معلوم ہوا کہ جو چیز سایہ کئے ہوئے ہے وہ فرشتہ ہے۔ کیا کفار عرب کو فرشتوں کی شناخت کا کوئی مخصوص علم عطا ہوا تھا؟

سوئم۔ اس مخصوص درخت کے نیچے ایسا رہی قیام کیا کرتے تھے۔ کہ یہ سطورا نامی ولی کا مشاہدہ تھا۔ پھر نورو اس کی عمر شیطان کی عمر تھی۔ یا اس درخت کا آتا یہ بھی انجیل میں موجود تھا۔ یا اس درخت کی یہ کرات تھی کہ جو بھی مس کے نیچے بیٹھ جاتا وہ نبی بن جاتا؟

چہارم۔ میسرہ کا بیان ہے کہ حضرت خدیجہؓ ہیلیوں کے ساتھ کوٹھے پر چڑھ چکی تھیں۔ اور ہیلیوں کو بھی انہوں نے یہ نظر دکھایا تھا۔ کیا کوئی مورخ یہ ثابت کر سکتا ہے کہ حضرت خدیجہؓ کی ننان ہیلی آپ کی نبوت

کے بعد آپ پر اس لئے ایمان لائی ہو کہ اس نے یہ منظر دیکھا تھا۔ اور پھر اس نے یہ واقعہ دوسروں سے بھی بیان کیا ہو۔

بخم۔ جب اس راہب نے مسرہ کو یہ وصیت کی تھی کہ تو ان کی رفاقت نہ چھوڑنا۔ اور وہ غیب کے مکاشفات دیکھتا آیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود میں حضور کی ملی زندگی میں کسی مسرہ نامی صحابی کو کہیں کوئی تذکرہ نظر نہیں آتا۔ کیا اسے زمین کھائی یا آسمان نگل گیا تھا۔ یا یہ تمام بتائبات دیکھنے کے باوجود کافر رہا اور گناہ کی سوت گر گیا؟

ششم۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت خدیجہ کی حضور سے شادی ہوئی تو حضرت خدیجہ کی عمر چالیس سال تھی۔ ذرا دل پر ناتھ رکھ کر بتا دیا کہ یہ کوئی چٹھنے اور سہیلیوں سے اشارے بازی کرنے کی عمر ہے۔ پھر مزید لطف یہ ہے کہ چالیس سال کی عمر تک تو حضرت خدیجہ کے یہاں پہلے خاوند سے صرف دوپٹے ہوئے اور چالیس سال کی عمر کے بعد حضور سے سات بچے ہوئے۔ کیا یہ بھی کوئی معجزہ تھا یا ان محوسی مورخین نے حضرت خدیجہ کی عمر اس لئے بڑھائی تاکہ یہ کہنے کے لئے راہ سوار ہو جائے کہ حضرت فاطمہ کے علاوہ آپ کی کوئی صاحبزادی نہیں۔ ہمیں تو دال میں کالا نظر آتا ہے۔

آئیے اب ذرا سید صاحب کی زبانی اس کی سند کا حال بھی سن لیجئے۔

یہ واقعہ ابن اسحاق، ابن سعد، البخاری اور ابن عساکر میں ہے۔ ابن اسحاق میں اس روایت کی کوئی سند نہیں ہے۔ بقیہ کتابوں میں اس کی سند یہ ہے کہ ان کتابوں کے مصنفین واقفی سے اور واقفی موسیٰ بن شیبہ سے اور وہ عمیرہ بنت عبداللہ بن کعب سے اور عمیرہ ام سعد بنت کعب سے اور وہ یحییٰ بن مینہ صہبائی کی بہن نفیثہ بنت مینہ سے جو صحابہ تھیں روایت کرتے ہیں۔ واقفی کی بے اعتباری تو متلج بیان نہیں اس کے علاوہ موسیٰ بن شیبہ کی نسبت امام احمد بن حنبل کہتے ہیں اس کی حدیث منکر ہیں۔ عمیرہ بنت کعب اور ام سعد کا حال معلوم نہیں۔ سیرت النبی ص ۶۷ ج ۳۔

یعنی سند کے لحاظ سے یہ واقعہ تو پہلے واقعہ سے بھی گزرا ہے اور اس لحاظ سے خلاف عقل بھی ہے کہ اگر اسی صورت پیش آتی تو تمام اہل قاعدہ کے مشاہدہ میں یہ بات آتی کہ آپ پر فرشتے سایہ کئے ہوئے ہیں۔ اور جب ان کے مشاہدہ میں آتی تو مکہ میں جگہ جگہ اس کے چہرے ہوئے۔ جس کا تقاضا یہ ہے کہ جب آپ نے دعوائے نبوت کیا تو لوگوں کو یہ واقعات یاد آنا چاہیے تھا اور متعدد افراد کو اس واقعہ کے تعلق سے اسلام لانا چاہیے تھا لیکن ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ جو اس واقعہ کے جھوٹ ہونے کا ثبوت ہے۔

---

## قریش کی دعوت

مؤرخین و اہل سیر لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان صفا کے چند روز بعد حضرت علیؑ کو حکم دیا کہ دعوت کا سامان کرو، تمام خاندان عبدالمطلب اور دیگر رشتہ داروں کو مدعو کیا گیا۔ تقریباً چالیس افراد نے دعوت میں شرکت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا: میں تم لوگوں کے لئے وہ چیز لے کر آیا ہوں جو تمہارے لئے دین و دنیا دونوں کی کفیل ہو، میں نہیں جانتا کہ عرب بھرمیں کوئی شخص اپنی قوم کے لئے ایسا نادر تحفہ لے کر آیا ہو کون ہے جو اس بارگاہوں کے اٹھانے میں میرا ساتھ دے۔ اور میری رفاقت اختیار کرے۔

تمام مجلس میں سنا تھا۔ دفعہ حضرت علیؑ نے اٹھ کر کہا: گو مجھ کو آشوبِ حشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی میں اور گو میں سب سے نوعربوں۔ تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا۔

قریش کے لئے یہ ایک حیرت انگیز منظر تھا۔ کدہ لوگ جن میں سے ایک سیرہ سالہ نوجوان ہے دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی لیکن آگے چل کر زمانے نے بتا دیا کہ یہ سراسر کج تھا۔ سیرت النبی ص ۲۱ ج ۱۔ تاریخ مسلمانان عالم ص ۱۶ ج ۲

علامہ شبلی مرحوم نے معلوم کس روی میں اس واقعہ کو نقل کر گئے۔ لیکن اُن کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کے حاشیہ میں تحریر کیا۔

یہ روایت خبری ص ۱ ج ۳ اور تفسیر ص ۹۹ میں عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمر کے واسطے سے مروی ہے۔ یہ بلاشبہ صحیح اور مستردک ہے۔ اور دوسرا جہ مذہب اس روایت میں اور بھی وجوہ ضعیف بلکہ وجوہ وضع موجود ہیں۔ سید صاحب نے تو حقیقت حال اُسادوں اشاروں میں بیان کی تھی۔ لیکن قاری احمد علی بھٹی کی رگِ خواجگیت اور رگِ تادریت اسے برداشت نہ کر سکی۔ بے چارے اسی واقعہ کی صحت کے بارے میں تو کیا لکھتے لیکن سید صاحب پر اپنے دل کا غبار نکالتے بیٹھ گئے لکھتے ہیں۔

مولانا شبلی نے بھی اس روایت کو سیرت النبی جلد اول میں درج کیا ہے۔ جو طبری کی تاریخ اور تفسیر سے



ماخوذ ہے۔ لیکن سید سلیمان ندوی نے استاد کی تحریر کردہ روایت کو ضعیف کہا ہے اور حاشیہ میں لکھا ہے کہ اس کے راویوں میں عبد الغفار بن قاسم شعی مژدک ہے۔ دوسرا ہند بھب ہے جس کا نام منہال بن عمرو ہے۔

نقد و نظر اچھی چیز ہے۔ مگر اتنی سختی بھی ٹھیک نہیں کہ مولانا شبلی کی برسوں کی محنت اور کاوش کو غیر معتبر کہہ دیا جائے۔ تاریخ مسلمان عالم ص ۱۶۱ ج ۲

قاری صاحب سے پہلی عرض تو یہ ہے کہ کلام اللہ کے علاوہ وہ کون سی کتاب ہے جس کے ہر حرف پر آنکھیں بند کر کے ایمان لایا جاسکے۔ یا روئے زمیں کی وہ کون سی کتاب ہے جس کا ہر حرف غلط ہو۔ ظاہر ہے کہ کسی فن کی بھی کتاب ہو۔ وہ انسان کی کد و کاوش کا نتیجہ ہوتی ہے۔ انسان کا علم بھی محدود ہے۔ اس کی عقل بھی محدود ہے اور اس کی سوچ بھی محدود ہے۔ لہذا نقد و نظریات لازمی شے ہے۔ ورنہ کسی باطل شے کو باطل قرار دینا ممکن نہ ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور میں کچھ نہ کچھ ایسے افراد ضرور موجود رہے جنہوں نے غلط چیزوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھا۔ سید صاحب کی اس تحریر سے علامہ شبلی کی کاوش پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ اس لئے کہ ان کا مقصد بھی تحقیق تھی۔ اور انہوں نے بہت سی ایسی کہانیوں کا رد کیا۔ جو ان کے نزدیک غلط تھیں۔ پھر بھی آپ نے انہیں اپنی کتاب میں درج کیا۔ حتیٰ کہ اس واقعہ کو بھی۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ آپ کو شبلی سے کوئی ہمدردی نہیں۔ آپ کو تکلیف اس بات کی ہے کہ جھوٹ کو جھوٹ کیوں کہا گیا۔ اور خاص طور پر اس واقعہ کو، کیونکہ اس واقعہ کو تو آپ حضرات فضیلت علیٰ میں نقل کرتے ہیں اس لئے آپ کی رگِ قادریت اسے برداشت نہ کر سکی۔

آئیے پہلے ہم سید صاحب مرحوم کے اشارات کی وضاحت پیش کر دیں پھر بقیہ گفتگو ہوگی۔

اس روایت کا ایک راوی منہال بن عمرو الکوفی ہے۔ اس نے کسی صحابی سے کوئی روایت منہال بن عمرو: نہیں سنی۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں یہ ناقابل اعتبار ہے۔ جو زبانی اپنی ضعف میں لکھتے ہیں جو ہند بھب تھا۔ ابن حزم نے اس پر مبنی اعتراض کیا ہے۔ شعبہ نے اس کی روایت ترک کر دی تھی۔ مسلم نے بھی اس کی روایت نہیں لی۔ میزان ص ۱۹۲ ج ۲۔

اس صحابی کو اگر نقد بھی تسلیم کر لیا جائے۔ تب بھی یہ روایت قابل قبول نہ ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے اوپر کے راوی بیان نہیں کئے۔ اس طرح ایک تابعی اور ایک صحابی سند سے غائب ہے۔ اور جس روایت سے دو

راوی چھوٹ جائیں اسے اصطلاح محدثین میں معضل کہا جاتا ہے۔ اور معضل روایت بہترین درجہ کی ضعیف سمجھی جاتی ہے۔ اس منہال سے اس روایت کو نقل کرنے والا عبد الغفار بن قاسم ہے۔ اس کا حال بھی ملاحظہ ہو۔ امام ذہبی میزان میں لکھتے ہیں۔

اس کی کنیت ابو مریم الانصاری ہے۔ ذہبی کہتے ہیں۔ یہ ثقہ نہیں ہے۔ بلکہ رافضی ہے۔

**عبد الغفار بن قاسم** | امام علی بن اللہ یعنی جوف بن رجال میں بخاری مسلم، ابو داؤد و دار نسائی کے استاد ہیں فرماتے ہیں۔ یہ شیعوں کا رئیس (مجتہد) تھا۔ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ یہ کچھ نہیں ہے۔ امام بخاری کہتے ہیں یہ محدثین کے نزدیک قوی نہیں۔

امام شعبہ کا بیان ہے کہ میں نے ابو مریم کی ایک بات پر سماک الحنفی کو یہ الفاظ کہئے مَسَا لَہُ اللہ کی قسم تو جھوٹ بولتا ہے۔

عبد الواحد بن زیاد کا بیان ہے کہ ابو مریم نے ایک روز لوگوں کے سامنے قرآن کی ایک آیت کی تفسیر کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی امت کے اعمال دیکھنے کے لئے دنیا میں دوبارہ تشریف لائیں گے۔ میں نے اس سے کہا تو جھوٹ بولتا ہے۔ وہ ڈھیٹ ہی کر بولا کہ تو مجھے جھٹلاتا ہے۔

ابو داؤد و طیالسی کا بیان ہے کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ابو مریم جھوٹا ہے میں اس سے ملا ہوں۔ اور میں نے اس کی باتیں سنی ہیں۔ اس کا نام عبد الغفار بن قاسم ہے۔

امام احمد بن حنبل کا ارشاد ہے کہ ابو عبیدہ سے احادیث سننے جایا کرتے تھے لیکن جب کبھی وہ ابو مریم کی روایات بیان کرنا چاہتے تو لوگ شور مچا دیتے تھے کہ ہم اس کی کوئی روایت سننا نہیں چاہتے۔ نیز امام احمد یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عثمانؓ کی برائیوں میں روایات بیان کیا کرتا تھا۔

ابو حاتم اور نسائی کہتے ہیں یہ متروک الحدیث ہے۔ عفا نے بھی اس کی روایت قبول نہیں کی۔ امام شعبہ نے اس سے ابتداء میں روایات سُنی تھیں۔ لیکن جب اُن پر اس کا جھوٹ کھلا تو انہوں نے اس سے روایت لینا چھوڑ دیا۔ ابو مریم ۱۷۰ تک زندہ رہا۔ میزان الاعتدال ص ۶۲ ج ۲

ان تمام بیانات سے یہ بات تو واضح ہو گئی کہ یہ روایت عبد الغفار بن قاسم ابو مریم الانصاری کی وضع کردہ ہے۔

اس نے حضرت علیؓ کی شان بڑھانے کے لئے یہ روایت وضع کی۔ لیکن اپنی اس موضوع کہانی میں چند ایسے نقصان چھوڑ دیئے کہ اگر اس روایت کو بیان کا سند صحیح بھی فرض کر لیا جائے۔ تب بھی مستوی اعتبار سے یہ درست نہ ہوگی۔ غالباً اسی نے سید صاحب نے یہ جملہ تحریر فرمایا کہ اس کے موضوع ہونے کی اور بھی وجوہات ہیں۔  
 آئیے چند وجوہات ہم بھی پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ راوی یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ حضرت علیؓ یحییٰ بن یسے آشوب چشم کے مریض تھے۔ گویا ان کا یہ مرض دائمی تھا۔ حالانکہ ان کو یہ مرض فتح خیبر کے وقت لاحق ہوا تھا۔ اور کسی اور موقع پر کسی نے بھی ان کی اس دائمی بیماری کا تذکرہ نہیں کیا۔

۲۔ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس وقت تک کسی نے ایمان قبول نہیں کیا تھا۔ حالانکہ اس وقت تک تیس سے زیادہ افراد ایمان قبول کر چکے تھے۔ خود خاندان عبدالمطلب میں حضرت علیؓ کے بڑے بھائی حضرت جعفرؓ اور ان کی زوجہ سمیرہ بنت عیسیٰ، عبیدہ بن حاشم بن عبدالمطلب اور حضرت عباسؓ کی زوجہ ام الفضلؓ ایمان قبول کر چکی تھیں۔ اسی طرح حضورؐ کی صاحبزادیاں۔ بہار بی میں شرف باسلام ہو گئی تھیں۔ گویا یہ روایت ان تمام صحابہ اور صحابیات پر تبر ہے۔

۳۔ اس میں اختلاف ہے کہ اسلام کے وقت حضرت علیؓ کی عمر کیا تھی۔ کوئی پانچ، کوئی سات، کوئی نو، کوئی گیارہ اور کوئی تیرہ بیان کرتا ہے۔ لیکن جعفر بن محمد کا قول ہے کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے وقت عمر اٹھادس سال تھی۔ ایک روایت یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ جنگ بدر کے وقت حضرت علیؓ کی عمر بیس سال تھی۔ اور ایک روایت ہمیں یہ بھی نظر آتی ہے کہ ایک بار حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ میں اس عمر کے مسئلہ پر گفتگو چھڑی ہوئی تھی۔ کہ علیؓ بڑے ہیں یا فاطمہؓ، فاطمہؓ کا دعویٰ تھا کہ میں بڑی ہوں۔ حضرت علیؓ کے چچا حضرت عباسؓ نے سن کر یہ فیصلہ دیا کہ علیؓ فاطمہؓ سے چار پانچ روز بڑے ہیں۔ اور فاطمہؓ فوت سے پانچ سال قبل پیدا ہوئیں۔ ان تینوں واقعات سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ بعثت رسول کے وقت پانچ سال کے اور اس واقعہ کے وقت آٹھ سال کے بچہ تھے۔ اسی لئے راوی کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی کہ لوگ حضرت علیؓ کی بات پر نہ منے لگے۔ اس طرح یہ حضرت علیؓ کی ذات پر ایک طنز بھی ہے۔ الغرض اس واقعہ کی کوئی کل سیدھی نہیں۔

اس تمام تفصیل سے ایک بات ضرور سامنے آتی ہے کہ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ حضور نے اُن کی پرورش کی اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن ایک دعویٰ یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے اسلام لائے۔ پانچ سال کی عمر ایمان لانے کی نہیں ہوتی۔ اس وقت تو بچہ کو ان باتوں کا ہوش بھی نہیں ہوتا۔ لیکن ایک جانب ان کے ایمان کا خوب ڈھنڈورا پیٹا جاتا ہے۔ اور دوسری جانب حضورؐ کی صاحبزادیوں کے ایمان لانے کا ذکر تاریخ و سیر کی کسی کتاب میں موجود نہیں۔ حالانکہ حضرت زینبؓ اس وقت جوان تھیں، اور حضرت رقیہؓ بھی جوان ہونے کے قریب تھیں۔ اور حضرت رقیہؓ ہجرت حبشہ سے قبل حضرت عثمانؓ کی زوجیت میں آچکی تھیں۔ اور ہجرت حبشہ نبوت کے پانچویں سال ہوئی۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ کے ایمان لانے کا کوئی مورخ ذکر نہیں کرتا۔ اگر کسی وجہ سے یہ کہہ دیا جائے کہ ان کی پرورش حضورؐ نے فرمائی تھی۔ اور وہ حضور کے رتبہ میں رہی، ہوتی تھیں۔ لہذا اس نے اُن کے ایمان کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ تو حضرت علیؓ نے بھی حضور کے یہاں پرورش پائی تھیں۔ لہذا آپ کے ایمان کے تذکرہ کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ محدثین نے کسی جگہ بھی حضرت علیؓ کے ایمان کا تذکرہ نہیں کیا۔

ہاں ہم اپنے تاریخی کو ایک لطیفہ ضرور سنا چکاتے ہیں کہ ایک جانب سبائی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ ہم عمر تھے۔ دوسری جانب یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ نبوت کے پانچ سال بعد پیدا ہوئیں۔ اس لحاظ سے اس واقعہ دعوت کے دو سال بعد حضرت علیؓ پیدا ہوتے ہیں۔

پھر یہ سبائی ایک جانب یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ معراج کے بعد پیدا ہوئیں۔ اور دراصل ان کی پیدائش جنت کا ایک سیب کھانے کے باعث ہوئی تھی۔ معراج، ہجرت مدینہ سے ایک سال قبل ہوئی ہے۔ گویا حضرت علیؓ اور حضرت فاطمہؓ کی شادی کے وقت عمر صرف تین سال تھی۔ اس طرح جنگ بدر بھی حضرت علیؓ کے ہاتھ سے گئی۔

ان کے بعض مجتہدین اس کے قائل ہیں کہ حضرت فاطمہؓ کی عمر بہت زیادہ تھی۔ حتیٰ کہ شادی کے وقت بوجھ معلوم ہوتی تھیں۔ اور اسی سبب سے لوگ انہیں ام ابیہا (یعنی اپنے باپ کی ماں) کہہ کرتے تھے۔ تفصیل کیلئے آیات بنیات اور مولانا عبد الشکور لکھنوی کی کتابیں ملاحظہ فرمائیں۔ ہم تو صرف یہی عرض کر سکتے ہیں کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیبیھی۔

## حضرت عمرؓ کا اسلام

حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ جو تمام کتب سیر اور کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ اور ہر مولوی برہنہ زبر جسے لگا کر سنا ہے۔ جس پر ہر شخص سردھنسا نظر آتا ہے۔ اس واقعہ کو سیاتیوں نے اتنی شہرت دی ہے کہ علامہ شبلی جیسے مؤرخ بھی اس مغالطہ کا شکار ہو گئے۔ اور ان کی اس جانب توجہ بھی نہ ہوئی کہ اس واقعہ کی سند کا مطالعہ کر لیتے۔ یا اس واقعہ میں جو ہر بھڑا ہوا ہے اسی پر نظر ڈال لیتے۔ وہ بھی اس مشہور عام قصہ کو الفاظ روق اور سیرت النبیؐ میں یا اس الفاظ نقل کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا تیسواں سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے حضرت عمرؓ کے گھرانے میں زید بن عمرو بن نفیل کی وجہ سے توحید کی آواز نا مانوس نہیں رہی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے زید کے بیٹے سعیدؓ کا نکاح حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ سے ہوا تھا۔ اس تعلق سے فاطمہؓ بھی مسلمان ہو گئیں۔ لیکن اسی خاندان میں ایک اور معزز شخص نعیمؓ بن عبد اللہ نے بھی اسلام قبول کر لیا تھا لیکن حضرت عمرؓ بھی تک اسلام سے بیگانہ تھے۔ ان کے کانوں میں جب یہ صدا پہنچی تو سخت برہم ہوئے۔ یہاں تک کہ قبیلے میں جو لوگ اسلام لا چکے تھے ان کے دشمن بن گئے۔ لیکن ان کے خاندان کی کنیز تھی جس نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس کو بے تحاشا مارتے اور مارتے مارتے تھک جاتے تو کہتے کہ دم لے لوں، پھر ماروں گا۔ لیکن کسے سوا اور جس جس پر قابو چلتا تھا زور و کوب سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ لیکن اسلام کا نشہ ایسا تھا کہ جس کو چڑھ جاتا تھا اترتا نہ تھا ان تمام سختیوں پر ایک شخص کو بھی وہ اسلام سے بد دل نہ کر سکے۔ آخر مجبور ہو کر نوحہ خداوند بنوئی صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا۔ تلوار کمر سے لگا کر سیدھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف چلے۔ کارکنانِ قضا نے کہا۔ عوامد آں یارے کہ مامی خواستیم۔

راہ میں اتفاقاً نعیمؓ بن عبد اللہ مل گئے۔ ان کے تیور دیکھ کر پوچھا خبر ہے، بلوے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ کرنے جاتا ہوں۔ انہوں نے کہا پہلے اپنے گھر کی خبر لو۔ خود تباری، بہن اور بہنوئی اسلام لا چکے ہیں۔

نور اپنے اور بہن کے ہاں پہنچے۔ وہ قرآن پڑھ رہی تھیں۔ ان کی اسٹ پائر چپ بروجس اور قرآن کے  
 اجزا چھپائے لیکن آواز ان کے کانوں میں پڑی تھی۔ بہن سے پوچھا یہ کیا آواز تھی۔ بولیں کچھ نہیں، انہوں نے  
 کہا میں اس چکا ہوں تم۔ دونوں رتہ ہو گئے ہو۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئیں۔ اور جب ان  
 کی بہن خاوند کو بچانے کو آئیں تو ان کی بھی خبری۔ یہاں تک کہ ان کا جسم بہو بہان ہو گیا لیکن اسلام کی محبت  
 اس سے بالاتر تھی۔ بولیں کہ عمر بنوین آئے کر دیں، لیکن اسلام اب دل سے نہیں کل سکتا۔ ان الفاظ نے حضرت  
 عمرؓ کے دل پر خاص اثر کیا۔ بہن کی طرف محبت کی نگاہ سے دیکھا۔ ان کے جسم سے خون جاری تھا۔ دیکھ  
 کر اور بھی اُبت ہوئی۔ فرمایا۔ تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھ کو بھی سناؤ۔ غار نے قرآن کے اجزا سامنے لاکر  
 رکھ دیئے۔ اٹھا کر دیکھا تو یہ سورت تھی۔

سَبِّحْ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ  
 وَ عَمَّا يُغْشٰی الْعَرْشِ الْعَلِیْمِ۔ الْحَمْدُ  
 آسمانوں اور زمینوں میں عتیٰ بھی اسیا ہیں  
 سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ اور وہ غائب  
 حکیم ہے۔

ایک ایک لفظ پر ان کا دل مرعوب ہوتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ جب اس آیت پر پہنچے۔  
 فَارْتَضُوا لِلّٰهِ وَرَسُولِهِ  
 تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ  
 تو بے اختیار پکارا اٹھے۔ اشہدان لا الہ الا اللہ واشہدان محمد اسر حول اللہ۔  
 یہ وہ زمانہ تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ارقمؓ کے مکان میں جو کوہ صفا کی تلی میں واقع تھا  
 پناہ گزیں تھے۔ حضرت عمرؓ نے آستانہ مبارک پر پہنچ کر دستک دی چونکہ شمشیر کف گئے تھے۔ صحابہ کو تردد  
 ہوا لیکن حضرت امیر حمزہؓ نے کہا آئے دو، مخلصانہ آیا ہے تو بہتر ہے۔ ورنہ اسی کی تلواریں اس کا سر قلم کر دوں  
 گا۔ حضرت عمرؓ نے اندر قدم رکھا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود آگے بڑھے۔ اور ان کا دامن پکڑ کر فرمایا۔  
 کیوں عمرؓ کس ارادے سے آیا ہے۔ نبوت کی پر جلال آواز نے ان کو کپکپا دیا۔ نہایت حضور کے ساتھ  
 عرض کیا کہ ایمان لائے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بے ساختہ اللہ اکبر پکارا اٹھے اور ساتھ ہی تمام  
 صحابہ نے مل کر اس زور سے اللہ اکبر کا نغہ مارا کہ مکہ کی تمام پیٹریاں گونج اٹھیں۔ زانباں الا شرف بلاذریؒ

طبقات ابن سعد، اسد الغابہ ابن عساکر، کامل ابن اثیر، سیرت النبی ص ۲۲۳ ج ۱۔ اصح السیرۃ  
یہ واقعہ بلحاظ سند کیسا ہے۔ اس پر تو ہم بعد میں بحث کریں گے لیکن واقعہ کی یہ نوعیت خود اس  
بات کی شہادت دے رہی ہے کہ یہ واقعہ سراسر جھوٹ اور صریح اتہام ہے۔ جس کے مختلف شواہد ہیں۔  
۱۔ اس واقعہ میں سورہ حدید کی ابتدائی آیات کی تلاوت کا ذکر ہے جو مدینہ منورہ میں فتح مکہ کے بعد  
نازل ہوئی اور مؤرخین کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبویؐ میں اسلام لانے یعنی جس آیت کی ان سے اسلام  
کے وقت تلاوت کرائی جا رہی ہے۔ وہ ان کے ایمان لانے کے پندرہ سال بعد نازل ہوئی جس کی صرف  
دو وجہ ہو سکتی ہیں۔ یا تو اس کے راوی قرآن سے مطلقاً جاہل تھے۔ یا اس میں دیر پردہ مازیہ ہے کہ کسی  
نہ کسی طرح حضرت عمرؓ کے اسلام کو فتح مکہ کے بعد ثابت کر کے انہیں مؤلفۃ القلوب میں داخل کر دیا جائے  
اور اس طرح ان کے ایمان پر شک و شبہ کی راہ ہموار ہو۔ کیونکہ وہ اہل مکہ جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے  
انہیں شیعہ خارج از ایمان سمجھتے ہیں۔ اور مودودی صاحب کو بھی ان کے ایمان پر شک و شبہ ہے لیکن  
اللہ تعالیٰ نے اس صورت میں خود وضاحت فرمادی ہے کہ فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے بھی پکے  
مومن اور حقیقی ہیں۔ لیکن بسائی ہوں یا خواہ ان کے سنی یا مجتہد۔ وہ صرف ان ہی لوگوں کے ایمان  
میں شک و شبہ کرتے ہیں جن کا تعلق بنو امیہ سے ہے۔ اور جن کا تعلق نبی ہاشم سے ہے۔ مثلاً ابوسفیانؓ  
بن حارث، عقیل بن ابی طالب اور ام ہانیؓ وغیرہ ان کے ایمان پر کسی نے حرف گیری نہیں کی۔ آخر اس  
کی وجہ بغض معاویہ کے علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے ؟

۲۔ اس روایت میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام کا کوئی علم  
نہ تھا۔ لیکن امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب اسلام سعید بن زید کے تحت حضرت سعید بن زید کا یہ  
ارشاد نقل کیا ہے۔

واللہ لقد مرايتني وان عمر  
لموثقی علی الاسلام قبل ان یسلم  
عمر دہ ان احدہ۔ ارفض  
الثانی قسم میں نے خود کو اس حال میں دیکھا  
ہے کہ اسلام لانے سے قبل حضرت عمرؓ مجھے  
باندھ کر ڈال دیا کرتے تھے لیکن تم نے

اللہی صنعتہم بعثمان لکان۔ مسلمان ہونے کے باوجود عثمان کے ساتھ

صیغہ پنجاس ہی ۵۴ ج ۱  
وہ حرکت کی ہے کہ احد پہاڑ بھی ریزہ  
ریزہ ہو جائے۔

اس قول کے سند کے راوی انتہائی اعلیٰ آئے ہیں یعنی قیس بن سعید، سفیان ثوری، اسماعیل بن ابی خالد، زرقیس بن ابی حاتم۔

حضرت حید کے اس قول سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ حضرت عمرؓ کو اپنی بہن اور بہنوئی کے اسلام کیلئے صرف علم تھا۔ بلکہ وہ اپنے بہنوئی کو اسلام کے باعث باندھ کر ڈال دیا کرتے تھے۔ تو اس قصہ میں یہ دعویٰ کہ حضرت عمرؓ کو علم نہ تھا سراسر جھوٹ ہے۔

۳۔ اس قصہ کے آخر میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے جب اسلام کا اظہار کیا تو صحابہ نے اتنی زور سے نعرہ نکمیر لگایا کہ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ ہمارے نزدیک ان راویوں کی یہ سب سے بڑی حماقت ہے۔ اس لئے کہ حضور اس وقت دار اترق میں مخفی تھے۔ اور صحابہ چھپ چھپ کر آپ کی خدمت میں جایا کرتے تھے۔ صحابہ کلام نعرہ لگانے کی غلطی ہرگز نہ کر سکتے تھے جس سے حضور اور تمام صحابہ کا راز فاش ہو جاتا۔

۴۔ بقول اس راوی کے جب حضرت عمرؓ کو بہن اور بہنوئی کے اسلام کا علم نہ تھا۔ تو نعیم بن عبد اللہ کو یہ راز فاش کرنے کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔ یا اللہ نہ کرے وہ گھر بھونک تماشا دیکھنا چاہتے تھے۔ یہ حضرت نعیمؓ کی ذات پر کھلا تبرا ہے۔

۵۔ ایک بہادر اور طاقت ور شخص کے لئے لڑکی کو مار مار کر تھک جانا اور پھر سانس لینے کے لئے بیٹھنا دو حال سے خالی نہیں۔ یا تو مارنے والا ایک کمزور انسان ہے جو اتنی جلدی ہانپ جاتا ہے۔ یا ایسا ظالم اور سنگدل ہے کہ وہ اس بات تک کا خیال نہیں کرتا کہ جس کو مارا جا رہا ہے وہ ایک لڑکی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کہانی کا مقصد یہی ہے کہ حضرت عمرؓ کو ظالم اور سنگ دل ثابت کیا جائے۔

۶۔ یہ لہجہ جسے مارا جاتا تھا۔ اس کا ذکر ہمیں اس واقعہ کے علاوہ تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا اس

کی وجہ کیا ہے ؟



۷۔ حضرت حمزہؓ کے یہ الفاظ کہ اسی کی تلوار سے اس کا سر قلم کر دوں گا کہیں یہ الفاظ اس لئے تو وضع نہیں کئے گئے تاکہ اسدہ مجوسی داستان میں حمزہؓ تیار کر سکیں اور پھر اس کی قبولیت میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ غالباً شبلی مرحوم کا ذہن بھی داستان میں حمزہؓ سے متاثر ہے۔ اس لئے کہ سب سے اول اس داستان کے مصنف نے حضرت حمزہؓ کے ساتھ میر کا لفظ لگایا ہے۔ ورنہ تمام کتب و احادیث کتب تاریخ کتب رجال اور کتب انساب میں ہیں ان کے نام کے ساتھ یہ لفظ کہیں نظر نہیں آتا۔ اور ہمارے ہندوپاک میں میر سید کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ آخر یہ کس رشتے سے سید بنے ہیں۔ اگر واقعاً یہ سید ہیں تو پھر عباسی بھی یقیناً سید ہیں۔

۸۔ حیرت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تو ان کے لئے یہ دعا فرماتیں۔  
اللہم اعز الاسلام بعمر بن اے اللہ عمر کے ذریعہ اسلام کو عزت  
الخطاب۔ عطا فرما۔

اور اسی سبب انہیں مراد رسول کہا جا گیا ہے۔ اور اس دعا کے باوجود وہ تلوار بے کرمیدان میں آجائیں جیف صد جیف۔  
ایسی صورت میں تو ہمیں اس میں بھی اشتباہ ہو رہا ہے کہ حضرت عمرؓ نے نبی میں ایمان لائے لیکن  
ہے کہ یہ بھی تو زمین کی ایک دیسہ کاری ہو، اور وہ اس سے بہت قبل اسلام لاپکے ہوں۔ جیسا کہ اسدہ  
صحیح روایات سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

آمد بر سر مطلب ایک دوسری روایت میں سورہ حدید کی آیات کے بجائے سورہ طہ کی ابتدائی  
آیات کا ذکر ہے بقیہ کہانی وہی ہے۔ یہ ہر دور روایات طبقات ابن سعد، مسند ابی یعلیٰ، مسند دارقطنی،  
مسند رک الحاکم، ہیثمی، طبرانی، بیہرہ اور ابوالنعیم میں پائی جاتی ہیں۔ دارقطنی نے اسے بہت مختصراً تا اسم  
بن عثمان کے ذریعہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے۔

حضرت انسؓ مدینہ منورہ کے باشندہ ہیں۔ اور ہجرت ۱۰ھ کے بعد اسلام لائے۔ ان کی والدہ  
نے انہیں حقور کی خدمت کے لئے پیش کیا۔ اس وقت ان کی عمر دس سال تھی۔ یعنی جب حضرت

عمرؓ اسلام لائے تو یہ تین سال کے بچہ تھے۔ اور اس وقت ان کی پوری قوم کافر تھی۔ انہوں نے یہ واقعہ کس سے سنا اس صحابی کا کوئی ذکر موجود نہیں۔

حضرت انسؓ کی جانب یہ واقعہ منسوب کرنے والا قاسم بن عثمان ہے۔ **قاسم بن عثمان** : فرماتے ہیں یہ ایسی روایات بیان کرتا ہے جس کا کوئی شاہد نہیں ہوتا۔ امام ذہبیؒ کی تصنیف مستدرک میں لکھتے ہیں کہ یہ قصہ نہایت ردی اور منقطع ہے۔ میزان میں فرماتے ہیں اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ نقل کیا ہے۔ جو انتہا سے زیادہ منکر ہے۔ میزان الاعتدال ص ۲۴۵ ج ۳

حافظ ابن حجرؒ لسان میزان میں لکھتے ہیں کہ اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ نقل کیا ہے جو انتہا سے زیادہ منکر ہے۔ دارقطنیؒ کہتے ہیں یہ قوی نہیں ہے۔ لسان میزان ص ۲۹۳ ج ۴

اس کی سند کا دو مرادوی اسحاق بن ابراہیم الحنینی ہے۔ ذہبیؒ لکھتے ہیں یہ کبریات کا ماہر ہے۔ عقلی کہتے ہیں یہ امام مالکؒ سے جتنی روایات نقل کرتا ہے۔ سب بے بنیاد ہوتی ہیں۔ بخاریؒ کہتے ہیں اس پر اعتراض ہے۔ نسائیؒ کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں ہے۔ ۱۲۸ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان الاعتدال ص ۱۴۹ ج ۱

اس کا تیسرا راوی اسامہ بن زید بن اسلم ہے۔ امام احمدؒ اور بخاریؒ بن معینؒ اسامہ بن زید بن اسلم : کہتے ہیں ضعیف ہے۔ نسائیؒ وغیرہ کہتے ہیں قوی نہیں ہے۔ میزان الاعتدال ص ۱۴۹ ج ۱

گویا اس قصہ کا ایک راوی بھی قابل اعتماد نہیں ہے۔ یہ تو وہ کہانی تھی جس کی کوئی حقیقت نہیں۔ آئیے اب اصل واقعات کو دیکھیں کہ کس طرح رونما ہوتے ہیں جو حضرت عمرؓ کے اسلام کا سبب بنے۔

۱۔ سب سے پہلا سبب تو یہ ہے کہ زید بن عمرو بن نفیل ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے حضورؐ کی نبوت سے قبل سرزمین مکہ میں توحید کا نعرہ بلند کیا۔ اور بت پرستی کی مخالفت کی۔ اور بتوں کے نام پر چڑھائے ہوئے کھانوں سے دوسروں کو روکا۔ یہ زید حضرت عمرؓ کے چچا تھے۔ زید کو اسی سلسلہ میں بہت

سی تکایف بھی پہنچائی گئیں۔ ظاہر ہے کہ یہ امور حضرت عمرؓ کی زندگی میں پیش آئے۔ اُن پر زید کی باتوں کا کچھ نہ کچھ تاثر قائم ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اعلان نبوت کے چند ہی روز بعد ان زید کے بیٹے سعیدؓ شرفِ اسلام ہوئے۔ ان کی بہن سعیدؓ کے نکاح میں تھیں، اور سعیدؓ کی بہن زید کی بیٹی حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ پھر سعیدؓ کے اسلام کے بعد حضرت عمرؓ انہیں گھر میں باندھ کر ڈال دیا کرتے تھے۔ اس طرح گھر کی صورت حال یہ تھی کہ بہن اور بہنوئی مسلمان ہوسر مکہ کا موحداور یوی ایک موحدا کی بیٹی اور ایک مسلمان کی بہن۔ اس صورت حال سے ان کے ذہن کا تاثر ہونا لازمی امر تھا۔ انہیں اگر اسلام پر کسی کو مارنا ہوتا تو پہلے سعیدؓ کو مارتے۔ لیکن حضرت سعیدؓ کا بیان یہ ہے کہ مجھے باندھ کر رکھتے۔ یعنی ان کا اسلام تو انہیں قبول تھا لیکن دیگر لوگوں سے اُن کا علنا جلنا پسند نہ تھا

۲۔ امام بخاری نے صحیح اور متصل سند کے ساتھ حضرت عمرؓ سے نقل کیا ہے کہ میں ایک روز کفاد کے بتوں کے درمیان لیٹا ہوا تھا کہ ایک شخص ایک پھڑپھڑے کر آیا۔ اور اسے ذبح کیا اور اس کے ذبح ہوتے ہی ایک چپخنے والے کی چیخ سنائی دی۔ اتنی زبردست چیخ میں نے کبھی نہیں سنی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ اے دشمن، عمدہ کام نمبر پندرہ ہوا ہے۔ ایک عقل مند انسان بے چوک تباہی لالہ لا اللہ۔

حضرت عمرؓ نے یہ چیخ سن کر نہ گھبرا کر نہ گھڑے ہوئے لیکن یہ سن کر دل میں یہ تہیہ کر لیا کہ میں اس وقت تک زندہ نہیں رہوں گا جب تک کہ اس شخص کی مصلحت معلوم نہ کر لوں۔ اس وقت وہ اس کے آواز فانی۔ اسے دشمن کہہ رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ یہ شخص ایک عقل مند انسان ہے۔ اور اس کے ذبح ہونے کی چیخ سن کر میں نے چلا آیا ابھی چند دن نگزرے تھے کہ سننے میں آیا کہ انہیں نبی ہے۔ بخاری ص ۱۱۱

امام بخاری نے اس واقعہ پر باب اسلام عمرؓ بن الخطابؓ کی سرخی قائم کی ہے۔ گویا وہ اس واقعہ کو حضرت عمرؓ کے اسلام کا اصل سبب سمجھتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اسی واقعہ نے ان کے دل میں جستجو کا مادہ پیدا کر دیا ہو لیکن اس صورت میں وہ سبب کو نسا ہے جو اظہار اسلام کا ذریعہ بنا۔

ہم جب مزید حیران میں کرتے ہیں تو امام احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں حضرت عمرؓ کی زبانی نقل کیا ہے کہ ایک شخص نے حضور کو چھیڑنے کے لئے اسے سے نکالا۔ آپؐ کو یہی حرام میں داخل ہے۔ اور نماز

شروع فرمادی۔ اور سورت الحاقہ کی تلاوت شروع کی۔ میں کھڑا ہوا۔ میں نے قرآن مجید کے اسلوب بیان کو دیکھ کر دل میں یہ خیال کیا کہ یہ کوئی شاعر ہے۔ ابھی یہ خیال گزرا ہی تھا کہ آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَمَا هُوَ بِقَوْلٍ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا  
تُؤْمِنُونَ ۝

یہ کسی شاعر کا قول نہیں۔ تم بہت کم ایمان لائے ہو۔

میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ کوئی کاہن ہے جو میرے دل کا حال بھی جان گیا۔ لیکن اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَلَا يَقُولُ كَاهِنٌ قَلِيلًا مَّا  
تَذْكُرُونَ ۝

یہ کسی کاہن کا قول بھی نہیں۔ تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

آپ نے آخر تک پوری سورت تلاوت کی۔ اور میرے دل میں اسلام پوری طرح گھر کر گیا۔ یہ ہے اصل واقعہ۔ لیکن چونکہ اس واقعہ کی ابتدا میں یہ الفاظ تھے کہ میں حضور کو چھڑنے کی غرض سے نکلا۔ یا لوگوں نے اسے قتل کے منصوبے سے تبدیل کر دیا۔ اور غمت میں بہن اور بہنوئی کو بھی بٹوا دیا۔ ہم نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کا ایک خاکہ سید سلیمان ندوی کی زبانی بھی سن لیجئے۔ وہ اپنے استاد محترم شبلی نعمانی کا رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

استاذ مرحوم نے سیرت کی پہلی جلد میں حضرت عمرؓ کے اسلام کا واقعہ حسب طرح لکھا ہے وہ حرف بحرف انفرادی کی نقل ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی بہن سے لیکر جو سورت پڑھی۔ اور جس سے متاثر ہو کر وہ مسلمان ہوئے۔

تَبَيَّنَ لِلَّهِ مَا فِي الْقُلُوبِ  
وَأَلَّا مَرَضٍ ۝

آسمانوں اور زمینوں میں جتنی بھی مخلوقات ہیں۔ وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔

یعنی سورہ حدید تھی۔ اس میں شک نہیں کہ بزار، طبرانی، بیہقی اور ابوالنعمین میں یہ روایت بھی ہے لیکن حد درجہ کمزور ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عمرؓ کا اسلام مکہ کا واقعہ ہے۔ اور سورہ حدید مدنی ہے۔ اس کو حضرت عمرؓ نے وقت کیوں کر پڑھ سکتے تھے۔ استاد مرحوم نے انفرادی میں یہ واقعہ کتب رجال و تاریخ کے حوالہ

سے نقل کیا ہے۔ لیکن حدیث دسیر کی کتابوں میں یہ واقعہ دو صورتوں سے مذکور ہے۔ ایک تو وہی مشہور صورت ہے کہ حضرت عمرؓ تلوار کر کے لگا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے نکلے تھے۔ کہ راہ میں ایک مسلمان سے ملاقات ہو گئی اس نے حضرت عمرؓ کے ارادے کا حال سن کر کہا کہ پہلے اپنے گھر کی توخیرلو، متبہاری بہن اور بہنوئی اس نئے دین میں داخل ہو چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ غصہ میں اپنی بہن کے گھر گئے اور مار پیٹ کی۔ بالآخر انہوں نے قرآن کی ایک سورت لے کر بہن کے پڑھنی۔ اور وہ سورۃ طہ تھی۔ اور جب اس آیت پر پہنچے۔

اِنْتِیْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا  
فَاَعْبُدْنِیْ وَاَقِمِ  
الصَّلٰوةَ لِیَذِکَّرِیْ  
یٰقِیْنٰمِ اللّٰہِ یٰہوں۔ میرے علاوہ کوئی الہ  
نہیں۔ پس میری عبادت کر۔ اور میرے  
ذکر کے لئے نماز قائم کر۔

تو یثاثر ہوا کہ دل سے لا الہ الا اللہ پکاراٹھے۔ اور در اقدس پر حاضری کی درخواست کی۔ یہ روایت ابن سعد، ابویعلیٰ، دارقطنی، حاکم اور بیہقی میں حضرت انسؓ بن مالک سے مروی ہے۔ لیکن حد درجہ کمزور ہے۔ اور ان دونوں میں ایسے روایت ہیں جو قبول کے لائق نہیں۔ اور محدثین نے اس کی تصریح کی ہے۔

سید صاحب مرحوم حاشیہ میں اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دارقطنی نے اس روایت کو مختصراً لکھ کر کہا ہے کہ اس کا ایک راوی قاسم بن عثمان بصری قوی نہیں۔ (باب الظہارۃ للقرآن) ذہبی نے مستدرک حاکم ص ۵۱۹ ج ۴ کے استدرک میں لکھا ہے کہ یہ روایت وہابی اور منقطع ہے۔ اور میزان الاعتدال میں قاسم بن عثمان کے حال میں جو اس روایت کا ایک راوی ہے لکھا ہے۔ اس نے حضرت عمرؓ کے اسلام کا قصہ بیان کیا ہے دھبی منکرۃ جداً اور وہ نہایت ہی منکر ہے یکنزعاً (فضائل عمر بن الخطاب) میں بھی اس روایت کی کمزوری ظاہر کی گئی ہے۔ ان روایتوں کے مشترک راوی، سحاق بن یوسف، قاسم بن عثمان، سحاق بن ابراہیم الحنفی اور اسامہ بن زید بن اسلم ہیں۔ اور یہ سب پائیدار اعتبار سے ساقط ہیں۔

اس کے بعد سید صاحب نے مسند احمد کی روایت نقل کی۔ اور اس پر کوئی حرج نہیں کی۔ ہاں  
آخر میں یہ ضرور لکھا ہے کہ ابن اسحاق نے ان دونوں روایتوں کو بہت کچھ گھٹا کر ہاں اپنی سیرت میں بخیر  
کے لکھا ہے۔ اس لئے وہ اس باب میں سند کے قابل نہیں۔ سیرت ابنی ص ۳۲۵ ج ۳

ہاں ابن اسحاق نے ایک کثرہ ضرور دکھایا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ وہ کتبہ کے حضرت عمرؓ کی  
شراب کی تلاش میں نکلے تھے۔ اور مکہ کی ایک ایک بھٹی پر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اتفاق سے کعبہ  
میں پہنچ گئے (کیا وہاں بھی کوئی بھٹی موجود تھی؟) حالانکہ تمام کتب احادیث اور کتب تفاسیر حرج حج کر کہہ ہی  
میں کہ شراب کی حرمت کا سبب حضرت عمرؓ کی ذات ہے۔ ان ہی کے اصرار پر شراب حرام ہوئی۔ اور متعدد  
مؤرخین نے دعویٰ کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے زمانہ جاہلیت میں بھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا۔ لیکن ابن اسحاقؒ  
جیسے محوسی کے دل کو ان پر الزام لگائے بغیر کیسے قرار داتا۔ اس لئے اس نے حضرت عمرؓ کو بذمہ کرنے کے لئے  
کعبہ میں شراب کی بھٹی لگادی۔ اسی سے قارئین اندازہ کر لیں کہ حضورؐ کے قتل کے پس پردہ کون سی ذہنیت  
کار فرما ہے۔ یہ وہی ذہنیت ہے۔ جس کا پرچار ایک شیعہ نے اس طرح کیا تھا۔

بشکت پشت ہر بران عجم را      برباد و نساود تخت جم را  
ایں عربہ ز غصب خلافت علی نیست      ز آل عمر کہ قدیم است عجم را

حضرت عمرؓ اور ان کی اولاد سے عجیوں کو پرانا کینہ چلا آ رہا ہے۔ اور ہمارے مورخ بھی عجی ہیں۔ لہذا  
وہ کینہ نکالنا تو ضروری ہے۔ اور شاعر کے بقول حضرت علیؓ کی خلافت کا جو جھگڑا کیا جاتا ہے۔ اس کی کوئی  
حقیقت نہیں۔ اس کے پس پردہ بھی بغض عمرؓ کا کام کر رہا ہے۔ محمد بن اسحاق کا تفصیلی حال ہم پہلے پیش کر چکے  
ہیں کہ وہ کس قسم کا انسان تھا۔

ہاں میں افسوس تو ان حضرات پر ہے جو عالم بھی تھے اور خود کو محقق بھی سمجھتے تھے۔ لیکن انہوں  
نے ابن اسحاق بلکہ اس سے بھی بدترین افراد کی روایات نقل کر کے۔ انہیں تاریخی حقائق قرار دیا۔ اور صحابہ پر  
تبر کیا۔ بلکہ ایک شہور زمانہ محقق نے تو عند گناہ بہ تراز گناہ پر عمل کرتے ہوئے ان کذابین کے بارے میں  
یہ فرمایا کہ اگر ہم ان کی روایات پھینک دیں گے۔ اور حدیث کی طرح تاریخی روایات کی چھان بین کریں گے

تو ہمارے پاس کیا پئے گا۔ اور ظاہر ہے کہ جب کچھ نہ بچے گا تو حضرت عثمانؓ پر قرابت داری، امیر معاویہؓ پر ملکیت، عمرو بن عاصؓ پر چال بازی اور دھوکہ دہی، مغیرہ بن شعبہؓ پر سیاسی رشوت دینے اور ولید بن عقبہؓ پر نفاق ہونے کا الزام کیسے قائم کیا جائے گا۔ اور جب یہ سب چیزیں غلط قرار پائیں گی تو خلافت و ملکیت کیسے وجود میں آئے گی۔

## شعب بنی ہاشم میں محصور ہونا

اس سلسلہ میں سب سے اول تو یہ ذہن میں رکھیں کہ دو پہاڑوں کے درمیان کا وہ درہ جسے بعد کے مورخین نے شعب ابی طالب کے نام سے مشہور کیا ہے۔ اس کا اصل نام شعب بنی ہاشم ہے۔ یہ درہ بنو ہاشم کا موروثی تھا۔ اور اسی درہ میں تمام بنی ہاشم کے مکانات تھے۔ یہ کسی خاص فرد بشر کی ملکیت نہ تھا۔ سبائیوں نے اسے ابو طالب کی جانب منسوب کر کے مشہور کر دیا۔ جس سے یہ تاثر لیا جانے لگا کہ یہ ابو طالب کی ملکیت تھا۔ حتیٰ کہ پاک و ہند کا ہر فرد اسے شعب ابی طالب ہی کے نام سے یاد کرتا ہے۔ اور شبلی جیسا مورخ بھی اس مخالفہ کا شکار ہو گیا ہے۔ یا انہوں نے روانی تحریر میں شعب ابی طالب کی سرخی قائم کر دی۔

واقعہ کی نوعیت کچھ اس طرح ہے کہ جب کفار قریش نے یہ دیکھا کہ مسلمانوں پر اتنی سختیوں کے باوجود اسلام پھیلتا جا رہا ہے۔ اور روز بروز ان کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور جو لوگ ان حالات سے تنگ آکر مشہد ہجرت کو گئے تھے۔ انہیں شاہ حبشہ نے پناہ دی ہے۔ لہذا انہوں نے مل کر اب یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خاندان کو محصور کر کے اور فقر و فاقہ میں مبتلا کر کے تباہ و برباد

کر دیا جائے۔

چنانچہ تمام قبائل نے ایک معاہدہ مرتب کیا۔ کہ کوئی شخص نہ خاندان نبی ہاشم سے قربت دار نہ کرے گا۔ نہ ان کے ہاتھ خرید و فروخت کرے گا۔ نہ ان سے ملے گا اور نہ ان کے پاس کھانے پینے کا سامان جانے دے گا۔ یہ معاہدہ نبوت کے ساتویں سال محرم میں مرتب کیا گیا۔ اور منصور بن عکرمہ نے یہ معاہدہ لکھ کر درکعبہ پر آویزاں کر دیا۔

ابو طالب مجبور ہو کر تمام قبیلے نبی ہاشم کے ساتھ اس دہ میں پناہ گزین ہو گئے۔ اور تین سال تک نبی ہاشم نے اس محاصرہ میں بسر کی۔ یہ زمانہ ایسا سخت گزارا کہ کھانے کے پتے کھا کھا کر گزارا کرتے تھے۔ حدیثوں میں جو صحابہ کی زبان سے مذکور ہے کہ ہم طلحہ کی پتیاں کھا کر گزارہ کرتے۔ یہ اسی زمانہ کا واقعہ ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص کا جو یہ بیان ہے کہ ہمارے پتے کھا کھا کر ہونٹ ایسے ہو گئے تھے۔ جیسے اونٹ کے ہونٹ ہوں۔ جب ہم اجابت کرتے تو وہ اونٹ کی منگیلیوں کی طرح ہوتی۔ ایک دفعہ رات کو سوکھا ہوا چمڑا میرے ہاتھ آگیا۔ میں نے اسے پانی سے دھویا۔ آگ پر بھونا۔ اور پانی میں ملا کر کھایا۔ یہ سب اسی دور کے حالات ہیں۔ گویا اس مقاطعہ میں وہ تمام حضرات شریک تھے جو مشرف باسلام ہو چکے تھے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ہاشم کے باپ عبد مناف جس وقت نبی ہاشم کا یہ مقاطعہ کیا گیا۔ تو ہاشم کے دو بھائیوں کی اولاد نے حضور کا ساتھ دیا۔ یعنی بنو نوفل اور بنو مطلب۔ اور تین بھائیوں کی اولاد نے ان کا ساتھ نہیں دیا۔ اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مال فہ میں سے بنو نوفل اور بنو نوفل کو مال عطا کیا کرتے تھے۔ جب حضرت عثمانؓ نے جو ہاشم کے چوتھے بھائی عبد شمس کی اولاد میں سے تھے۔ آپ سے دریافت کیا کہ آپ ہمیں اس مال سے کیوں نہیں نوازتے۔ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ مقاطعہ کے وقت بنو نوفل اور بنو مطلب نے ہمارا ساتھ دیا۔ لیکن بنو عبد شمس نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔ یہ واقعہ صحیح مسلم میں مذکور ہے۔

اس مقاطعہ میں مسلم اور غیر مسلم کی تیز نہ تھی۔ بلکہ بلوہب کے علاوہ تمام خاندان نبی ہاشم۔ خاندان بنی مطلب اور خاندان بنی نوفل کے خلاف یہ مقاطعہ عمل میں آیا۔ حالانکہ ان تینوں خاندانوں کے بیشتر



افراد کافر تھے۔ چونکہ عرب میں ایک خاندان دوسرے خاندان کے کسی فرد پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ورنہ جنگ کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوتا۔ جو صدیوں تک منقطع نہ ہوتا۔ اس لحاظ سے قریش کا ہر خاندان حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے ڈرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ کی زندگی میں کسی تاریخ اور کسی سیرت کی کتاب میں آپ کو یہ کہیں نظر نہیں آئے گا کہ حضرت علیؓ پر اسلام کی خاطر فلاں مصائب ڈھائے گئے۔ یا انہوں نے اسلام کی خاطر فلاں فلاں تکلیف برداشت کی۔ کیونکہ انہیں خاندان نبی ہاشم کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اس لئے ان پر کوئی دست اندازی نہ کر سکا۔ اگر حضور کو صحیح معنی میں ابو طالب اور نبی ہاشم کی حمایت حاصل ہوتی تو آپ پر بھی ہرگز کوئی زیادتی نہیں ہو سکتی تھی۔

ابن سعد نے روایت کیا ہے کہ جب بچے بھوکے سے روتے تھے تو اس درہ سے باہر آواز آتی تھی۔ قریش سن کر خوش ہوتے تھے۔ لیکن بعض رحم دل انسانوں کو رحم بھی آتا تھا۔ حضور کی بھی کسں بچیاں تھیں (یعنی فاطمہ اور ام کلثوم) ایک دن حکیم بن حزام نے جو حضرت خدیجہؓ کے بھتیجے تھے۔ تھوڑے سے گیسوں اپنے غلام کے ہاتھ حضرت خدیجہؓ کے پاس بھیجے۔ راہ میں ابو جہل نے دیکھ لیا۔ اور جھپٹ لینا پہاڑ اتفاق سے ابو لہبؓ کی ہاں سے آگیا۔ اگرچہ وہ کافر تھا لیکن اس کو رحم آیا۔ وہ بولا کہ ایک شخص اپنی بھوپھی کو کچھ بھیجنا چاہتا ہے۔ تو اسے کیوں روکتا ہے۔

یہ ہے اُس مقاطعہ کا پس منظر۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقاطعہ آخر کیسے ختم ہوا۔ اس کے خاتمہ کے لئے جو داستان سرائی کی گئی۔ وہ ابن اسحاق، ابن سعد، سیقی اور ابو نعیم نے اس طرح نقل کی ہے۔

کہ قریش نے جب نبو ہاشم کا مقاطعہ کر کے انہیں شعب بنی ہاشم میں محصور کیا۔ اور باہم معاہدہ مرتب کر کے تحریری صورت میں در کعبہ پر لٹکایا۔ تو چند سال کے بعد اللہ تعالیٰ نے دیکھ کو بھیجا۔ جس نے کاغذ کو کھایا۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ کا نام چھوڑ کر باقی عبارت کو جس میں نبو ہاشم کے مقاطعہ کا عہد تھا۔ دیکھ نے کھایا تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اللہ کا نام کھایا تھا۔ اور باقی عبارت چھوڑ دی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر مطلع کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو طالب کے اس کا ذکر کیا۔ ابو طالب نے قریش کو اس کی خبر کی۔ اور بالآخر اس واقعہ کے جھوٹ اور سچ ہونے پر معاہدہ باقی

رہنے یا ٹوٹ جانے کا فیصلہ قرار پایا۔ کفار نے جب کاغذ کو آتار کر دیکھا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قول کی تصدیق ہو گئی۔

سید سلیمان ندوی مرحوم اس کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

ابن اسحاق کی روایت تو بے سند ہے۔ بقیہ تمام روایتیں واقفی یا ابن ہبیسہ سے مروی ہیں۔ جن کا اعتبار نہیں۔ اور جو ثقہ راویوں سے مروی ہیں تو وہ تمام تر مرسل ہیں۔ ان تمام روایتوں میں اگر کوئی بہتر روایت ہے تو وہ سیقی میں موسیٰ بن عقبہ کی ہے جو امام زہری سے اس کو روایت کرتے ہیں۔ مگر وہ زہری تک پہنچ کر رہ جاتی ہے۔ کسی صحابی تک نہیں پہنچتی۔ سیرت النبی ص ۴۶ ج ۳

زہری بے شک ایک مسلمہ امام ہیں۔ لیکن ان کی روایت اسی صورت میں قبول کی جاسکتی ہے جب وہ اوپر کی سند بیان کریں۔ اس لئے کہ وہ چھوٹے درجہ کے تابعی ہیں۔ اور بڑے درجہ کے تابعین سے روایت نقل کرتے ہیں۔ اس طرح اوپر کے دور راوی غائب ہیں۔ اور جب دور راوی ایک دم سے غائب ہوں تو محدث ایسی روایت کو معضل کہتے ہیں۔ جو بدترین ضعیف روایت سمجھی جاتی ہے۔ اور زہری کی تو رسالت بھی قابل قبول نہیں۔ امام ترمذی نے کتاب العلال میں امام یحییٰ بن سعید القطان کا قول نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ان مراسلات یحییٰ بن ابی کثیر لیس

بشيء دھکذا مراسلات الزهري وصفيان

یحییٰ بن ابی کثیر کی مراسلات کچھ نہیں۔ اسی طرح زہری اور صفیان بن عیینہ کی مراسلات ہیں۔

بن عیینہ۔

محمد بن اسحاق اور واقفی کا حال ہم پہلے پیش کر چکے ہیں۔ اب ابن ہبیسہ کا بھی کچھ حال ملاحظہ فرمائیں۔ کیونکہ یہ محدثین میں بہت شہرت رکھتے ہیں۔

اس کا نام عبد اللہ ہے۔ ابو عبد الرحمن اس کی کنیت ہے۔ مصر کا عالم تھا۔ وہاں کا قاضی بھی رہا۔ ابن ہبیسہ: تبع تابعی ہے۔ ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ میں اس کی روایات پائی جاتی ہیں لیکن ترمذی نے اسے خود ضعیف کہا ہے۔ یحییٰ بن یعین فرماتے ہیں یہ ضعیف ہے۔ قابل حجت نہیں۔ حمیری کا بیان ہے کہ یحییٰ بن سعید القطان اسے کچھ نہ سمجھتے تھے۔ عبد الرحمن بن ہمدانی فرماتے ہیں۔ میں اس کی روایت نہیں لیتا۔

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس نے اپنی کچھ روایات لکھ کر بھیجی تھیں جن میں اس نے یہ بیان کیا تھا کہ یہ روایات میں نے عمرو بن شعیب سے سنی ہیں۔ لیکن جب میں نے یہ روایات امام عبد اللہ بن المبارک کو پڑھ کر سناں تو وہ اندر گھر میں گئے۔ اور اس ابن سیرین کی کتاب کی نقل اٹھا کر لے آئے۔ اس کتاب میں ان تمام روایات کے بارے میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ابن سیرین نے یہ تمام روایات اسحاق بن ابی فرہ سے سنی ہیں جو ناقابل اعتبار راوی ہے۔ ابن سیرین نے اسحاق کا نام تبدیل کر کے عمرو بن شعیب کی جانب سے روایات منسوب کر دیں۔

(اس نے اپنے جھوٹ کو چھپانے کے لئے بہانہ یہ تراشا کہ میرے گھر میں آگ لگ گئی تھی جس سے میرے تمام مسودات جل گئے۔ اس لئے میں اب روایت میں بھول جا رہا ہوں)

بجی بن کبریا بیان ہے کہ اس کے گھر میں شام میں آگ لگ گئی تھی۔ جس سے اس کے مسودات جل گئے۔ لیکن عثمان بن صالح کہتے ہیں کہ کوئی مسودہ نہیں جلا تھا۔ صرف یہ ہاتھ کا اس مسودے میں چند اجزاء غمدہ نقل کر رکھے تھے۔ اور وہ لوگوں کو اسی میں سے روایات سنایا کرتا تھا۔ اس نقل کا کچھ حصہ جل گیا تھا۔ عثمان بن صالح یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں اس کی بیماری کی ابتداء سے واقف ہو رہا تھا۔ ایک روز میں ابو عثمان بن عقیق جمعہ پڑھ کر آئے تھے۔ ہمارے آگے آگے گدھے پر سوار یہ ابن سیرین جا رہا تھا۔ اچانک اس پر فالج گرا۔ اور یہ گدھے سے نیچے گر پڑا۔ عثمان بن عقیق ایک دم سے آگے بڑھے۔ انہوں نے اسے سہا مار دے کر بٹھایا اور پھر ہم اسے اس کے گھر پہنچا کر آتے۔ اس کی اصل بیماری یہ تھی۔

امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں یہ شنی بن الصباح۔ سے احادیث لکھتا تھا۔ اور انہیں عمرو بن شعیب کی جانب منسوب کر دیتا۔ بجی بن معین کہتے ہیں یہ قوی نہیں، ایک بار فرمایا یہ ضعیف ہے۔

بجی بن سعید القطان کا قول ہے کہ مجھے بشر بن انس نے حکم دیا کہ اگر تیری ابن سیرین سے ملاقات ہو تو تو اس سے کوئی روایت نہ لینا۔ بجی بن معین فرماتے ہیں۔ یہ کتابیں جملنے سے قبل بھی ضعیف تھا اور بعد میں بھی ضعیف ہے۔

ابوزرہ رازی فرماتے ہیں۔ اس کی ابتدائی اودا خری روایات سب برابر ہیں۔ ہاں ابن المبارک اور ابن وہب اس سے جو روایات نقل کرتے ہیں۔ وہ پرکھ کر نقل کرتے ہیں۔ نسائی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ اور یہ

بھی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی سن میں اس کی کوئی روایت نہیں لی۔ سوائے ایک روایت کے کہ سورۃ حج میں دو جگہ سے ہیں۔

ابن ابی مریم کا بیان ہے کہ آخر میں اس کے پاس گیا تو بربر قوم کی ایک جماعت اس سے احادیث پڑھ رہی تھی۔ اور یہ ان سے منصور، اعمر، اور علماء عراق کی احادیث بیان کر رہا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا۔ تیرا اہل عراق کی احادیث سے کیا تعلق تو مصر کا باشندہ ہے۔ تجھے اہل عراق کی احادیث کا کیسے علم ہوا۔ کہنے لگا کہ راہ چلتے یہ احادیث میرے کانوں میں پڑ گئی تھیں۔ (یعنی بالتحقیق انہیں بیان کرنا شروع کر دیا۔) ابو زید اور ابو حاتم کہتے ہیں۔ اس کا معاملہ پریشان کن ہے۔ لیکن شہادت کے طور پر اس کی روایت لکھی جائیں۔ جو زبانی کا بیان ہے کہ اس کی حدیث پر کوئی فور نہیں ہوتا۔ یہ حجت کے قابل نہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں ابن بسبیہ کی حدیث حجت نہیں لیکن میں اس کی روایات اس لئے لکھتا ہوں کہ شاید کسی حدیث صحیح کی اس کی روایت سے تا یہ بد ہوتی ہو۔ امام ذہبی فرماتے ہیں۔ اسے خلیفہ منہ سور نے ۱۵۷ میں مصر کا قاضی بنایا تھا اور تیس اشرفی ماہانہ اس کا وظیفہ متعین کیا تھا۔ یہ نو ماہ اس عہدے پر فائز رہا۔

ابوالاسود النضر کا بیان ہے کہ مصر کے علماء ہمارے جو احادیث بیان کرتے تھے۔ ان کی کتابیں اس نے بہت کم نیچے کئے ہیں۔

امام ابن جبران اس کی زندگی کا مختصر سا جائزہ ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں کہ ابن بسبیہ ۱۵۷ میں پیدا ہوا۔ ۱۸۷ میں وفات پائی۔ طبعاً یہ نیک آدمی تھا۔ لیکر ضعیف راویوں سے روایت نقل کرتا اور درمیان سے ان کا نام اڑا دیتا۔ پھر اس کی کتابیں جل گئیں۔ اسی لئے بعض محدثین کا قول یہ ہے کہ جن حضرات نے اس سے کتاب میں احادیث نقل کی ہیں تو وہ معتبر ہیں۔ اور وہ چار شخص ہیں۔ عبداللہ بن المبارک، عبداللہ بن دہب، عبداللہ بن یزید المقرئ اور عبداللہ بن سلمہ القعنبی۔ یہ لوگ جو اس سے روایت نقل کریں گے وہ قابل قبول ہوگی۔ ورنہ نہیں۔

آخر عمر میں اس کی جتنی روایات ہیں سب بے بنیاد ہیں۔ یہ ضعیف راویوں سے موضوع روایات نقل کرتا۔

اور انہیں ثقہ راویوں کی جانب منسوب کر دیتا ہے۔ بخاری نے کتاب الضعفاء میں اس کو ضعیف اور اس کی روایت کو منکر قرار دیا ہے۔

اس کی حقیقت حال ظاہر کرنے کیلئے اس کی ایک روایت پیش کئے دیتے ہیں۔

اس نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص سے یہ روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں فرمایا۔ میرے بھائی کو میرے پاس بلاؤ۔ لوگوں نے ابو بکرؓ کو بلایا۔ آپ نے ان کی جانب سے منہ پھیر لیا اور پھر فرمایا میرے بھائی کو بلاؤ تو عثمانؓ بلوائے گئے۔ آپ نے ان کی جانب سے بھی منہ پھیر لیا۔ پھر فرمایا میرے بھائی کو بلاؤ۔ اب علیؓ کو بلایا گیا۔ آپ نے انہیں اپنے پیڑھے میں چھپایا جب علیؓ آپ کے پاس سے نکلے تو لوگوں نے دریافت کیا کہ حضورؐ نے تم سے کیا باتیں کیں کہنے لگے۔ حضورؐ نے مجھے علم کے ایک ہزار دروازوں کی تعلیم دی۔ اور ہر دروازے میں ایک ہزار دروازے تھے۔

امام ابن عدی کامل میں فرماتے ہیں۔ یہ روایت اسی ابن بسبیحہ کی وضع کردہ ہے۔ کیونکہ وہ غالی شیعہ تھے میزان الاعتدال ص ۴۵ ج ۲

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ مقاطعہ کیسے ختم ہوا اس کا کوئی نہ کوئی سبب تو ضرور ہوگا۔ بیشک اس کے اسباب رونما ہوئے۔ لیکن وہ سب دنیاوی اسباب تھے۔ قدرتی اور آسمانی اسباب نہ تھے۔ سب ان اسباب کا حال علامہ علی کی زبانی سن لیجیے۔

متصل تین برس تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام آل ہاشم نے یہ مصیبتیں جھیلیں۔ بار آخر دشمنوں ہی کو رحم آیا اور خود ان ہی کے طرف سے اس معاہدہ کے توڑنے کی تحریک ہوئی۔ ہشام عامری جو خاندان بنی ہاشم کا قریبی رشتہ دار اور اپنے قبیلہ میں ممتاز تھا۔ وہ چوری چھپے بنو ہاشم وغیرہ کو غلہ وغیرہ بھیجتا رہتا تھا۔ ایک دفعہ وہ زبیر کے پاس جو عبد المطلب کا نواسا تھا گیا۔ اور کہا کیوں زبیر تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ، پیو، ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمہارے ماموں کو ملک وادہ تک نصیب نہ ہو، زبیر نے کہا کیا کروں۔ تنہا تو ایک شخص بھی میرا ساتھ دے تو میں اس ظالمانہ معاہدہ کو پھاڑ کر چھینک دوں، ہشام عامری نے کہا میں موجود ہوں، دونوں مل کر مظلم بن عدی کے پاس گئے۔ ابو الجحزی، ابن ہشام، ابن ہشام بن سواد نے بھی

ساتھ دیا۔ دوسرے دن سب مل کر حرم میں گئے۔ زہیر نے سب لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ اے اہل مکہ یہ کیا انصاف ہے کہ ہم لوگ آرام سے بسر کریں اور نبوہاشم کو آب و دانہ نصیب نہ ہو۔ اللہ کی قسم جب تک یہ ظالمانہ معاہدہ پیا ب نہ کر دیا جائے گا میں باز نہ آؤں گا۔ ابوجہل برابر سے بولا۔ ہرگز اس معاہدہ کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ۱۔ زمعہ نے کہا تو جھوٹ کہتا ہے۔ جب یہ لکھا گیا تھا۔ ہم تو اس وقت بھی راضی نہ تھے۔ جب شیر بن مطہم نے ہاتھ بڑھا کر اس دستاویز کو چاک کر دیا۔ مطہم بن عدی، عدی بن قیس، زمعہ بن بنی الاسود، ابوالا۔ بختری اور زبیر وغیرہ سب ہتھیار باندھ کر نبوہاشم کے پاس گئے۔ اور ان کو درہ سے نکال لائے۔ بقول ابن سعد مدینہ منورہ کا واقعہ ہے۔

یہ تمام واقعہ ابن ہشام، طبری اور ابن سعد وغیرہ میں مذکور ہے۔ اس واقعہ کے کچھ دن بعد حضرت خدیجہ انتقال کر گئیں۔ اور ابوطالب بھی مر گیا۔ اس کے بعد معراج کا واقعہ پیش آیا۔ سیرت النبی ص ۱۲۶ ج ۱

## معراج رسول

### اور اُمّ ہانی کا گھسٹ

یہ ایک مشہور داستان ہے کہ جس رات آپ کو معراج ہوئی اس رات آپ اُمّ ہانی کے گھر آرام فرما رہے تھے۔ وہیں سے آپ کو معراج ہوئی۔ حالانکہ قرآن پکار پکار کر کہہ رہا ہے۔

سُبْحَانَ الَّذِي أَسْرَى بِعَبْدِهِ لَيْلًا  
مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ إِلَى الْمَسْجِدِ الْأَقْصَى

پاک ہے وہ ذات جو راتوں رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک لے گئی۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت انس بن مالک اور حضرت مالک بن مسعود کے ذریعہ حضور کا یہ

فرمان مروی ہے۔ اَنَا فِي الْبَيْتِ (میں بیت اللہ میں تھا) اَنَا فِي الْحَطِيمِ (میں حطیم میں تھا)۔ لیکن تب ہم بیمارے علماء برابر ہر بات پر تعارض میں اپنے بے ضامین اور اپنی تصنیفات میں یہی فرماتے اور لکھتے نظر آتے ہیں

کہ معراج ام بانیؑ کے گھر سے ہوئی۔ اتفاق سے جس عمارت کی نظر قرآن وحدیث پر لگئی۔ انہوں نے تب بھی اس روایت کو اپنے دامن سے چٹلے رکھا۔ کچھ حضرات نے تو یہ تاویل فرمائی کہ ام بانیؑ کا گھر حطیم میں تھا حالانکہ حطیم میں کسی کا بھی مکان موجود نہ تھا۔ اور مولوی احتشام الحق تھانوی مرحوم نے تو عجیب کمال کر دکھایا۔ انہوں نے اپنے متعدد مضامین میں جو اخبار جنگ میں شائع ہوتے رہے۔ فرمایا کہ آپ ام بانیؑ کے گھر بیٹے ہوئے تھے۔ دو فرشتے آئے۔ انہوں نے ام بانیؑ کے گھر کی چھت پھاڑی۔ اور آپ کو کعبہ بٹھا کر لے گئے۔ یہ طریقہ اس لئے اپنایا گیا کہ کوئی قرآن پیش کر کے ان کا رد بھی نہ کر سکے۔ اور ام بانیؑ سے جو ناتہ ہے وہ بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ حالانکہ ان کے جواب کے لئے صحیح بخاری اصحیح مسلم کے یہ الفاظ کافی ہیں کہ میں بیت اللہ میں تھا۔ میں حطیم میں تھا۔ لیکن چونکہ ام بانیؑ کی داستان ذہنوں سے چسپی ہوئی تھی۔ لہذا فرشتوں کو بھی نقب زنی کا فن سکھانا پڑا۔ ہمیں اس واقعہ پر جو اعتراضات ہیں وہ تو ہم بعد میں پیش کریں گے۔ پہلے سید سلیمان ندوی رحمہ کی تحقیق بھی ملاحظہ فرمائیے۔

بعض نیچے درج کی روایتوں اور تاریخ کی کتابوں میں ام بانی کا بیان ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے گھر میں معراج ہوئی۔ ام بانیؑ کا گھر شعب الی طالب میں تھا۔ یہ روایت شہور دروغ گو کلیبی کی ہے۔ اس روایت میں حد درجہ بنوا اور غریب و منکر باتیں مذکور ہیں۔

مسند ابی نعلیٰ میں ام بانیؑ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم عشاء کی نماز پڑھ کر ہم لوگوں کے ساتھ میرے مکان میں سوئے۔ شب کو میری آنکھ کھلی تو آپ کو نہ پایا۔ رو سائے قریش کی دشمنی کے باعث دلیلیں عجیب عجیب بگائیاں پیدا ہونے لگیں۔ نیند نہ آئی صبح اٹھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا واقعہ بیان کیا۔ اور فرمایا کہ میں رو سائے قریش سے کہتے جاتا ہوں۔ میں نے آپ کا دامن پکڑ لیا کہ لبتہا ان سے یہ نہ کہئے وہ آپ کی تکذیب کریں گے۔ اور آپ کی جان پر حملہ کریں گے۔ لیکن آپ نے نہ مانا اور دامن چٹک کر چلے گئے۔

ان روایتوں میں علاوہ اور لغویات کے عشاء اور صبح کی نماز و جاہلیت کی بات کس قدر غلط ہے۔ کہ یہ نماز پنجگانہ تو عین شب معراج میں فرض ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی روایتوں کا صحیحین کے مقابلہ میں کیا

رتبہ اور اعتبار ہو سکتا ہے اس لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ معراج کی شب آپ خانہ کعبہ میں تھے۔

### سیرت النبی ص ۴۱ ج ۲

سید صاحب رجوم نے اس روایت کو اس قابل بھی تصور نہیں کیا کہ اُس پر کھل کر تبصرہ فرماتے۔ اور اس کی ضرورت بھی نہیں اس لئے کہ اس کہانی کا واضح مفسر اور مؤرخ کلی ہے۔ جو تفسیر ابن عباسؓ کا واضح ہے۔ اس نے یہ روایت تفسیر میں بیان کی۔ اور وہاں سے بعد میں آنے والے اسے لے اڑے۔ ہم اس کا تفصیلی حال پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یہ تو واقعی سے بھی زیادہ بدترین انسان ہے۔ لیکن اس روایت میں ایسے متعدد عیوب بھی ہیں کہ اگر اس کے مادی معتبر بھی ہوتے تب بھی یہ روایت ماننے کے قابل نہ تھی۔

۱۔ ام بانی فتح مکہ کے روز اسلام لائیں۔ اور معراج بحرت نبوی سے قبل ہوئی۔

۲۔ عشاء اور صبح وغیرہ کی نمازیں ماسی رات تو فرض ہوئی تھیں۔ کیا فرضیت سے قبل ہی نمازیں پڑھ لی گئیں۔

۳۔ لفظ ہم سے ام بانیؓ کی کیا مراد ہے۔ اگر ان کی مراد ان کا خاندان ہے تو وہ حضور کا بدترین دشمن تھا۔ اور فتح مکہ کے بعد بھاگ کر خجانب چلا گیا۔ پھر وہاں سے روم چلا گیا۔ اور عیسائی بن گیا۔ اور اسی حالت میں مر گیا۔

۴۔ حضور نے حضرت خدیجہؓ سے قبل ان ام بانیؓ کے لئے ابو طالب کو پیغام نکاح دیا تھا۔ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اور ابو طالب نے آپ کو فقیر اور غیر شریف بنا کر صاف انکار کر دیا تھا۔ اور اس کا نکاح بسیرہ سے کیا جو آپ کا بدترین دشمن ثابت ہوا۔ ایسی صورت میں کیا یہ ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس کے گھر جا کر سوئیں گویا اس کلی رافضی نے اپنی اس کہانی کے ذریعہ حضور کی ذلت اقدس پر دو الزام قائم کئے۔

(ا) اگر بسیرہ کی موجودگی میں سوئے تو اس سے زیادہ بے غیرتی کوئی نہیں ہو سکتی کہ آپ اس شخص کے گھر جا کر سوئیں۔ جس کے باعث آپ کو فقیر اور غیر شریف قرار دیا گیا۔ اور اب آپ کا دشمن بھی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کو اپنا رقیب بھی تصور کرتا ہو۔

(ب) اور اگر بسیرہ کی غیر موجودگی میں سوئے تو گویا آپ نے ایک دشمن کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ آپ کی



عصمت پر حملہ آور ہو۔

۵۔ یہ کہانی قرآن اور صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

۶۔ آپ پوری رات گھر سے کیسے باہر رہ سکتے تھے۔ جب کہ آپ کے گھر میں دو کسٹ لڑکیاں یعنی غامطہ اور ام کلثوم موجود تھیں۔ انہیں چھوڑ کر کسی دوسرے کے گھر سونے کا کیا مقصد۔

۷۔ بقول راوی ام بانی آپ کا دامن پکڑ کر آپ کو یہ واقعہ برسر عام بیان کرنے سے روکنا چاہتی ہیں تاکہ لوگوں کو علم نہ ہو۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اُس رات گھر پر بسیرہ موجود نہیں تھا۔ یہ حضوری ذات اقدس پر کتنا رلیک حملہ ہے اور جب بسیرہ موجود نہیں تھا تو وہ کون سے افراد تھے جو ام بانی کے گھر سوتے تھے، اور جنہوں نے جماعت کے ساتھ عثمانی نماز پڑھی تھی۔

یہ روایت ایک طویل داستان ہے ہم اس کے کچھ حصے آگے پیش کریں گے۔

## معراج سے متعلق چند مزید داستانیں

تاریخ و میر کی کتابوں سے واپسی کے بعد کے سلسلہ میں مختلف واقعات نقل کئے جاتے ہیں۔ جن میں سے ایک واقعہ یہ بھی ہے کہ راستہ میں آپ کو قریش کے اونٹ اور قافلے ملے تھے۔ ان قافلوں والوں پر جو کچھ گزر رہی تھی آپ نے اہل مکہ کے سامنے بیان کیا کہ فلاں فلاں وقت پہنچے گا۔ اور وہ اسی وقت وہاں پہنچا۔ بعض لوگ حضرت صدیق کے پاس گئے۔ اور ان سے کہا کہ تمہارے رسول تو کہتے ہیں کہ وہ رات کو بیت المقدس سے ہو آئے ہیں۔ جہاں قافلہ ایک مہینہ میں جاتا اور ایک مہینہ میں آتا ہے صدیق نے فرمایا اگر وہ کہتے ہیں تو میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ میں تو ان کی اس سے بڑی بات کی بھی تصدیق کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ آسمان سے میرے پاس فرشتے آتے ہیں۔ اور میں اس کو قبول کرتا ہوں۔ اس کے بعد حضرت صدیق مہنصور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ کیا آپ نے ایسا فرمایا ہے؟ آپ نے کہا ہاں۔ صدیق نے فرمایا میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ جو کچھ آپ فرماتے ہیں وہ سچ ہے۔ اسی درجہ سے

حضرت ابو بکرؓ کا لقب صدیق ہو گیا۔ اصح السیرۃ ۱۰۲

ایک روایت ہے کہ جب مات کو آپ کے اعزاء نے آپ کو بستر پر نہ پایا تو آپ کو ڈھونڈنے کے لئے پہاڑوں اور غاروں میں نکل گئے۔ کیونکہ انہیں یہ خوف پیدا ہوا کہ کہیں قریش آپ کو گزند پہنچائیں۔ ان قصوں کے آخر میں یہ بھی ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے معراج کا واقعہ بیان کیا۔ تو بہت سے مسلمانوں کے ایمان متزلزل ہو گئے اور اکثر مسلمان مرتد ہو گئے۔

فاسر تذکثیرا من اسلام  
تو بہت سے مسلمان مرتد ہو گئے  
ان واقعات کی ابتدا میں یہ بھی ہے کہ معراج ام ہانیؓ کے گھر سے ہوئی۔ اور ام ہانیؓ نے آپ کو صبح کے وقت باہر جانے اور لوگوں کے سامنے یہ واقعہ بیان کرنے سے روکا۔ یہ وہ ام ہانیؓ تھیں کہ انی کہانی نہیں ہے۔ جس کا ذکر اوپر کیا گیا تھا۔ بلکہ یہ کہانی حضرت ابو ہریرہؓ کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ حالانکہ حضرت ابو ہریرہؓ شہ میں اسلام لائے۔ اور ان کا مکہ سے کوئی تعلق نہ تھا۔  
سید سلیمان ندوی اس کہانی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ تمام قصے ستر یا نعو اور باطل ہیں۔ ابن اسحاق اور ابن سعدؒ نے تو سرے سے ان واقعات کے اسناد نہیں لکھے۔ لیکن ابن جریر طبریؒ، ہیثمیؒ، ابن ابی حاتمؒ، ابو یعلیٰؒ، ابن عساکرؒ نے ان کی سندیں ذکر کی ہیں۔ ان کے روایات ابو جعفر رازیؒ، ابو بارودن عبدیؒ اور خالد بن یزیدؒ ابی مالکؒ ہیں جن میں سے ابو جعفر رازیؒ کو بجائے خود وثقہ ہیں۔ مگر بے سر وپا روایتوں کے بیان کرنے میں بے باک ہیں۔ بقیہ دو مشہور کذاب اور دروغ گو ہیں۔

ابن جریر طبریؒ نے حسن بصریؒ، قتادہ اور ابن زیدؒ سے بھی واقعہ ارتداد نقل کیا ہے۔ لیکن ان کا سلسلہ ان سے آگے نہیں بڑھتا۔

اس واقعہ کے انکار کی سب سے پر زور دلیل ہمارے پاس یہ ہے کہ اس وقت مکہ میں جو اصحاب اسلام لائے تھے۔ وہ گئے چنے لوگ تھے۔ جو ہم کو نام بنام معلوم ہیں۔ ان میں سے کسی کی پیشانی پر ارتداد کا داغ نہیں۔ سیرت ابنی ص ۴۱۹ ج ۳۔

جہاں تک حسن بصری تاہی، قتادہ تاہی اور ابن زید شح تاہی کے اقوال کا سوال ہے یہ ان کی آرا میں حدیث نہیں۔ اور ان حضرات کو قرآن کی ایک آیت کے باعث مغالطہ ہوا ہے۔ وہ آیت یہ ہے۔  
 وَمَلَجَطْنَا السُّرِّيَا لَلَّتِي اسِيْنَا لَا  
 اور ہم نے جو کچھ آپ کو دکھایا تھا۔ وہ لوگوں  
 کی آزمائش کے لئے دکھایا تھا۔  
 فَنَسَقْنَا لِّلنَّاسِ۔

ان حضرات نے اس آزمائش کو صحابہ کے لئے آزمائش تصور کر لیا۔ حالانکہ یہ واقعہ کفار کے لئے آزمائش تھا۔

اب اس تفصیلی روایت کا سوال تو یہ حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ اسے ابو جعفر رازی نے ریح بن انس سے نقل کیا ہے۔ وہ اسے ابو العالیہؓ کے ذریعہ ابو ہریرہؓ سے نقل کرتے ہیں۔ ریح بن انس اور ابو العالیہ مسلہ امام ہیں لیکن ان سے یہ روایت ابو جعفر رازی کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا۔ ابو جعفر سے یہ کہانی نقل کرنے والا ابو ہارون عابدی ہے۔ اور اس سے نقل کرنے والا خالد بن یزید بن ابی مالک ہے۔ یہ تینوں کس حشیت کے افراد ہیں۔ سید صاحب نے ان کی جانب اشارے کئے ہیں لیکن ہم امام ذہبی کی زبانی ان کی صحیح صورت حال قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

اس کا نام عیسیٰ بن ابی عیسیٰ ہے۔ یہ بصرہ میں پیدا ہوا، اور اسے میں کونٹ اختیار ابو جعفر رازی: کی اس سے اس کا بیٹا عبداللہ اور ابو نعیم روایت کرتے ہیں۔ یحییٰ بن یحییٰ اور ابو حاتم کہتے ہیں یہ ثقہ ہے لیکن علی بن الدین کہتے ہیں یہ غلطیاں کرتا ہے۔ روایات میں خلط ملط کرتا ہے۔ فلاں کہتے ہیں اس کا حافظہ بہت خراب تھا اب جہاں کہتے ہیں یہ منکر روایات بیان کرتا اور انہیں شہورائے کتبہ کی جانب منسوب کر دیتا ہے (جیسا کہ اس روایت کو ریح بن انس اور ابو العالیہ کی جانب منسوب کر دیا) ابو زرہ کہتے ہیں اسے بہت دہم ہوتا تھا۔ ذہبی میزان میں فرماتے ہیں اس نے ریح بن انس کے ذریعہ ابو العالیہ سے اور ابو العالیہ ابو ہریرہؓ سے اس سند کے ذریعہ اس نے معراج کے سلسلہ میں ایک طویل روایت بیان کی ہے۔ جس میں بہت سی باتیں منکر ہیں۔ میزان مثلاً ج ۳  
 امام ذہبی نے صرف ابو جعفر رازی کے باعث اسے منکر قرار دے دیا۔ حالانکہ اس کا تو صرف حافظہ

خراب تھا اس میں تو صرف اتنا ہی عیب تھا کہ لغو روایات کو مشہور ائمہ کی جانب منسوب کر دیتا۔ لیکن جب ان کے ساتھ بقیہ دو راویوں کو اور ملا لیا جائے۔ جن کا ذکر ہم ذیل میں کر رہے ہیں۔ پھر قارئین خود ہی فیصلہ کریں کہ اس کہانی کو کیا کہا جائے۔

**خالد بن یزید:** یہ دمشق کا باشندہ ہے۔ اس کا نسب نامہ خالد بن یزید بن عبد الرحمن بن ابی مالک الشمشقی ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔ یہ وہابی انسان ہے۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ نسائی کا قول ہے یہ ثقہ نہیں ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔

ابن ابی الحواری کا بیان ہے کہ میں نے امام یحییٰ بن معین کو یہ فرماتے سنا کہ عراق میں ایک کتاب ایسی ہے جسے دفن کر دینا چاہیے وہ تفسیر کلبی ہے (یعنی تفسیر ابن عباس۔ ام ہانی کی پہلی کہانی اسی کتاب کے تعلق رکھتی ہے) اور شام میں بھی ایک ایسی کتاب ہے جسے دفن کرنا چاہیئے۔ وہ خالد بن یزید کی کتاب الہیات ہے اس خالد کا دل اس وقت تک خوش نہیں ہوتا جب تک اپنے باپ اور صحابہ پر جھوٹ نہ قبول لے۔

یہی احمد بن ابی الحواری کہتے ہیں کہ میں نے یہ کتاب خالد سے نقل کی تھی۔ بعد میں میں نے ایک عطار کو دیدی۔ وہ اس میں دعائیں باندھ باندھ کر لوگوں کو دیا کرتا تھا۔ ذہبی کہتے ہیں یہ ضعیف میں پیدا ہوا۔ اور اسی سال کی عمر میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان صفحہ ۶۴۵ ج ۱

گویا یہ خالد تمام محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار اور امام یحییٰ بن معین کے نزدیک کذاب ہے۔ صحابہ پر جھوٹ بولتا ہے۔

اب تیسرے راوی ابو ہارون العبدی کا چہرہ بھی دیکھ لیجئے۔

**ابو ہارون العبدی:** اس کا نام عمارہ بن الجوین ہے۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ ذہبی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ امام حماد بن زید فرماتے ہیں کذاب ہے امام احمد کا قول ہے کہ کچھ نہیں ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں ضعیف ہے۔ اس کی روایات کی تصدیق نہیں ہوتی۔ نسائی کا قول ہے متروک الحدیث ہے۔ ابن حبان کا بیان ہے کہ یہ حضرت ابو سعید خدریؓ کی جانب ایسی روایات منسوب کرتا ہے جو انہوں نے بیان نہیں کیں۔

امام شعبہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی مجھے دو باتوں کا اختیار دے کہ یا قتل ہونا منظور کرو یا اس ابو ہریرہ کی روایات لوگوں کے سامنے بیان کرو، تو میں قتل ہونا منظور کروں گا لیکن اس کی روایت بیان کرنے کے لئے تیار نہیں۔ میں پہلے ہر قافلہ والوں سے اس کا حال پوچھتا لیکن پھر اتفاق سے یہ بصرہ گیا۔ اس کے پاس ایک کتاب تھی۔ میں نے اسے دیکھا تو اس میں حضرت علیؓ کی برائیاں لکھی ہوئی تھیں۔

ارتقنی کا قول ہے کہ یہ متکون المزاج شخص تھا کہ کسی دفعہ میں جانا تھا۔ اور کبھی خارجی باطن جہان فرماتے ہیں یہ حضرت ابوسعید خدریؓ کے نام سے جتنی روایات بیان کر رہا ہے۔ وہ سب جھوٹ ہیں۔ انہوں نے یہ روایت کبھی بیان نہیں کی۔ جو زہلانی کا قول ہے کہ ابو ہریرہ کذاب ہے۔ صحابہ پر تہمتیں لگانا ہے۔

امام شعبہ فرماتے ہیں میں اس کے پاس گیا اور اس سے سوال کیا کہ تمہارے پاس ابوسعید خدریؓ کی جو لکھی ہوئی روایات ہیں وہ مجھے دکھاؤ۔ اس نے ایک کتاب نکال کر میرے سامنے رکھی۔ اس میں ایک روایت یہ بھی تھی کہ حضرت ابوسعیدؓ فرماتے ہیں کہ عثمانؓ بن عفان اپنے مرنے اور دفن ہونے سے قبل اللہ کا منکر بن چکا تھا۔ میں نے وہ کتاب اسے واپس کر دی اور اٹھ کر چلا آیا۔

یعنی ایک کتاب میں حضرت علیؓ کی برائیاں تھیں اور دوسری میں حضرت عثمانؓ کی۔ اب بات کھل کر سامنے آگئی کہ بہت سے مسلمان مرتد ہو گئے تھے۔ جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بھی داخل ہیں۔ اسی سے اس روایت کا اندازہ کر لیجئے۔ کہ یہ سبائی مؤرخین آپ کو کس منزل پر لے جانا چاہتے ہیں۔

یحییٰ بن یعین فرماتے ہیں۔ اس کے پاس ایک صحیفہ تھا۔ جسے یہ صحیفۃ الوحی کہا کرتا تھا۔ صراحہ بن محمد کا بیان ہے کہ یہ تو فرعون سے بھی زیادہ جھوٹا ہے۔ ۱۳۰ھ میں اس کا انتقال ہوا۔ میزان ص ۱۳۵ ج ۲

اس تمام کہانی کے ذریعہ اول تو صحابہ کا مرتد ہونا ظاہر کیا گیا۔ اور دوسرے ام ہانیؓ کے گھر سے معراج کا ذکر کر کے حضور کی ذات پر الزام لگانے کی کوشش کی گئی۔ یہ ہے ان جھوٹی کہانیوں کا خلاصہ۔

## کیا معراج ایک خواب تھا؟

ان سبائیوں اور خاص طور پر مؤرخین نے جہاں ہزارہا قسم کے سیاہ کارنامے انجام دیئے ہیں۔ وہاں صحابہ کرام کی ذات کو بدنام کرنے اور اسلام کی صورت کو مسخ کرنے کا کوئی پہلو باقی نہیں چھوڑا۔ معراج سے متعلقہ پہلی روایات میں درپردہ حضور کی ذات اقدس پر تبر کیا گیا۔ اور حضرات صحابہ کو مرتد ثابت کیا گیا۔ لیکن چونکہ ان سبائیوں کو ام المومنین عائشہؓ اور حضرت امیر معاویہؓ سے خاص بغض ہے۔ لہذا ان ہر دو حضرات کی جانب یہ بات منسوب کی گئی کہ یہ معراج جسمانی کے قائل نہ تھے۔ بلکہ یہ معراج کو ایک خواب تصور کرتے تھے اگر واقعاً معراج کی حیثیت ایک خواب کی ہوتی تو نہ کسی کے مرتد ہونے کا کیا سوال تھا۔ نہ قریش کے مذاق اڑانے کا اور نہ اُم ہانیؓ کے گھر کی کہانی وضع کرنے کا۔ آخر ان سبائیوں کو یہ داستانیں وضع کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی؟ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت عائشہؓ کی جانب جو روایات منسوب کی گئیں۔ ان ہی کو دیکھتے ہوئے سرسید نے معراج کے جسمانی ہونے کا انکار کیا تھا۔ اور قادیانی بھی ان ہی روایات کو سہارا بنا کر غلام احمد قادیانی کی معراج روحانی کفایت گاتے رہے۔

امیر معاویہؓ کے اس قول کو ابن ہشام نے زیادہ بالکافی کے واسطے سے محمد بن اسحاق امیر معاویہؓ کا قول سے نقل کیا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں۔

عن محمد بن اسحاق قال حدثني	محمد بن اسحاق سے مروی ہے کہ مجھ سے یعقوب
يعقوب بن عتبة بن المغيرة ان	بن عتبة بن المغيرة نے بیان کیا کہ معاویہؓ بن
معاوية بن ابي سفيان	ابی سفیان سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے
كان اذا سئل عن مسرى رسول	معراج کے سلسلہ میں دریافت کیا گیا۔ انہوں
الله صلى الله عليه وسلم قال	نے فرمایا یہ اللہ کی جانب سے ایک سچا خواب تھا۔
كانت رويا من الله صادقة	

اس روایت میں اگر محمد بن اسحاق کی ذات اور اس کی محبوسیت کو بھی نظر انداز کر دیں تو یعقوب بن غنیمۃ الخیرۃ تبع تابعی ہیں۔ مسلم میں ان کا انتقال ہوا۔ انہوں نے امیر معاویہؓ کو کیا خواب میں دیکھا تھا یا اور کیا خواب میں امیر معاویہؓ نے ان سے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا۔ اور یعقوب نے اس شخص کا نام نہیں لیا جس سے یعقوب نے امیر معاویہؓ کا یہ قول سنا تھا۔ درمیان سے یہ روایت منقطع ہوئی اور منقطع روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔

پھر عربی لحاظ سے روایا مصدر ہے جس کے معنی دیکھنے کے آتے ہیں۔ یہ آنکھوں سے دیکھنے پر بولا جاتا ہے۔ خواب کے معنی میں تو مجازی طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اس کا کیا ثبوت ہے۔ کہ امیر معاویہؓ نے اس لفظ کا استعمال مجازی معنی میں کیا ہے۔ اور نحوی معنی مراد نہیں لئے۔ اس صورت میں یہ روایت خود دلیل نہیں بن سکتی۔ بلکہ یہ خود دلیل کی محتاج ہوگی۔ اور دعویٰ اور دلیل ایک نہیں ہوا کرتے۔ ہمارے نزدیک یہ ساری کارستانی محمد بن اسحاق کی ہے۔ اس کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔ اور محبوس ہونے کے ناتے اسے امیر معاویہؓ سے جو تعلق ہو گا اسے بیان کرنے کی بھی ضرورت نہیں ویسے ہم اس کا تفصیلی حال پہلے عرض کر چکے ہیں۔

محمد بن اسحاق سے اس کی مغازی نقل کرنے والے اصل دو افراد ہیں۔ ایک زیاد البکائی اور ایک سلمۃ الابریش۔ ابن ہشام نے زیاد البکائی سے اس کتاب کو نقل کر کے ترتیب دیا ہے۔ گویا سیرت ابن ہشام دراصل مغازی محمد بن اسحاق ہے۔ جو ابن ہشام نے زیاد البکائی سے نقل کی تھی۔ اور زیاد نے محمد بن اسحاق سے۔ آج دنیا میں محمد بن اسحاق کے نام کی اگر کوئی کتاب موجود ہے تو وہ یہی سیرت ابن ہشام ہے۔ یعنی جس طرح تفسیر کلبی تفسیر ابن عباس کے نام سے مشہور ہو گئی۔ اسی طرح مغازی ابن اسحاق سیرت ابن ہشام کے نام سے مشہور ہو گئی۔ چونکہ ابن ہشام نے اس کتاب کو زیاد البکائی سے نقل کیا ہے۔ اس لئے ہم زیاد البکائی کا بھی کچھ حال پیش کئے دیتے ہیں۔

اس کا پورا نام زیاد بن عبداللہ بن الطفیل البکائی ہے۔ یہ کوفہ کا باشندہ تھا۔ **مورخ زیاد البکائی:** اسے متعدد محدثین نے ثقہ قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے بھی اس سے ایک حدیث لے لی ہے۔ ابن اسحاق کا نسخہ مل گیا ہے۔

روایت نقل کی ہے۔ لیکن دوسرے راوی کے ساتھ۔ گویا یہ اس روایت میں تنہا نہیں ہے۔ مسلم میں بھی اس کی روایات پائی جاتی ہیں۔ امام احمد نے بھی اس سے روایات لی ہیں۔

امام احمد فرماتے ہیں یہ سچا ہے البوزرہ بھی اسے سچا کہتے ہیں۔ یحییٰ بن معین فرماتے ہیں غزوات کی روایات نقل کرے پھر تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن بقیہ روایات میں ہرگز بھی قابل قبول نہیں۔ نسائی کہتے ہیں ضعیف ہے قوی نہیں ہے۔ ابویہ کا قول ہے کہ یہ حجت نہیں ہے۔ ابن الدینی فرماتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ اگرچہ محدثین نے اس سے روایات لی ہیں لیکن محدثین کے نزدیک یہ حجت نہیں۔ صالح جزیرہ کا بیان ہے کہ فی اللغات تو ضعیف ہے۔ لیکن مغازی کی روایات میں معتبر ہے۔ عبد اللہ بن ادریس کہتے ہیں۔ محمد بن اسحاق کے اقوال اور روایات نقل کرنے میں اس سے زیادہ قابل اعتبار کوئی نہیں۔ اس لئے کہ اس زیادہ سے ابن اسحاق کی مغازی اسے دو دفعہ پڑھ کر سنائی تھی۔ اس کا انتقال ۸۲ھ میں ہوا۔ میزان ص ۹۱ ج ۲

اس تفصیل سے چند امور ظاہر ہوئے۔

۱۔ اکثر محدثین کے نزدیک یہ ناقابل اعتبار ہے۔

۲۔ جن کے نزدیک قابل اعتبار ہے ان کے نزدیک بھی مغازی یعنی غزوات رسول کی روایات میں

معتبر ہے۔ بقیہ روایات میں نہیں۔

۳۔ ہاں محمد بن اسحاق کے اقوال کو سب سے زیادہ صحیح طور پر نقل کرتا ہے۔

اتفاق سے اس روایت کا تعلق غزوات النبی سے نہیں اس لئے بھی یہ روایت ناقابل قبول ہے۔ گویا

کہ اس روایت میں تین عیوب جمع ہو گئے۔

۱۔ زیادہ لکھی ناقابل اعتبار ہے۔

۲۔ ابن اسحاق مجوسی ہے یہودیوں سے روایات لیتا اور دھوکہ بازی سے کام لیتا ہے۔

۳۔ درمیان سے ایک راوی غائب ہے۔ اس طرح یہ روایت منقطع ہے۔ اور منقطع روایت کو کسی

کے نزدیک بھی قابل قبول نہیں۔



طبری نے سنی قسم کی ایک روایت حضرت عائشہؓ کی جانب  
**حضرت عائشہؓ پر ایک الزام :** بھی منسوب کی ہے جو اس نے اپنی تفسیر میں نقل کی ہے  
 اس کے الفاظ ہیں۔

حدثنا ابن حمید قال حدثنا سلمة  
 عن محمد بن عبد بن حمید قال حدثنا بعض آل الجی  
 بکر ان عائشة كانت تقول ما فقد  
 جسد رسول الله صلى الله عليه وسلم  
 ولكن اسرى بروحه۔  
 ہم سے ابن حمید نے بیان دیا۔ من سے سمر نے  
 وہ محمد سے نقل کرتے ہیں۔ محمد کہتے ہیں کہ  
 مجھ سے ابو بکر کی اطوار میں سے کسی نے بیان  
 کیا کہ عائشہؓ کہا کرتی تھیں کہ حضورؐ کا جسم غائب  
 نہیں ہوا تھا بلکہ معراج آپ کو آپ کی روح  
 کے ذریعہ ہوئی۔

سید سلیمان ندوی اس روایت پر مختصر کلام کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس روایت کے سلسلہ میں محمد بن  
 اسحاق اور حضرت عائشہؓ کے درمیان ایک راوی یعنی خاندان ابی جحک کے ایک شخص کا نام و نشان مذکور نہیں ہے۔  
 اس لئے یہ روایت بھی پایہ صحت سے فروتر ہے۔ سیرت النبی ص ۲۲۲ ج ۳  
 اس کہانی کو درجہ صحت سے فروتر قرار دینا یہ بھی اس روایت کو ایک گونہ تسلیم کرنا اور اس کی حیثیت کو  
 بڑھانا ہے۔ غالباً سید صاحب مرحوم نے صرف اس چیز کو پیش نظر رکھا کہ درمیان کے ایک راوی کا نام  
 معلوم نہیں۔ یعنی راوی مہجول ہے۔ اس لحاظ سے یہ روایت غریب و مہجول ہے۔ کاش سید صاحب ابن حمید  
 اور سلمہ کے حال پر غور فرما لیتے تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اس روایت کے بارے میں کچھ اور ہی رائے قائم فرماتے  
 لہذا ہم پہلے سلمہ اور ابن حمید کے سلسلہ میں کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں۔

محمد بن اسحاق سے اس الزام کو نقل کرنے والا ایک شخص سلمہ نامی ہے۔ اس کا پورا  
**مؤرخ سلمۃ الابشر :** نام سلمہ بن الفضل ہے۔ ابشر کے لقب سے مشہور تھا۔ یہ رے کا تافسی  
 تھا۔ اسی نے رازی کی نسبت سے مشہور ہے۔ اس کی کنیت ابو عبد اللہ تھی۔ اپنے دور کا مؤرخ تھا۔ محمد بن  
 اسحاق کی مغازی کا ایک راوی یہ بھی ہے۔ ہم اس کا حال اور اس کے بارے میں محدثین کے نظریات امام ذہبی

کی زبانی نقل کرتے ہیں۔

امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں مغازی میں اس کی کتاب سے زیادہ اور کوئی کامل کتاب نہیں۔ ہم نے اس کے کچھ روایات لکھی تھیں۔ امام اسحاق بن راہویہ فرماتے ہیں یہ ضعیف ہے۔ بخاری کہتے ہیں اس کی بعض احادیث منکر ہوتی ہیں۔ نسائی کا قول ہے کہ یہ ضعیف ہے علی بن المدینی کا بیان ہے کہ ہم جس وقت رے سے واپس ہوئے تھے۔ تو ہم نے اُن روایات کو جو اس سے سُن کر لکھی تھیں لغو اور جھوٹ سمجھ کر زمین پر پھینک دیا تھا۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں کہ یہ ابورش رازی شیعہ تھا۔

امام ابو حاتم رازی فرماتے ہیں یہ قابلِ محبت نہیں۔ امام ابو زرہ رازی کا ارشاد ہے کہ رے کے باشندے اسے قطعاً پسند نہ کرتے تھے۔ کیونکہ اس کے خیالات بہت گندے تھے۔ اور قاضی ہونے کے لحاظ سے لوگوں پر بہت ظلم ڈھاتا تھا۔ اگرچہ نمازیں بہت خشوع و خضوع سے پڑھتا۔ قاضی بننے سے قبل بچوں کو پڑھایا کرتا تھا۔<sup>۱۹</sup> اس کا انتقال ہوا۔

اسلمہ بن الابرش سے یہ کہانی نقل کرنے والا ابن حمید ہے جو مورخ طبری کا استاد ہے۔ اب اس کا حال بھی امام ذہبی کی زبانی سُن لیجئے۔

اس کا پورا نام محمد بن حمید ہے۔ یہ بھی رے کا باشندہ ہے۔ یعقوب ثقی (جو شیعہ محمد بن حمید رازی) کتابوں کا مصنف ہے، وغیرہ سے روایات نقل کرتا ہے۔ حافظ الروایات سمجھا جاتا ہے ضعیف ہے۔ یعقوب بن شیبہ کہتے ہیں یہ بہت منکر روایات بیان کرتا ہے۔ بخاری فرماتے ہیں اس پر اعتراض ہے، اس کے ہم وطن امام ابو زرہ رازی کا فرمان ہے کہ کذاب ہے۔ فضیل الرازی فرماتے ہیں کہ میرے پاس اس کی پچاس ہزار روایات ہیں۔ جن میں سے ایک بھی بیان کرنا میں پسند نہیں کرتا۔

اسحاق الکوسجی کا بیان ہے کہ ہمارے سامنے محمد بن حمید نے کتاب المغازی جو وہ سلمہ بن الابرش کے ذریعہ محمد بن اسحاق سے نقل کرتا ہے۔ پڑھ کر سنائی۔ اتفاق سے میں اس کے بعد علی بن ہریران کے پاس گیا۔ میں نے سلمہ کی کتاب المغازی پڑھتے دیکھا۔ میں نے علی بن ہریران سے سوال کیا کہ کیا تو نے یہ المغازی محمد بن حمید سے سنی ہے۔ وہ یہ سُن کر حیرت میں مبتلا ہو گیا۔ اور بولا کہ ابن حمید نے تو یہ کتاب مجھ سے سنی ہے۔

یعنی ابن حمید کا یہ دعویٰ کہ ابن اسحاق کی روایات اس نے سلمہ سے سنی تھیں۔ یہ جھوٹ ہے۔ اس نے تو علی بن ہریران سے سنی ہیں اور علی بن ہریران نے سلمہ سے۔ یہ حقیقت حال معلوم ہونے کے بعد اسحاق کو سچ فرماتے ہیں۔ میں شامت و دنیا ہوں کہ محمد بن حنفیہ کذاب ہے۔

صالح جزرہ کا قول ہے کہ ہم لوگ اس محمد بن حمید کو ہر بات میں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ میں نے اس شخص سے زیادہ اللہ سے بے خوف کوئی انسان نہیں دیکھا۔ یہ لوگوں سے احادیث و روایات سننا اور ان میں رد و بدل کرتا رہتا تھا۔

ابن خراش نے ایک بار اس محمد بن حمید کی روایت بیان کی۔ اور فرمایا اللہ کی قسم وہ جھوٹ بولتا ہے دیگر محدثین کا قول ہے کہ وہ لوگوں کی احادیث لے کر دوسروں کی جانب منسوب کر دیتا۔ سنائی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ صالح جزرہ کا قول ہے کہ میں نے اپنی زندگی میں دس شخصوں سے زیادہ جھوٹ کا ماہر کوئی نہیں دیکھا۔ ایک محمد بن حمید مورخ اور دوسرا ابن الشاذکونی۔

امام فضیل الرازی فرماتے ہیں کہ میں اس محمد بن حمید کے پاس گیا تو یہ سنی سنائی کہانیوں کی سندت وضع کر رہا تھا۔

ذہبی کہتے ہیں کہ اس کے شاگرد مورخ طبری نے یہ بات تو یقین و صحت کے ساتھ لکھی ہے کہ اسے قرآن بھی یاد نہ تھا۔ آخر عمر میں اس سے روایات سننے والے دس شخص ہیں۔ ابوالقاسم لغوی اور محمد بن جریر طبری۔ اس ابن حمید کا انتقال ۱۸۰ھ میں ہوا۔ میزان ۲۵۳ ج ۳

علی بن ہریران نے دعویٰ کیا تھا کہ ابن اسحاق کی روایات اس نے سلمہ سے نہیں سنی، بلکہ اس نے مجھ سے سنی تھیں۔ اور میں نے سلمہ سے سنی تھیں۔ اس نے درمیان سے میرا نام غائب کر دیا۔ اب ذرا علی بن ہریران پر بھی اچھٹی سی نظر ڈال لیجئے۔

یہ بے کابا شندہ ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں۔ یہ کلمۃ الابریش سے ابن اسحاق مورخ علی بن ہریران کی کتاب روایت کرتا ہے۔ ابوالاسحاق جو زبانی کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں ہے۔ اس کا مذہب انتہائی ردی تھا۔ میزان ۱۵۸ ج ۳۔

اب حقیقت حال کھل کر سامنے آگئی کہ حضرت عائشہؓ کے اس قول کو چار مؤرخ نقل کر رہے ہیں۔ چاروں ایرانی ہیں۔ چاروں بد مذہب ہیں۔ چاروں سبائی ہیں۔ اور جو عرب ہے اس کا نام غائب ہے۔ ان چاروں میں سے تین دے کے باشندہ ہیں یعنی سلمہ بن الابرش۔ محمد بن حمید علی بن مہران۔ اور اتفاق سے دسے کے محدثین انہیں کذاب سمجھتے ہیں۔ مثلاً فضیل الرازی، ابو زرہ رازی۔ اور ابو حاتم رازی۔

پھر ان مازنیوں سے نقل کرنے والا محمد بن جریر طبری ہے جو خود شیعی ہے۔ اور طبرستان کا باشندہ ہے اور دے طبرستان کے علاقہ میں داخل تھا۔ طبری کا انتقال سنہ ۲۴۰ میں ہوا۔ گویا سنہ ۲۳۰ تک یہ روایت صرف طبرستان کے علاقہ میں گھومتی رہی۔ اس سے باہر کا کوئی فرد اس روایت سے واقف نہ تھا۔ اور امام المؤمنین عائشہؓ کی وفات سنہ ۴۰ میں ہوئی۔ گویا وہ حال سوال تک اس روایت کا ایک ایک فرد کے علاوہ کسی کو علم نہ ہوا۔ اور یہ علم باطن کی طرح سینہ بسینہ چلتی رہی۔

بظاہر تو یہ ایک معمولی سی بات نظر آتی ہے۔ لیکن اس روایت کے ذریعہ ان کو باطنوں نے حضور کی معراج کی حیثیت پر ایک کاری ضرب لگائی ہے۔ کہ یہ تو صرف ایک خواب تھا۔ اور خواب سچا بھی ہوتا ہے اور جھوٹا بھی۔ اگر صرف یہ خواب تھا۔ تو ان مرنے والوں سے کوئی پوچھے کہ پھر صحابہ کو مرتد بنانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور کس لئے ام ابی قیس کے گھر کی کہانی وضع کی گئی۔ ہمارے نزدیک اس روایت کا مقصود حضرت عائشہؓ کی وفات کو متہم کرنا تھا۔

ہم شاید اس روایت پر اتنی بحث نہ کرتے، لیکن ہم اپنے بچپن سے یہ دیکھتے چلے آئے ہیں کہ ہر وہ طبقہ جو مذہب کا دشمن ہے، وہ معراج جسمانی کے انکار کے لئے اس روایت کو ضرور پیش کرتا رہا ہے۔ سرسید نے بھی اسی سے استدلال کیا۔ پر ویزا واران کے ہم نوا بھی اسے پیش کرتے رہے ہیں، اور قلیوٹی تو خاص طور پر اس روایت کے شیدائی ہیں۔ یہ سب حضرات معراج کو ایک خواب قرار دیتے ہیں اور مزید بدحاشی یہ کہ نبی کے خواب کو بھی وہ اپنے ہم جنس کا خواب سمجھ بیٹھے ہیں جو شیطان کی گورکھ دھندے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

## ہجرت مدینہ

حکیم عبدالرؤف دایا پوری اپنی کتاب الحیۃ السیر میں ہجرت مدینہ کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں۔  
 جب کفار نے دیکھا کہ اصحاب رسول اللہ چلے گئے۔ اپنا مال و متاع اور اپنے ذراری و اطفال کو بھی  
 ساتھ لے گئے، اور اوس خنزرج کے قبیلے جو زبردست اور ذی اثر قبیلے ہیں وہ ان کے ساتھ ہیں۔ تو ان  
 کو اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سخت خطرہ ہوا سب کے سب دار اندوہ میں جمع ہوئے۔  
 اور یہ ان کا ایسا زبردست اجتماع تھا کہ کوئی اہل الرائے ایسا نہ تھا جو اس مشورہ میں شریک نہ ہوا ہو، ان کا  
 اصلی سردار بلیس ایک شیخ کبیر کی شکل میں موجود تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے کی مختلف تدبیریں  
 کی گئیں۔ سب کو اس شیخ کبیر نے ناپسند کیا۔ آخر ابو جہل نے یہ تدبیر پیش کی کہ تمام قبائل سے ایک ایک جوان لیا  
 اور ان سب کو تیار دی جائے۔ یہ سب مل کر بیک ضرب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاتمہ کر دیں۔ اس  
 طرح ان کا دم بہت سے قبائل میں تقسیم ہو جائے گا۔ اور تمام قبائل کا بنی عبد مناف مقابلہ نہیں کر سکتے۔ بالقرض  
 اگر انہوں نے دیت جاری تو ہم سب مل کر دیت ادا کر دیں گے۔ بڑھے شیخ نے اس رائے کو پسند کیا اور  
 یہی رائے طے پائی۔

**ہجرت کا حکم اور ہجرت نبوی:** حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت جبریلؑ تشریف  
 لائے۔ کفار کے مشورے کی خبر دی۔ ہجرت کا حکم ہوا۔ اور

فرمایا کہ آج رات کو اپنے بستر پر نہ سوئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ٹھیک دوپہر کے وقت جا کر حضرت  
 زیدؓ کو ہجرت کی خبر دیدی تھی۔ شب کے وقت کفار دروازے پر جمع ہو گئے۔ اور مکان گھیر لیا۔ آپ نے  
 حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنے بستر پر سلا دیا اور یہ آیت تلاوت فرمائی وجعلنا من بین یدیم سدا  
الائۃ اور ایک مٹھی بطحا کا خاک لے کر چھینکی۔ جو تمام کفار کے سروں پر پڑی۔ اور آپ نکل کر چلے گئے کسی کا نہ

آپ کو نہ دیکھا۔ حضرت صدیقؓ کے دروازے سے ان کے مکان میں گئے۔ اور حضرت صدیقؓ کو ساتھ لے کر دوسری طرف کھڑکی کے راستے روانہ ہو گئے۔ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر جمع تھے۔ ایک شخص نے اگر کہا کلاب کیا کر رہے ہو، وہ تو تہارے سروں پر خاک ڈال کر چلے بھی گئے۔ کفار نے دیکھا تو سب کے سروں پر خاک تھی۔ وہ صاف کرنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہو کر غار ثور پر پہنچے۔ اور تین دن تک اس میں رہے۔ مگر ٹی نے جالاتن دیا۔ پرندوں نے اس پر انڈے دیئے۔ کفار تلاش میں غار کے منہ تک پہنچے۔ مگر خدا نے آپ کو ان کے شر سے محفوظ رکھا۔ صبح الیرمۃؑ

یہ ہجرت کے واقعہ کا ابتدائی حصہ ہے۔ جو مکہ سے غار ثور تک کے واقعات پر مبنی ہے۔ اس حصہ میں خاص طور پر چند امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ صحابہ کرام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قبل سب مدینہ چلے گئے تھے۔ اور اپنا مال و متاع بھی ساتھ لے گئے تھے۔

۲۔ ہجرت کے روز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکرؓ کے گھر دوبارہ تشریف لے گئے۔ ایک بار عین دوپہر کے وقت، اور ایک بار رات کے وقت حن میں صرف اطلاع دینے تشریف لے گئے تھے۔

۳۔ آپ نے ہجرت رات کے وقت اپنے گھر سے فرمائی۔

۴۔ اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو سلا یا۔

۵۔ کفار نے آپ کے خلاف قتل کا منصوبہ تیار کیا۔ جس میں جو عبد مناف کے علاوہ تمام قریش کے با اثر اشخاص شامل تھے۔

۶۔ سب نے آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ لیکن آپ انکے سروں پر مٹی ڈال کر چلے آئے۔

۷۔ غار کے منہ پر مگر ٹی نے جالاتن دیا۔ اور پرندوں نے انڈے دیئے۔

۸۔ ابو بکرؓ کے گھر سے غار ثور تک کے تمام واقعات کا کوئی ذکر حکیم صاحب نے نہیں کیا۔

یہ تمام واقعات طبری اور ابن سعد میں واقعی اور ابن ہشام میں محمد بن اسحاق سے مروی ہیں۔ جن کا

تفصیلی جلیہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لیکن عقلی طور پر بھی یہاں چند اعتراضات وارد ہوتے ہیں۔

۱۔ ان تمام واقعات کا مشاہدہ کرنے والا کون تھا ہاں اسحاق اور داؤد ہی اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔

۲۔ ابو بکر کے گھر سے لے کر غار ثور تک کے تمام واقعات جن کا تعلق حضرت ابو بکرؓ اور ان کے گھرانے

سے ہے۔ انہیں حکیم صاحب نے کیا اس لئے نظر انداز کیا ہے کہ سبائی حضرت ابو بکرؓ اور ان کے خاندان کی حیثیت کو ختم کرنے کے درپے ہیں، اس کی تکمیل کی جلا سکے۔

۳۔ حضور کے گھر میں اُس وقت حضرت فاطمہؓ حضرت ام کلثومؓ۔ آپ کی دائی حضرت ام ایمنؓ، آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سوداؓ اور آپ کے ستنی حضرت اسماءؓ بن زیدؓ موجود تھے۔ گھر میں تنہا حضرت علیؓ نہ تھے۔ اور اہل عرب زمانہ مکان میں داخل نہ ہوتے تھے۔ در نہ گھر گھیرنے اور پوری رات باہر کھڑے رہنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ پھر حضرت علیؓ کو بستر پر لٹانے سے بجز افسانہ تراشی کے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ آپ کی روانگی کی اطلاع تو صبح کے وقت کسی د کسی سے ہو سکتی تھی۔

۴۔ اس کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ہجرت رات کے وقت ہوئی۔ حالانکہ اہل مکہ ہمیشہ رات ہی میں سفر کرتے۔ اور رات ہی میں ان کا کاروبار ہوتا۔ جیسا کہ آج تک مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور جدہ میں نظر آتا ہے۔ کہ اہل عرب زیادہ تر رات جاگ کر گزارتے۔ اور دن میں سوتے ہیں۔ اس لحاظ سے رات کا وقت آمدوت کا وقت تھا اور ہجرت کے لئے انتہائی خطرناک وقت۔ مناسب تو یہ تھا کہ ہجرت دوپہر کے وقت کی جاتی۔ جب گرمی کی شدت کے باعث لوگ گھروں میں بند ہوتے۔ اور واقعہ بھی ایسا ہی پیش آیا ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں آ رہا ہے لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو سبائی داستانیں کیسے تیار ہوتیں۔

۵۔ اگر مٹی ڈالنے سے مقصود یہ تھا کہ وہ دیکھ نہ سکیں تو پھر تو مٹی آنکھوں میں ڈالنی چاہیئے تھی۔ پر مٹی ڈالنے سے اس کے علاوہ اور کیا فائدہ ہو سکتا ہے کہ دشمن ہوشیار ہو جائے اور چاروں طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھنے لگے۔

۶۔ حکیم دانا پوری صاحب نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ حضور سے قبل تمام صحابہ اپنا مال و متاع لے کر ہجرت کر گئے تھے۔ تو ان کی خدمت میں پہلی عرض تو یہ ہے کہ سب ہی نے ہجرت نہ کی تھی۔ اور متعدد

افراد اور عورتیں کفار کے گھروں میں محصور تھیں۔ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ صحابہ اپنا مال و متاع لے کر چلے گئے تھے۔ تو کاش حکیم صاحب قرآن ہی کھول کر دیکھ لیتے۔ وہ ہجرت کا ذکر ان الفاظ میں کرتا ہے۔  
 الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ  
 وَ أَمْوَالِهِمْ۔  
 وہ لوگ جو اپنے شہروں اور اپنے مالوں سے نکال دیئے گئے۔

اور تاریخ کے ناطے اس پر غور کر لیتے کہ پھر انصار سے ان کے بھائی جارے کی کیا ضرورت تھی۔ اور انصار نے جو اپنے کھجور کے درخت انہیں پیش کئے اس کی کیا ضرورت واقع ہوئی تھی اور ان تمام واقعات کی تفصیل خود حکیم صاحب نے بیان کی ہے۔ یہ تمام امور اس کی تردید کے لئے کافی ہیں۔ تاریخ کا ہر شخص یہ نہیں بتا کہ اگے پیچھے سے انہیں بند کر لی جائیں۔ اور عقل کو بالائے طاقت کیا جائے۔ یہ کام تو ہر شخص کر سکتا ہے جس کے پیش نظر کوئی خاص غرض منسوب ہو۔

اس سے قبل کہ ہم اس واقعہ کی حقیقت پیش کرے۔ بہتر یہ معلوم ہو تب کہ پاک و ہند کے سب سے بڑے مؤرخ علامہ شبلی مرحوم کا نقطہ نگاہ بھی پیش کر دیا جائے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں۔

نبوت کا تیر ہواں سال شروع ہوا۔ اور اکثر صحابہ مدینہ پہنچ چکے تو وحی الہی کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی مدینہ کا عزم فرمایا۔ یہ داستان نہایت پر اثر ہے۔ اور اسی وجہ سے امام بخاری نے باوجود اختصار پسندی کے اس کو خوب پھیلا کر لکھا ہے۔ اور حضرت عائشہؓ کی زبانی لکھا ہے۔ حضرت عائشہؓ کو اس وقت آٹھ برس کی تھیں۔ لیکن ان کا بیان درحقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کا بیان ہے کہ ان ہی سے سن کر کہا ہو گا۔ اور ابتداء سے واقعہ میں وہ خود بھی موجود تھیں۔

قریش نے دیکھا کہ اب سلمان الدنیر میں جا کر طاق پکڑتے جا رہے ہیں۔ اور وہاں اسلام پھیلتا جا رہا ہے۔ اس بنا پر انہوں نے دارالندہ میں جو دارا شوری تھا۔ اجلاس عام کیا۔ ہر قبیلہ کے رؤساء یعنی عتبہ، ابوسفیان، جبرین، مطعم، نضر بن حارث بن کلہ، ابوالخزیم بن ہشام، زمعہ بن اسود بن مطلب، حکیم بن خزیم، ابوجہل، نبیہ، متبہ اور امیہ بن خلف وغیرہ سب شریک تھے۔ لوگوں نے مختلف رائے پیش کیں۔ ایک نے کہا محمد کے پاؤں میں زنجیر ڈال کر مکان میں بند کر دیا جائے۔ دوسرے نے کہا جلا وطن سے تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ آپ کی عمر شریف ستہ سال و ماہ سے زیادہ ہے۔



کرنا کافی ہے۔ ابو جہل نے کہا ہر قبیلہ سے ایک شخص منتخب ہو، اور پورا مجمع ایک ساتھ مل کر تلواروں سے ان کا خاتمہ کر دے۔ اس صورت میں ان کا خون تمام قبائل میں بٹ جائے گا۔ اور اہل ہاشم اکیلے تمام قبائل کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس باخیر رائے پر اتفاق ہو گیا۔

اہل عرب زنا نہ مکنان کے اندر گھسنا معیوب سمجھتے تھے۔ اس لئے باہر ٹھہرے رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نکلیں تو یہ فرض ادا کیا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریش کو اس درجہ عداوت تھی۔ تاہم آپ کی دیانت پر یہ اعتماد تھا کہ جس شخص کو کچھ مالی واسباب امانت رکھنا ہوتا تھا۔ آپ کے پاس لا کر رکھتا تھا۔ اس وقت بھی آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں۔ آپ کو قریش کے ارادے کی پہلے سے خبر ہو چکی تھی۔ اس بنا پر حضرت علیؑ کو فرمایا کہ نیچے ہجرت کا حکم ہو چکا ہے۔ میں آج مدینہ روانہ ہو جاؤں گا۔ تم میرے پلنگ پر میری چادر اوڑھ کر سو رہو۔ صبح کو سب کی امانتیں جا کر واپس دے آنا۔ یہ سخت خطرہ کا موقع تھا۔ حضرت علیؑ کو معلوم ہو چکا تھا کہ قریش آپ کے قتل کا ارادہ کر چکے ہیں۔ اور آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بستر خواب قتل گاہ کی زمیں ہے۔ لیکن فائز خیبر کے لئے قتل گاہ فرش لگی تھا۔

شبلی مرحوم نے دوبرہ دعویٰ کیا تھا کہ چونکہ ہجرت کا واقعہ صحیح بخاری میں بالتفصیل موجود ہے اس واقعہ کو ہم بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ تو ہم اللہ کو حاضر ناظر مان کر اور اس کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ اب تک جو کچھ بیان کیا گیا ہے۔ اس میں سے ایک لفظ بھی صحیح بخاری میں موجود نہیں۔ ہاں ان کی اس داستان سرائی سے جس کے اصل بانی ابن اسحاق اور واقفی ہیں چند سوالات ضرور ذہن میں آتے ہیں۔

۱۔ جب اہل عرب زنا خانے میں داخل ہونے کو معیوب تصور کرتے تھے۔ تو حضرت علیؑ کو اپنے بستر پر لٹانے اور انہیں چادر اوڑھانے میں کیا حکمت پوشیدہ تھی۔ اور گھر میں ان کے لئے کیا خطرہ ہو ہو سکتا تھا جو اسے بلا وجہ توانا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ سیاتیوں کے پیش نظر تو انہیں شکل کشا بنانا تھا۔ لیکن اہل سنت کے پیش نظر آخر کیا ہے۔ جو انہیں یہ قلابازیاں کھانے کی ضرورت پیش آئی۔

۲۔ حکیم عبدالرؤف نے مجلس شوریٰ کے اجلاس سے بنو عبد مناف کو علیحدہ کیا تھا۔ آپ نے بنو ہاشم کو۔ ان دونوں جملوں سے بہت بڑا فرق واقع ہوتا ہے۔ حکیم عبدالرؤف کے بقول اس اجلاس میں عقبہ، ابوسفیان اور زمعہ بن الاسود بن العطلب شریک ہی نہ تھے۔ کیونکہ ان تینوں کا تعلق بنو عبد مناف سے تھا۔ اور علامہ شبلی نے ان تینوں کا نام فہرست میں شامل کیا ہے۔ اور اتفاق سے دونوں حضرات نے اس فہرست کے لئے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا۔ گویا یہ فہرست تو خود ساختہ ہے اُس دور کے جتنے افراد کے نام ذہن میں آتے تھے لکھتے گئے۔ اور اس کا سب سے اہم ثبوت یہ ہے کہ اس فہرست میں حکیم بن حزام کا نام بھی موجود ہے۔ حالانکہ شبلی نے خود مختلف مقامات پر لکھا ہے کہ یہ زید بن عمرو بن نفیل سے متاثر تھے اسی لئے بت پرستی سے نفرت کرتے تھے حضور کے چچن کے دوست تھے جنگ بدر انہوں نے لڑنے کی کوشش کی تھی اور جب حضور شعب بنی ہاشم میں محصور تھے تو یہ چھپ کر غلہ بھیجا کرتے تھے۔ ایک جانب تو حالت کفر میں بھی ان کی یہ خوبیاں گنوائی جائیں۔ اور انہیں حضور کا دوست ثابت کیا جائے۔ دوسری جانب منصوبہ قتل میں ان کا نام شامل ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ کسی خاص مقصد کے تحت ہمارے مؤرخین نے ان کا نام شامل کیا ہے۔ شبلی مرحوم آگے لکھتے ہیں۔

ہجرت سے دو تین دن پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دوپہر کے وقت حضرت ابو بکرؓ کے گھر پہنچے۔ دستور کے موافق دروازے پر دستک دی۔ اجازت کے بعد گھر میں تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا کچھ شہوہ کرنا ہے سب کو ہٹا دو۔ بولے کہ یہاں آپ کی حرم کے سوا کوئی نہیں ہے اس وقت حضرت عائشہؓ سے شادی ہو چکی تھی آپ نے فرمایا مجھ کو ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے نہایت بیباکی سے کہا۔ میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں کیا مجھ کو بھی ہر اسی کا شرف حاصل ہو گا ارشاد ہوا۔ ہاں۔ حضرت ابو بکرؓ نے ہجرت کے لئے چار بیٹے سے دوا و نشیاں بول کر پتیاں بھلا بھلا کر تیاں کی تھیں۔ عرض کی کہ ان میں سے ایک آپ پسند فرمائیں۔ بحسب عالم کو کسی کا احسان گوارا نہ ہو سکتا تھا ارشاد ہوا اچھا مگر بتیت۔ حضرت ابو بکرؓ نے مجبوراً قبول کیا۔ حضرت عائشہؓ اس وقت کم سن تھیں۔ ان کی بڑی بہن حضرت اسماءؓ نے جو حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ کی والدہ تھیں۔ سفر کا سامان کیا۔ دو تین دن کا کھانا تیار کیا۔

رکھا۔ لفظ جس کو عورتیں کمر سے پھینکتی ہیں۔ پھاڑ کر اس سے ناشتہ دان کا منہ باندھا۔ یہ وہ شرف تھا۔ جس کی بناء پر آج تک ان کو ذات النطاقین کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ شبلی نے یہ پیرا لفظ صحیح بخاری سے نقل کیا ہے۔ لیکن صحیح بخاری کے ابتدائی الفاظ میں بڑا تحریف کی کیونکہ بخاری میں تو اسی دن کا واقعہ بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اسی وقت ابو بکرؓ کے گھر سے ہجرت شروع ہو گئی۔ شبلی نے ابو بکرؓ کے گھر جانے اور اس تمام گفتگو کو دو تین دن قبل کا واقعہ بیان کیا ہے۔ تاکہ صحیح بخاری کا نام بھی باقی رہے۔ اور واقعی وہاں اسحاق کی داستان بھی ہاتھ سے نہ جاتے۔ دراصل اس مقام پر علامہ شبلی نے دو کشتیوں میں بادوں ٹکرا رکھے ہیں یعنی حدیث اور تاریخ۔ اور چاہتے یہ ہیں کہ کوئی کشتی قابو سے باہر نہ ہو۔ لیکن اس کام کے لئے تاریخی داستان کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تو وہ ہرگز تیار نہیں۔ بلا اس کی بقا کے لئے جا بجا حدیث میں ضرر و تحریف سے کام لیا ہے۔

ایک جانب تو یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ہجرت کے وقت حضرت ابو بکرؓ آپ کے ساتھ تھے اور راہ کے تمام واقعات حضرت عائشہؓ نے ان ہی سے نقل کئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر آپؐ نے اپنے گھر سے ہجرت کی تھی تو ابو بکرؓ کس وقت، اور کہاں آپؐ سے اگر ملے۔ حکیم عبدالرؤف نے اس کا یہ حل نکالا کہ رات کو دوبارہ حضور کو حضرت ابو بکرؓ کے گھر بھیجا۔ تاکہ آپؐ وہاں سے ناو راہ لے سکیں اور سواری پر سوار ہو سکیں۔ لیکن شبلی نے زور راہ میں دن قبل بندھو لیا۔ حالانکہ کھانا تین روز قبل کوئی نہیں بندھو تا۔ اور وہ اشکالات علیٰ حالہ قائم رہے۔ یہ اشکالات اسی صورت میں رفع ہو سکتے تھے۔ جب کہ صحیح بخاری کی روایت کو بہن و عنی قبول کیا جاتا لیکن پھر حضرت علیؓ کے لئے کانٹوں کا بستر کیسے تیار ہوا۔ امان کی یہ فضیلت کیسے ثابت ہوتی۔ حالانکہ نہ ہر فضیلت ہر صحابی کو حاصل ہوتی ہے اور نہ ہر صحابی کو ہر واقعہ میں زبردستی گھسیٹا جاسکتا ہے۔ شبلی آگے لکھتے ہیں۔

کفار نے جب آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور رات زیادہ گزر گئی تو قدرت نے ان کو بے خبر کر دیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان کو سوتا ہوا چھوڑ کر باہر آئے۔

ہم علامہ شبلی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے کم از کم سردوں پر غناک ڈالنے اور پھر ہر ایک کے

سر سے خاک جھڑونے کے عمل کا تذکرہ نہیں کیا۔ کیونکہ انہیں بھی اس کے مہمل ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ لیکن ہم قسم کھا کر یہ بھی کہتے ہیں کہ بخاری میں گھر کے محاصرہ کرنے اور رات کے کھٹنے کا کوئی تذکرہ نہیں شبلی آگے لکھتے ہیں۔

کعبہ کو دکھایا اور فرمایا کعبہ کو تمام دنیا سے عزیز ہے۔ لیکن تیرے فرزند مجھ کو رہنے نہیں دیتے۔ حیرت ہے کہ شب کی تاریکی میں کعبہ کیسے نظر آیا۔ کیا وہاں بجلی کے قمقمے جگمگا رہے تھے شبلی آگے لکھتے ہیں۔ حضرت ابو بکرؓ سے پہلے قرارداد ہو چکی تھی (شبلی کے ذہن کی پیداوار ہے)، دونوں صاحبِ پہلے جبل ثور کے غار میں جا کر پوشیدہ ہوئے۔ یہ غار آج بھی موجود ہے اور بوسہ گاہِ خلافت ہے۔ حضرت ابو بکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ جو نوخیز جوان تھے۔ شب کو غار میں سوتے۔ صبح منہ اندھیرے شہر چلے جاتے اور پتہ لگاتے کہ قریش کیا مشورے کر رہے ہیں۔ جو کچھ خبر ملتی۔ شام کو آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کرتے۔ حضرت ابو بکرؓ کا غلام کچھ رات گئے بکریاں چرا کر لائے۔ اور آپ اور حضرت ابو بکرؓ ان کا دودھ پی لیتے۔ تین دن تک صرف یہی غذا تھی۔ لیکن ابن ہشام نے لکھا ہے کہ روزانہ شام کو حضرت اسماءؓ گھر سے کھانا پکا کر غار میں پہنچا آتی تھیں۔ اس طرح تین راتیں غار میں گزریں۔

صبح کو قریش کی آنکھیں کھلیں تو بے لنگ پیرا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بجائے حضرت علیؓ غفلتوں نے آپ کو پکڑ کر اور تھوڑی دیر حرم میں بے جا گرد کھا۔ اور پھر چھوڑ دیا۔

یہ جملہ شبلی نے طبری کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ لیکن جب بقول شبلی عرب زرخانے میں داخل ہوتے تھے تو پھر مکان میں داخل ہوئے بغیر حضرت علیؓ بستر پر کیسے نظر آ گئے اگر یہ کہا جاتا کہ حضرت علیؓ جب ضرورت سے باہر نکلے تو ان سے پوچھ گچھ کی گئی۔ تو اسے عقل سلیم قبول کر لیتی۔ لیکن پھر بستر پر سنانے کا عمل بے کار ہو جاتا۔ ہاں طبری کے بیان سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ حضرت علیؓ کے لئے کوئی نہ ملے نہ تھا بلکہ وہ بستر کو کانٹوں کا بستر بنایا جا رہا تھا۔ اس لئے کہ جس رد عمل کی ثابت کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی وہاں وہ رد عمل کچھ بھی ظاہر نہیں ہوا۔ اور چند منٹ حرم میں بٹھانے کے بعد حضرت علیؓ کو چھوڑ دیا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی نہ تھا۔ شبلی آگے لکھتے ہیں۔

پھر کفار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش میں نکلے۔ ڈھونڈتے ڈھونڈتے غار کے دہانے تک آگئے۔ آہٹ پا کر حضرت ابو بکرؓ غرزدہ ہوئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ اب دشمن اس قدر قریب آگئے کہ اگر اپنے قدموں پر ان کی نظر پڑ جائے تو ہم کو دیکھ لیں گے۔ آپ نے فرمایا۔  
لَا تَخْزَنُ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا غم نہ کر، یقیناً اللہ ہمارے ساتھ ہے۔

مشہور ہے کہ جب کفار غار کے قریب آگئے تو اللہ نے حکم دیا۔ دفعۃً بھول کا درخت اگا۔ اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھپایا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے۔ اور گھونسل بنا کر انڈے دیتے۔ حرم کے کبوتر ان ہی کبوتروں کی نسل سے ہیں۔ اس روایت کو مواہب لدینہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اور زر قانی نے بزاز وغیرہ سے اس کے ماخذ بتائے ہیں۔ لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں۔ اس روایت کا اصل راوی عون بن عمرو ہے۔ اس کی نسبت امام فخری بن عیین کا قول ہے لاشیء یعنی یہ سچ ہے۔ امام بخاری نے کہا کہ وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے۔ وہ مجہول الحال ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال اعلیٰ کئے ہیں۔ اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیرت ابنی ص ۴۷ ج ۱

اس روایت کے موضوع ہونے میں ہم بھی شبہی نعمانی سے متفق ہیں۔ لیکن کاش وہ ہر روایت کی اسی طرح چھان بین کر لیتے تو کیا اچھا ہوتا۔ ہماری تاریخ کا سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ تاریخ کے معاملہ میں سب نے چشم پوشی اختیار کی۔ اور کسی نے بھی اسے تنقیدی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ شیعوں نے اسے اپنے مذہبی اور سیاسی مفاد کے لئے استعمال کیا۔ جس کے نتیجے میں ہم سبائی داستانوں کے پھندے میں ایسے پھنسے کہ گلے تک اس میں دھستے چلے گئے اور کسی کو احساس بھی نہ ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔ حتیٰ کہ وہی داستانیں اب ہمارے لئے دین و ایمان بن گئیں۔

اب صحیح بخاری کی حدیث کی جانب آئے کہ وہ کیا ثابت کر رہی ہے۔ ہم ہجرت کا پورا تفصیلی واقعہ صحیح بخاری سے پیش کئے دیتے ہیں۔ لیکن امام بخاری نے حضرت عائشہؓ کی زبانی ایک ساتھ دو خبریں کا ذکر کیا ہے۔ ایک حضرت ابو بکرؓ کی ہجرت حبشہ کا اور دوسری ہجرت مدینہ کا۔ ہم ام المؤمنین کی پوری

حدیث پیش کئے دیتے ہیں تاکہ قارئین کے سامنے حضرت ابو بکرؓ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باہمی تعلقات اور حضرت ابو بکرؓ کے گھرانے کی حیثیت کھل کر سامنے آجائے اور قارئین کو یہ بھی اندازہ ہو جائے کہ ان سبائیوں نے کیا کیا تحریفیں کی ہیں۔ اور ابو بکرؓ کے مقام کو گولانے کے لئے کیا کیا طریقے اختیار کئے ہیں۔ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعہ کو جس اعلیٰ سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس پر کتب تاریخ کی تمام سندات قربان کی جاسکتی ہیں۔ یعنی امام یحییٰ بن کبیر، امام لیث بن سعد، عقیل، امام زہری، عردقہ بن الزبیر، ان میں سے ہر راوی جہاں ثقہ اور مسلمہ امام ہیں۔ وہاں ان میں سے ہر ایک اپنے استاد کی خدمت میں سالہا سال رہا ہے۔ کوئی راہ چلتے سنی سنائی ہوئی گپ نہیں۔ الغرض امام بخاری حضرت عائشہؓ سے نقل کرتے ہیں۔

**حضرت ابو بکرؓ اور ہجرت حبشہ:** ام المؤمنین فرماتی ہیں۔ مجھے جب عقل آئی تو میں نے تو یہی دیکھا کہ میرے ماں باپ دین اسلام پر عامل تھے۔ اور یہ بھی دیکھا کہ کوئی دن ایسا نہ گزرنا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے یہاں صبح شام تشریف نہ لاتے۔ جب سلمان ایذا میں مبتلا کئے گئے۔ تو حضرت ابو بکرؓ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا۔ حضرت ابو بکرؓ مکہ سے نکل کر حبشہ کی طرف روانہ ہوئے۔ جب وہ برکہ غماد میں پہنچے۔ تو ان کو ابن دغنے ملا۔ جو قبیلہ قارہ کا سردار تھا۔ کہنے لگا کہ اے ابو بکرؓ کہاں کا ارادہ ہے؟ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا مجھے میری قوم نے نکال دیا ہے تو میں نے ارادہ کیا ہے کہ زمین میں سفر کروں، اور اپنے رب کی عبادت کروں۔ ابن دغنے نے کہا کہ اے ابو بکرؓ تم جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے۔ نہ نکالا جاسکتا ہے۔ تم لوگوں کے لئے کماتے ہو۔ صلہ رحمی کرتے ہو۔ جو لوگ معاشرہ پر بار ہیں ان کا بوجھ اٹھاتے ہو۔ ہمان کی خاطر تواضع کرتے ہو۔ حق کے کاموں میں مدد کرتے ہو۔ لہذا میں تم کو پناہ دیتا ہوں۔ واپس چلو۔ اور اپنے شہر میں اپنے رب کی عبادت کرو۔ حضرت ابو بکرؓ واپس آئے۔ ابن دغنے بھی ان کے ساتھ ہی آگیا۔ شام کو ابن دغنے اشرف قریش کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ ابو بکرؓ جیسا آدمی نہ نکل سکتا ہے، نہ نکالا جاسکتا ہے۔ کیا تم لوگ ایسے آدمی کو نکالتے ہو جو نادرلوں کے لئے کماتا ہے۔ صلہ رحمی کرتا ہے۔ جو لوگ معاشرہ پر بار ہیں ان کا بوجھ اٹھاتا ہے۔ ہمان کی خاطر تواضع کرتا ہے۔ اور حق

کے کاموں میں مدد کرتا ہے۔ قریش نے ابنِ دغنه کی امان کو مسترد نہیں کیا۔ انہوں نے ابنِ دغنه سے کہا کہ ابو بکرؓ سے کہو کہ وہ اپنے رب کی عبادت اپنے گھر کے اندر کریں۔ اسی میں نماز پڑھیں اور جو چاہیں پڑھیں۔ لیکن ہمیں اپنی قرارت سے تکلیف زدیں۔ بلند آواز سے قرارت نہ کریں کیونکہ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہماری عورتیں اور ہماری اولادِ نقتہ میں مبتلا نہ ہو جائے (یعنی مسلمان نہ ہو جائے) ابنِ دغنه نے یہ باتیں حضرت ابو بکرؓ سے کہہ دیں۔ حضرت ابو بکرؓ کچھ عرصہ تک ان شرائط پر قائم رہے۔ اپنے گھر ہی میں عبادت کرتے۔ اپنی نماز میں بلند آواز سے قرارت نہ کرتے۔ اور نہ اپنے گھر کے علاوہ کسی اور مقام پر قرآن مجید کی تلاوت کرتے۔

**اسلام میں سب سے پہلی مسجد:** پھر ایک دن ان کو یہ سوچ بھی کہ اپنے گھر کے باہر میدان میں مسجد بنالی اس میں نماز پڑھنے لگے۔ اور قرآن مجید کی تلاوت شروع

کر دی۔ مشرکین کی عورتوں اور بچوں کا اُن کے پاس هجوم ہو جاتا تھا۔ وہ ان کی قرارت کو پسند نہ کرتے۔ اور ان کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ بہت رونے والے آدمی تھے۔ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے تو انہیں اپنی آنکھوں پر قابو نہ رہتا۔ مشرکین میں سے اشراف قریش اس بات سے خوف زدہ ہوئے۔ انہوں نے ابنِ دغنه کو بلوایا۔ ابنِ دغنه ان کے پاس گیا۔ اشراف قریش نے اس سے کہا کہ تم نے تمہاری امان پر ابو بکرؓ کو پناہ دی تھی۔ اس شرط پر کہ وہ اپنے گھر میں اپنے رب کی عبادت کریں۔ لیکن انہوں نے اس شرط کی خلاف ورزی کی۔ باہر میدان میں انہوں نے مسجد بنالی۔ اور علی الاعلان نماز اور قرآن پڑھتے ہیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ کہیں ہماری عورتیں اور بچے نقتہ میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ لہذا تم انہیں منع کرو۔ اگر وہ صرف اپنے گھر کے اندر نہ کر اپنے رب کی عبادت کر سکتے ہیں تو کریں۔ اور اگر وہ نہ کریں اور علی الاعلان نماز اور قرآن پڑھنے پر اصرار کریں تو اُن سے کہو کہ تمہارا ذمہ ہمیں واپس کر دیں کیونکہ ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ تمہاری امان کی توہین کریں۔ ہم فیصلہ کر چکے ہیں کہ ابو بکرؓ کے اس اعلان کو برقرار نہ رہنے دیں گے۔ ابنِ دغنه حضرت ابو بکرؓ کے پاس آیا اور کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ میں نے کس شرط پر تم سے معاہدہ کیا تھا۔ پس اگر تم اس پر قائم رہو تو ٹھیک ہے۔ ورنہ میرا ذمہ واپس کر دو کیونکہ میں نہیں چاہتا عرب یہ سنیں کہ میں نے ایک شخص کو امان دی تھی۔ لیکن میری امان ضائع کر دی گئی۔ حضرت ابو بکرؓ نے ہمارے میں تمہاری امان واپس کرنا ہوں۔ اور اللہ عزوجل کی امان

سے راضی ہوں۔ صحیح بخاری ص ۵۵۲ تاریخ الاسلام والمسلمین ص ۱۳

اس سے قبل کہ ہم اس حدیث کا بقیہ حصہ قارئین کے سامنے پیش کریں۔ اس حصہ سے جو امور ثابت ہو رہے ہیں وہ قارئین کے سامنے ترتیب وار پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ اس میں حضرت ابو بکرؓ کی ایک کافرا بن الدغنے کے ذریعہ جو صفات سامنے آئی ہیں۔ ان کا خاکہ کچھ اس طرح ہے۔ جو لوگ معاشرہ پر بار ہیں۔ اُن کا بار برداشت کرنا صلہ رحمی کرنا۔ ناداروں کے لئے کانا نہ صرف اپنی ذات کے لئے۔ ہمانوں کی خاطر قواضع کرنا اور حق کے کاموں میں مرد کرنا۔ حضرت ابو بکرؓ کی یہ وہ صفات ہیں جن کا دشمن اقرار کر رہے ہیں۔ ایسی صورت میں دنیاوی لحاظ سے ان کا کوئی دشمن نہیں ہو سکتا تھا۔ بلکہ ہر فرد بشر اُن کا زیر بار احسان ہوا۔ یہ وہ صفات اور خوبیاں ہیں جو کسی دوسرے انسان میں قطعاً نہ پائی جاتی تھیں۔

۲۔ اہل مکہ کو ابو بکرؓ سے اصل تکلیف یہ تھی کہ وہ عبادت گھر سے باہر کرتے اور بلند آواز سے قرآن پڑھتے تھے۔ جس کے باعث مشرکین کی عورتیں اور بچے قرآن سننے کے لئے جمع ہو جاتے۔ اور قرآن سے متاثر ہوتے یہی تمام ایذا رسانی کا سبب تھا۔ اور امان کے وقت انہوں نے یہی شرط لگائی تھی کہ ابو بکرؓ گھر میں نماز پڑھیں۔ اور بلند آواز سے قراست نہ کریں۔

۳۔ وقتی طور پر ابو بکرؓ نے اس شرط کو قبول کیا۔ لیکن زیادہ دن تک وہ اسے تسلیم نہ کر سکا۔ اور پھر ابو بکرؓ نے اپنے گھر کے باہر میدان میں مسجد بنالی۔ اور بلند آواز سے قراست شروع کر دی۔ اور پھر اسی طرح عورتوں اور بچوں کا مجمع جمع ہونے لگا۔ نتیجہ ابو بکرؓ نے اس امان کو ختم کیا۔ اور اللہ کے بھروسہ پر اس تبلیغ کو جاری رکھا۔ یہ وہ امور ہیں کہ جن میں مکی زندگی میں کوئی ابو بکرؓ کا ثانی نظر نہیں آتا۔

۴۔ ابن الدغنے جس کا نام حارث بن مالک تھا اور قبیلہ قارہ کا سردار تھا۔ اس کا تعلق قبیلہ قریش سے نہ تھا۔ بلکہ یہ قبیلہ خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر کی اولاد میں سے تھا۔ اور مکہ کے قریب و جوار میں آباد تھا۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کے احسانات صرف قبیلہ قریش تک محدود نہ تھے۔ بلکہ اس کے اثرات مکہ سے باہر بھی پھیلے ہوئے تھے۔

۵۔ ابو بکرؓ نے مجبور ہو کر حبش کی جانب ہجرت کی تھی جو ابن الدغنے نے ختم کرائی۔ تمام مؤرخین اور تمام اہل



اور محدثین اس پر متفق ہیں کہ یہ ہجرت نبوت کے پانچویں سال ہوئی۔ اور ام المومنین عائشہؓ یہ تمام واقعہ آنکھوں  
 دیکھا بیان کر رہی ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر کر رہی ہیں کہ میں اس وقت صاحب عقل تھی۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ام المومنین  
 کی عمر خضتی کے وقت نو سال تھی تو اس لحاظ سے تو یہ واقعہ ان کی پیدائش سے قبل کا ہونا چاہیئے حالانکہ ام المومنین  
 اپنا مشاہدہ بیان کر رہی ہیں۔ اور یہ بھی بیان کر رہی ہیں کہ میں اس وقت صاحب عقل تھی۔ لہذا یہ تسلیم کرنا ہوگا  
 کہ ہجرت حبشہ کے وقت ان کی عمر دس بارہ سال کی ضرور تھی۔ وہ کس نہی نہ تھیں۔ اس لئے ہم یہ ماننے پر  
 مجبور ہیں کہ خضتی کے وقت ام المومنین کی عمر نو سال نہیں بلکہ انیس سال تھی۔

۶۔ ام المومنین کا بیان ہے کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا تھا۔ میں نے اپنے والدین کو دین اسلام

پر پایا تھا۔

۷۔ حضور کا ہجرت حبشہ سے قبل ہی سے یہ معمول تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روزانہ صبح وشام ابو بکر  
 کے گھر تشریف لے جاتے۔ یہ آمد و رفت اس لئے نہیں تھی کہ ام المومنین سے آپ کا ازدواجی رشتہ تھا۔ بلکہ یہ  
 آمد و رفت حضرت ابو بکرؓ کی دوستی اور ان کی اسلام کی قربانی کے باعث تھی۔ حضور کا صبح وشام ابو بکرؓ کے گھر جانا  
 ایک ایسا معمول تھا جس کے خلاف کبھی نہ ہوا تھا۔

۸۔ اسلام میں سب سے اول مسجد کی بنیاد حضرت ابو بکرؓ صدیق نے رکھی۔

۹۔ ابو بکرؓ کی تبلیغی کا اثر تھا کہ مکلی زندگی میں جتنے افراد ایمان لائے۔ ان میں سے بیشتر افراد نئے ابو بکرؓ

کی تبلیغ سے ایمان قبول کیا۔

اب اس حدیث کا اگلا حصہ ملاحظہ کیجیے۔

پھر ہجرت مدینہ کے قریب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا۔ مجھے ہجرت کا مقام  
 دکھایا گیا ہے۔ یہ ایک ایسی سرزمین ہے جس میں کھجوریں ہیں۔ اس کے دو طرف دو پتھر لے میدان ہیں۔ نتیجہ  
 بہت سے مسلمان مدینہ ہجرت کر کے چلے گئے۔ اور جنہوں نے حبشہ ہجرت کی تھی۔ ان میں سے بہت سے افراد  
 مدینہ ہجرت کر گئے۔ ابو بکرؓ نے بھی مدینہ جانے کی تیاریاں کیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن سے ارشاد  
 فرمایا۔ تم ابھی ٹھہرو۔ کیونکہ مجھے ایسا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مجھے بھی ہجرت کی اجازت مل جائے گی۔

حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ قربان کیا آپ کو بھی عنقریب اجازت ملنے کی امید ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ پس ابو بکرؓ حضور کی رفاقت کی خاطر رک گئے۔ ابو بکرؓ کے پاس دو اونٹیاں تھیں جنہیں وہ چار ماہ تک میری کے پتے کھلاتے رہے۔ تاریخ الاسلام والسین ۱۵۴۔ بخاری ص ۵۵۳ ج ۱

یعنی ہجرت کے لئے آپ نے جو خواب دیکھا تھا۔ اس کے بعد آپ چار ماہ تک مکہ میں مقیم رہے۔ اور ابو بکرؓ کو بھی روکے رکھا۔ ابو بکرؓ نے اس کام کے لئے اونٹنیوں کو خوب کھلانا شروع کر دیا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں ایک روز ہم سب گھر میں بیٹھے ہوئے تھے۔ عین دوپہر کا وقت تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے گھر کے کسی فرد نے در سے دیکھ کر کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سارک پر کڑا پیٹھے ہوئے تشریف لارہے ہیں۔ کہ اس سے پہلے اس وقت کبھی تشریف نہ لائے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اللہ کی قسم آپ اس وقت (خلافت ممل) جو تشریف لائے ہیں تو ضرور کوئی اہم کام ہے۔ اتنے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکرؓ کے مکان پر پہنچ گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجازت طلب کی۔ آپ کو اجازت دی گئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اندر تشریف لے آئے۔ آپ نے حضرت ابو بکرؓ سے فرمایا۔ یہاں جو لوگ موجود ہیں انہیں باہر کر دو۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا۔ اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان یہ تو آپ ہی کے گھر والے ہیں۔ یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں۔ عائشہؓ اور اسماءؓ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے یہاں سے جانے کا حکم مل گیا ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول میرے ماں باپ آپ پر قربان مجھے بھی اپنی رفاقت میں لے لیجئے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ اس پر ابو بکرؓ نے عرض کیا میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ ان دونوں اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی آپ لے لیجئے۔ ان کو سفر ہی کے لئے تیار کیا ہے۔ آپ نے فرمایا قیامتوں گا۔

ام المؤمنین فرماتی ہیں۔ ہم نے جلدی جلدی سامان سفر تیار کیا۔ کچھ کھانا چڑھے کے ایک تھیلے میں رکھ دیا۔ حضرت اسماءؓ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا میرے پاس تھیلہ باندھنے کے لئے سوائے میرے ازار بند کے اور کچھ نہیں ہے۔ حضرت ابو بکرؓ نے فرمایا اس کے دو ٹکڑے کر لو۔ حضرت اسماءؓ نے اپنے ازار بند کے دو ٹکڑے کئے۔ ایک سے شیکڑہ اور تھیلے کا منہ باندھ دیا۔ اور دوسرے ٹکڑے سے اپنے ازار بند کو باندھ

لیا۔ اسی وجہ سے اُن کا لقب ذات النطاقین (دو کمر بند والی) ہو گیا۔

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ اپنی اپنی سواریوں پر روانہ ہو گئے اور غارِ ثور میں جا کر چھپ گئے۔

ان الفاظ کو غور سے پڑھیے اور پوری حدیث پر نظر ڈالئے تو یہ بات واضح طور پر صاف نظر آ رہی ہے کہ ہجرت کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلاف معمول دوپہر کے وقت ابوبکرؓ کے گھر گئے۔ اسی وقت سامانِ سفر تیار ہوا۔ اور اسی وقت ان دونوں حضرات نے ہجرت کی۔ اور غارِ ثور میں جا کر چھپ گئے۔

یہ الفاظ اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ ہجرت کی ابتداء حضرت ابوبکرؓ کے گھر سے ہوئی۔ حضورؐ نے ہجرت اپنے گھر سے نہیں فرمائی۔ عین دوپہر کے وقت ہوئی۔ رات کے وقت نہیں ہوئی۔ اور اس راز میں ابوبکرؓ کے گھرانہ کے علاوہ کوئی اور فرد شریک نہیں تھا۔ بخاری کے عربی الفاظ بھی ملاحظہ کیجئے۔

ثم لحق رسول الله صلى الله عليه وسلم  
وابوبكر بغار في جبل ثور - بخاری ۵۵۳/۱  
جبل ثور کے غار میں پہنچ گئے،

بخاری کے محشی مولانا احمد علی سہارنپوری نے قسطلانی کے حوالہ سے واقعہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضورؐ اور ابوبکرؓ مکان کی پچھلی جانب چڑھ کر کھڑکی تھی اس سے خاموشی سے نکل کر اپنی اپنی سواری پر سوار ہو گئے۔ یہاں تک کہ حدیث سے چند امور خود بخود ثابت ہو گئے۔

۱۔ ہجرت ابوبکرؓ کے گھر سے ہوئی۔ لہذا حضرت علیؓ کو بستر پر لٹانے اور قتل کے خوف کی کہانی سب بے سرو پا داستان ہے۔ کیونکہ یہ ہجرت عین دوپہر کے وقت ہوئی ہے نہ کہ رات کے وقت۔ بلکہ ہوا یہ ہے کہ ادھر حضورؐ کو ہجرت کا حکم ہوا۔ اور فوراً آپ ابوبکرؓ کے گھر تشریف لے گئے اور ہجرت فرمائی۔ کئی روز قبل سے کوئی منصوبہ بندی نہیں ہوئی تھی۔

۲۔ یہ دعویٰ بھی غلط ہے کہ حضورؐ ابوبکرؓ کے گھر دو دفعہ تشریف لے گئے۔ ایک بار دن اور ایک بار شب میں۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ ابوبکرؓ کے گھر دو تین روز قبل گئے تھے۔ اور اسی وقت زادِ راہ لے آئے تھے۔ بخاری کے الفاظ کھل کر اس کی تردید کر رہے ہیں۔

۳۔ شبلی کا یہ دعویٰ کہ اسماعیلؑ نے زادراہ تیار کیا۔ کیونکہ ام المؤمنینؓ کم سن تھیں یہ بھی غلط ہے کیونکہ ام المؤمنینؓ فرما رہی ہیں۔ ہم نے جلدی سے سامان سفر تیار کیا۔ گویا اس تیاری میں ام المؤمنینؓ بھی برابر کی شریک تھیں۔

۴۔ ہمارے مؤرخین کا اصل مرض یہی ہے کہ وہ ابن اسحاق، واقدی، طبری، سلمۃ الابرش وغیرہ جیسے لوگوں کے مقابلے میں حدیث صحیح تک کچھوڑ دیتے ہیں۔ اردو زبان میں کہیں کہیں شبلی نے اس طریقہ کار کو تبدیل کیا۔ اور سید سلیمان ندوی مرحوم نے اس کام کو مزید آگے بڑھایا۔ لیکن ان کے علاوہ دیگر مصنفین نے وہی اپنی پرانی ڈگر قائم رکھی۔ بلکہ بعض حضرات نے تو ان تاریخی داستانوں کے باعث احادیث کا مذاق اڑایا۔ اور منکرین حدیث نے تو اسے اپنا وظیفہ بنالیا ہے۔ اب حضرت عائشہؓ کی بقیہ حدیث ملاحظہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ تین رات اسی غار میں رہے۔ عبد اللہ بن ابی بکرؓ بھی رات غار ہی میں گزارتے تھے۔ اور وہ اس زمانہ میں ایک سمجھ دار اور ذہین نوجوان تھے۔ صبح کے وقت وہاں سے چلے جاتے تھے اور مکہ میں قریش کے ساتھ اس طرح صبح کرتے تھے۔ گویا رات کو بھی وہیں رہے ہوں۔ پس جو بات ان دونوں کے خلاف وہ مکہ میں سنتے تھے، اس کو محفوظ کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد غار میں اگر وہ یہ باتیں ان دونوں کو پہنچا کر دیتے تھے۔

حضرت ابو بکرؓ کے غلام حضرت عامر بن فہیرہ غار کے قریب کربیاں چرایا کرتے تھے۔ جب کچھ رات گزر جاتی تو وہ ان بکریوں کو ان دونوں کے پاس لے جاتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ رات کو ان ہی بکریوں کا دودھ پنی لیا کرتے تھے۔ صبح کو اندھیرے ہی میں عامرؓ بکریوں کو ہانک کر لے جایا کرتے تھے۔ تینوں مائوں میں انہیں نے ایسا ہی کیا۔ ان کی اس بات سے کوئی دوسرا چرہا واقف نہ تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے قبیلہ بنی دہل میں سے ایک شخص کو اپنی اجرت پر ملازم رکھا یہ تھا۔ یہ شخص جو عبد بن عدی کے گھرانے کا ایک فرد تھا اور اس نے بتائے میں بڑا ماہر تھا۔ یہ شخص عامر بن داکل سہمی کا حلیف تھا۔ اور ابھی تک کفار قریش کے دین پر تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ نے اسے اپنا امین بنالیا (غار ثور پہنچ کر) دونوں انٹیاں اس کے حوالہ کر دیں۔ اور اس سے تین رات بعد یقوت

صبح اونٹیاں لانے کا وعدہ لے لیا۔ تیسرے روز یہ دونوں حضرات اور ان کے ساتھ حضرت عامر بن فہرہ اور ابوسریحہ اور ساحل کا رخ اختیار کیا۔

یہاں درمیان میں امام زہری مکہ کے حالات نقل کرتے ہیں۔ کیونکہ یہ حالات انہوں نے عروہ سے نہیں سنے تھے۔ اور نہ ان حالات کا حضرت عائشہ کی حدیث میں ذکر تھا۔ اس لئے ان واقعات کو امام زہری دوسرے حضرات سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

**تعاقب:** مجھے عبدالرحمان بن مالک بن ابی الجہلی نے جو سراقہ بن مالک کے بھتیجے تھے نیا پایا ہے کہ انہوں نے اپنے والد سے سنا۔ اور انہوں نے اپنے بھائی سراقہ سے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ہمارے پاس قریش کے قاصد آئے اور بولے کہ یا تو ان دونوں کو قید کر کے ناراؤ اگر ان میں کوئی قتل ہو جائے گا تو اس کی دیت ہمارے ذمہ ہوگی۔ قریش نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو بکرؓ کو گرفتار کر کے لانے کا یا قتل کر دینے کی صورت میں ہر ایک کے عوض سوا دسٹ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ سراقہ اس وقت اپنی قوم بنو مدلیج کی ایک مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ان قاصدوں میں سے ایک شخص آیا۔ اور اس مجلس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ اُس نے کہا اے سراقہ بے شک میں نے ابھی چند لوگوں کو ساحل پر دیکھا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ محمدؐ اور ان کے ساتھی ہیں۔ سراقہ کہتے ہیں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہی ہیں۔ لیکن میں نے اس سے کہہ دیا کہ یہ وہ نہیں ہیں بلکہ تم نے فلاں فلاں شخص کو دیکھا ہوگا۔ وہ ابھی ہماری آنکھوں کے سامنے سے گزر رہے ہیں۔

پھر سراقہ کچھ دیر اپنی مجلس میں بیٹھے رہے۔ پھر وہاں سے اٹھ کر اپنے مکان میں داخل ہوئے۔ اپنی لونڈی کو حکم دیا کہ گھوڑے کر باہر جائے۔ اور ٹیلے کے پیچھے اسے لے کر کھڑی ہو جائے۔ پھر سراقہ نے اپنا نیزہ لیا۔ اور گھر کی چھت پر چڑھے۔ نیزے کی نوک زمین پر ٹکائی۔ اور اس کا اوپر کا حصہ جھکایا اور نیچے اتر گئے۔ پھر وہ اپنے گھوڑے کے پاس پہنچے۔ اس پر سوار ہو کر اسے نوب نیزہ دوڑایا۔ تاکہ وہ جلدی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچ جائیں۔ تھوڑی دیر میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے پاس پہنچ گئے۔ قریب پہنچے ہی تھے کہ ان کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ اور اس

پر سے گر پڑے۔ پھر اٹھے اور اپنا ہاتھ ترکش کی طرف بڑھایا۔ اُس میں سے تیز نکالے اور ان سے فال نکالی۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھیوں کو نقصان پہنچائیں یا نہیں۔ فال میں وہ بات نکلی جس کو انہوں نے پسند نہیں کیا۔ وہ پھر گھوڑے پر سوار ہو گئے۔ اور فال کی پڑھ نہ کی۔ اب ان کا گھوڑا، اُن کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آساقریب پہنچ گیا۔ کمان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قرأت سنائی دینے لگی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ادھر ادھر نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت ابو بکرؓ کثرت سے ادھر ادھر دیکھتے جا رہے تھے۔ اتنے میں اُن کو سراقہ نظر آئے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول یہ سوار ہمارے قریب آ گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ڈرو نہیں۔ اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہ کہہ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مڑ کر دیکھا۔ اور دعا کی کہ اے اللہ اے گرا دے۔ فوراً سراقہ کے گھوڑے کے لگے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور سراقہ اُس پر سے پھر گر پڑے۔ سراقہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا آپ میرے لئے دعا فرمائیں، میں آپ کو نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی آپ کی دعا کی برکت سے انہیں نجات ملی۔ اس کے بعد انہوں نے اپنے گھوڑے کو ڈانٹا تو بڑی مشکل سے اس کے پاؤں باہر نکلے۔ جب گھوڑا سیدھا کھڑا ہوا تو اس کی وجہ سے بہت ماغبار دھویں کے مثل آسمان تک بلند ہو گیا۔ گھوڑا نہہنا لے لگا۔ سراقہ نے پھرتیروں سے فال نکالی۔ پھر وہی چیز نکلی جس کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ لہذا انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کو امان کے ساتھ پکارا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی ٹھہر گئے۔ سراقہ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے پاس پہنچ گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ مجھے آپ تک پہنچنے میں جو وقت پیش آیا۔ تو میں سمجھ گیا کہ رسول پہلا امن نامہ: اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام (یعنی دین) غالب ہو کر رہے گا۔ سراقہ نے عرض کیا کہ آپ کی قوم نے آپ کے لئے انعام مقرر کیا ہے اور وہ آپ کے ساتھ ایسا کیا کرنا چاہتے ہیں۔

پھر سراقہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو زادِ راہ اور کچھ سامان پیش کیا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قبول نہیں فرمایا۔ اور نہ خود ہی کچھ طلب کیا۔ سراقہؓ نے عرض کیا کہ آپ جو پسند کریں مجھے حکم دیں میں تعمیل کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ تم ابھی یہیں ٹھہرو۔ اور کسی کو ہم تک نہ آنے دو، ہمارے حال کو کسی پر ظاہر نہ کرو۔ سراقہؓ نے عرض کیا۔ میرے لئے ایک پروانہ امن لکھ دیا جائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عامر بن نبیرہ کو حکم دیا۔ انہوں نے چمڑے کے ایک ٹکڑے پر تحریر امن لکھ دی۔

غرض یہ کہ سراقہؓ جو دن کے اول حصہ میں دشمن تھے آخر حصہ میں دوست بن گئے۔ جو شخص بھی انہیں ملتا اس سے کہتے کہ میں تمہارے لئے کافی ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُدھر نہیں ہیں۔ اس طرح وہ تمام تلاش کرنے والوں کو واپس کرتے رہے۔

یہاں تک کہ واقعات سے جو امور ثابت ہوتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ حضور کو قتل کے منصوبے کا علم سراقہؓ کی زبانی ہوا۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ پہلے سے قتل کا کوئی منصوبہ نہ تھا۔ بلکہ جب آپؐ نے مکہ چھوڑ دیا۔ تو اب آپؐ کے بارے میں دو فیصلے کئے گئے۔ قتل یا گرفتاری۔

۲۔ یہ فیصلے صرف حضورؐ کی ذات کے لئے نہ تھے۔ بلکہ حضور اور حضرت ابوبکرؓ دونوں کے لئے تھے۔ گویا یہ دونوں حضرات لازم و ملزوم تھے۔ ان دونوں کے علاوہ کسی کے قتل یا گرفتاری کا کوئی فیصلہ نہ تھا جو کسی کے لئے خطرہ کا باعث ہوتا۔

۳۔ یہ تمام سفر اور اس کی تیاری سب کی سب ابوبکرؓ اور ان کے گھرانہ کی مرہون منت تھی۔ اور اس فیصلیت میں ابوبکرؓ اور ان کے گھرانہ کے علاوہ کوئی دوسرا فرد ہرگز شریک نہ تھا۔ سبالی اسی خوبی کو برداشت نہ کر سکے۔ اور انہوں نے واقعہ کی نوعیت تبدیل کر دی۔

۴۔ بخاری کی اس روایت میں ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اس کی سند میں ایک بھی عجمی نہیں ہے۔

۵۔ یہ پہلا امن نامہ تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے غلام حضرت عامر بن فہیرہ نے تحریر کیا۔  
اب امام زہری حضرت عائشہؓ کی اصل روایت کی جانب لوٹتے ہیں۔ اور آگے کی تفصیل میں  
بیان فرماتے ہیں :-

کہ مجھ سے عروہ بن الزبیر نے بیان کیا ہے کہ اثنائے راہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت  
زبیرؓ مع چند مسلم تاجروں کے ملک شام سے آتے ہوئے ملے۔ (عروہ ان ہی حضرت زبیرؓ کے صاحبزادے  
ہیں۔ اور زبیرؓ حضورؐ کے چھوٹی زاد بھائی اور ابوبکرؓ کے داماد ہیں۔ ان کے نکاح میں حضرت عائشہؓ کی بڑی  
بہن حضرت اسماءؓ ہیں۔ اس رشتہ سے ابوبکرؓ عروہ کے نانا اور ام المؤمنینؓ عالمہ ہیں) حضرت زبیرؓ نے رسول  
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو پہننے کے لئے سفید کپڑے پیش کئے۔ (ان دونوں حضرات  
نے وہ کپڑے پہن لئے)

مدینہ منورہ کے مسلمانوں کو جب مکہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روانگی کی خبر ملی تو وہ  
ہر روز صبح کو مقام حرقہ تک استقبال کے لئے آتے اور وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتظار کرتے  
تھے۔ یہاں تک کہ انہیں دوپہر کی گرمی واپس کیا کرتی تھی۔

ایک روز وہ کافی دیر انتظار کرنے کے بعد جب لوٹ کر گھر واپس پہنچے۔ تو ایک یہودی  
مدینہ آمد۔ مدینہ منورہ کے ٹیلوں میں سے کسی ٹیلے پر کام کے لئے چڑھا۔ اس نے رسول اللہ صلی اللہ  
علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو سفید لباس میں ملبوس مدینہ منورہ کی طرف آتے دیکھا۔ ان کی سفیدی اور  
چمک دمک کی وجہ سے سراب غائب ہو گیا تھا۔ وہ یہودی بے ساختہ چہینے لگا کہ اے گروہ عرب  
تمہارا مقصود آپہنچا جس کا تم انتظار کر رہے تھے۔ یہ سنتے ہی تمام مؤمنین تہیابارے کر دوڑ پڑے۔ اور  
مقام حرہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا۔ وہاں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستہ  
طرف مڑ گئے۔ یہاں تک کہ چلتے چلتے آپ مدینہ کی ایک مرتفع بستی یعنی بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں جا  
اترے۔ وہ ربیع الاول کا مہینہ اور دو شنبہ کا دن تھا۔ حضرت ابوبکرؓ لوگوں سے ملاقات کے لئے کھڑے  
ہوئے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاموش بیٹھے ہوئے تھے جن لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ



کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے تھے۔ اور ان کو اللہ کا رسول سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر دھوپ لگئی۔ تو ابوبکرؓ نے آپ کے پاس کھڑے ہو کر آپ کے اوپر اپنی چادر سے سایہ کر لیا۔ اب لوگوں نے سمجھا کہ اللہ کے رسول یہ ہیں۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں چودہ دن قیام فرمایا۔ آپ نے وہاں ایک مسجد کی بنیاد ڈالی جس کی بنیاد تقوے پر ہے (یعنی مسجد نیا) اس مسجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے رہے حتیٰ کہ ایک دن آپ نے انصار مدینہ کو بلوایا۔ انصار حاضر خدمت ہوئے اور سلام عرض کیا۔ اور درخواست کی کہ آپ دونوں اطمینان کے ساتھ مدینہ چلے۔ ہم آپ کی اطاعت کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی سواری پر سوار ہو گئے۔ اور مدینہ منورہ کی طرف چلے۔ لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چل رہے تھے۔ انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کو ہتھیاروں سے گھیر رکھا تھا۔ مدینہ منورہ میں ہر طرف یہی چرچا تھا کہ اللہ کے نبی آ رہے ہیں۔ لوگ بلند یوں پر چڑھ کر نظارہ کر رہے تھے۔ بہت سے مرد و عورت گھروں کی پھتوں پر چڑھ گئے۔ لڑکے اور عوام راستوں میں پھیل گئے۔ وہ پکار پکار کر آپ کو مخاطب کر رہے۔ یا محمد یا رسول اللہ۔ یا محمد یا رسول اللہ۔ لوگ بار بار کہہ رہے تھے کہ اللہ کبھی آئے گا۔ اللہ کے نبی آ گئے۔ اہل مدینہ ایسے خوش تھے کہ اس سے پہلے ایسے خوش کبھی نہ ہوئے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کے سلسلہ میں باہم جھگڑ رہے تھے۔ ہر شخص یہی چاہتا تھا کہ میرے یہاں قیام فرمائیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں عبدالمطلب کی نھیاں یعنی بنو نجار کے یہاں قیام کروں گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم برابر چلتے رہے۔ یہاں تک کہ اونٹنی اس جگہ جا کر بیٹھ گئی۔ جہاں بعد میں مسجد نبوی تعمیر ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انشاء اللہ یہی ہماری منزل ہے۔ الغرض آپ اپنی نھیاں میں حضرت الیاء یوسفؑ کے ایک مکان کی جانب اتر گئے۔ اور ان کے گھر والوں سے باتیں کرتے رہے۔ تاریخ الاسلام والمسلمین از مشائخ اسلام بخاری ج ۱ ص ۵۵۵ آملہ ۵۵۵ ہم نے پورا تفصیلی واقعہ اس سے پیش کیا ہے کہ اول آیت قرآنیہ کے سامنے، ہجرت رسول اکرمؐ

صحیح واقعہ آجائے۔ اور نارین کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہجرت کے تمام واقعہ میں از ابتدا تا انتہا کوئی کردار ایسا نہیں جس کا تعلق حضرت ابوبکرؓ کی ذات سے نہ ہو۔ رفیق سفر گز ابوبکرؓ نہیں۔ تورات کو غار میں ساتھ سونے والے ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ ہیں۔ بکریوں کا دودھ پلانے والے راہ کے ہم سفر اور پہلا پروانہ امن لکھنے والے عامرؓ بن فہرہ ہیں جو ابوبکرؓ کے غلام ہیں۔ سامان اور زاد و بار تیار کرنے والیاں ابوبکرؓ کی بیٹیاں عائشہؓ اور اسماءؓ ہیں۔ راہ میں کپڑے پیش کرنے والے زبیرؓ ہیں جو ابوبکرؓ کے داماد ہیں۔ مشورے ہونے میں تو ابوبکرؓ سے۔ ہجرت فرماتے ہیں تو ابوبکرؓ کے گھر سے اور سواری استعمال کرتے ہیں تو ابوبکرؓ کی۔ گویا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر اس دنیا میں کسی پر کلی اعتماد تھا تو وہ صرف ابوبکرؓ کی ذات تھی۔ یا ان کے گھر کے افراد تھے۔

یہی تو وہ خوبیاں ہیں جنہیں سبائی اور مجوسی ذہن برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ تو ان دشمنان اسلام کے نزدیک سب سے اول غاصب ہیں۔ اس لئے اس طبقہ نے ابوبکرؓ کی اس فضیلت پر ڈاکہ ڈالنے کے لئے منصوبہ قتل اور بستر کی کہانی وضع کی۔ تاکہ وہ تاثر جو ہجرت کے واقعہ سے حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ کالعدم ہو کر رہ جائے۔ اور اتفاق سے سبائیوں کو اس منصوبہ کو پھیلانے کے لئے سینوں میں ایجنٹ بھی مل گئے۔ بلکہ اب ان ایجنٹوں نے ایک نیا روپ دھار لیا ہے کہ تاریخی حقائق کے نام سے احادیث صحیحہ کا رد کیا جائے۔ ان نام نہاد سنیوں کے نزدیک کتب احادیث تو ناقابل اعتبار ہیں۔ کیونکہ ان میں ضعیف روایات پائی جاتی ہیں۔ لیکن تاریخ جو تمام تر یہودیت اور شیعیت کا چر بہ ہے۔ وہ ایک یقینی شے ہے۔ حالانکہ احادیث کی تحقیق اور محنت کے لئے متعدد فنون وجود میں آئے۔ لیکن آج تک تاریخ کی تحقیق و تنقید کے لئے کوئی فن تو کجا ایک اصول بھی وضع نہیں ہوا۔ اور جب ہم محدثین کے وضع کردہ اصول کے مطابق تاریخی واقعات کی تحقیق کرتے ہیں تو شیعوں کا یہ ایجنٹ طبقہ چلا اٹھتا ہے کہ ہمارے ہاتھ سے تاریخ گئی۔ اور مودودی صاحب تو یہ فرماتے ہیں کہ اگر ان راولوں کی روایتیں ہم ترک کر دیں گے تو ہمارے پاس تاریخ میں کیا بچے گا۔ لہذا ہمیں تحقیق کی کوئی ضرورت نہیں۔ مورخ طبری، مورخ ابن اسحاق اور مورخ واقفی نے ایک مورخ برنہ کے

ناتے خود ہی تحقیق کر لی ہوگی۔ ان مورخین کی تحقیق کا حال بھی قارئین نے دیکھ لیا۔ بلکہ ان کے چہرے مہرے بھی دیکھ لئے ہیں۔ یہ تو ہم نے قارئین کے سامنے چیدہ چیدہ واقعات پیش کئے ہیں۔ ورنہ یہ تو تمام خانہ سیاہ ہی سیاہ ہے۔ کاش کوئی اللہ کا بندہ ایسا ہو کہ جو کم از کم سیرت رسول ہی صحیح طور پر پیش کر دے۔ ورنہ ایک مشہور محدث حافظ عراقی تو بے تاب ہو کر کہہ اٹھے تھے۔

لیعلم الطالب ان السیرا ماصح وماقدانکرا

طالب علم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سیرت میں صحیح اور منکر ہمہ قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ اور اسی لئے سید سلیمان ندوی یہ لکھنے پر مجبور ہوئے کہ آج تک سیرت رسول پر کسی زبان میں ایک بھی صحیح کتاب نہیں لکھی گئی۔

## غارِ ثور پر کبوتروں کا انڈے دینا

علامہ شبلی سیرت النبی میں لکھتے ہیں۔

مشہور ہے کہ جب کفار مکہ غار کے قریب آگئے تو اللہ نے حکم دیا۔ ذنقہ بول کا درخت آگ اور اس کی ٹہنیوں نے پھیل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو چھایا۔ ساتھ ہی دو کبوتر آئے اور گھونسل بنا کر انڈے دیئے۔ حرم کے کبوتران ہی کی نسل سے ہیں۔ (گویا اس سے قبل حرم میں کبوتروں کا کوئی وجود نہ تھا)

اس روایت کو ہوا رب الدینہ میں تفصیل سے نقل کیا ہے۔ اور زندقانی نے بنارہ وغیرہ سے اس کے ماتخذ بتائے ہیں۔ لیکن یہ تمام روایتیں غلط ہیں اس روایت کا اصل راوی عون بن عمرو ہے۔ اس کی نسبت امام من رجال یحییٰ بن معین کا قول ہے لا شیئی یعنی بی بیج ہے۔ امام بخاری نے کہا ہے وہ منکر الحدیث اور مجہول ہے۔ اس روایت کا ایک اور راوی ابو مصعب مکی ہے۔ اور وہ مجہول الحال ہے۔ چنانچہ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں عون بن عمرو کے حال میں یہ تمام اقوال نقل کئے ہیں اور خود اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے۔ سیرت النبی ص ۱۷۱



فمروا بالغار فراوا علی بابہ وہ لوگ غار پر سے گزرے تو انہوں نے  
نسبح العنکبوت فقالوا غار کے منہ پر مکڑی کا جالادیکھا تو کہنے  
لودخل ههنا لم یکن نسبح لگے۔ اگر یہ لوگ اس میں داخل ہوتے تو  
العنکبوت۔ یہاں یہ مکڑی کا جالاند ہوتا۔

لیکن ان الفاظ سے اس واقعہ کا غیر معمولی ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ البتہ اس روایت کی بناء پر اس  
کو تائیدات میں جگہ دی جاسکتی ہے۔ تاہم یہ روایت بھی قائم نہیں۔ اس کے راوی مقسم ہیں جو اپنے  
کو مولیٰ ابن عباسؓ کہتے ہیں۔ اور ان سے عثمان الجزری نام ایک شخص روایت کرتا ہے مقسم کی اگرچہ  
متعدد محدثین نے توثیق کی ہے۔ اور امام بخاری نے صحیح میں ان سے جماعت کی روایت نقل کی ہے۔  
مگر انہوں نے خود کتاب الضعفاء میں ان کو ضعیف کہا ہے، ابن سعد نے بھی ان کو ضعیف کہا ہے۔  
ساجی نے لکھا ہے کہ محدثین نے ان کی روایت میں کلام کیا ہے۔ ابن حزم نے لکھا ہے کہ وہ قوی نہیں۔  
عثمان الجزری جو عثمان بن عمرو بن ساج الجزری ہے۔ اور کہیں عثمان بن ساج کے نام سے  
مشہور ہے۔ گو ابن حبان نے اپنے مشہور تساہیل کی بناء پر اس کو ثقافت میں داخل کیا ہے۔ مگر محدث  
ابو حاتم کہتے ہیں کہ اس کی حدیث لکھی جاتے۔ حجت میں پیش نہ کی جاتے۔ علامہ ذہبی نے میزان  
میں اور حافظ ابن حجر نے لسان میں صرف ابو حاتم کا قول نقل کیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس  
کی نسبت محدثین کا آخری فیصلہ یہی ہے۔ سیرت البنی ص ۴۶۶ ج ۳

عثمان ابن ساج کے بارے میں ذہبی نے ابو حاتم کا یہ قول میزان ص ۴۱ ج ۳ پر نقل کیا ہے۔  
لیکن ص ۳۴ پر لکھتے ہیں کہ ضعیف کہتے ہیں کہ اس کی روایت کی کوئی تصدیق نہیں کرتا۔ جہاں تک المجتہب  
کی روایت کا تعلق ہے تو وہ اس روایت کو حضرت زید بن ارقم، حضرت انسؓ اور حضرت غیرۃ بن شعبہ  
سے نقل کرتا ہے۔ ذہبی کہتے ہیں یہ مجہول ہے۔ میزان ص ۴۰ ج ۳ جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ مجتہب  
کون شخص ہے۔ اس کا نام کیا ہے، یہ کب پیدا ہوا، اور کب مرا، تو اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے ان تینوں  
صحابہ سے یہ روایت سنی کیسے قبول کیا جاسکتا ہے؟

پھر ابو مصعب کا یہ دعویٰ اس لحاظ سے بھی جھوٹ ہے کہ ان تینوں صحابہ میں سے کوئی صحابی ایسا نہیں جو اس واقعہ کے وقت موجود ہو، مثلاً حضرت انس بن مالک اس وقت دس سال کے بچہ تھے، اور مدینہ میں مقیم تھے زید بن ارقم چند سال کے بچہ تھے اور مدینہ میں مقیم تھے۔ اور حضرت مغیرہ بن شعبہؓ نے اس وقت تک اسلام لائے۔ اُس وقت تک کافر تھے اور طائف میں مقیم تھے۔ اور جو حضرات ہجرت کے وقت حضور کے ساتھ تھے یعنی حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عامر بن فہیرہ وہ اس قسم کا کوئی واقعہ بیان نہیں کرتے۔ اور نہ ابوبکرؓ کے بیٹے عبداللہؓ جو غار میں سات کو ساتھ سویا کرتے تھے۔ اُن سے بھی اس سلسلہ میں کوئی واقعہ مروی نہیں۔ اسی طرح ابن عباسؓ اس وقت مکہ میں تھے اور دو سال کے بچہ تھے۔

پھر ان حضرات کے سن وفات میں بھی زبردست فرق ہے۔ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے کوفہ میں ۳۵ھ میں انتقال فرمایا۔ جب کہ زید بن ارقم کی وفات ۳۵ھ میں ہوئی اور حضرت انس بن مالک کا انتقال بعد میں ۹۳ھ میں ہوا۔ اور ابن عباسؓ کی وفات طائف میں ۳۵ھ میں ہوئی۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ جس نے حضرت انسؓ بن مالک کو دیکھا ہو اُس نے بقیہ صحابہ کو بھی دیکھا ہو۔ مثلاً امام زہری۔ امام ابو حنیفہ اور قتادہ نے حضرت انسؓ کو دیکھا ہے۔ لیکن ان حضرات نے بقیہ صحابہ میں سے کسی کو نہیں دیکھا کیونکہ ۳۵ھ تک پیدا ہونے والے اشخاص کے لئے حضرت انسؓ کو دیکھنا ممکن تھا۔ لیکن حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کو تو وہی شخص دیکھ سکتا ہے جس کی پیدائش ۳۵ھ کے قریب ہوئی ہو۔ اور ان تمام امور کے جوابات اس پر موقوف ہیں کہ یہ ابو مصعب کون ہے، کب پیدا ہوا۔ یہ کہاں کا باشندہ تھا اور اس نے کہاں کی سکونت اختیار کی تھی اور کس کس جگہ کا سفر کس کس سن میں کیا اور کس کس سے استفادہ کیا۔ لیکن ان میں سے کسی ایک بات کا بھی کسی کو علم نہیں پایا۔ محسوس ہوتا ہے کہ یہ کوئی فرضی کردار ہے جو اس کہانی کے پلاٹ کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اسی لئے اس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا۔

## قصہ ام معبد

(بے دودھ کی بکری کے تھنوں میں دودھ اتر آنا)

ہجرت کے موقع پر بے دودھ والی بکری کے تھنوں میں دودھ پیدا ہو جانے کا مشہور ترین معجزہ ام معبد کے خیمے کا ہے۔ کہتے ہیں کہ مکہ اور مدینہ کی راہ میں قبیلہ خزاعہ کے ایک خاندان کا میدان میں خیمہ تھا۔ ام معبد اور ابو معبد میاں بیوی اس خیمے میں رہتے تھے۔ اور مسافروں کو آرام پہنچا لیتے تھے۔ بکریوں کی پرورش پر ان کا گزارہ تھا۔ صبح کو ابو معبد تمام ابھی اور دودھ والی بکریاں لے کر چراگاہ کو نکل گیا تھا۔ صرف بے دودھ والی بکریاں خیمے میں رہ گئی تھیں۔ اتنے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکرؓ کا ادھر سے گزر ہوا۔ کھانے پینے کی کچھ چیزیں آپ نے بہ قیمت طلب کیں۔ جو نہیں ملیں۔ خیمہ کے ایک گوشہ میں ایک بکری نظر آئی۔ آپ نے پوچھا ام معبد یہ بکری کیسی ہے؟ اس نے کہا یہ لاغری کے سبب بکریوں کے ساتھ نہ جاسکی۔ پھر فرمایا کہ اس کے کچھ دودھ ہے؟ اس نے جواب دیا یہ دودھ سے معذور ہے۔

راوی کا بیان ہے کہ اس سال خشک سالی تھی۔ اور لوگ قحط میں مبتلا تھے۔ فرمایا کہ مجھے اس کا دودھ دوہنے کی اجازت ہے۔ عرض کی میرے ماں باپ قربان اگر اس کے دودھ ہو تو دودھ لیجئے۔ آپ نے دعا فرمائی۔ اور بسم اللہ کہہ کر تھن کو ہاتھ لگایا۔ فوراً اس کے تھنوں میں دودھ اتر آیا۔ دودھ سب نے پی لیا۔ اور کچھ بچ گیا اور قافلہ نبوی آگے روانہ ہوا۔ کچھ دیر کے بعد ابو معبد آیا۔ دیکھا کہ گھر میں دودھ رکھا ہے۔ تعجب سے پوچھا یہ دودھ کہاں سے آیا؟ بکریاں تو سب میرے ساتھ تھیں۔ ام معبد نے ساط قصہ بیان کیا۔ ابو معبد نے کہا ذرا اس شخص کی صورت و شکل بیان کر دو؟ ام معبد نے نہایت تفصیل سے آپ کے حسن و جمال اور شکل و شمائل کی تصویر کھینچی۔ جسے سن کر ابو معبد نے کہا یہ تو اللہ کی قسم قریش والا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ جس کا کچھ حال میں سن چکا ہوں۔ میری آرزو ہے کہ مجھے اس کی صحبت میسر ہوتی۔ اور جب انشاء اللہ موقع مل گیا تو میں یہ کروں گا۔

اسی وقت مکہ میں کچھ اشعار سنے گئے۔ ان اشعار میں ام معبد کے واقعہ کا بیان تھا۔ حضرت حسانؓ نے جب باتف کی یہ آواز سنی تو ان اشعار کے جواب میں یہ اشعار کہے۔ یہ جوابی اشعار بھی روایت میں مذکور ہیں۔

سیلیمان ندوی مرحوم اس روایت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

یہ روایت بغوی، ابن شاپہن، ابن سلک، ابن مندہ، ابوالنعم، طبرانی، بیہقی اور حاکم میں ام معبد کے بھائی حبیش بن خالد کی زبانی منقول ہے۔ حاکم نے نہ صرف یہ کہ اسے صحیح کہا ہے۔ بلکہ اور دیگر طریقوں سے اسے ثابت کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ مگر حاکم کے صحیح کہنے کی علماء کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کر دی ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کی شرائط کے مطابق نہیں۔

حافظ ذہبی نے عملاً اسی قدر لکھا ہے۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ یہ روایت حاکم کے علاوہ اور کتابوں میں بھی اسی سلسلہ سند سے مذکور ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ حزام اپنے باپ ہشام سے۔ اور ہشام اپنے باپ حبیش بن خالد خزاعی سے ناقل ہیں۔ حزام مجہول ہے۔ حبیش بن خالد سے صرف یہی ایک روایت کتب حدیث میں مذکور ہے۔ حبیش اصل واقعہ کے وقت موجود نہ تھے۔ معلوم نہیں انہوں نے کس سے سنا۔ اس لئے اگر یہ روایت ثابت بھی ہو تو مرسل ہے۔

حاکم نے دو طریقوں سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ ایک ان ہی حزام اور ہشام بن حبیش کے ذریعہ سے اور دوسرے حزن صباح سے اور وہ ام معبد کے شوہر ابو معبد سے راوی ہیں۔ پہلے طریقہ میں حاکم نے یہ کہا کیا ہے کہ حبیش کے بھائی اس کے بیٹے ہشام بن حبیش کو اصل راوی اور صحابی قرار دے دیا۔ ظاہر ہے کہ اس طریق سے روایت کا ارسال اور بڑھ گیا (یعنی اب درمیان سے دو راوی چھوٹ گئے)۔ ہشام کا صحابی ہونا ثابت نہیں۔

دوسرے طریقہ میں حزن صباح کو ثقہ میں مگر ابو معبد سے ان کی سماعت ثابت نہیں چنانچہ ابن حجر نے تہذیب میں لکھا ہے کہ حزام ابو معبد سے مرسل روایتیں کرتے ہیں (یعنی درمیان سے



راوی غائب کر دیتے ہیں)

یہ تو ان تمام روایتوں کے اوپر کے راویوں کا حال ہے۔ نیچے کے راویوں میں اکثر مجہول لوگ ہیں۔ حرین صباح والی روایت میں نیچے ایک شخص محمد بن بشر سکری ہے جس کو از دی نے منکر الحدیث اور ابن عدی نے وابی کہا ہے۔

ابو نعیم نے دلائل میں ایک اور صحابی سلیط ابوسلیمان انصاری بدری سے اس کی روایت کی ہے۔ سلیط سے اُن کے بیٹے سلیمان اور اُن سے اُن کے بیٹے محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری روایت کرتے ہیں۔ لیکن ان سلیط کا نام صرف اسی روایت کی رو سے بعض مؤلفین سیر صحابہ نے۔ صحابہ میں داخل کر لیا ہے۔ ورنہ ان کا کوئی حال ہم کو معلوم نہیں۔

سلیط انصاری جو بدری صحابی ہیں۔ وہ سلیط بن قیس انصاری خزرجمی ہیں۔ اُن کے بیٹے کا نام عبد اللہ تھا۔ جس سے نسل نہیں چلی۔ اُن کی روایت سنن نسائی میں موجود ہے۔ مگر ابوسلیمان سلیط انصاری بدری سے اس کے علاوہ کوئی روایت موجود نہیں۔ اسی لئے اسماء الرجال اور مؤلفین رجال صحابہ میں سے بعض نے ان کو اور سلیط بن قیس انصاری کو ایک سمجھا ہے۔ اگر ایسا ہے تو سلیمان ان کے بیٹے اور محمد اُن کے پوتے کا ہرگز نام نہ تھا۔ اگر یہ دو شخص ہیں تو صاحب بدر کے نام سب گئے ہوتے ہیں۔ ان میں سلیط بن قیس خزرجمی کے سوا کوئی دوسرا سلیط نامی نہیں۔ پھر یہ مدینہ کے باشندہ تھے اور ام معبد قبیلہ خزاعہ کی تھیں جو مکہ اور مدینہ کے بیچ میں آباد تھا۔ معلوم نہیں کہ سلیط انصاری نے کس سے سنا۔ پھر ان کے بیٹے سلیمان اور پوتے محمد سے کوئی واقف نہیں۔ حافظ ابن حجر لسان للیزان میں محمد بن سلیمان بن سلیط انصاری کے حال میں لکھتے ہیں۔

قال العقيلي مجهول بالنقل	عقيلي کہتے ہیں یہ نقل میں مجہول ہے۔ یہ
روى عن ابيه عن جده	اپنے باپ کے ذریعہ دادا سے نقل کرتا
فذكر قصة ام معبد وهو	ہے۔ اس نے ام معبد کا قصہ ذکر کیا ہے
واه وقال ليس هذا الطريق	جو درجہ ہے۔ اور ام معبد کے قصہ میں

محفوظاً فی حدیث ام معبد  
یہ سند محفوظ نہیں۔ ابن مندہ کہتے ہیں یہ  
قال ابن مندہ وہو مجهول  
مجهول ہے۔

علاوہ ازیں ان روایتوں کے الفاظ "ام معبد اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے باہم طرزِ مخاطب  
اور اشعار کی زبان اور ابو معبد کی گفتگو میں ایک خاص قسم کی غرابت ہے جس کو ناقدین حدیث اچھی  
طرح سمجھ سکتے ہیں۔

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہاتفِ غیب نے اشعار تو مکہ میں لوگوں کو سنائے۔ اور حسانؓ نے  
جو ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے۔ مدینہ میں بیٹھے بیٹھے اُن کا جواب کہا۔ ہجرت کے سال مکہ کے اُس پاس  
تھوٹ کا پڑنا اور خشک سال ہونا بھی ثابت نہیں۔

مجھے ہجرت کے موقع پر ان دودھ والی روایتوں کے تسلیم کرنے میں اس لئے بھی پس و پیش  
ہے۔ کہ ہجرت کے رفتی سفر حضرت ابو بکرؓ سے واقعات ہجرت کی جو دراست صحیح بخاری میں مذکور ہے  
اس میں ایک جگہ ایک چرواہے سے دودھ مانگ کر پیئے گا ذکر موجود ہے۔ مگر اس معجزہ کا مطلق ذکر موجود  
نہیں۔ چنانچہ صحیح بخاری میں حضرت ابو بکرؓ کی زبانی یہ قصہ ان الفاظ میں مذکور ہے۔

دفعتاً ایک چرواہا نظر آیا۔ جو اپنی بکریوں کو بانگے لئے جارہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا تم کس  
کے غلام ہو؟ اس نے قریش کے ایک آدمی کا نام لیا جس کو میں جانتا تھا۔ پھر میں نے کہا تمہاری بکریوں  
کے دودھ ہے؟ اس نے کہا ہاں۔ میں نے کہا اپنے ہاتھ اور بکری کے تھن بھاڑ کر پیالہ میں دودھ دو۔  
اُس نے دیا۔ تو میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک برتن میں رکھ کر اور تھوڑا پیالی ملا کر تاکہ  
ٹھنڈا ہو جائے آپ کے پاس لایا۔ آپ نے نوش فرمایا۔ سیرت النبیؐ ج ۲

یہ تھا اصل واقعہ جسے بعد کے مصنفین نے رنگ آمیزی کر کے اسے ایک معجزہ بنا کر پیش  
کر دیا۔ ہمیں حیرت تو اس پر ہے کہ ام معبدؓ آپ سے واقف بھی نہیں۔ اور بات بات پر پھر کب رہی  
ہے کہ میرے ماں باپ آپ پر قربان۔ اور پھر آخر میں اپنے خاندان کے سامنے حضورؐ سے لاعلمیت کا  
اظہار کر رہی ہے۔

یہ بھی تعجب انگیز ہے کہ بقول راوی ابو عبد دُہلی بکریاں خیمے میں جھوٹ گیا تھا۔ لیکن اگے کہتا ہے کہ حضور کو وہاں ایک دُہلی بکری نظر آئی۔ آخر بقیہ دُہلی بکریاں کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ گویا اس راوی کو اپنے جھوٹ میں اتنا بھی ہوش نہیں کہ قصہ جمع سے شروع کیا تھا اور ختم واحد پر ہوا۔ بقیہ بکریوں کا کا زنامہ بھی تو سامنے آنا چاہیئے تھا۔

راوی یہ بھی بیان کرتا ہے کہ حضور اور ابو بکر ابو عبد کے خیمے پر پہنچے۔ حالانکہ ان دونوں حضرات کے ساتھ عاشر بن نبیرہ اور رابہر بھی تھے۔ وہ دونوں کہاں گئے کیا وہ دودھ کے محتاج نہ تھے۔ ہم جب بخاری کی ہجرت والی حدیث کا مطالعہ کرتے ہیں تو صاف یہ محسوس ہوتا ہے کہ راہ میں تمام گھرانے کسی فرد نے انجام دیتے۔ راہ میں چرواہا ملا تو ابو بکر دودھ لے کر آئے۔ خود حضور کسی غرض سے کسی کام کے لئے تشریف نہیں لے گئے۔ ام عبد کی کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء حضور تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ یہ وہ متعدد وجوہات ہیں جو اس روایت کے جھوٹا ہونے کا مین ثبوت ہیں۔

## مولود کعبہ کون؟

ہمارے ہندوپاک میں یہ کہانی زبان زد عام ہے کہ حضرت علیؑ خانہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ اس کی حقیقت کیا ہے؟ ہمارے سینوں کی زبان پر صرف اتنی ہی بات عام ہے۔ لیکن اس کہانی کا اصل پس منظر کیا ہے۔ ہم اس کے کچھ حصے ملا باقر مجلسیؒ کی جلالہ العیون سے پیش کئے دیتے ہیں۔ کچھ حصے اس لئے کہ یہ داستان اتنی طویل ہے کہ مفت میں ہمارے پندرہ بیس صفحات ضائع ہو جائیں گے اس لئے ہم اختصار سے کام لیتے ہوئے اس کے ضروری ضروری حصے نقل کر رہے ہیں۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

کہ والدہ علیؑ کو وضع حمل کے وقت خانہ کعبہ میں پہنچا دیا گیا۔ انہوں نے دیوار کعبہ سے اپنا شکم ملنا شروع کیا۔ تو دیوار شق ہو گئی اور اس میں سے ایک دروازہ نمودار ہوا جس سے آواز آئی۔ کہ اے مادرِ افضل اوصیا، اندر آ جاؤ، اور بچہ جنو۔

الغرض یہ تین روز تک کعبہ میں پوشیدہ رہیں۔ اور تین روز بعد جنم ہوئے بچہ کو لے کر گھر پہنچیں۔ کعبہ کے اندر جانے، باہر آنے اور گھر پہنچنے کے بعد کیا کیا معجزات حضرت علیؑ اور ان کی والدہ کے ذریعہ ظاہر ہوئے۔ اور کن کن امور کی حضرت فاطمہؑ اور حضرت علیؑ پر وحی کی گئی جسے یہ تفصیلی داستان دیکھنی مطلوب ہو وہ جلالہ العیون کا مطالعہ کرے۔ انشاء اللہ سرمر نور بصری طرح آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کو سرور حاصل ہو گا۔ اور سیاست کے جو پر دے آنکھوں پر پڑے ہوئے ہیں وہ سب اٹھتے چلے جائیں گے اور چودہ طبق روشن ہو جائیں گے۔ ہم اس داستان سے جو کچھ ثابت کر رہے ہیں اس کے کچھ حصے اور خاکہ پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ فاطمہ بنت اسد جب کعبہ کے سامنے پہنچیں تو اولا اللہ پر ایمان لائیں اور اپنی مشکل کے حل ہونے کے لئے اپنے پیٹ کے بچہ کا واسطہ دیا۔ جس کے بعد دیوار کعبہ شق ہو گئی۔ اور فاطمہ اندر داخل ہو گئیں۔ لوگوں نے کعبہ کا دروازہ کھولنا چاہا اور بہت زور لگایا۔ لیکن سب ناکام ہو گئے۔ حتیٰ کہ تمام

اہل مکہ کی زبان پر اس کا چرچا ہونے لگا۔

یہ ضرور ذہن میں رہے کہ حضرت علیؑ کی والدہ کا نام فاطمہ بنت اسد ہے۔ بقول ملا باقر مجلسی وہ حضور کی نبوت سے قبل ہی اللہ پر ایمان لے آئی تھیں۔ حالانکہ قرآن یہ ثابت کر رہا ہے کہ تمام اہل مکہ اللہ ہی کو مانتے تھے۔ لیکن جہاں تک نبوت پر ایمان کا تعلق ہے تو اس کا شرف ابن فاطمہ کو فتح مکہ کے بعد نصیب ہوا۔ اسی لئے ملا باقر نے اس بات کو حذف کر دیا۔ فاطمہ بنت اسد نے اللہ کو کسی نبی وغیرہ کا واسطہ نہیں دیا۔ بلکہ پیٹ کے بچہ کا واسطہ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتیں تو ہمارے صوفیاء مناجاتوں اور شجرہوں میں یہ کیسے لکھتے؟

مولا علیؑ شکل کشا کے واسطے

انہوں نے سب سے پہلی حاجت برآری اپنی والدہ کی فرمائی۔ اور ان کے پیٹ کی شکل حل کی اگر مولا علیؑ یہ شکل حل کرتے تو وہ وجود ظاہری میں کیسے تشریف لاتے۔ اور فاطمہ مدتِ عمر زیادہ ہونے کے باعث مصیبت میں گھری رہتیں۔ اس واقعہ کا چرچا اتنا عام تھا کہ تمام اہل مکہ کی زبان پر ایک مدت تک جاری رہا۔ لیکن جس طرح تمام صحابہ نے حضرت علیؑ کے لئے وصیت اور خلافت کو چھپایا تھا۔ اسی طرح تمام اہل عرب نے اس واقعہ کو چھپایا اور کسی عرب نے آج تک بھی اشارہ اس کا تذکرہ نہیں کیا۔ یہ تو ان سبائیوں اور عجمیوں کا کرم ہے جو ہم اس واقعہ سے واقف بھی ہو گئے۔ ورنہ کف افسوس ہی ملتے رہتے۔

۲۔ چوتھے دن دوبارہ کعبہ کی دیوار شش ہوئی۔ فاطمہ بنت اسد باہر نکلیں۔ اور لوگوں کے سامنے

ایک خطبہ دیا۔ جس کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ اور جتنی عورتیں مجھ سے پہلے گزری ہیں ان پر بھی مجھے فضیلت دی ہے۔ حتیٰ کہ آسیہ اور آت فرعون اور یم بنہ عمران پر بھی اور اس کی دلیل یہ ہے کہ میرے جو بچہ پیدا ہو وہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ اور میں ان تین روز تک بہشت کے میوے کھاتی رہی۔ ہاتھ غیب نے مجھے مخاطب ہو کر کہا کہ اس کا نام علی رکھنا۔ کیونکہ میں خداوند علیؑ پر ایمان رکھتا ہوں۔

کاکلی حصہ اسے بخش دیا۔ اس کا نام اپنے نام پر رکھا۔ اسے اپنے آداب تعلیم دیئے۔ اپنے تمام کام اور احکام اس کے سپرد کر دیئے۔ اس پر اپنے تمام مخفی علوم ظاہر کر دیئے یہ خانہ محترم میں پیدا ہوا۔ یہ سب سے پہلا شخص ہو گا جو کعبہ میں اذان دے گا۔ بتوں کو توڑے گا اور خانہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر باہر پھینکے گا۔ یہ میرے پیغمبر کے بعد امام اور وحی ہو گا۔

اس عبارت میں ملا باقر مجلسی نے اپنے مذہب کی پوری حقیقت بیان کر دی ہے۔ اگر ہم اس کی تفصیل پیش کریں۔ تو اس کے لئے ایک ضخیم کتاب درکار ہوگی۔ لیکن چند امور اہل سنت حضرات ذہن میں رکھیں۔

۱۔ فاطمہ بنت اسد کو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء و ملائک پر بھی۔ فاطمہ بنت اسد حضرت مریم اور آسیہ سے بھی افضل ہیں۔ لہذا سیدہ نساء العالمین اور سیدہ نساء اہل الجنۃ فاطمہ بنت اسد میں نہ کہ حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے سینوں نے بے وقوفی سے حضور کی صاحبزادی مراد لے لیا ہے۔

(ب) حضرت علیؑ کو اللہ نے اپنی قدرت و جلال سے پیدا کیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ فاطمہؑ کے بیٹے اور عبد مناف کا فر کے نطفہ سے ظہور میں آئے۔ اپنے نام پر آپ کا نام علی رکھا۔ اپنے تمام کام اور احکامات ان کے سپرد کئے۔ اب ان کے وجود میں آنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے ذمہ کوئی کام باقی نہیں رہا۔ اب تو سب کام حضرت علیؑ انجام دیتے ہیں۔ اس طرح اسلام میں دو خدا ہوئے۔ ایک خدائے معطل اور دوسرا خدائے برسر اقتدار۔ اگرچہ تمام زندگی اس مقتدر خدا پر اس کے ماتحت ہی غالب آتے رہے۔ اللہ نے فاطمہؑ کو یہ بھی حکم دیا تھا کہ اس کا نام علیؑ رکھنا۔ لیکن چونکہ اب وہ خدا معطل ہو چکا تھا۔ اب تو تمام تر خدایت فاطمہؑ اودان کے بیٹے کے قبضہ میں آچکی تھی۔ اس لئے فاطمہؑ نے اس نام کو پسند نہیں کیا۔ اود آپ کا نام حیدر رکھا۔ اور اس کا اقراء خود حضرت علیؑ نے اپنے ایک شعر میں کیا ہے۔

انا الذی سمعتنی امی حیدرہ      صیری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے۔

ج۔ یہ سب سے پہلا شخص ہوگا جو کعبہ میں اذان دے گا۔ بتوں کو توڑے گا۔ اور کعبہ سے بتوں کو نکال کر باہر پھینکے گا۔

جب کہ کعبہ میں سب سے پہلی اذان حضرت بلالؓ نے دی۔ پھر آپؐ نے حضرت ابو محمدؓ کے صحابی کو حرم کعبہ کا مؤذن متعین فرمایا۔ کعبہ کے اندر سے بت حضور کے حکم سے حضرت عمرؓ نے باہر پھینکے اور توڑے۔

د۔ یہ میرے پیغمبر کے بعد امام اور وحی ہوگا۔

جب خدایت کا رتبہ حاصل ہو گیا تو اب اس ادنیٰ سی چیز کی کیا ضرورت تھی۔ تب بھی پچیس سال تک دیگر صحابہ امام بنتے رہے۔ اور جب امامت ملی تو کوئی ان کی امامت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اور جو کچھ بھی تھوڑی بہت تھی۔ وہ ان کے صاحبزادے حضرت حسنؓ نے جو امیہ کے سپرد کر دی۔ اور چونکہ ہر امام اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ خواہ کسی کو بھی اپنا وحی متعین کر دے۔ خواہ زندگی میں یا مرتے وقت۔ اس لحاظ سے تیسرے امام و وحی امیر معاویہؓ ہوئے۔ انہوں نے اپنا یہ حق استعمال کرتے ہوئے۔ یزید کو اپنا وحی اور امام متعین کیا۔

۳۔ فاطمہ جب بچے کو لے کر گھر پہنچیں۔ تو جناب امیر نے اپنے والد کو ان الفاظ میں سلام کیا۔

السلام علیک یا ابنت و  
رحمة الله وبرکاته  
اے میرے باپ آپ پر اللہ کا سلام  
اور رحمت و برکت نازل ہو۔

جب حضور تشریف لائے تو جناب امیر کو اپنے دامن میں لے لیا۔ جناب امیر نے ان کو بھی ان الفاظ میں سلام کیا۔

السلام علیک یا رسول الله  
ورحمة الله وبرکاته  
یا رسول اللہ آپ پر اللہ سلام اور رحمت  
و برکت نازل فرمائے۔

پھر اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ سے جناب امیر نے سورۃ مومنون تلاوت فرمائی۔ جناب رسولؐ نے فرمایا تیری وجہ سے تمام مومنین کو نجات مل گئی۔ جناب امیر نے ہم فیہا خلدون تک

تک آیات تلاوت کیں۔ حضور نے فرمایا خدا کی قسم تو ان کا بادشاہ اور امیر ہے اور تو ان کو علم و حکمت کی روزی بہم پہنچاتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے مہد میں کلام کیا تھا۔ لہذا حضرت علیؑ ان سے کیسے پیچھے رہ سکتے تھے۔ انہوں نے بھی کلام کیا۔ اور سورۃ مؤمنوں کی ابتدائی آیات اُن پر حضور کی نبوت سے قبل ہی نازل ہو گئیں۔ کیونکہ ان آیات میں مؤمنین کی شان بیان ہو رہی ہے اور تیرائیوں کے علاوہ روئے زمین پر کوئی مؤمن نہیں۔ حضرت علیؑ کے باعث تمام مؤمنین کے لئے روزِ ازل ہی نجات لکھ دی گئی۔ لہذا اب انہیں کھلی چھٹی حاصل ہے۔ وہ آیات یہ ہیں۔

وہ مؤمنین کامیاب ہوئے جو اپنی نمازوں میں خشوع سے کام لیتے ہیں۔ جو لغو باتوں سے احتراز کرتے ہیں۔ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اپنی پیشاب گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ مگر اپنی بیویوں اور باندیوں سے۔ اس سلسلہ میں ان پر کوئی ملامت نہیں اور جو بیویوں اور باندیوں کے علاوہ کوئی اور راہ تلاش کرے تو ایسے لوگ سرکش ہیں۔

قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ أَلَّا يَذْكُرُوا عَلَىٰ أَوْجَهِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ فَمَنْ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ

لیکن چونکہ نجات کا اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس لئے اب مؤمنین خواہ نمازیں بائیں کریں

نواہ تبرا اور تقیہ کی لغویت کو اپنائیں۔ خواہ زکوٰۃ سے انکار کریں۔ اور خواہ بیوی اور باندی کے علاوہ اپنی خواہشات نفسانی پوری کرنے کے لئے متعدد کریں سب کچھ نہ صرف جائز بلکہ کارِ ثواب ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ آخری آیت میں پہلے سے یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہی سرکش لوگ ہیں۔ اب ہم آگے



اس پر ایہ کا آخری جملہ یہ ہے۔ کہ تو ان کو علم و حکمت کی روزی بہم پہنچا ہے۔ حالانکہ قرآن نے یہ حضور کی شان بیان کی ہے۔

وَلَعَلَّهُمْ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ  
وَرُزِقُوا مِنْهَا  
اور بنی ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا۔  
اور ان کا تزکیہ کرتا ہے۔

اس طرح حضور کا یہ منصب چھین کر حضرت علیؓ کو دیا گیا۔ اور یہ سب کچھ اس وقت کے بت خانے میں ولادت کے باعث ہو رہا ہے۔

۴۔ اس کے بعد آپؐ فاطمہ بنت اسد سے فرماتے ہیں جاؤ اس کے چچا حمزہؓ کو بشارت دو۔ فاطمہؓ نے عرض کیا اگر میں چلی جاؤں گی تو اسے دودھ کون دے گا۔ حضرت رسولؐ نے فرمایا میں اسے سیراب کر دوں گا۔ رسولؐ نے اپنی زبان جناب امیرؓ کے منہ میں دیدی جس سے بارہ پشے جاری ہوئے اس لئے اس روز کو یوم الترویہ کہا جاتا ہے۔

یوم الترویہ ذی الحجہ کی آٹھ تاریخ ہے۔ اس روز اہل مکہ حج کے ارادے سے عرفات کے لئے کوچ کرتے ہیں۔ فاطمہ بنت اسدؓ کی پیدائش کے فوراً بعد گھر گئی تھیں۔ بیہ زچگی کا پہلا دن تھا۔ عورت زچگی کے کئی دن بعد تک پلنگ سے نہیں ہٹتی۔ لیکن انہیں حمزہؓ کو بلانے کے لئے بھیج دیا گیا۔ ہمیں یہاں سب سے زیادہ حیرت دہانوں پر ہے کہ ایک روز کی زچہ کو حمزہؓ کے بلانے کے لئے بھیجا گیا۔ اور عبد منافؓ پڑا اینڈ تاربا۔ پھر چچاؤں میں صرف حمزہؓ ہی تو نہ تھے۔ ابوہب اور عباسؓ بھی تھے۔ عباسؓ سے تو چلتے یہ عادت تھی کہ ان کی اولاد کو خلافت ملنے والی تھی لیکن ابوہب نے کیا قصور کیا تھا۔

ہاں اہل سنت والجماعت کو یہ بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ یہود کے بارہ قبیلے تھے۔ اور مقام تہ میں ان کے لئے بارہ چشمے پھوٹے تھے۔ کیونکہ وہ سب ایک گھاٹ پانی نہ پی سکتے تھے۔ ا۔ جناب امیرؓ کے منہ میں بھی بارہ چشمے پھوٹے اور ہم بارہ امام ہوئے۔ کیا یہ اس کا ثبوت نہیں ہے کہ شیعیت یہودیت کا چہرہ ہے۔ اور جس طرح یہودیوں کے بارہ قبائل ہمیشہ ایک

دوسرے کے رقیب رہے۔ اسی طرح آگے چل کر حضرت علیؑ کی اطالاد میں بھی یہ رقابت قائم رہی۔

۵۔ فاطمہؑ طحجب واپس آئیں۔ تو دیکھا کہ آسماں سے زمیں تک ایک نور چھایا ہوا ہے۔ انہوں نے بچے کو ایک کپڑے میں لپیٹا۔ جب امیر نے بقوت ربانی اس کو پھاڑ ڈالا۔ اور اپنے ہاتھ کپڑے سے باہر نکال لئے۔ فاطمہؑ ایک مضبوط کپڑا لائیں۔ جناب امیر کو اس میں لپیٹا۔ جناب امیر نے اسے بھی پھاڑ دیا پھر فاطمہؑ دیا کے چھ کپڑے لائیں۔ اور اوپر سے چڑا لپیٹ دیا لیکن جناب امیر نے ان کو بھی پھاڑ دیا اس کے بعد جناب امیر نے فرمایا میرے ہاتھ کھلے رہنے دو۔ تاکہ میں اللہ کے سامنے گڑاؤں اور اس کی تسبیح کر دوں۔ الغرض انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا۔

عبد مناف کے لئے تو اس دن سے زیادہ کوئی غم ناک دن نہ ہوگا۔ جو شخص اپنے فقر کے باعث اپنے بچوں کو کھانا بھی نہ کھلا سکے۔ ایک تو نئے بچے کا باا اور پھر آتے ہی ذہ گھر کے تمام کپڑے بھی پھاڑ پھینکے تو وہ بے چارہ سر کپڑے بیٹھا ہوگا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اس کا کوئی کردار اس کہانی میں پیش نہیں کیا گیا۔ وہ تو اس قسم کے جناتی بچے سے گھرا اٹھا ہوگا۔

۶۔ جب دوسرا دن ہوا اور حضورؐ ابوطالب کے گھر تشریف لے گئے۔ تو جناب امیر کو گود میں لے لیا۔ جناب امیر نے سلام کیا۔ اور چشمے پینے کی درخواست کی۔ اس پر فاطمہؑ نے ہنس کر کہا خداوند کعبہ کی قسم جناب امیر نے جناب رسولؐ کو بچیان لیا۔ اسی لئے اس روز کا نام عر نہ ہو گیا۔

۷۔ جب تیسرا دن ہوا تو دس ذی الحجہ تھی۔ ابوطالب نے لوگوں سے کہا میرے بیٹے کئے لیمہ میں حاضر ہو۔ اور تین سواونٹ اور ایک ہزار گائیں اور بھیڑیں دعوت کے لئے ذبح کیں، اور تمام اہل مکہ کو دعوت دی۔ اور اعلان کر یا کہ جس شخص کو میرے بچے کے دیمے میں شرکت کرنی ہو۔ وہ سات بار خانہ کعبہ کا طواف کرے اور اگر میرے بیٹے کو سلام کرے۔ اسی وجہ سے یوم نحر کی تعظیم و تحريم کرتے اور عید کا دن جانتے ہیں اور قربانی اسی دن سے مقرر ہوئی۔

اہل سنت والجماعت کی آنکھیں کھولنے کے لئے کیا یہ کہانی کافی نہیں ہے۔ کہ اس پیرایہ میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمعیلؑ اور حضرت ہاجرہؑ کے عمل اور ان کی فضیلت پر کس طرح ڈاکہ ڈالا

گیا ہے۔ لیکن ہم ملا باقر مجلس کے ہم لوگوں سے یہ سوال کرنے کا حق ضرور رکھتے ہیں کہ ولی شادی کے بعد ہوا کرتا ہے۔ یہ تین روزہ کے بچک شادی کس سے ہوئی تھی۔ ذرا اس گڑیا کا حال تو بیان کر دیجئے گا اور اگر اس سے مراد حقیقہ ہے تو اوّل تو حقیقہ کو ولی نہ کہیں کہا جاتا اس میں بچہ کے ال اتلے جاتے ہیں۔ اور وہ ساتویں دن ہوتا ہے۔ وراعل اس کے پیش نظر تو حضرت ابراہیمؑ حضرت اعلیٰ اور حضرت ہاجرہؑ کی یادگاروں پر پانی پھیلاتا تھا اور اس سازش کے تحت وہ اس بات کو بھی بھول گیا کہ ابوطالب تو ایک فقیر تھا۔ اس کے پاس اتنے اونٹ اور گائے بھریاں کہاں سے آگئی تھیں۔ پھر اس سے قبل جلال العیون ص ۱۸ پر اس مصنف نے یہ تحریر کیا تھا کہ جناب امیر بروز جمعہ تیرھویں جب کو پیدا ہوئے۔ اس لحاظ سے قربانی پندرھویں رجب کو ہونی چاہیے اور پندرہ رجب کا نام یوم النحر ۱۴ رجب کا نام یوم عرفہ اور تیرہ رجب کا نام یوم الترویہ ہونا چاہیے۔ اب یہ سبائی ہی بتا سکتے ہیں کہ ان کے مجتہد کماں دونوں اقوال میں سے کون سا قول جھوٹا ہے۔ اگر واقعاً حضرت علیؑ تیرہ رجب کو پیدا ہوئے تو پھر اس کہانی کو خیر باد کہنا ہوگا۔ اب اس کہانی کا اصل مقصد بھی ملاحظہ فرمائے۔

۸۔ حضور کو جناب امیر سے اتنی محبت تھی کہ ان کا جھولا اپنی خواب گاہ کے قریب رکھتے۔ نہلاتے دھلاتے۔ دودھ پاتا رہ چشمتے، منہ میں ٹپکاتے۔ سوتے میں جھولا جھلاتے۔ جاگتے میں باتیں کرتے۔ اپنے سینہ سے لگاتے اور فرماتے۔ یہ میرا بھائی۔ میرا ولی۔ میرا پشت پناہ اور میری وصیتوں کا جانشین ہے۔ اس وقت حضور کی عمر تیس سال تھی حضور انہیں لے کر مکہ کے پہاڑوں، جنگلوں اور دروں میں چلے جاتے۔ اور علوم و اسرار الہی تعلیم دیتے۔ جلال العیون ص ۲۴ ج ۱ ص ۲۵

یہ بھی غور کر لیں کہ یہ واقعہ بقول ملا باقر بنوت سے دس سال قبل کا ہے۔ اس وقت وہ دن سے علوم و اسرار الہی تھے جو حضور حضرت علیؑ کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قرآن و سنت سے ان علوم کا کوئی واسطہ نہ تھا اور غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارے صوفیاء کے نزدیک یہ علوم ظاہرہ ہیں اور ان کی حیثیت پھلکے کی ہے۔ اور اسی لئے وہ ہمیشہ آبادی کے مقابلے میں جنگلوں کو ترجیح دیتے رہے۔

نہیں یہ بات بیان کی گئی تھی کہ جب حضور ابوطالب کے گھر تشریف لے گئے۔ یہ الفاظ ثابت کر رہے ہیں کہ حضور علیحدہ رہتے تھے اور رہنا بھی چاہیے تھا۔ اب تو حضرت خدیجہ آپ کے نکاح میں تھیں تو حضرت علیؑ کے ساتھ یہ سب کام کس طرح انجام دیتے۔ اس کی صرف ایک ہی صورت ممکن ہے۔ اور وہ کہ دوسرے یا تیسرے دن حضور حضرت علیؑ کو اپنے گھر لے گئے ہوں۔ ورنہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن نہیں۔ اس صورت میں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ابوطالب اپنے فقر و فاقہ کے باعث دودھ پیتے پئے کو بھی اپنے پاس نہ رکھ سکا جس سے سارا ڈھول کا پول کھل جاتا ہے۔ ہمارے سنی علماء کو چاہیے کہ وہ اس روایت پر غور کر کے یا تو اپنے طریقہ کار میں تبدیلی کریں یا پھر لوگوں کے سامنے پوری کہانی بیان کیا کریں۔ اس سے زیادہ میں ان سے کیا عرض کر سکتا ہوں۔ بالفرض و الحال اگر حضرت علیؑ کعبہ میں پیدا بھی ہوئے۔ تو اس سے کون سا فخر پیدا ہو گیا اس وقت تو یہ بت خانہ تھا۔ اگرچہ نام اس کا کعبہ تھا۔ یہ کوئی فخر کی بات نہیں۔ بلکہ یہ ایک طرح کی بھائی اور بے غیرتی ہے کہ عورت وضع حمل کے لئے مجمع میں چلی جاتے۔ اُس وقت کعبہ کی جو بھی صورت ہو۔ مکہ کے تمام لوگ اکثر وہیں مجمع لگا کر بیٹھتے اور وہیں مجلس لگتیں۔

کیا حضرت علیؑ کے لئے اسلام، صحابیت، ہجرت اور جہاد وغیرہ کے فضائل کافی نہ تھے۔ جو بے سرو پا کہانیاں وضع کی گئیں۔ لیکن اس قسم کی کہانیاں وضع نہ کی جاتیں تو حضرت علیؑ امام الاولیاء کیسے بنتے، اور پھر اس ولایت کے ناتے سبائی خلافت کے جھگڑے کیسے کھڑے کرتے۔ فاطمہؑ سیدۃ النساء کیسے بنتیں۔ اُن پر وحی کیسے نازل ہوتی۔ اور یہ سارے گورکھ دھندے کیسے وجود میں آتے۔

اغیار سے ہمیں کیا شکوہ، وہ تو ہر صورت اغیار ہیں۔ گلہ تو ان سے ہے جو خود کو سنی کہتے ہیں۔ اور پروپیگنڈہ شیعہ داستانوں کا کرتے ہیں۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے اور اُن کے گن گاتے ہیں۔

یہ سب ڈھکوسلے بازیاں اور سبائی داستانیں ہیں۔ خانہ کعبہ میں دراصل صرف ایک شخص پیدا

ہوا ہے۔ اور اس کا نام حکیم بن حزام ہے۔ یہ حکیم حضور سے عمر میں دو سال بڑے تھے۔ اور زید بن عمرو بن نفیل سے متاثر تھے۔ اس لئے بچپن سے بت پرستی سے متنفر تھے۔ حتیٰ کہ کتاب الحجر کا مصنف جو خود تفضیلی شیعہ تھا۔ خاندکعبہ میں صرف حکیم کی پیدائش کا ذکر کرتا ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں۔

حکیم بن حزام الصحابی ومن مناقبہ انہ ولد فی الکعبۃ قال بعض العلماء ولا یعرف احد شارکہ احد قال العلماء ومن طرف اخبارہ انہ عاش مستین سنۃ فی الباہلیۃ و ستین فی الاسلام واسلم عام الفتم ومات بالمدینۃ سنۃ

حکیم بن حزام صحابی ہیں۔ ان کے مناقب میں یہ بھی ہے کہ وہ کعبہ میں پیدا ہوئے۔ بعض علماء کہتے ہیں کہ اس فضیلت میں ان کا کوئی اور شریک نہیں۔ ان کے حالات میں ایک خاص امر یہ ہے کہ انہوں نے ساٹھ سال جاہلیت میں گزارے اور ساٹھ اسلام میں۔ ۲۵ میں مدینہ میں انتقال ہوا۔

اربع و خمسين۔

یہ حکیم بن حزام حضرت خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی تھے اور حضور کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے۔ شبلی مرحوم سیرت النبیؐ ص ۱۶۷ پر لکھتے ہیں۔

حضرت خدیجہؓ کے چچرے بھائی جو قریش کے نہایت معزز رئیس تھے۔ وہ بھی حضور کے احباب خاص میں تھے۔ حرم کا منصب نفاذ ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ دارالندوہ کے بھی یہی مالک تھے۔

محوسی طبقہ نے جہاں حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کے بارے میں لاکھوں روایات وضع کیں۔ بقول امام حماد بن زید تبع تابعی جن کی تعداد تین لاکھ ہے۔ وہاں ایک کام یہ بھی انجام دیا کہ جہاں کسی واقعہ میں کسی صحابی کی فضیلت نظر آئی۔ اسے حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر کے شہرت دیدی۔

اللہ! وہ اس کے رسول نے حضرت ابو بکرؓ کو صدیق کا خطاب عطا کیا۔ لیکن اس طبقہ نے حضرت علیؓ کی جانب یہ قول منسوب کیا۔

ان الصدیق الا کبر فمن قالها  
 میں صدیق اکبر ہوں۔ میرے علاوہ جو اس  
 بعدی فقد کفر۔  
 کا دعویٰ کرے وہ کافر ہے۔

اس قسم کی خرافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ حضرت علیؓ کی شخصیت ان خرافات میں چھپ کر رہ گئی۔  
 اور یہ چھپنا دشوار ہو گیا کہ کون سی بات ان کی ضرورہ ہے۔ اور کون سی بات کی جانب فرضی طور پر  
 منسوب کی گئی ہے۔ اتنی طرح امت ان کے صحیح علم سے نہ صرف محروم ہو گئی۔ بلکہ اُن کے لئے  
 یہ پتہ چلا بھی دشوار ہو گیا کہ ان کا کردار کیا تھا۔ اخلاق کیا تھے۔ عادات کیا تھیں۔ کن صفات کے  
 مالک تھے۔ حتیٰ کہ محدثین تابعین کو یہ فیصلہ دینا پڑا کہ

اصحاب علی کلهم کذابون  
 اور امام محمد بن سیریں کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آئی۔  
 کہ حضرت علیؓ کے سب ساتھی جھوٹے ہیں۔

کل ما یروی عن علی بن ابی  
 طالب فهو باطل۔  
 حضرت علیؓ سے جتنی روایات نقل کی جاتی  
 ہیں وہ سب باطل ہیں۔

تابعین نے یہ فیصلہ ان ہی غلط روایات کے باعث دیئے ہیں۔ آج اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے  
 کہ وہ حضرت علیؓ کی زندگی یا ان کی احادیث صحیح طور پر پیش کر سکتا ہے۔ تو وہ اس کٹھن میں ملوث  
 ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ نہ اس میں حضرت علیؓ کی تصویر داریں۔ نہ تابعین کرام اور نہ کوئی اور۔ بلکہ تمام  
 ذمہ داری اسی سبائی طبقہ پر ہے۔ جس نے حضرت علیؓ کی ذات و صفات کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔  
 اعاذنا اللہ من ہولک۔

## حضرت علیؑ کیلئے سورج کا لوٹنا

اس موضوع پر اس سے قبل کہ ہم اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ حکیم فیض عالم صدیقی شہید کی تحقیقات پیش کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جو امور باقی رہ جائیں گے تو انشا اللہ ہم اس کی تکمیل تارئین کرام کے سامنے پیش کریں گے۔ حکیم صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ نے سورج غروب ہونے کے بعد اس کے لوٹ کر آنے کا واقعہ بھی لکھا ہے کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ کی نماز فوت ہو گئی تھی۔ آنحضرت نے دعا کی تو سورج لوٹ آیا۔ حضرت علیؑ نے وضو کر کے نماز پڑھ لی تو سورج پھر غروب ہو گیا۔

قطع نظر دیگر طریق سے دیکھنے کے ناز کے متعلق کتاباً مؤقوتاً ہی پر غور کر لیا ہوتا۔ تو اس روایت کی حقیقت کھل جاتی۔ اصل وقت فوت ہو جانے کے بعد سورج کو واپس لانے سے اس فرض کی ادائیگی، جس کا تعلق اصل وقت سے تھا۔ آئین فطرت کے خلاف ہے۔

شیعوں نے اس روایت کو اس لئے وضع کیا تھا کہ اس پر آگے چل کر ایک عمارت کھڑی کرنی مطلوب تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب کو وہ عمارت نظری نہیں آئی۔ یا انہوں نے ارادہ اسے نظر انداز کر دیا۔

آگے شیعہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت علیؑ نے سورج کو سلام کیا (ڈنڈوت کی) اور سورج نے سلام کا جواب دیا۔ اور کہا کہ اے علیؑ تم ہی اول ہو اور تم ہی آخر ہو۔ اب یہ دریا نت کرنا شیعوں کا کام ہے کہ علیؑ نے زبان سے سلام کیا تھا یا با تھ کے اشارے سے۔ اور یہ آتش پرستوں کا شعائر تھا یا وصی رسول اللہ کا۔ اور پھر سورج کا جواب حضرت علیؑ نے سنا تھا، یا نبی اکرم نے بھی، یا کسی اور صحابی نے بھی، اگر سنا تھا تو اس کا رد عمل کیا ہوا؟

اگر شاہ ولی اللہ جیسے عبقری اس طرح شیعیت کی ہنوائی کرتے ہوئے پائے جائیں،

توماؤ شما کا اللہ ہی حافظ ہے۔

چنانچہ ملا علی قاری حنفی لکھتے ہیں کہ امام احمد فرماتے ہیں۔ اس کی کوئی اصل نہیں۔ اور علامہ ابن جوزی لکھتے ہیں یہ سن گھڑت ہے۔ موضوعات کبیر ص ۴۱۔ دوسرے مقام پر لکھتے ہیں جھوٹ ہے کہ حضرت علیؑ کے لئے سورج ٹوٹا گیا۔ موضوعات کبیر ص ۱۵۷۔

ابن کثیر لکھتے ہیں کہ آئمہ حدیث مثل امام مالک، مصنفین صحاح ستہ اور اصحاب مسانید و سنن اور حسن احادیث کے جامعین کا اپنی کتابوں میں اسے درج نہ کرنا۔ اس بات کا بڑا ثبوت ہے کہ ان سب کے نزدیک یہ سن گھڑت ہے (البدایہ ص ۴)۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ اگرچہ امام طحاوی اور قاضی عیاض نے (شفایں) اسے درج کیا ہے۔ لیکن محققین جانتے ہیں کہ یہ روایت خالص جھوٹ اور موضوع و باطل ہے۔ منہاج السنہ ج ۴ ص ۱۸۶۔ ۱۸۷

روشمس والی روایت حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے۔ لیکن اس کی سند میں یزید بن عبد الملک ہے۔ جسے امام احمد، امام بخاری، امام احمد بن حنبل، امام ابو زرعہ، امام ابن عدی، امام بخاری، اور امام نسائی نے ضعیف و متروک کہا ہے۔

اس روایت کا دوسرا راوی یحییٰ بن یزید ہے۔ جسے ذہبی حد درجہ کمزور اور ضعیف کہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ کو اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اگر حضرت علیؑ کی نماز قضا ہوئی۔ تو نبی علیہ السلام کی کوئی قضا نہیں ہوئی۔ جب کہ آپ سیدنا علیؑ کے زانو پر سر رکھ کر آرام فرما رہے تھے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز ادا کر کے آرام فرمایا تھا تو سیدنا علیؑ اس وقت کیا کر رہے تھے۔ جب نبی کریم علیہ السلام نماز ادا فرما رہے تھے۔

معین کاشانی نے یہاں پندرہ اشعار کی ایک نظم کہی ہے ے

تا صورت پیونہ جہاں بود عملی بود      تا نقش زیں بود زماں بود عملی بود  
ہم اول و ہم آخر و ہم ظاہر و ہم باطن      ہم عابد و ہم معبود و ہم معبود عملی بود



عیسیٰ بوجود آمد فی الحال سخن گفت      اَل نطق فصاحت کہ بد و بود علی بود  
 موسیٰ دعصاید بیضاؤ نبوت      در مصر بہ فرعون کہ نبوت علی بود  
 ہارون ولایت کہ پس از موسیٰ عمران      واللہ کہ علی بود علی بود علی بود  
 جبرئیل کہ آمد و ہر خالق بے چون      در پیش محمد شد و مقصود علی بود

ہر چند کہ نظر کردم و دیدم بحقیقت

از ہر دو جہاں مقصد و مقصود علی بود

یہ دہی معین کاشانی ہے۔ جس نے یہ رباعی لکھی ہے

شاہ است حسین ہشہنشاہست حسین      دین است حسین دین پناہ است حسین

سرداد، نہ داد دست و در دست یزید      حقا کہ بنائے لالہ است حسین !

اور آج زبان زد خاص و عام ہے کہ یہ رباعی خواجہ معین الدین اجمیری کی لکھی ہوئی ہے

اور ہر مسجد کے محراب کی دیوار اس رباعی سے مزین نظر آتی ہے۔ اور ہر خطیب اسے اجمیری کی

طرف منسوب کرتا ہے۔ حاشیہ حقیقت مذہب شیعہ ۱۷۹ ص ۱۸۱

ہم سب سے پہلے۔ قارئین کے سامنے ان اشعار کا ترجمہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔ کاشانی کہتا ہے۔

جب تک اس جہاں کی صورت باقی رہے گی علیؑ بھی باقی رہیں گے، جب تک زمین کا نقش

باقی رہے گا، زمانہ باقی رہے گا، علیؑ بھی باقی رہیں گے۔ وہی اول ہیں، وہی آخر ہیں، وہی ظاہر

ہیں، وہی باطن ہیں، وہ عابد بھی ہیں، عبادت گاہ بھی اور معبود بھی ہیں (اسی کا نام تصوف میں

فلسفہ وحدت الوجود ہے) عیسیٰؑ نے جو وجود میں آئے کے بعد اتنا فصیح کلام کیا دراصل وہ علیؑ تھے۔

فرعون کے مقابلہ میں موسیٰؑ ہوں یا ان کا عصا اور بد بیضیہ کچھ بھی نہ تھے وہ تو علیؑ تھے۔ موسیٰ بن

عمران نے جو اپنے بعد ہارونؑ کو ولایت سونپی۔ وہ بھی اللہ کی قسم علیؑ تھے، علیؑ تھے، علیؑ تھے۔

جب خالق بے چوں کی جانب سے جبرئیلؑ کا صہ بن کر آئے۔ تو ظاہر میں تو محمدؐ کے سامنے آئے

تھے لیکن مقصود علیؑ تھے۔ جتنا بھی میں نے غور کیا اور حقیقت سمجھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ دونوں جہاں سے مقصد اور مقصود علیؑ ہیں۔

سنی حضرات ذرا غور کریں، اور بتائیں کہ اب اللہ اور علیؑ میں کیا فرق ہے؟ اور انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی کیا پوزیشن باقی رہی؟ اور ایسی صورت میں یہ بھی سوچ لیں کہ ایسے افراد دائرہ اسلام میں داخل ہیں کیا؟ ہم ان کے جوابات فارغین کلام پر چھوڑتے ہیں..... اب رباعی کا ترجمہ بھی ملاحظہ ہو شاہد بھی حسینؑ میں شبستانہ بھی حسینؑ ہیں اور دین پناہ بھی حسینؑ ہیں۔ سر دے دیا۔ لیکن یزید کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دیا۔ اس لحاظ سے لا الہ الا اللہ کی بنیاد بھی حسینؑ ہیں۔

یعنی حضرت علیؑ تو اللہ کا مقام حاصل کر چکے ہیں۔ اور دین حضرت حسینؑ کا نام ہے۔ اور لا الہ الا اللہ کی بنیاد انہی سے قائم ہوئی۔ (یعنی اس کلمہ میں جس اللہ کی نفی کی گئی تھی وہ یزید تھا)۔ تاریخی یہ سرور سوچ لیں کہ اس مقام پر بھی کاشانی نے لا الہ الا اللہ کا اقرار نہیں کیا۔ کیونکہ اس کے نزدیک تو سب کچھ علیؑ تھے۔ اور علماء جانتے ہیں کہ کلمہ توحید کے دو جز ہیں۔ ایک جز یہ منفی ہے۔ اور ایک مثبت اور تاقبتیکہ منفی جز یہ کے ساتھ مثبت یعنی اللہ کے وجود کا اقرار نہ کرے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اور یہاں کاشانی اسے ہضم کر گیا ہے۔

اب اصل موضوع پر آئیے۔

حکیم صاحب مرحوم کو شاہ دلی اللہ سے شکایت ہے کہ انہوں نے یہ روایت نقل کی لیکن ہمیں شکایت امام طحاوی، قاضی عیاض، محب الدین طبری اور ابن سعد جیسے حضرات سے ہے۔ اور علی الخصوص امام طحاوی سے کہ انہوں نے اس روایت کو کیسے نقل کر دیا۔ شاہ صاحب کا معاملہ، اول تو وہ روایت پرست ہیں۔ ثانیاً صوفی ہونے کے ناتے اس روایت کا اپنا نام بھی ضروری تھا۔ اور اس روایت کی نقل نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ شاہ صاحب نے موضوعات کی کسی کتاب کا مطالعہ بھی کیا تھا یا نہیں۔ ورنہ ان پر یہ حقیقت کھل جاتی کہ موضوعات پر مبنی بھی آج تک کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ان سب کتابوں کے مضمین نے اسے موضوع قرار دیا ہے۔

حکیم صاحب نے ایک فقہی دلیل بھی پیش کی ہے۔ ہمیں حیرت اس پر ہے کہ یہ دلیل ایک اہل حدیث عالم نے پیش کی اور احناف جن کے شب و روز فقہ میں گزرتے ہیں ان کو اس کا ہوش بھی نہ آیا۔ حکیم صاحب نے جو دلیل اشارۃً پیش کی ہے اس کا مقصود یہ ہے کہ اس پر تمام امت کا اتفاق ہے کہ نماز و رقت معینہ میں فرض کی گئی ہے۔ ارشاد الہی ہے۔

إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى  
الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا۔۔۔ فرض کی گئی ہے۔

اور جب وہ وقت گزر گیا تو نماز فوت ہو گئی۔ اب خواہ وہ کسی وقت بھی پڑھی جائے وہ قضا کہلائے گی نہ کہ ادا۔ تو سورج کے لوٹانے سے حاصل کیا ہو گا۔ کیا وہ قضا ادا بن جائے گی؟ مالا کہ کوئی قضا ادا نہیں ہوتی۔

یہ ہے ہماری روایت پرستی کا حال کہ کسی کو بھی اتنا ہوش نہ آیا۔ کاش شاہ ولی اللہ اسی بات پر غور کر لیتے۔ پھر قیامت کی علامات سے ایک علامت یہ بیان کی گئی ہے کہ سورج مغرب سے نکلے گا اور جب سورج اس صورت میں مغرب سے نکل آیا۔ تو آخر اب تک قیامت کیوں واقع نہیں ہوئی؟ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ وہ دوبار مغرب سے نکلے گا۔ تو نہ تو حدیث میں دوبار کا ذکر ہے۔ اور نہ آج تک کسی نے دعویٰ کیا ہے۔ الغرض آپ اس روایت پر جس اصول سے بھی نظر ڈالیں گے تو یہ صریح ہو گا اس نظر آئے گی۔

یہ روایت چند سلسلوں سے مروی ہے ایک روایت کے آخری راوی حضرت حسین بن علیؑ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور حضرت علیؑ کی گود میں سر رکھے آرام فرما رہے تھے۔ اور آپ پر وحی نازل ہو رہی تھی۔ جب وحی ختم ہو گئی تو آپ نے حضرت علیؑ سے دریافت کیا کیا تم نے صبر کی نماز پڑھ لی۔ انہوں نے کہا نہیں۔ حضور نے اللہ سے دعا کی اور سورج لوٹ آیا۔ جب نبوت علیؑ نے نماز پڑھ لی تو پھر غروب ہو گیا۔

ملا علی قاری حنفی نے امام جزری کا قول نقل کیا ہے۔ کہ علماء فرماتے ہیں یہ حدیث موضوع

ہے۔ سورج آج تک کسی کسے لئے نہیں لوٹا یا گیا۔ صرف یوشع بن نون کے لئے غروب ہونے سے روک دیا گیا تھا۔ موضوعات کبیرہ ص ۱۵۲

بجائے اس کے کہ خود ہم اپنے الفاظ میں اس پر کلام کریں۔ ہم یہ زیادہ بہتر سمجھتے ہیں کہ امام ابن الجوزی نے اس پر جو کچھ لکھا ہے وہ قارئین کے سامنے پیش کر دیں۔ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں۔ یہ روایت اسماء بنت عمیس سے مروی ہے اور بلا شک و شبہ موضوع ہے۔ اس کا ایک راوی احمد بن داؤد ہے۔ جو بے کار محض ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں متروک ہے، کذاب ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ اس کا ایک اور راوی عمار بن مضر ہے۔ عقلی کہتے ہیں یہ منکر روایتیں ثقہ راویوں کی جانب منسوب کرتا ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں متروک الحدیث ہے۔ اس کی سند کا ایک اور راوی فضیل بن مرزوق الکوفی ہے۔ اسے یحییٰ نے ضعیف کہا ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں یہ موضوعات روایت کرتا۔ اور ثقہ راویوں کی جانب غلط باتیں منسوب کرتا ہے۔ اس کا ایک اور راوی عبدالرحمان بن شریک ہے۔ ابو حاتم رازی کہتے ہیں اس کی حدیث ردی ہوئی ہے ہمارے نزدیک یہ عبدالرحمان اپنے باپ شریک سے روایت کرتا ہے اور وہ کوفہ کے شیعہ کارمیس تھا۔ تمام محدثین نے بھی اسے ناقابل اعتبار قرار دیا ہے۔ ابن جوزی کہتے ہیں اس کا ایک راوی ابن عقدہ ہے۔ وہ رافضی تھا اور صحابہ کی برائیوں میں روایات بیان کرتا میرے نزدیک اسی نے یہ روایت وضع کی ہے۔ حمزہ بن یوسف کا بیان ہے کہ ابن عقدہ صحابہ کی برائیاں بیان کرتا، خاص طور پر حضرات ابو بکرؓ اور عمرؓ کی۔ اسی لئے میں نے اس کی روایت ترک کر دی۔ دارقطنی کہتے ہیں یہ بہت بُرا آدمی تھا۔ ابن عدی کہتے ہیں یہ حدیث کے معاملہ میں دنیہ ارنہ تھا۔ کوفہ کے علماء کو اس نے جھوٹ بولنا سکھایا۔ یہ خود روایات گھڑ گھڑ کر ان کے پاس لے جاتا۔ اور ان سے کہتا یہ روایات لوگوں سے بیان کرو۔

یہ روایت ابو ہریرہؓ سے بھی مروی ہے اور ان سے داؤد بن فراسؓ نے اسے نقل کیا ہے۔ لیکن اس فراسؓ کو شعبہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ الموضوعات ج ۱ ص ۱۲۵ اللآلی المصنوعہ فی احادیث

الموضوع للسیوطی - ۳۹ ج ۱ - تذکرہ الموضوعات محمد طاہر مٹنی ص ۹۶ - المقاصد الحسنہ للسخاوی ص ۲۲۹  
 محدثین کا ایک اصول یہ ہے کہ اگر کوئی راوی ایسا واقعہ بیان کرے کہ اگر وہ وقوع پذیر ہوتا  
 تو ہزاروں افراد اسے نقل کرتے - لیکن پھر بھی اسے ایک دو افراد نقل کرتے ہوں خواہ وہ ثقہ  
 ہوں - تب بھی وہ روایت موضوع ہوگی۔

سورج کا ڈوب کر ٹوٹنا ایک ایسا حادثہ ہے کہ روئے زمین کا کوئی فرد بشر ایسا نہ بچا  
 ہو گا کہ جس نے یہ صورت حال نہ دیکھی ہوگی۔ لیکن تب بھی اسے صرف اسماء بنت عیس  
 اور ابو ہریرہ نقل کر رہے ہیں۔ کوئی اور فرد نقل نہیں کرتا۔ اسماءؓ والی روایت کی جتنی بھی سند  
 ہے۔ سب میں کئی کئی راوی نامعتبر ہیں۔ پھر ان راویوں میں خود اختلاف ہے۔ کوئی تو کہتا ہے  
 کہ اسماءؓ سے یہ روایت حضرت فاطمہ بنت حسین نے نقل کی ہے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ فاطمہ بنت  
 علیؓ نے اور ان دونوں نے اسماءؓ کو نہیں دیکھا۔ بعض راویوں نے اسماءؓ کے بجائے اسے حضرت  
 حسینؓ کی جانب منسوب کیا ہے۔ لیکن حضرت حسینؓ تو اس وقت دودھ پیتے بچے تھے۔ آخر یہ  
 ہزار ہا صحابہ کہاں چلے گئے تھے۔ جوان میں سے کوئی بھی روایت نہیں کرتا۔

رہی حدیث ابی ہریرہؓ۔ ابن جوزی، اور سیوطی وغیرہ نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کی سند میں داؤد  
 بن فرابج کو شعبہ نے ضعیف قرار دیا ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے۔  
 موضوع نہیں۔ لیکن داؤد سے اسے نقل کرنے والا یزید بن عبد الملک ہے اور اس سے اس کا  
 بیٹا یحییٰ نقل کرتا ہے۔ امام ذہبی یزید بن عبد الملک کے حال میں لکھتے ہیں۔ اسے امام احمد وغیرہ  
 نے ضعیف قرار دیا۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ کچھ نہیں ہے۔ احمد بن صالح کہتے ہیں اس کی حدیث  
 کچھ نہیں ہوتی۔ یحییٰ بن زرع کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابن عدی کہتے ہیں اس کی عام روایات درست  
 نہیں ہوتیں۔ امام بخاری نے امام احمد کا قول نقل کیا ہے کہ اس کی روایات منکر ہوتی ہیں۔ نسائی کہتے  
 ہیں۔ متردک الحدیث ہے۔ ذہبی نے اس روایت کو منکر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا بیٹا یحییٰ  
 بھی وہی ہے۔ گویا ابو ہریرہؓ کی روایت کے تین راوی ناقابل اعتبار ہیں۔ میزان ص ۳۲ ج ۲۔

## حضرت علیؑ کو کاندھوں پر اٹھانا

عام طور پر یہ واقعہ مشہور ہے کہ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ فتح فرمایا۔ اور آپ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو جو بیت بندی پر نصب تھے۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں گرانے کے لئے حضرت علیؑ بن ابی طالب کو اپنے کاندھوں پر اٹھایا۔ یہ واقعہ ہماری کتب تاریخ و سیر میں مختلف رنگ آمیز یوں کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ اور شیعوں کی تو کوئی مجلس بھی اس ذکر سے خالی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ ہمارے اہل سنت علماء اور عوام ہر دو طبقے سبائیوں کے اس پر پریکٹس سے اتنے متاثر ہیں کہ ان کا ذہن اس کے خلاف کچھ سوچنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ یہاں تک کہ اس کہانی نے اب ایک قسم کی مذہبی حیثیت اختیار کر لی ہے حالانکہ یہ واقعہ خلاف عقل بھی ہے اور خلاف نقل بھی۔ اس کے خلاف عقل ہونے کی چند وجوہات ہیں۔

۱۔ یہ واقعہ ماہ رمضان میں پیش آیا۔ اس وقت بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر مبارک ساٹھ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ جب کہ ہماری تحقیق کے مطابق حضرت علیؑ کی عمر ۲۶ سال تھی۔ اگرچہ دیگر لوگوں کے خیال کے مطابق تیس سے تیس سال بنتی ہے۔ گویا حضرت علیؑ اس وقت بھر نوجوان تھے۔ اور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ اور آپ کا جسم مبارک بھاری ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اور ساٹھ سال کی عمر ایسی عمر ہوتی ہے کہ اس عمر کا کوئی انسان ایک جوان العمر کو ہرگز اپنے کاندھوں پر نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہوتا ہے کہ چھبیس سے ستائیس سالہ جوان ایک ساٹھ سالہ انسان کو ضرورت کے تحت اپنے کاندھوں پر اٹھالے۔ ایسی صورت میں یہ واقعہ خلاف عقل اور ناممکن ہے۔

۲۔ تمام صحابہ کرام میں حضرت علیؑ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما سب سے زیادہ پستہ قد تھے۔ لہذا بلندی پر سے بتوں کا گرانا جو مقصود اصلی تھا۔ حضرت علیؑ کے کاندھوں

پراٹھانے سے ہرگز حاصل نہ ہو سکتا تھا۔ کیونکہ کعبہ کافی بلند ہے۔ اس کام کے لئے ایسا ہی فرد مناسب تھا۔ جس کا قد و قامت بھی مناسب ہو، اور حضور کے لئے اس کے بار اٹھانے میں دقت بھی نہ ہو۔ اور حضرت علیؓ کے ساتھ یہ دونوں صورتیں مفقود تھیں۔ لہذا حضرت علیؓ بن ابی طالب کو کاندھوں پر اٹھانا ہر صورت میں خلاف عقل ہے۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بت جو کعبہ کے باہر سجد حرام میں تھے۔ انہیں اپنی چھڑی سے گرایا۔ پھر آپ خانہ کعبہ میں داخل ہوئے۔ اور حضرت عمرؓ کو حکم دیا کہ ان بتوں کو باہر اٹھوا کر پھینک دیا جائے۔ حضرت عمرؓ ان بتوں کو توڑتے جاتے اور باہر پھکواتے جاتے۔ جیسا کہ کتب احادیث میں آیا ہے اور تاریخ و سیر سے یہ ثابت ہے کہ حضرت عمرؓ کافی طویل القامت تھے۔ حتیٰ کہ شبلی الفاروق میں لکھتے ہیں کہ آپ گھوڑے پر بغیر کلاب کے سوار ہوتے۔ اور جب گھوڑے پر بیٹھے تو پاؤں زمین پر لگ جاتے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے بتوں کو گرانے کے لئے کسی شخص کو کاندھوں پر اٹھایا ہوگا۔ جن تک حضرت عمرؓ کا ہاتھ نہ پہنچ سکا ہوگا۔ اور اس کام کے لئے کسی طویل القامت شخص کا ہونا ضروری تھا۔ کسی پستہ قد انسان کے ذریعہ اس کام کا انجام پانا ممکن نہ تھا۔

اسی لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ بن ابی العاص کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیا۔ حدیث کی مشہور کتاب سنن ابی داؤد میں ہے۔

فحمل علی بن ابی العاص آپ نے علی بن ابی العاص کو اپنے کاندھے پر اٹھالیا۔  
علی عاتقہ

العاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت زینبؓ کے صاحبزادے ہیں اور حضور کے سب سے بڑے نواسے ہیں۔ ان کے والد ابو العاص بن ہاشم خانہ ان کے ایک بہت سخی، نہایت امانت دار اور انتہائی شجاع فرو تھے۔ اور ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کے بھانجے تھے۔ یہ علیؓ ہجرت مدینہ سے سات آٹھ سال قبل پیدا ہوئے تھے۔

عربی دستور کے مطابق دو سال کی دودھ پینے کی مدت جو غاضرہ میں گزاری۔ اس کے بعد بچپن سے جوانی تک ناناکے آغوش میں پلے اور بڑھے اور تربیت پائی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بچہ کو اپنی بیٹی سے مانگ لیا تھا۔ اور انہیں خود پرورش فرمایا تھا۔ (الاصابہ ص ۵۲ ج ۲)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے سب سے بڑے نواسے سے بہت محبت تھی اور ہر اہم موقعہ پر آپ انہیں اپنے ساتھ رکھتے۔ فتح مکہ کے وقت یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آپ کی اونٹنی پر موجود تھے۔ (اصابہ ج ۲ ص ۵۲۔ رحمۃ اللعالمین ص ۹۸ ج ۲)

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کے مطابق آپ کے کاندھوں پر چڑھ کر بیت اللہ کو بتوں کی آلائش و نجاست سے پاک صاف کیا۔ (الصدائق العظمی ص ۲۲) اس وقت حضرت علی بن ابی العاص کی عمر چودہ پندرہ سال تھی۔ (الاصابہ ص ۵۳ ج ۲)

ان حوالوں سے جہاں یہ اثر ثابت ہوا کہ جن کو کاندھوں پر اٹھایا گیا تھا۔ وہ حضرت علی بن ابی العاص تھے، یہ کہ حضرت علی بن ابی طالب، وہاں یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا کہ ساٹھ سال کی عمر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک بھر پور جوان کو اٹھانا خلاف عقل ہے۔ اب یہ اعتراض باقی نہیں رہا۔ قد و قامت کا مسئلہ تو عام دستور میں ہے کہ جب تک کسی خاص شخص کے بارے میں یہ وضاحت نہ کی جائے کہ فلان شخص طویل القامت تھا، یا فلان شخص پستہ قد تھا۔ تب تک اس شخص کو متوسط القامت تصور کیا جاتا ہے۔ کیونکہ عام طور پر انسانوں کی اکثریت متوسط القامت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے حضرت علیؓ زینبؓ کا قد حضرت علی بن ابی طالب سے زیادہ ہی ہو گا۔

ہمارے محبوس مؤرخین اور ان کے ہم نواؤں کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ جہاں کسی صحابی کی کوئی فضیلت نظر آئی، جھٹ اس واقعہ کی صورت بدلی کہ حضرت علیؓ کی جانب منسوب کر دیا مثلاً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ اُحد کے موقعہ پر حضرت حمزہؓ کو رسیہ شہداء اور اسد اللہ کا خطاب دیا۔ انہوں نے اسد اللہ کے خطاب کو حضرت علیؓ کے ساتھ اور رسیہ الشہداء کے خطاب کو حضرت حسینؓ کے ساتھ عیاں کر دیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی صدیق اکبر کا



خطاب دیا گیا۔ ان مجاہدین نے حضرت علیؑ کی زبانی یہ اعلان کر دیا۔

انا الصديق الاكبر فمن قالها من صديق اكبر ہوں۔ میرے علاوہ دگر

بعدی فقہ کفر۔ کوئی یہ دعویٰ کرے تو وہ کافر ہے۔

حضرت حکیم ابن حزام کعبہ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے حضرت علیؑ کو کعبہ میں پیدا کر کے دکھا دیا۔ سیکڑوں اس قسم کی مثالیں دستیاب ہو جاتیں گی۔ اس واقعہ میں بھی اسی اصول سے کام لیا گیا۔ اور اس کے پس پردہ یہ نجات دہندہ بھی کار فرما تھی کہ تاریخ کے پردے سے حضور کے سب سے بڑے نواسے کو غائب کیا جائے۔ تاکہ اُن رسول اور پیغمبرؐ کی کہانیاں وضع کی جائیں۔ حالانکہ سب سے پہلے پانچ تن کی بنیاد قرآن مجید رکھی تھی۔ ان کے بھی پانچ معبود تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کا یہ قول نقل کیا ہے۔

لَا تَدْرُسْ وَذَاوُلَا سُوءًا  
وَلَا يَغُوثَ وَيَعُوقَ وَنَسْرًا۔  
ذو نواد کو چھوڑ د، نہ سواع کو، نہ یغوث  
کو، نہ یعوق کو اور نہ نسر کو۔

ان میں بھی چار مرد تھے اور ایک عورت تھی یعنی سواع۔ ہمارے پانچ تن بھی چار مرد اور ایک عورت ہے۔ ہندوؤں میں بھی پانچ تن موجود ہیں، جن کو نجنا کہا جاتا ہے۔ ان کے ہاں بھی چار مرد اور ایک عورت سیتا نامی ہے۔ الغرض اس سازش کے تحت حضرت علیؑ بن ابی العاص کے اسم گرامی کو تاریخ سے غائب کرنے کی کوشش کی گئی اور کم از کم ہندو پاکستان کے سینوں کو تو انہوں نے یہ باور کرا دیا کہ حضور کے صرف دو ہی نواسے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس محبوب اور سب سے بڑے نواسے نے جن کا اسم گرامی علیؑ بن ابی العاص ہے اور ماں کی نسبت سے یہ علیؑ زینبی کہلاتے ہیں۔ رومن ایمپائر کو تباہ کرنے والی اس عظیم جنگ میں حصہ لیا۔ جو آج تاریخ میں جنگ یرموک کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ ۱۵ھ میں حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ میں ہوئی۔ یہ اس جنگ میں جہاد کرتے ہوئے، دونوں عالم کی کامرانیں کمانج سر پر رکھ کر شہادت سے سرفراز ہوئے

اس وقت ان کی عمر مبارک بائیس سال تھی حضور کے نواسوں میں یہ سب سے اول شہید ہیں۔ جنہوں نے اعلیٰ کلمۃ اللہ کے لئے کفار کے مقابلہ میں اپنی جان، جانِ آفریں کے سپرد کی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

اقبال مرحوم نے بانگ درا میں ”جنگ یرموک کا ایک واقعہ کے تحت ان ہی نواسہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے شوق شہادت کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

صفحہ تہمت تھے عرب کے جوانان تیغ بند تھی منتظر حنا کی، عروس زمین شام  
 اک نوجوان صورت سیما مضطرب اگر ہوا امیر عالم سے ہم کھام  
 لے ابو عبیدہ رخصت پیکار دے مجھے لبریز ہو گیا مرے سرد سوں کا جام  
 بیتاب ہو رہا ہوں فراق رسول میں اک دم کی زندگی بھی محبت میں ہے ظلم  
 جاتا ہوں میں حضور رسالت پناہ میں لے جاؤں گا خوشی سے اگر ہو کوئی پیام  
 یہ ذوق و شوق دیکھ کے پریم ہوئی وہ آنکھ جس کی نگاہ تھی، صفت تیغ بے نیام  
 بولا امیر فوج کہ ”وہ نوجوان ہے تو پیروں پہ تیرے عشق کا واجب احترام  
 پوری کرے خدا تے محمد تری مراد کتنا بلند تیری محبت کا ہے مقام  
 پہنچے جو بارگاہ رسول امیں میں تو کرنا یہ عرض میری طرف سے اُن سلام

ہم پر کرم کیا ہے خدا نے غیور نے  
 پورے ہوئے جو وعدے تھے حضور نے

جہاں تاریخ کا یہ ظلم حضرت علیؓ بن ابی العاص پر ہوا ہے وہاں اُن کی بہن اور حضور کی سب سے بڑی نواسی حضرت امامہؓ پر بھی ہوا ہے۔ اللہ بھلا کرے محدثین کرام کا جو اتنی باتیں ہمیں معلوم ہو گئیں۔ اس طرح سبائیت کا پردہ چاک ہو گیا۔ ورنہ ہم بھی اس مرض سبائیت کی ہسینٹ چڑھ جاتے۔

امامہؓ حضرت علیؓ بن ابی العاص کی بہن ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان سے اتنی محبت

فرماتے کہ جب مسجد میں نماز پڑھانے کے لئے تشریف لاتے تو یہ امامؑ آپ کے کانٹوں پر ہوتیں۔

حضرت ابو قتادہؓ انصاری کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی حالت میں بھی انہیں اپنی گردن پر بٹھائے ہوتے۔ جب آپ سجدہ میں جانے کا ارادہ فرماتے تو انہیں نیچے اتار دیتے۔ اور جب کھڑے ہوتے تو پھر انہیں گردن پر بٹھا لیتے۔ ابو قتادہؓ کہتے ہیں: یہ امامؑ زینب بنت رسول اللہ کی صاحبزادی تھیں۔ ان کے والد ابو العاصؓ بن ربیعہ بن عبد شمس تھے۔ صحیح بخاری ص ۱۷۱ ج ۱۔ مسلم۔ ابو داؤد۔ مسند احمد۔ نسائی۔ ابن ماجہ۔

ایک بار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تحفہ میں ایک خوبصورت ہار آیا۔ آپ نے فرمایا یہ ہار میں اپنے عزیزوں میں سے سب سے زیادہ محبوب ہستی کو پہناؤں گا۔ لوگوں نے یہ سمجھا کہ شاید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہار حضرت عائشہؓ کو عطا فرمائیں گے کہ آپ کو سب سے زیادہ دہری محبوب ہیں۔ آپ نے اپنی پیاری نواسی سیدہ امامہؓ کو بلایا۔ اور نہایت شفقت و محبت سے وہ ہار اپنے ہاتھ سے انہیں پہنایا۔

حضرت فاطمہؓ کے انتقال کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے نکاح کیا۔ اور حضرت زینبؓ نے ان سے نکاح کیا۔ اس کی وصیت کی تھی۔ رحمۃ للعالمین جلد دوم

حضرت فاطمہؓ کا انتقال حضور کی وفات کے چھ ماہ بعد ہوا ہے۔ گویا یہ امامہؓ حضور کی حیات میں جوان ہو گئی تھیں۔ اس لحاظ سے یہ اپنے بڑے بھائی حضرت علیؓ بن العاص سے زیادہ چھوٹی نہ تھیں۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب کی شہادت کے بعد یہ محمد بن جعفر بن ابی طالب کے نکاح میں آئیں۔ جب ان کا انتقال ہو گیا تو کچھ دن بعد لڑکے میں حضرت حسینؓ نے کوڑا جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت حسینؓ کی بہن زینب جو حضرت عبداللہ بن جعفرؓ کے نکاح میں تھیں۔ اور عبداللہؓ حضرت علیؓ کے سگے بھتیجے تھے۔ انہوں نے زینبؓ کو بھائی کے ساتھ جانے سے روکا لیکن وہ باز نہ آئیں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن جعفرؓ نے زینب بنت علیؓ کو طلاق دیدی اور ان

امامہ بنت ابی العاص سے نکاح کر لیا۔

یہ حضرت امامہ کا ایک ایسا قصور تھا جو سبائی آج تک صاف نہ کر سکے، اول تو گردوغبار میں اُن کی ذات کو چھپانے کی کوشش کی۔ اور جب اس میں کامیابی ہوئی نظر نہ آئی تو یہ دعویٰ کر بیٹھے کہ حضور کی مرنے ایک ماحزادی حضرت فاطمہؓ تھیں بقیہ ماحزادیاں حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند سے ہیں۔ اس طرح ان سبائیوں نے حضرت علیؓ بن ابی العاص اور امامہ بنت ابی العاص کو حضور کی اولاد سے خارج کر دیا۔

ان ہردو حضرت کے حالات کو ہماری تاریخ نے جس طرح مسخ کر کے کی کوشش کی اسی طرح آپ کے ایک اور نواسے عبداللہ بن عثمان کو بھی دنیا سے ناپید بنانے کی سعی کی۔ یہ حضرت عثمانؓ کے ماحزادے ہیں۔ ان کی والدہ حضرت رقیہؓ بنت رسول اللہؐ ہیں۔ حضرت رقیہؓ کی وفات رمضان ۳۱ء میں ہوئی۔ لازماً یہ اس سے قبل پیدا ہو چکے تھے۔ حضرت رقیہؓ کا حضرت عثمانؓ سے نکاح ہجرت حبشہ سے قبل ہوا۔

طبری کہتا ہے کہ جب یہ سات سال کے تھے تو ان کی آنکھ میں ایک پرندے نے چوچ ماری۔ جس کی تکلیف سے ان کا انتقال ہو گیا۔ لیکن سعودی جو طبری سے کہیں زیادہ خطرناک شیعہ ہے۔ لکھتا ہے کہ جب ان کی عمر ستر سال ہوئی، اور ان کی آنکھوں کے پوٹے ٹھک آئے۔ تو ایک پرندے نے ان کی آنکھ میں چوچ ماری۔ اور بڑھاپے کی وجہ سے کوئی علاج کارگر نہ ہوا اسی تکلیف میں انتقال کر گئے اگے کہتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں (یعنی چوتھی صدی میں) ان کی اولاد سے مکہ میں ایک محلہ آباد ہے۔ اسی طرح ایک محلہ قرطبہ اندلس میں ہے، اور اشیلیہ میں بھی ان کی اولاد پائی جاتی ہے۔

گویا یہ حضور کے دوسرے نواسے ہیں۔ چونکہ ان کی اولاد چلی۔ اور ان کے والد محترم حضرت عثمانؓ اسی تھے۔ اس طرح ان کی اولاد اسی ہوئی۔ لیکن بنو امیہ میں حضور کی اولاد کا تصور کسی سبائی سے ممکن نہیں۔ اسی لئے اُن کی عمر کو ستر سے گھٹا کر سات بنایا گیا۔ اس سے دو فائدے

حاصل کئے گئے۔ اول بن کی اولاد کا مسک باقی نہیں رہا۔ دوم جب بقول طبری یہ بچپن میں انتقال کر گئے تو سبائوں کے لئے اس پر و پیگنڈے کی راہیں ہموار ہو گئیں کہ حضور کے صرف دو نواسے تھے۔ حالانکہ حضور کے چار نواسے تھے۔ جن میں دو صحابی تھے۔

۱۔ حضرت علی بن ابی العاص صحابی

۲۔ حضرت عبداللہ بن عثمان صحابی

۳۔ حضرت حسن

۴۔ حضرت حسین

اور تین نواسیاں تھیں

۱۔ امامہ بنت ابی العاص صحابیہ

۲۔ ام کلثوم بنت علی

۳۔ زینب بنت علی

اللہ کا فضل ہے آپ کے بر نواسے اور نواسی سے اولاد چلی۔ حضرت علی رضی

اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت ام کلثومؓ حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ جن سے حضرت عمرؓ کے دو

بچے ہوئے۔ زید بن عمر اور رقیہ بنت عمر

# جگر خوارہ

## حضرت ہند پر بے بنیاد الزامات

اسلام میں جنگ اُحد کو ایک خاص قسم کی شہرت حاصل ہے۔ اس جنگ میں ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی حاصل ہوئی تھی، لیکن بعد میں مسلمان شکست سے دوچار ہوئے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہوئے، مغفر کی کڑیاں آپ کے رخسار مبارک میں گھس گئیں۔ گڑھے میں گرنے کے باعث ٹانگوں میں زخم آئے۔ بڑے بڑے صحابہ کرام نے جام شہادت نوش کیا۔ جن میں حضرت حمزہؓ بن عبد المطلب اور حضرت مصعبؓ بن عمیر بھی تھے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت حمزہؓ سے بہت ہی قریبی اور خصوصی تعلق تھا جو کسی اور سے پیدا ہونا ممکن نہ تھا۔ اس کی مختلف وجوہات تھیں۔

۱۔ حضرت حمزہؓ آپ کے چچا تھے۔

۲۔ حضرت حمزہؓ نے کچھ دن ثویبہ کا دودھ پیا تھا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی سات دن تک ثویبہ کا دودھ پیا۔ اس رشتہ سے حضرت حمزہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے رضاعی بھائی تھے۔

۳۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی والدہ آمنہ بنت وہب کے چچا ابیب کی ایک لڑکی کا نام ہالہ تھا۔ جو عبد المطلب کے نکاح میں آئی، جس سے حضرت حمزہؓ پیدا ہوئے۔ اس رشتہ سے

حضرت حمزہؓ حضور کے خالہ زاد بھائی تھے۔ جیسا کہ علامہ ابن حزم نے جمہور الانساب میں تحریر کیا ہے۔

۴۔ حضرت حمزہؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عمر تھے، وہ آپ سے عمر میں صرف چھ ماہ بڑے تھے۔ اس لحاظ سے وہ آپ کے بچپن کے ساتھی تھے۔

۵۔ اسلام کے ابتدائی دور میں حضرت حمزہؓ ایمان لانے کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کیلئے ایک ڈھال بن گئے تھے۔ وہ مکہ کے ایک مانے ہوئے بہادر اور شجاع تصور کئے جاتے تھے۔ اس لئے کفار ان کے سامنے آنے سے کتراتے تھے۔

۶۔ اسلام لانے کے بعد اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ یعنی دس سال حضور کے ساتھ گزارا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اعانت میں اپنی جان جان آفریں کو سپرد کی۔

بہی وجوہات ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ان سے بے پناہ محبت تھی۔ اور آپ کو ان کی شہادت کا از حد غم تھا۔ لیکن ہمیں حیرت اس امر پر ہے کہ ہمارے محوسی اور سبائی مورخین کو آخر کس بات کا غم ہے جو آج تک وہ حضرت حمزہؓ کو نہ بھلا سکے۔ آخر حضرت حمزہؓ سے وہ کون سی ان کی رشتہ داری ہے جو آج تک ان کی زبان پر حضرت حمزہؓ کی شہادت کا یہ قصہ جاری ہے۔ اگر حضورؐ کی رشتہ داری کا معاملہ ہے تو جنگ بدر میں عبیدہؓ بن حارث شہید ہوئے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سگے چچا زاد بھائی تھے۔ لیکن کسی انسان کو ان کے حال کی خبر نہیں۔ اور نہ کوئی مورخ اور سیرت نگاران کا کوئی تذکرہ کرتا ہے۔ اور نہ ان کے ساتھ کوئی کہانی وابستہ کی جاتی ہے۔ آخر حضرت حمزہؓ کے ساتھ ایسا کون سا نیا شاخصانہ پیش آیا تھا۔ جو آج تک ہمارا ہر مورخ، ہر سیرت نگار اور ہر ملا مسجد کے نمبر پر چڑھ کر یہ واقعہ شہادت بیان کرتا، اور جگر خوارہ کی کہانی دہراتا رہتا ہے۔

قارئین کرام یہ بھی جانتے ہیں کہ جنگ اُحد، جنگ بدر کی شکست کا ایک انتقامی جذبہ تھا اس لئے تمام اہل مکہ نے اپنے دل گردے نکال کر پھینک دیئے تھے۔ کیونکہ جنگ بدر میں ستر کافر مارے گئے تھے۔ جن میں سے ہر شخص اپنے اپنے قبیلہ کا سربراہ اور وہ فرد تھا۔ ایسی صورت میں یہ لازمی تھا کہ مکہ کے ہر ہر فرد کے دماغ پر انتقامی جذبہ کا رفرما ہو، اس انتقامی جذبہ میں ہر ہر فرد برابر کا شریک تھا۔ مثلاً جنگ بدر میں ابو جہل مارا گیا تھا تو بنو مخزوم کے وہ افراد بھی جنگ اُحد میں شریک تھے۔ جو اس سے قبل نہ حضور کے مد مقابل کئے تھے۔ اور نہ مسلمانوں کے خلاف اپنی زندگی میں کسی قسم کا قدم اٹھایا تھا اس سلسلہ میں سب سے اولین مثال حضرت خالد بن الولید کی ہے۔ مکی زندگی میں ہمیں یہ کہیں نظر نہیں آتا کہ انہوں نے کسی وقت بھی اسلام کی مخالفت میں کسی قسم کا

قدم اٹھایا ہو۔

یہی صورت حال بنو امیہ کے ساتھ پیش آئی۔ جنگ بدر میں بنو امیہ کے متعدد افراد مارے گئے۔ مثلاً عقبہ، شیبہ اور ولید۔ ان میں سے عقبہ ابوسفیان کا سر تھا۔ شیبہ عقبہ کا بھائی تھا اور ولید عقبہ کا بیٹا تھا۔ اس لحاظ سے آپ خود ٹھنڈے دل سے سوچئے کہ ہند جو ابوسفیان کی زوجہ اور عقبہ کی بیٹی تھیں۔ ان کے دل پر کیا گزری ہوگی، کہ ان کا باپ، چچا، اور بھائی تینوں مارے گئے تھے۔ اور ان کے مارے جانے کے بعد بنو امیہ کی سیادت ابوسفیان کو حاصل ہوئی تھی۔ یہ تینوں افراد جو مارے گئے وہ ابوسفیان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ایک سر تھا، ایک چچا سر تھا اور ایک سالہ تھا۔

اس لئے وہ ابوسفیان جس نے مکہ کی زندگی میں اسلام کے خلاف کوئی اقدام نہ کیا تھا، بلکہ ابوجہل وغیرہ جب حضور کو تنگ کرتے تو آپ ابوسفیان ہی کے گھر جا کر پناہ لیتے، اور ابوسفیان آپ کو پناہ دیتا۔ کیونکہ بنو عبدالمطلب اور بنو امیہ دونوں ایک ہی دادا کی اولاد تھے۔

لیکن جنگ بدر کے نتیجے نے ہر چیز کی کاپا پلٹ دی تھی اب وہ افراد بھی مد مقابل آگئے تھے جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے خلاف کبھی کسی قسم کا اقدام نہ کیا تھا۔ گویا اس جنگ کے پس پردہ دو عوامل کارفرما تھے۔

۱۔ مخالفت اسلام اور حضور کی عداوت۔

۲۔ انتقامی جذبہ۔

چونکہ اس جنگ اُحد کے پس پردہ دونوں قسم کے عوامل تھے۔ لیکن انہیں ایک تصور کر لیا گیا اور ان لوگوں کو بھی دشمن اسلام ثابت کر کے دکھایا گیا جو صرف انتقامی جذبہ کے تحت اس جنگ میں شریک ہوئے تھے اور خاص طور پر ان افراد کو ہدف بنایا گیا جن کا تعلق بنو امیہ سے تھا۔ حتیٰ کہ ان میں سے جو افراد بعد میں اسلام بھی لے آئے تھے، لیکن اسلام لانے کے باوجود آج تک ان کی گذشتہ غلطیوں کو معاف نہیں کیا گیا۔ حالانکہ اسلام کا مسلہ قانون تو یہ تھا۔



ان الاسلام یہاں ماکان قبلہ اسلام پہلے گناہوں کو منہدم کر دیتا ہے لیکن خاندان بنو امیہ کو اس اسلامی قانون سے بھی مستثنیٰ سمجھا گیا۔ اور یہ بات ذہنوں میں بٹھادی گئی کہ ان کی زمانہ کفر کی برائیاں بھی علیٰ حالہ آج تک قائم ہیں۔ ان کا ایمان نفاق پر مبنی تھا۔ اس کی بین مثال۔ حضرت ابو سفیانؓ، حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت ہندؓ ہیں۔ یہ وہ حضرات ہیں کہ جن پر آج تک سنی مؤرخین، مفسرین اور مصنفین مختلف رنگ و انداز میں تبرا کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے مضمون کا اس وقت مقصد حضرت ہندؓ کی ذات ہے۔ جو حضرت امیر معاویہؓ کی والدہ حضرت ابوسفیانؓ کی زوجہ اور ام المؤمنین ام حبیبہؓ کی ماں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساس ہیں۔

یہ جنگ احد میں کفار کی جانب سے شریک ہوئیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ حضرت حمزہؓ کو انہوں نے شہید کر پایا۔ پھر حضرت حمزہؓ کا منہ کیا۔ اور کلیجہ چھپایا۔ اسی لحاظ سے انہیں جگر خوارہ کہا جاتا ہے۔ انہیں جگر خوارہ ثابت کرنے کے لئے ہمارا ہر ایک مولوی، ہر ایک محقق اور ہر ایک مؤرخ حضرت حمزہؓ کی شہادت کا قصہ بیان کرتا ہے۔ حضرت ہندؓ کے اس کردار کو باقی رکھنے کے لئے داستان میر حمزہؓ جو دو میں لائی گئی۔ اور اسی وجہ سے حضرت حمزہؓ کو میر بنایا گیا۔ حالانکہ یہ لفظ میر ہندوستان کے سادات اور شیعہ اپنے لئے استعمال کرتے تھے۔ مثلاً میر تقی، میر مینائی، میر انیس وغیرہ۔

ساتھ ساتھ یہ تخیل پیدا کیا گیا کہ بنو امیہ کو بنو ہاشم سے پرانی رقابت تھی۔ لہذا یہ کاروائیاں اسی رقابت کے نتیجے میں ہوئیں۔ اور اسی لئے نبی امیہ اسلام کی مخالفت میں پیش پیش رہے۔ حالانکہ سابقین اولین میں حضرت عثمانؓ، حضرت ابو حذیفہؓ، حضرت خالد بن ابی العاص اور حضرت سعید بن ابی العاص وغیرہ سب اموی تھے، حضور نے اپنی تین صاحبزادیوں کا نکاح امویوں سے کیا۔ آپ کی ازواج میں سے ایک زوجہ حضرت ابوسفیانؓ کی صاحبزادی ہیں۔ جب کہ خاندان بنی ہاشم میں سے کسی عورت کو آپ کی زوجیت کا فخر حاصل نہیں ہو سکا۔ اگر اسی کا نام رقابت و

عداوت ہے تو پھر محبت اور تعلق کس شے کا نام ہے۔ عمر برعکس نہند نام زندگی کا نور

آمدن بر سر مطلب۔ یہ وہ انتقامی جذبہ تھا جس کے باعث قریش کی متعدد عورتیں بھی میدانِ کارزار میں ساتھ آئی تھیں۔ طبری جلد دوم ۱۸۷ء پر لکھتا ہے۔

پس قریش بڑی شان و شوکت اور آب و تاب کے ساتھ جنگ کے لئے نکلے اور قریش کے مختلف قبیلے اور وہ لوگ جو بنو کنانہ اور تہامہ والوں میں سے تھے۔ ان کے ساتھ تھے، اور یہ لوگ اپنی پردہ نشین عورتوں کو بھی ساتھ لے گئے تھے۔ تاکہ وہ عورتوں کی نگہبانی کے احساس سے جنگ سے منہ موڑیں۔

پس ابوسفیانؓ بن حرب بھی نکلے، اور وہ لوگوں کے قائد تھے۔ ان کے ساتھ ہند بنت عتبہ بن ربیعہ بھی تھیں اور عکرمہ بن ابی جہل بن ہشام بن الغیرہ بھی نکلے۔ ان کے ساتھ حکیم بنت الحارث بن ابہشام بن الغیرہ بھی تھیں۔ حارث بن ہشام بن الغیرہ نکلے، ان کے ساتھ فاطمہ بنت الولید بن الغیرہ تھیں۔ (حضرت خالد بن الولید کی بہن) صفوان بن امیہ بن خلف نکلے۔ ان کے ساتھ ہرزہ تھیں۔ اور ایک روایت میں ہے کہ برہہ بنت مسعود بن عمرو بن عیسر الثقفیہ بھی نکلیں۔ اور یہ عبداللہ بن صفوان کی والدہ ہیں، عمرو بن العاص بن دائل نکلے، ان کے ساتھ بریطہ بنت منبہ بن الحجاج بھی تھیں، اور یہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کی والدہ ہیں، اور طلحہ بن ابی طلحہ اور ابو طلحہ عبداللہ بن عبدعزی بن عثمان بن عبدالدار نکلے، ان کے ساتھ سلمہ بنت سعد تھیں، اور وہ طلحہ کے بیٹے سافہ، الجلاس، اور کلاب کی والدہ ہیں، اور اس دن یہ تینوں اور ان کے والد قتل ہوئے۔ اور خناس بنت مالک بن المغرب نکلے۔ یہ بنو مالک بن حسل کی عورتوں میں سے ایک ہے۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا ابو عزی بن عمیر تھا۔ اور یہ حضرت مصعب بن عمیر کی ماں ہے اور عمرہ بنت علقمہ نکلے، یہ نبی حارث بن عبد مناف بن کنانہ کی عورتوں میں سے ایک ہے۔

یہ آٹھ عورتیں تو وہ ہیں جو سردارانِ مکہ کے ساتھ آئی تھیں، اور ان کے علاوہ جو دیگر

افراد کے ساتھ ہوں گی وہ جدا گانہ ہوں گی۔

یہ بھی ایک مسئلہ حقیقت ہے کہ حضرت حمزہؓ کی شہادت وحشی بن حرب کے نیرے سے ہوئی۔ لیکن سب سے اہم سوال یہ ہے کہ وحشی بن حرب کو حضرت حمزہؓ کے قتل پر کس نے آمادہ کیا۔ اور انہیں اس کام کا کیا صلہ ملا؟

تمام مورخین یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عرب قبائل میں یہ عام رواج تھا کہ جنگ کے خاتمہ کے بعد فاتح قبیلہ مفتوح قبیلہ کے مقتولین کی لاشوں کا مشلہ کرتے۔ یعنی اس کے ناک، کان، کاٹتے اسلام نے اس کی سختی سے ممانعت کی۔ حدیث میں آتا ہے۔

نہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن المشلۃ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشلہ سے منع فرمایا۔

کتب احادیث و تاریخ سے یہ امر بھی ثابت ہے کہ جنگ اُحد کے خاتمہ کے بعد کفار مکہ نے مسلمانوں کی لاشوں کا مشلہ کیا۔ حضرت عبداللہ بن حرام انصاری کے مشلہ کا ذکر صحیح بخاری اور صحیح مسلم وغیرہ میں مذکور ہے۔ حتیٰ کہ ان کی لاش کو ان کے اقرباء و اعزاء بھی نہ پہچان سکے صرف ان کی بہن نے اُن کی انگلیوں کے پوروں سے انہیں پہچانا اور جنگ کے خاتمہ کے بعد جب ہوسفیہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ کہا تھا کہ یہ جنگ بدر کا بدلہ ہے۔ اس وقت یہ بھی اقرار کیا تھا کہ ہمارے کچھ آدمیوں نے مقتولین کی لاشوں کا مشلہ کیا ہے۔ لیکن میں نے نہ تو اس کام کا حکم دیا تھا اور نہ میں اسے بُرا سمجھتا ہوں۔ بخاری ص ۵۹ ج ۲

ان تمام امور سے یہ بات واضح ہوئی کہ کفار عرب میں مشلہ کا عام رواج تھا اور شہدائے اُحد کی لاشوں کا مشلہ بھی کیا گیا۔ اور یہ مشلہ کسی خاص شخصیت کے ساتھ مخصوص نہ تھا اور بقول ہوسفیہ اس مشلہ میں متعدد افراد شریک تھے۔ لیکن یہ کون کون افراد تھے۔ اور انہوں نے کس کس شخص کی لاش کا مشلہ کیا؟ یہ مشلہ کرنے والے مرد تھے یا عورتیں تھیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ جن کا ایسی افرا تفری میں جائزہ لینا ایک امر محال ہے۔ نہ اس کا جواب کوئی ایسا مسلمان دے سکتا ہے جو شریک

جنگ ہو، اس لئے کہ مسلمان تو اپنی جان بچانے کے لئے پہاڑی کے اوپر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور کفار مکہ میں سے بھی کسی ایسے شخص نے جو بعد میں اسلام لایا ہو، اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کی۔ مثلاً حضرت ابوسفیانؓ، حضرت خالد بن الولیدؓ، عکرمہ بن ابی جہلؓ، ام حکیمؓ بنت الحارث بن ہشامؓ، اور حضرت ہند بنت عتبہؓ، یہ سب فتح مکہ کے دن اسلام لائے۔ یا اس سے قبل اسلام لائے۔

ایسی انفرادی کے عالم میں جب کہ مسلمان اپنی جان بچانے کی فکر میں ہوں، خاص طور پر یہ دیکھنا کہ حضرت ہند بنت عتبہؓ یعنی امیر سعادہؓ کی والدہ نے کس کی لاش کا مشہ کیا۔ اور کس کے ناک کان کا بار بنایا۔ اور کس کا کلیجہ چھپایا؟ یہ تمام امور اسی صورت میں محفوظ کئے جاسکتے ہیں کہ باقاعدہ طور پر کچھ افراد اس کام کے لئے مامور کئے گئے ہوں کہ وہ حضرت ہندؓ کی ایک ایک حرکت کا جائزہ لیتے رہیں، اور ان کا جنگ وغیرہ سے کوئی تعلق نہ ہو۔ گویا آج کل کی اصطلاح میں اس کی ذمہ داری صرف رپورٹر تک ہو، اور اس کے ساتھ کوئی پریس فوٹو گرافر بھی ہو، جس نے پوری پوری تفصیل کے ساتھ یہ رپورٹ تیار کر کے ہمارے سبائی مؤرخین کے پاس بھیجی ہو۔ تاکہ وہ بطور ریکارڈ محفوظ رہے۔ اور پھر یہ ثابت کیا جاسکے کہ حضرت حمزہؓ کی لاش کا مشہ حضرت ہندؓ نے کیا تھا۔ اور ان کا کلیجہ چھپایا تھا۔

اس داستان کی حقیقت کیا ہے۔ یہ کہاں سے چلی، کس نے اس کہانی کی ابتداء کی، اور کن لوگوں نے اسے عام کیا؟ قبل اس کے کہ ہم اس پر کچھ تبصرہ کریں۔ پہلے اپنے اردو سیرت نگاروں کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیں۔

قاری احمد علی بھٹی تاریخ مسلمانان عالم میں لکھتے ہیں۔

کافروں کی عورتیں میدان میں گشت نگار ہی تھیں، مسلمانوں کی لاشوں کے ساتھ بہت نازیبا سلوک کر رہی تھیں۔ ابوسفیانؓ کی بیوی ہندؓ نے اپنے گلے کا بار اُتار کر وحشی کے گلے میں ڈال دیا۔ اور اس کو حضرت امیر حمزہؓ کے قتل پر مبارک باد دی۔ بہت سے شہداء کے ناک کان کاٹا،

ڈالے۔ اور بار بار باندھنے اپنے گلے میں پہنا۔ حضرت امیر حمزہؓ کی لاش کے قریب ہندہؓ گئی تو خنجر سے لاش کا سینہ چاک کیا۔ اور کچھ نکال کر دانتوں سے چبایا۔ ناک کان کاٹے اور لاش کو اچھی طرح خراب کیا۔ تاریخ مسلمانان عالم ص ۲۲۷ ج ۲  
عبدالحکیم نشتر جالندھری رقم طراز ہیں۔

کفار نے مقتولین بدر کے جوش انتقام میں بعض شہدار کی لاشوں کے ناک کان کاٹ ڈالے ابو سفیانؓ کی بیوی ہندہؓ نے حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ سخت بے حرمتی کی۔ اور ان کا جگر کاٹ کر چبا گئی تاریخ اسلام ص ۶۴۔ از عبدالحکیم نشتر جالندھری۔  
پرویز صاحب لکھتے ہیں۔

بب حضرت حمزہؓ کو وحشی غلام نے شہید کیا۔ تو ابو سفیانؓ کی بیوی ہندہؓ نے ان کے لاش کاٹ لیا۔ اور کچھ نکال کر چبا گئی۔ معارف القرآن ص ۵۲ ج ۴  
اسلم حیرا چوہدری لکھتے ہیں۔

وحشی نامی حبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ جو حربہ (چھوٹا تیز) چلانے میں مشہور تھا اور بہت کم خطا کرتا تھا۔ حبیر نے اس سے کہا کہ تم بھی لڑائی میں چلو۔ اگر حمزہؓ کو تم نے قتل کر دیا تو میں تم کو آزاد کروں گا۔ تاریخ الامت ص ۱۲

کافروں نے بدر کے کینہ کے جوش میں شہیدوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے تھے۔ ابو سفیانؓ کی بیوی ہندہؓ نے سید الشہداء حضرت حمزہؓ کی نعش کا ٹکڑا کیا۔ یعنی ناک کان وغیرہ کاٹ ڈالے آنکھیں نکالیں، اور سینہ چاک کر کے جگر کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈال کر چبایا۔ لیکن نگل نہ سکی، اُسے اگل دیا۔ اسی وجہ سے اس کا لقب جگر خواہ رکھا گیا۔ تاریخ الامت ص ۱۲۸  
علامہ شبلی مرحوم سیرت النبی میں رقم طراز ہیں۔

حضرت حمزہؓ نے ہندہؓ کے باپ عتبہ کو بدر میں قتل کیا تھا۔ حبیر بن مطعم کا چچا بھی حضرت حمزہؓ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ اس بنا پر ہندہؓ نے وحشی کو جو حبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ اور حربہ

اندازی میں کمال رکھتا تھا۔ حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا۔ اور یہ اقرار ہوا کہ اس کا رگزار سی کے صلہ میں وہ آزاد کر دیا جائے گا۔ سیرت النبی ص ۳۷ ج ۱  
اگے چل کر لکھتے ہیں۔

خاتونان قریش نے انتقام بدر کے جوش میں مسلمانوں کی لاشوں سے بھی بدلہ لیا۔ ان کے ناک کان کاٹ لئے۔ ہند (حضرت امیر معاویہ کی ملن) نے ان کا ہار بنایا۔ اور اپنے ٹپے میں ڈالا۔ حضرت حمزہؓ کی لاش پر گئی۔ اور ان کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبا گئی۔ لیکن گلے سے نہ اتر سکا۔ اس لئے اگل دینا پڑا۔ تاریخوں میں ہند کا لقب جو جگر غارہ لکھا جاتا ہے۔ وہ اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔ سیرت النبی ص ۳۸ ج ۱

ایک اور مقام پر شبلی لکھتے ہیں۔

وحشی بن جواکب حبشی غلام تھا۔ اور جس سے جبیر بن مطعم اس کے آقا نے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ حضرت حمزہؓ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ سیرت النبی ص ۳۷ ج ۱  
حکیم عبدالرؤف دانا پوری تحریر کرتے ہیں۔

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ہندہ بنت عتبہ اور اس کے ساتھ کی عورتوں نے شہدائے اُحد کا مشہ کیا۔ اُن کے کان اور ناک کاٹ کر ان کا ہار بنایا۔ اور اپنا ہار ہندہؓ نے خوشی میں وحشی بن حبشی قاتل حمزہؓ کو دے دیا۔ حضرت حمزہؓ کا پیٹ چاک کر کے ان کا جگر نکال کر چبا یا۔ اور بہت سے فحش اشعار پڑھے۔ اصح السیر ص ۱۵۲

ان تمام تحریرات کا مطالعہ کرنے کے بعد جو امور ہمارے سامنے آتے ہیں۔ وہ حسبِ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت حمزہؓ کے قاتل وحشی بن حرب ہیں۔

۲۔ یہ جبیر بن مطعم کے غلام تھے۔

۳۔ حضرت حمزہؓ کے قتل پر ان کی آزادی موقوف تھی۔

۴۔ حضرت حمزہؓ کے قتل پر بقول بعض مؤرخین اسے جبیر بن مطعم نے آمادہ کیا تھا۔ اور

بقول بعض ہند بنت عقبہ نے

۵۔ بقول بعض مورخین ہند نے اس سے وعدہ کیا تھا۔ کہ اگر تو حمزہ کو قتل کر دے گا تو میں تجھے آزاد کر دوں گی۔ جب کہ وہ ہند کے غلام نہ تھے۔ بلکہ جبر بن مطعم کے غلام تھے۔ اور جبر کے ہوتے ہوئے ہند کو یہ اختیار ہی نہ تھا کہ وہ اسے آزاد کر سکیں یا آزادی کا وعدہ کر سکیں۔

۶۔ بعض مورخین اس کے دعویدار ہیں کہ حضرت حمزہؓ کے قتل پر وحشیؓ کو ان کے مالک جبر بن مطعم نے آمادہ کیا تھا۔ شبلی نے کسی جگہ جبر کا نام لیا اور کسی جگہ ہند کا۔  
۷۔ اس جنگ میں قریش کی متعدد عورتیں شریک تھیں۔

۸۔ سب عورتوں نے لاشوں کا شلہ کیا تھا۔ اور ناک کان کاٹ کر ان سے اپنے گلے کے ہار بنائے تھے۔ لیکن ہند کے علاوہ کسی عورت کے بارے میں یہ ذکر نہیں کیا گیا کہ فلاں عورت نے فلاں شخص کا شلہ کیا تھا۔ آخر تمام مورخین کو پورے لشکر میں صرف ایک ہند ہی کیوں نظر آتی رہیں۔ بقیہ عورتوں کے بارے میں تفصیل کیوں بیان نہیں کی گئی۔ حالانکہ بقیہ عورتیں بھی قریش کی مقتدر عورتیں تھیں۔ مثلاً ام الحکیم بنت الحارث بن ہشام اور فاطمہ بنت الولید بن الغیرہ۔

۹۔ اس جنگ میں بنو مخزوم کے متعدد مشہور افراد شریک تھے۔ مثلاً عکرمہ بن ابی جہل، خالد بن الولید اور حارث بن ہشام۔ ان میں سے عکرمہ اور حارث کی بیویاں بھی ساتھ تھیں، یہ سب ابو جہل کا خاندان تھا۔ لیکن ان میں سے کسی فرد کے بارے میں ہمارے مورخین نے یہ تفصیلات بیان نہیں کیں۔  
۱۰۔ ہند کو جگر خواہ کا لقب دیا گیا۔ یہ لقب کون سے مورخین نے دیا ظاہر ہے کہ یہ لقب

کسی مجوسی ایرانی کا عطا کردہ ہو گا۔ کیونکہ لفظ جگر خواہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ یہ عربی زبان کا لفظ نہیں۔ اور تاج مک کسی عربی کی کتاب میں ان کا یہ لقب پایا جاتا ہے۔

۱۱۔ عبدالرؤف دانا پوری نے یہ تصریح کی ہے کہ یہ روایت ابن اسحاق کی ہے۔ اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ ابن اسحاق کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔

۱۲۔ تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ جب وحشیؓ حضور کی خدمت میں فتح مکہ کے بعد

حاضر ہوا تو آپ نے اس سے فرمایا تھا کہ کیا تو اپنا چہرہ مجھ سے نہیں چھپا سکتا؟ جس کے بعد وحشی  
کبھی حضور کے سامنے نہیں گئے اور یہ سب کچھ حضرت حمزہؓ کے قتل کے باعث ہوا۔

۱۳۔ لیکن ہندو جنہوں نے وحشیؓ کو قتل پر آمادہ کیا۔ حضرت حمزہؓ کا مثلہ کیا۔ امدان کا حجر  
چبایا۔ حضورؐ نعان کے ساتھ یہ سلوک نہیں فرمایا۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

۱۴۔ جبیر بن مطعم جو وحشیؓ کے مالک تھے اور جس نے حضرت حمزہؓ کے قتل پر اسے آمادہ کیا  
تھا۔ اور پھر اس وحشیؓ میں اسی کو آزاد کیا۔ ان کے ساتھ بھی یہ سلوک نہیں کیا گیا بلکہ انہیں بھی معاف  
کر دیا گیا۔

ظاہر ہے کہ ان دو مختلف فیصلوں کی اس کے علاوہ کوئی اور وجہ ممکن نہیں کہ یہ سب بعد کی  
اختراعات ہیں۔ اگر ایسا واقعہ پیش آتا تو حضورؐ کے علم میں ضرور آتا اور حضورؐ قطعاً یہ پسند نہ کرتے  
کہ ہندو کا چہرہ زوراً چھین لیں۔ لیکن ان کے برعکس حضورؐ نے ہندو کے ساتھ جو سلوک کیا وہ ہم سمجھ  
بخاری کے حوالہ سے پیش کریں گے۔

اس سے قبل کہ ہم اصل حقیقت پر سے پردہ اٹھائیں۔ یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ  
ہمارے یہ تمام اردو کے سیرت نگار ابھی تو اتنا بھی نہیں جانتے کہ حضرت ابوسفیانؓ کی زوجہ  
کا صحیح نام کیا ہے؟ ان سب نے اُن کا نام ہندہ لکھا ہے۔ حالانکہ اُن کا نام ہندہ نہیں ہے۔ یعنی اس  
کے آخرین ہ نہیں ہے۔ بال شہل نے نام صحیح لیا ہے۔ جن حضرات کو نام تک کی خبر نہ ہو۔ اور وہ  
اتنی معمولی سی بات کی بھی تحقیق نہ کر سکیں۔ اُن سے کسی حقیقی اور صحیح بات کی امید رکھنا بالکل ہی سی  
بات ہے۔

یہ کہانی ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اور ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں محمد بن اسحاق  
سے نقل کی ہے۔ محمد بن اسحاق کا تفصیلی حال ہم اوپر پیش کر چکے ہیں کہ وہ متعدد ائمہ حدیث کے  
نزدیک کتاب منکر تقویٰ لائی۔ مدلس اور مجتہبی شیعہ تھالیس سے اس روایت کو نقل کرنے والا  
مؤرخ شکر اللہ البرش اور سلمہ سے نقل کرنے والا مؤرخ محمد بن حمید ہے۔ ان دونوں کا تفصیلی حال



بھی ہم پہلے پیش کر چکے ہیں کہ یہ دونوں افراد قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔

ابن اسحاق نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے یہ روایت صالح بن کیسان سے سنی۔ صالح چھوٹے درجے کے تابعی ہیں۔ اگرچہ ثقہ ہیں۔ لیکن نشہ کے بعد پیدا ہوئے۔ اور نشہ میں ان کا انتقال ہوا۔ یہ تقریباً محمد بن اسحاق سے کچھ بڑے ہیں انہوں نے اوپر کی کوئی سند بیان نہیں کی۔ حالانکہ جنگ احد صالح بن کیسان کی پیدائش سے ستر سال قبل واقع ہوئی تھی۔ اُن کا قول اس سلسلہ میں کیا حیثیت رکھتا ہے۔ وہ خود چشم دید گواہ نہیں۔ بلکہ ممکن ہے کہ ابن اسحاق نے یہ کہانی وضع کر کے اُن کی جانب منسوب کی ہو۔ اور اس طرح ان کو بدنام کیا ہو۔ اگر واقعاً انہوں نے یہ روایت بیان بھی کی تب بھی روایت منقطع ہوئی۔ اور منقطع روایت قابل قبول نہیں ہوتی۔ اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ صالح کے علاوہ بقیہ تمام روایات سب ایرانی ہیں۔ اور تمام محدثین کے نزدیک ناقابل اعتبار ہیں تو اس کہانی کی کیا پوزیشن باقی رہتی ہے؟

اس لحاظ سے بھی اگر اس داستان پر غور کیا جائے کہ صالح کے علاوہ اسے کوئی بیان نہیں کرتا۔ پھر صالح سے ابن اسحاق کے علاوہ کوئی نقل نہیں کرتا۔ ابن اسحاق سے سلمۃ الابریش کے علاوہ کسی نے اسے نقل نہیں کیا۔ سلمہ سے محمد بن حمید رازی کے علاوہ اسے کوئی نقل نہیں کرتا۔ اور محمد بن حمید سے ابن جریر کے علاوہ اسے کوئی نقل کرنے والا نہیں۔ اور ابن جریر کا انتقال نشہ میں ہوا۔ گویا نشہ کے بعد سے اس کہانی کی ابتدا ہوئی اور نشہ تک ہر زمانہ میں صرف ایک فرد واحد کے سینہ میں یہ کہانی محفوظ رہی۔ اور اس فرد واحد کے علاوہ کوئی اس کہانی کو جانتا تک نہ تھا۔ حالانکہ اگر واقعہ پیش آتا تو اول تو اس کے متعدد چشم دید گواہ ہوتے۔ پھر جوں جوں زمانہ بڑھتا جاتا لوگوں کی زبان پر یہ عام ہوتا جاتا۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ یہ خالص مجوسی کہانی تھی۔ جسے شروع دور کے لوگوں نے قبول نہیں کیا تھا۔ اسے قبولیت تو اس وقت حاصل ہوئی جب لوگ آنکھیں بند کر کے ابن اسحاق اور طبری کی روایات پر ایمان لے آئے۔ اور پھر بعد کے لوگوں نے مکھی پر مکھی مارنی شروع کر دی۔ ورنہ نشہ سے قبل تو اس داستان سے کوئی

واقف ہی نہ تھا۔ پھر نہ تک یہ داستان علم باطن کی طرح ایک راز نہ رہی۔ جسے صرف ایک مجوسی دوسرے مجوسی کو تلقین کرتا رہا۔ چونکہ یہ تمام کام تقیہ بازوں نے انجام دیئے تھے۔ لہذا سنی جو ہمیشہ سے اور ہر معاملہ میں ان سے دھوکہ کھاتا رہا، اس نے اس مقام پر پہنچ کر حضرت ابوسفیانؓ، حضرت ہندؓ اور حضرت امیر معاویہؓ پر کھڑا اُچھالنا شروع کر دی۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ یہ سب حضرات مشرف باسلام ہو چکے تھے۔ اور یہ سب صحابہ میں داخل ہیں۔ اور تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق چلا آیا ہے کہ جس شخص نے حالت اسلام میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کی، اور اسلام ہی پر اس کا انتقال ہوا۔ اُس کا یہ دیدار رسول اتنا بڑا عمل ہے کہ پوری امت کے تمام اعمال اس کے سامنے بچ ہیں۔ پھر حضرت ہندؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ساس بھی ہیں، ان کی صاحبزادی ام حبیبہؓ تمام امت کی ماں ہیں۔ اور ان کے بھائی امیر معاویہؓ تمام امت کے ماسوں ہیں۔ لیکن آج کل کے سنیوں کو صرف پنج تن یاد ہیں۔ باقی افراد کی انہیں خبر بھی نہیں۔

یہ سب حرکات اس لئے عمل میں لائی گئی کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایران پر لشکر کشی شروع ہوئی۔ اور ایران کا کچھ حصہ فتح ہوا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جو اسوی تھے، ایران کا بیشتر علاقہ اسلام کے زیر نگین آیا۔ جو بچا کھچا باقی تھا۔ وہ ولید بن عبدالملک اموی اور سلیمان بن عبدالملک اموی کے دور میں مفتوح ہوا۔ جس کے نتیجے میں ہزار ہا سال پُرانے آتش کدے سرد ہوئے۔ جس سے ایرانیوں کی آتش انتقام بھڑک اُٹھی، اور ان میں سے ایک ایک فرد کے سینہ میں غضب و انتقام کا آتش کدہ سلگ اُٹھا۔ اور بنو امیہ کا کوئی فرد ایسا باقی نہ بچا۔ جس پر الزام تراشی نہ کی گئی ہو، اور جسے کسی نہ کسی واقعہ میں ملوث نہ کیا گیا ہو۔ اسی بے سرو پا پروپیگنڈے کے نتیجے میں خلافت نبی امیہ ختم ہوئی۔ اور نہ۔ لیکن یہ صرف اک خود فریبی ہے کہ بنو عباس کو اقتدار حاصل ہوا۔ ورنہ بنو عباس کے کا نہ ہوں پر رکھ کر بند و ق چلائی۔

دربار امکہ کون ہیں۔ ہارون الرشید نے  
فت کو دو بیٹوں پر تقسیم کر کے یعنی مامون

اور امین میں از سر نو عربوں اور ایرانیوں کو ٹکرا دیا۔ اور مامون نے ایرانیوں کے بل بوتے پر بغداد پر قبضہ کیا، امین الرشید اور عربوں کا قتل عام کیا۔ جس سے عرب طاقت ہمیشہ کے لئے دفن ہو گئی جب مامون کے مرنے کے بعد محکم باللہ برسرِ اقتدار آیا۔ تو اس نے ایرانیوں کی قوت ختم کرنے کے لئے ترکوں کا سہارا تلاش کیا۔ اور پھر بغداد کی سر زمین پر ان دونوں قوتوں کے ٹکراؤ سے اس مشہور عام اسلامی خلافت کا جو حال ہوا۔ اسے مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ بعض اوقات ایک ایک دن میں دو دو خلیفہ بنائے گئے۔ صبح کو ترکوں بے ایک خلیفہ کے ہاتھ پر بیعت کی، اور شام کو ایرانیوں نے اسے قتل کر کے دوسرا خلیفہ بنا دیا۔ دور دراز کے تمام امرا خود آزاد ہو گئے۔ اور اپنی اپنی ڈفلی بجانے لگے۔ آخر یہ غزنہ، غور، خوارزم، سلجوقیہ اور ایوبیہ وغیرہ کیسے اقتدار میں آئے۔ یہ سب ایرانی کرشمہ سازیاں ہیں۔ جن کی بنیاد ان بے مرد و پاسبان سے پڑی تھی۔ جب تک بنو امیہ اقتدار میں رہے تو خالص عرب حکومت تھی۔ اور کوئی اسیر اور کوئی گورنر اور کوئی بڑے سے بڑا سالار نہ آزاد تھا۔ اور نہ اپنی مرضی کا مختار تھا۔ خواہ وہ ہوسنی بن نصر ہو یا قتیبہ بن مسلم ہو۔ گویا مرکز مضبوط تھا۔ اور وحدت ملت قائم تھی۔ لیکن جب بنو عباس کی نام نہاد حکومت قائم ہوئی۔ تو اسلام کی مرکزیت اور وحدت ملت کا وجود ہی مٹ گیا۔ اور اس طرح یہ ایرانی سازش کامیاب ہوئی۔

ایران کی اس سازش کے ذریعہ سب سے پہلے امیر المومنین حضرت عمر شہید ہوئے پھر امیر المومنین حضرت عثمانؓ کو شہید کیا گیا۔ یہ ایرانی ہی تھے جنہوں نے حمل و صفیں برپا کرائی۔ پھر حضرت حسینؓ کو کھڑا کر کے انہیں خود شہید کیا۔ پھر زید بن علی بن حسین کو بنو لخمیہ کے مد مقابل کھڑا کر کے خود راہ فرار اختیار کی۔ اسکی تائید اس خط سے بھی ہوتی ہے جو زید بن علی بن حسین سے لکھوایا گیا۔

ہر عرب کو قتل کر دو

اقتلوا کل العرب

غور کیجئے کہ ایک عربی النسل خالص قریشی اہل عرب کے قتل کا حکم دے رہا ہے۔

آخر اس کے پس پردہ کون سی قوت اور کون سی سازش کا فرمایا ہے؟ کاش کوئی مورخ اس پر غور کرتا۔ اسی لئے ہم یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ آج ایران و عراق کی جو جنگ ہے۔ وہ بھی عرب و ایران کی جنگ ہے۔ یا بالفاظ دیگر سنیت اور شیعیت کی جنگ ہے۔ اس جنگ میں ایران کی حمایت اُس پرانی سازش کی حمایت ہے۔ جو حضرت عمرؓ کی شہادت سے وجود میں آئی تھی۔ اور جس نے چودہ سو سال تک ہمیں تباہی کے غار میں دھکیلا ہے۔ وہ تاریخ جسے ہم آج تاریخ اسلام کہتے اور جس پر ہم فخر کرتے ہیں۔ وہ ان ہی سازشیوں کی تیار کردہ ہے۔ اس کے اولین مصنف یا عجمی النسل ہیں یا سبائی ذہن رکھتے ہیں۔ مثلاً محمد بن اسحاق، داقدی، کلبی، سدی، سلمۃ اللابرش، حمید رازی، ابو مخنف، سری، ابن جویری طبری اور سعودی وغیرہ۔ اور جو حضرات سنی ہیں۔ وہ بھی ان ہی کے خوشہ چیں ہیں۔ مثلاً ابن ہشام، ابن سعد اور بلاذری وغیرہ۔ ہمارے لئے یہ تاریخ باعث فخر نہیں، بلکہ باعث افسوس ہے۔

اس تاریخ سے ہمیں سوائے اس کے کیا حاصل ہوا کہ ہم نے اُن صحابہ کرام کو اپنا ہدف بنالیا۔ جن کی خوبیوں سے قرآن سمور ہے۔ اور یہ وہی حضرات ہیں۔ جن کے ذریعہ ہم تک قرآن اور سنت رسولؐ پہنچی ہے۔ یہی حضرات ہیں جو ان دونوں امور کے گواہ ہیں۔ اور جب یہ گواہ ناقابل اعتبار قرار پائیں گے۔ تو جس شے کی یہ گواہی دے رہے ہیں اس کا مقام کیا ہوگا۔ لہذا کچھ تو سوچتے کہ آپ کے پاس نہ قرآن باقی رہے گا اور نہ سنت رسولؐ۔ اور یہی مجوسی برادری کا اصل مقصد ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک اصل قرآن تو امام غائب لے کر ایسے غائب ہوئے کہ ان کا آج تک ہمیں تو کیا پتہ چلتا۔ انہوں نے تو اپنے ہم نواؤں کو بھی خبر نہ ہونے دی۔ اور پوری امت مجوسیہ کو اصل قرآن سے بھی محروم کر گئے۔ کتنی گہری سازش ہے۔ اسے تو سوچنے کے لئے بھی عمر نوح ہونی چاہیے۔

آدم بر سر مطلب جنگ اُحد کے واقعات کا جہان تک تعلق ہے تو وہ صحابہ کرام جو اس جنگ میں شریک تھے۔ اُن میں سے کوئی ایک فرد بھی اس واقعہ کی جانب اشارہ تک نہیں کرتا

ربا فریق مخالف کا سوال۔ اُن میں متعدد افراد ایسے پاتے جاتے ہیں جو بعد میں مشرف باسلام ہوئے۔ مردوں میں بھی اور عورتوں میں بھی۔ مثلاً حضرت ہندؓ حضرت ام حکیمؓ بنت الحارث بن ہشام اور فاطمہؓ بنت الولید بن المغیرہ اور مردوں میں حضرت ابوسفیانؓ، حضرت عکرمہؓ بن ابی جہل، حضرت عاترؓ بن ہشام، حضرت خالدؓ بن الولید، حضرت عمرؓ بن العاص، حضرت صفوانؓ بن امیہ اور وحشیؓ بن حرب۔ یہ سب حضرات ہیں جو جنگِ اُحد میں اسلام کے مقابل بن کر آئے۔ اور بعد میں مشرف باسلام ہوئے۔ یہ جنگِ اُحد کے چشم دید گواہ ہیں۔ لیکن اُن میں سے کوئی شخص بھی حضرت ہندؓ کی یہ کہانی کہ انہوں نے حضرت حمزہؓ کا جگر چبایا۔ یا انہوں نے حضرت حمزہؓ کے قتل پر وحشی کو آمادہ کیا۔ یہ واقعہ کوئی بیان نہیں کرتا۔ ہاں ابوسفیانؓ نے اس بات کا اقرار ضرور اسی وقت کیا تھا کہ ہمارے کچھ افراد نے لاشوں کا مشلہ کیا ہے۔ لیکن میں نے نہ تو اس کا حکم دیا تھا۔ اور نہ یہ بات مجھے بری معلوم ہوئی۔ یہ اعلان ابوسفیانؓ نے جنگِ اُحد کے خاتمہ پر کیا تھا۔ یہ الفاظ تو اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ مشلہ کرنے والوں میں مرد بھی شامل تھے۔ یہ کام صرف عورتوں نے انجام نہیں دیا تھا۔ لیکن ایسا کرنے والے کون کون افراد تھے اور کس عورت نے کس کی لاش کے ساتھ یہ نازیبا حرکت کی تھی؟ ان شاہدوں میں سے کوئی کچھ بیان نہیں کرتا۔ ہاں حضرت حمزہؓ کے قتل کا تفصیلی واقعہ خود قاتل نے یعنی وحشیؓ بن حرب نے بیان کیا ہے جو صحیح بخاری میں بالتفصیل موجود ہے۔

\_\_\_\_\_ امام بخاری نے جعفر بن عمرو بن امتیہ الضمری سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں عبید اللہ بن عدی بن الحیار کے ساتھ سفر کے لئے چلا۔ جب ہم حمص پہنچے تو مجھ سے عبید اللہ بن عدی نے سوال کیا کیا تو وحشیؓ سے ملاقات کرنا چاہتا ہے؟ ہم اُن سے حضرت حمزہؓ کے قتل کے بارے میں دریافت کریں گے، میں نے جواب دیا ضرور۔

ان دونوں وحشیؓ نے حمص میں سکونت اختیار کر رکھی تھی۔ ہم نے ایک شخص سے وحشیؓ کے مکان کے بارے میں دریافت کیا۔ ہمیں بتایا گیا کہ وہ سامنے اپنے مکان کے سائے میں بیٹھا ہے۔

ہم نے اسے دیکھا تو شکل و صورت سے وہ بغیر بالوں کا ایک شکنیزہ معلوم ہوتا تھا۔ ہم اس کے پاس پہنچ کر تھوڑی دیر کھڑے رہے۔ پھر ہم نے اسے سلام کیا۔ اس نے ہمارے سلام کا جواب دیا۔ وادی کا بیان ہے کہ عبد اللہ بن عدی بن الحنیار نے اپنے سر اور چہرے پر عمامہ لپیٹ رکھا تھا۔ کہ اس طرح وحشی کو ان کی دو آنکھوں اور پاؤں کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔

عبد اللہ نے وحشی سے دریافت کیا کہ تم مجھے پہچانتے ہو؟ وحشی نے نظر اٹھا کر عبد اللہ کی جانب دیکھا۔ پھر کہا واللہ نہیں۔ ہاں میں اتنا جانتا ہوں کہ عدی بن الحنیار نے ایک عورت سے شادی کی تھی۔ جسے ام القتال بنت ابی العیص کہا جاتا تھا۔ اس کے بطن سے عدی بن الحنیار کا ایک لڑکا پیدا ہوا۔ میں نے مکہ میں اس لڑکے کے لئے ایک دائی تلاش کی۔ اور اس کی والدہ کے ساتھ اس بچہ کو لے جا کر اس دایہ کے سپرد کیا۔ میں تیرے قدموں کی جانب دیکھ رہا ہوں، اور میرا اندازہ ہے کہ تو وہی بچہ ہے۔

عبد اللہ نے اپنے چہرے سے کپڑا ہٹا دیا۔ اور وحشی سے دریافت کیا کہ کیا آپ ہیں حضرت حمزہؓ کے قتل کے بارے میں بتائیں گے؟ وحشی نے کہا ہاں بلاشبہ۔

بات یہ تھی کہ حضرت حمزہؓ نے بدر میں طعینہ بن عدی بن الحنیار کو قتل کر دیا تھا۔ میرے آقا جبر بن مسلم نے مجھ سے کہا کہ اگر تو حمزہؓ کو قتل کر دے تو تو آزاد ہے۔

پس جب لوگ عین کے سال جنگ کے لئے نکلے اور عین احد کے پہاڑوں میں سے ایک پہاڑ ہے۔ اس کے سامنے احد کی وادی ہے۔ میں بھی لوگوں کے ساتھ جنگ کے لئے نکلا۔ جب لڑنے والوں نے اپنی اپنی صفیں درست کر لیں۔ تو سب ابن عبد العزی صف سے باہر نکلا اور اس نے کہا ہے کوئی مقابلہ کرنے والا؟ وحشی کا بیان ہے کہ مد مقابل جسے حمزہؓ بن عبد المطلب نکلے اور بولے کہ اے ام انمار کے بیٹے جو حور توں کی ختنہ کیا کرتی تھی۔ کیا تو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتا ہے؟ پھر حضرت حمزہؓ نے اس پر حملہ کیا۔ تو

وہ ایسا ہو گیا جیسی گزری ہوئی کل (یعنی گزشتہ کل کی طرح وہ دنیا سے ناپید ہو گیا۔

وحشیؓ نے کہا میں ایک چٹان کے نیچے حمزہؓ کی گھات میں چھپا تھا۔ جب وہ میرے قریب سے گزرے تو میں نے اپنا حربہ اُن پر پھینکا۔ وہ حربہ اُن کی ناف میں لگ کر لپشت سے باہر نکل گیا۔ پس میری اُن کے ساتھ یہ آخری ملاقات تھی۔

جب لوگ میدان سے واپس آئے تو میں بھی ان کے ساتھ واپس چلا آیا۔ اور مکہ میں ٹھہر گیا (یعنی آزادی کے بعد) یہاں تک کہ مکہ میں اسلام پھیل گیا۔ تو میں طائف کی طرف نکل گیا۔ جب طائف والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قاصد روانہ کئے، تو مجھ سے کہا گیا تھا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم قاصدوں سے تعرض نہیں فرماتے، لہذا میں بھی ان قاصدوں کے ساتھ مل کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

آپ نے جب مجھے دیکھا تو فرمایا کیا تو وحشیؓ ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ نے استفسار کیا۔ کہ کیا تو نے ہی حمزہؓ کو قتل کیا تھا؟ میں نے عرض کیا جو خبر آپ تک پہنچی ہے۔ وہ درست ہے۔ آپ نے فرمایا۔ کیا تم اپنے چہرے کو مجھ سے چھپا سکتے ہو؟ (یعنی میرے سامنے نہ آیا کرو)۔ وحشیؓ کہتے ہیں پھر میں وہاں سے چلا آیا۔

اس کے بعد جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ اور سیلۃ الکذاب نے خروج کیا۔ تو میں نے دل میں سوچا۔ میں اب سیلہ کے مقابلہ کے لئے ضرور نکلوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں اسے قتل کر سکوں۔ اور حمزہؓ کے قتل کا اس سے بدلہ ہو جائے۔ یہ سوچ کر میں لوگوں کے ساتھ جنگ کے لئے نکلا۔ اچانک میں نے (میدان جنگ) میں ایک آدمی کو دیکھا کہ وہ ایک دیوار کی شق میں کھڑا ہے۔ گویا وہ ایک سیاہی مائل اونٹ ہے۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔ میں نے اسے اپنا حربہ مارا۔ میں نے یہ حربہ اس کے سینہ کے درمیان مارا۔ حتیٰ کہ وہ حربہ اس کے دونوں شانوں کے درمیان سے پشت پر نکل گیا۔ پھر سیلہ کی طرف انصارینہ میں سے ایک شخص بڑھا اور اس کے سر پر تلوار ماری۔

عبداللہ بن الفضل کا بیان ہے کہ مجھے سلیمان بن لیار نے یہ بات بتائی، اور انہوں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے سنی۔ انہوں نے فرمایا۔ کہ ایک لڑکی نے جو مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ چلا کر کہا۔ امیر المؤمنین (سیدہ کذاب) کی قسم اُن کو تو ایک حبشی غلام نے قتل کر دیا۔ بخاری مش ۵۸۲ ج ۲

یہ ہے وہ اصل واقعہ جو قاتل خود اپنی زبان سے بیان کر رہا ہے۔ جسے اقرارِ جرم کہا جائے تو بجا ہے۔ اور بیان بھی اس شخص سے کر رہا ہے۔ جس کے بھائی کے قصاص میں حضرت حمزہؓ کی شہادتِ عمل میں آئی۔ اس واقعہ سے جن جن امور کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وہ حسب ذیل ہیں۔  
۱۔ وحشیؓ بن حرب جبیر بن مطعم کا غلام تھا۔ اس نے اسے حضرت حمزہؓ کے قتل پر آمادہ کیا تھا۔ اور اس انعام کا وعدہ کیا تھا کہ اگر یہ انہیں قتل کرے گا تو آزاد کر دیا جائے گا۔ اس سے یہ امر تو واضح ہو گیا کہ اس قتل میں حضرت ہندؓ کا کوئی ہاتھ نہیں۔ نہ انہوں نے وحشیؓ کو قتل پر آمادہ کیا۔ اور نہ وحشیؓ کی آزادی حضرت ہندؓ کے ہاتھ میں تھی۔ اگر ابن اسحاق آزادی کے علاوہ کوئی اور شرط بیان کرتا تو شاید اس پر غور کیا جاتا۔ لیکن اس نے ایک ایسی شرط بیان کی جو حضرت ہندؓ کے قطعاً ہاتھ میں نہ تھی۔ اور وحشیؓ کا یہ اقبالِ جرم اور اس کی وجہ، کھل کر اس بات کی تردید کر رہی ہے کہ حضرت ہندؓ نے اس سے کوئی بات نہ کی تھی۔

۲۔ اگر آزادی کے علاوہ اسے کوئی اور انعام دیا جاتا تو وحشیؓ اسے ضرور بیان کرتا اس سے اس بات کا بھی رد ہو گیا کہ حضرت ہندؓ نے اپنے گلے کا ہارا تا کر اسے بطور انعام دیا تھا۔ اگر ایسا ہوا تھا تو وحشیؓ کو اس کے چھپانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

۳۔ وحشیؓ ابتدائے جنگ سے آخر تک کفار کے ساتھ رہا۔ اور ان ہی کے ساتھ مکہ واپس گیا۔ وہ ناک کان کے بار بنانے اور کلمہ چبانے کی کوئی کہانی بیان نہیں کرتا۔

۴۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشیؓ کا اپنے سامنے آنا پسند نہیں فرمایا۔

۵۔ قتلِ حمزہؓ میں بقول مورخین تین افراد برابر کے شریک ہیں۔ ایک وحشیؓ جو قاتل ہے۔



دوسرا جبیر بن مطعم جس نے قتل پر آزادی کا وعدہ کیا۔ تیسری ہند بنت عتبہ جنہوں نے ناک کان کاٹے اور کلیجہ چھایا۔

۶۔ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وحشیؓ کا سامنا آنا گوارا نہیں کیا۔ جبیر بن مطعم کا جرم وحشیؓ کے مقابلہ پر کمتر تھا۔ لہذا فتح مکہ کے بعد ان سے تعرض کیا گیا۔ اور نہ اس قسم کی کوئی پابندی عائد کی گئی۔ لیکن مؤرخین نے حضرت ہندؓ پر جو فرد جرم عائد کی ہے۔ وہ تو قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ کیونکہ دوران جنگ تو آدمی قتل ہوتے ہی رہتے ہیں۔ اس جرم کی موجودگی میں ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب آپ مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے اور اس کا اعلان کیا تو اس صورت میں چند افراد کے قتل کا اعلان کیا گیا۔ لیکن بجائے اس کے کہ ہندؓ کے قتل کا اعلان یا اظہار بیزاری کیا جاتا۔ ان کے گھر کو دارالامن بنا دیا گیا اور مکہ میں داخلہ سے قبل ہی یہ اعلان کر دیا گیا۔

من دخل فی بیت ابی  
سفیان فہو امن  
جو شخص ابوسفیانؓ کے گھر داخل ہوگا  
وہ مامون ہے۔

یہ اعلان خود اس امر کی شہادت ہے کہ حضرت حمزہؓ کے قتل سے حضرت ہندؓ یا ان کے خاوند ابوسفیانؓ کا کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر جب ہندؓ اسلام لاتی ہیں۔ اور حضور عورتوں سے یہ وعدہ لیتے ہیں کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کر دوں گی تو حضرت ہندؓ فرماتی ہیں۔

ربنا ہم صغارا  
وقتلہم کبارا۔  
ہم نے تو بچپن میں انہیں پرورش کیا تھا  
بڑے ہونے کے بعد انہیں آپ ہی نے  
قتل کیا۔

بیعت کے بعد حضرت ہندؓ صاف اور واضح الفاظ میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو اپنی گذشتہ اور موجودہ قلبی کیفیت کا برملا اظہار کرتی ہیں اور کہتی ہیں۔

یا رسول اللہ ما کان علی  
ظہر الارض من  
یا رسول اللہ روئے زمیں پر جتنے نیچے  
والے بستے ہیں۔ ان میں آپ سے

اہل خبائہ احب الی ان یذلوا زیادہ میری نظروں میں کوئی ذلیل نہ تھا  
 من اهل خبائث ثم ما اصبح لیکن اب روئے زمین کے تمام بسے  
 الیوم علی ظہر الارض اہل خبائہ والوں میں مجھے آپ سے زیادہ کوئی  
 احب الی ان یعزوا من اهل خبائث عزیز نہیں۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں اقرار کیا ہو سکتا ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا  
 جو جواب عطا فرمایا۔ وہ ان تمام سبائی داستان سراؤں پر پانی پھیر رہا ہے۔ وہ تو ایسا جواب ہے  
 جس پر ہزاروں زندگیاں قربان کی جاسکتی ہیں۔ حضور ارشاد فرماتے ہیں۔

والیضا والذی نفسی اُس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری  
 بیدار۔ بخاری سنہ ۵۲۹ ج ۱ جان ہے۔ میرا بھی یہی حال ہے۔

یعنی ایسی کوئی سرسری سی محبت نہیں جو کسی عام انسان سے ہو سکتی ہو۔ بلکہ اتنی شدید  
 محبت ہے کہ حضور اس کا ذکر بھی قسم کھا کر کر رہے ہیں۔ انصاف سے سوچئے کہ کیا رسول اللہ صلی اللہ  
 علیہ وسلم ایک جگر خوارہ کے ساتھ یہ سلوک فرما سکتے تھے؟ جب کہ آپ کو حضرت حمزہؓ سے جو محبت  
 تھی اس کا عالم آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ اگر ایسا کوئی حادثہ پیش آتا تو کیا آپ حضرت ہندؓ کے ساتھ  
 اسی محبت سے پیش آتے۔ بلکہ کم از کم اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا جاتا جو وحشی بن حرب کے  
 ساتھ کیا گیا۔ یہ برعکس سلوک اُس سبائی داستان کی تردید کے لئے کافی ہے۔ اور حضور کے اسی  
 اقرار محبت سے حضرت ہندؓ کا جو مقام ظاہر ہوتا ہے۔ وہ عام غورتوں سے بہت بلند ہے۔ آپ  
 نے فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والوں میں سے کسی کے لئے یہ الفاظ نہیں فرمائے۔ حالانکہ آپ  
 کے خاندان کے متعدد افراد بھی فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے۔ مثلاً عقیل بن ابی طالب، ام ہانیؓ  
 ابوسفیانؓ بن حارث، عبثہ بن ابی لہب اور معتبہ بن ابی لہب وغیرہ لیکن یہ دولت کسی کو  
 حاصل نہیں ہوتی یہ دولت حاصل ہوتی تو حضرت امیر معاویہؓ کی والدہ کو جن کا تعلق بنو امیہ سے  
 ہے۔ اسی لئے امام بخاری نے اس واقعہ پر باب فضل ہند بنت عبثہ کی سرخی قائم کی ہے۔ یہ اللہ

کالا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ کا ذہن کسی مقام پر بھی سبائیت کو قبول نہ کر سکا۔  
کاش ہمارے علماء بخاری کا ہی غور سے مطالعہ کر لیتے۔ تو بہت سی سبائی کہانیوں کی حقیقت  
کھل جاتی۔ لیکن جو لوگ بخاری کی صرف تلاوت کے قائل ہوں۔ وہ بخاری کو کیا سمجھیں گے۔

## در خیبر اور فاتح خیبر

سب سے اول تو ہمارے قارئین یہ ذہن نشین کر لیں کہ یہ در خیبر وہ درہ خیبر نہیں، جو  
صوبہ سرحد میں واقع ہے۔ اور جو پاکستان کو افغانستان سے ملاتا ہے۔ بلکہ یہ مدینہ منورہ  
کے قریب یہودیوں کا ایک علاقہ تھا۔ جس میں متعدد قلعے تھے۔ مثلاً صعب، سالم، قموص، نطاة  
قصارہ، شق اور مرطبہ وغیرہ۔ ان میں بیس ہزار سپاہی تھے۔ اور ان میں سب سے زیادہ  
محفوظ اور مضبوط قلعہ قموص تھا۔ اس مخصوص واقعہ کا تعلق قلعہ قموص سے ہے، خیبر نامی مکمل  
علاقے سے نہیں۔

خیبر کے کل دس قلعے تھے۔ سات ایک دائرے کے اندر اور تین الگ الگ تھے۔  
نو قلعے مختلف صحابہ کرام کے ہاتھوں پر فتح ہوئے۔ جن میں سے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ،  
حضرت زبیرؓ بن العوام، حضرت محمدؓ بن مسلمہ، حضرت سعدؓ بن عبادہ، اور حضرت خطابؓ بن المذند  
خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

قموص کا جب محاصرہ ہوا۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دردِ سر لاحق ہو گیا تھا۔ آپ  
خود معرکہ میں تشریف نہیں لے جاتے تھے۔ ورنہ بقیہ قلعوں پر جتنے حملے ہوئے، اُن میں اصل  
کمان بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں رہی۔ قلعہ قموص پر حملے کے وقت لشکر کی کمان

حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تھی۔ جیسا کہ ابن سعدؒ نے طبقات میں اس کا ذکر کیا ہے۔

جنگ کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ جس غزوہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود تشریف لے جاتے تو اس کی کمان آپ اپنے ہاتھ میں رکھتے۔ اور علم دوسروں کو دیتے۔ اور جب کوئی سریرہ روانہ فرماتے تو کمان کسی کے ہاتھ میں دیتے اور علم کسی اور کے ہاتھ میں سیرت کی تمام کتابوں کو ٹوٹل کر دیکھ لیجئے۔ آپ کو ہر جگہ یہی صورت حال نظر آئے گی۔ ہاں غزوہ موتہ کے وقت اس صورت پر عمل نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ لشکر ایک دور دراز فاصلے پر شام کی جانب روانہ کیا گیا تھا۔ اور ایک نئی قوم یعنی عیسائیوں سے مقابلہ تھا۔ وہاں کے بارے میں یہ فیصلہ پہلے سے مشکل تھا کہ وہاں کیا صورت حال پیش آئے۔ لہذا حضرت زیدؓ بن حارثہ کو اس لشکر کا امیر بنا کر انہیں جھنڈا دے دیا گیا۔ اور ایک امیر ہونے کی حیثیت سے انہیں اختیار تھا کہ وہ خواہ کسی اور کو جھنڈا دیدیں۔ لیکن انہوں نے جھنڈا اپنے پاس رکھا۔ یہ ایک مستثنیٰ صورت تھی۔

غزوہ موتہ کے علاوہ ہر غزوہ اور ہر سریرہ میں اسی اصول پر عمل کیا گیا۔ کہ امیر لشکر کوئی اور ہوتا اور علمبردار کوئی اور کیونکہ علمدار کا کام جنگ کرنا نہیں ہوتا۔ اس کا کام علم بلند رکھنا اور اس کی حفاظت کرنا ہوتا ہے۔ تاکہ لشکر اپنے علم کو دیکھ کر اپنے مقام پر ڈٹا رہے۔ جو جوں لشکر آگے بڑھتا ہے۔ علم بھی آگے بڑھتا جاتا ہے۔ اُس دور میں خواہ کوئی بھی قوم ہو اسی اصول پر عمل کرتی تھی۔ آپ جنگ احد کا نظارہ کیجئے۔ کفار کی جانب سے سالار لشکر ابوسفیانؓ ہے۔ لیکن علم دوسروں کے پاس ہے۔ اور جب تمام علمبردار قتل ہو گئے تو ایک حورت نے علم سنبھال لیا۔ مسلمانوں کی جانب سے امیر لشکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور علم حضرت مصعبؓ بن عمیر کے پاس ہے۔ یہی صورت حال آپ کو غزوہ بدر اور فتح مکہ کے وقت نظر آئے گی۔

یہ بھی ساتھ ساتھ ذہن نشین کر لیجئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جتنے غزوات میں تشریف لے گئے۔ اس میں کبھی بھی صرف ایک علم نہیں رہا ہے۔ بلکہ کم از کم تین علم رہے۔ جن میں سے ایک علم مہاجرین کا اور دو انصار کے۔ یعنی ایک قبیلہ ادس کا اور ایک قبیلہ خزرج کا۔

قارئین یہ بھی یاد رکھیں کہ عربی زبان میں علم بڑے جھنڈے کو کہتے ہیں۔ جو اس جگہ رہتا ہے جہاں سپہ سالار کھڑا ہو، بقیہ دستوں کو جو جھنڈے دیئے جاتے ہیں وہ عربی میں علم نہیں کہلاتے بلکہ انہیں ”رایہ“ کہتے ہیں۔ اتفاق سے جن احادیث میں حضرت علیؓ کو جھنڈا دینے کا ذکر آیا ہے سب جگہ لفظ رایہ ہے، کسی جگہ علم نہیں۔ کیونکہ علم تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھا۔ ہمارے اردو مؤرخین نے رایہ کو اپنی جہالت سے علم بنا دیا ہے۔ اور ہر جگہ علم لکھتے چلے گئے۔ یہ بھی ذہن میں رہے کہ اصول جنگ میں سے ایک اصول یہ ہے کہ ہمیشہ سے فتح و شکست کامیابی اور ناکامی حاکم اعلیٰ یا سالار لشکر کی جانب منسوب ہوتی ہے۔ سپاہی یا معمولی سردار خواہ کتنے ہی کارنامے دکھائیں۔ لیکن فتح سالار اعلیٰ کی جانب منسوب ہوگی۔

خیبر کے معاملہ میں سپاہیوں نے حضرت علیؓ کی ذات کو اچھالنے کے لئے تمام اصولوں کو پامال کر دیا۔ نہ تو یہ بیان کیا کہ امیر لشکر کون تھا، نہ اس کی دھات کی کہ اس کو خیرج کے جھنڈے کس کے پاس تھے۔ اور نہ فتح خیبر کو سالار لشکر کی جانب منسوب کیا۔ بلکہ اس کے ”کس علم دار کو فاتح بنا کر دکھا دیا۔ ان امور کے علاوہ جو جو گل فشانیاں کی گئیں، وہ جدا گانہ ہیں۔ ان تمام غلطیوں سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ خیبر صرف ایک قلعہ کا نام تھا جس کو حضرت علیؓ کے علاوہ ہر شخص فتح کرنے سے ناکام رہا تھا۔ یہ ان ہی کی بہادری اور شکل کشائی تھی جو انہوں نے یہ مشکل حل کر دی۔

دوسرا اثر یہ مرتب ہوا کہ خیبر کے بقیہ قلعہ جات اودان کے فاتحین نگاہوں سے قطعاً اوجھل ہو گئے، حتیٰ کہ ان فاتحین کے ناموں تک سے کوئی واقف نہ رہا۔ بلکہ اس واقعہ کو مباہلہ آمیز کے ساتھ اس کثرت سے دہرایا گیا کہ ان فاتحین کے اسماء گرامی بھی تاریکی میں چلے گئے جنہوں نے ہزار ہا میل کا رقبہ فتح کیا۔ بلکہ ان سبائی داستانوں کے باعث ان کو اس بہادری کا یہ صلہ ملا کہ تاریخ میں بدنامی کا ٹیکہ ان کے ماتھے پر سجایا گیا۔ مثلاً حضرت عمرو بن العاص، حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن ابی سرح، حضرت عبداللہ بن عامر حضری، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابو موسیٰ اشعری اور حضرت خالد بن الولید وغیرہ۔ اور بہت

سے وہ صحابہ جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں بڑے بڑے کا نام انجام دیے تھے۔ وہ گوشہ گننامی میں چلے گئے۔ یہ ہے ہمارے ان سبائی مؤرخین کی کرشمہ سازی۔ آئیے ہم آپ کو پہلے حکیم عبدالرؤف داناپوری کی زبانی یہ روداد سناتے ہیں حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم در بدر کی علالت کی وجہ سے خود معرکہ میں نہیں جاتے تھے مہاجر یا انصار میں سے کسی کو سالار فوج متعین کر دیتے تھے۔ یہ قلعہ (قموں) سب سے زیادہ زیادہ مستحکم تھا۔ اس لئے محاصرہ طویل ہوا۔ اور قلعہ فتح نہ ہوتا تھا۔

ایک روز حضرت صدیق گئے اور بڑی کوشش کی مگر فتح نہ ہوا، دوسرے روز حضرت عمر گئے اور بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آپ نے فرمایا کہ کل ایسا شخص علم لے گا جو اللہ اور اس کے رسول کو دوست رکھتا ہے۔ اور اللہ و رسول اس کو دوست رکھتے ہیں۔ اسی کے ہاتھ پر اللہ پاک اس قلعہ کی فتح غنایت کرے گا۔

سب صحابہ رات کے وقت آپس میں تذکرہ کرتے تھے کہ دیکھئے کل کس کو علم نصیب ہوتا ہے۔ جب یہ کہ وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں صحابہ حاضر ہوئے تو آپ نے پوچھا کہ علی کہاں ہیں؟ صحابہ نے کہا کہ ان کی آنکھوں میں رماد کی وجہ سے درد ہے وہ آنے کے قابل نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ان کو بلاؤ، وہ آئے تو آپ نے ان کی آنکھوں میں کھاجا دہن ڈالا۔ اور اللہ سے دعا کی۔ ان کی آنکھیں ایسی اچھی ہو گئیں جیسے کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر فرمایا کہ جاؤ، پہلے اسلام کی دعوت دو، اور اللہ کے حقوق سمجھاؤ۔ اے علی اگر تمہارے ذریعہ سے ایک شخص کو بھی ہدایت ہو گئی تو یہ تمہارے لئے سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اصح اسیر ۲۳۲

حکیم صاحب نے واقعہ کے ابتدائی حصہ کی جو نوعیت بیان کی ہے۔ وہ عجیب گول مول ہے۔ حکیم صاحب نے مجوسی اور سبائی اثرات کے تحت یہ تو بیان فرمادیا کہ ابو بکر و عمر نامکام ہو گئے۔ کیونکہ حضرت علیؓ کی فضیلت اس وقت تک ثابت نہ ہو سکتی تھی جب تک حضرت ابو بکرؓ

و عمر کو ناکام ثابت کر کے نہ دکھایا جائے۔ لیکن حکیم صاحب یہ گولی کر گئے کہ یہ حضرات کس عہد پر بھیجے گئے تھے۔ سالار بنا کر بھیجے گئے تھے یا علمدار۔ لیکن چونکہ آگے علم داری کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حکیم صاحب کے ذہن میں صرف علم داری کا قصہ ہے۔ حالانکہ یہ لشکر دو حصوں پر منقسم تھا۔ مینہ اور میسرہ۔ ایک حصہ کے امیر حضرت عمرؓ تھے۔ اور دوسرے حصہ کی امارت محمد بن مسلمہ انصاری کے پاس تھی۔ حضرت علیؓ اس حصہ کے علمدار تھے جس حصہ کے امیر حضرت عمرؓ تھے۔ جیسا کہ ابن سعد نے طبقات میں اس کی وضاحت کی ہے۔ گویا اس دست کی سالاری ابتدا سے انتہا تک حضرت عمرؓ کے پاس رہی۔ ظاہر ہے کہ کسی مجوسی مورخ نے واقعہ کی صورت بگاڑ کر حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ناکام بنا کر دکھایا ہے۔

ہاں ہم حکیم صاحب کی خدمت میں یہ بھی ضرور عرض کریں گے کہ ثعلب دہن آنکھوں میں ڈالنا نہیں جاتا بلکہ لگایا جاتا ہے، ڈالنے اور لگانے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر حکیم صاحب نے یہ الفاظ کسی اور سے نقل کئے ہیں تو یقیناً اس نے حضرت علیؓ کی کوئی مدح سرائی نہیں کی۔ بلکہ ان کے لئے اس میں ایک مذمت کا پہلو نکلتا ہے۔ باقی ہمارا لگان یہ ہے کہ ردائی تحریر میں یہ الفاظ نکل گئے ہیں۔ حکیم صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں۔

آپ جب قلعہ کے قریب پہنچے تو ایک یہودی نے قلعہ سے منزل نکال کر پوچھا کہ تم کون ہو، فرمایا میں علیؓ بن ابی طالب ہوں، اس نے کہا قسم ہے تو ریت کی کہ تم لوگ غالب ہوئے۔  
اصح السیرۃ ۲۳۵۔

کاش کوئی حکیم صاحب سے یہ دریافت کرتا کہ جنگ خیبرؓ میں ہوئی خیبر کے باشندے ہمہ وقت مدینہ آتے جاتے رہتے تھے، منافقت کا لبادہ پہن کر بھی یہی سامنے آتے۔ کیا ان میں سے سات سال تک کوئی شخص حضرت علیؓ کے نام سے واقف نہ ہوا تھا اور اگر یہ لوگ حضرت علیؓ کے نام سے واقف نہ تھے۔ تو کیا آج ہی ایک یہودی پر یہ الہام ہونا

تھا کہ تم غالب ہو گے اور وہ بھی علیؑ کے نام کے باعث۔ کاش حکیم صاحب یہ تو سوچ لیتے کہ بقیہ تو قلعہ جات تو حضرت علیؑ کے ہاتھ پر ہرگز فتح نہیں ہوئے۔ انہیں تو دیگر صحابہ نے فتح کیا تھا۔ وہ کس کے نام کی برکت سے فتح ہوئے تھے؟ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت کی موجودگی میں کسی اُمتی کی برکت کا اظہار صریح تو یمن رسول ہے۔ ایسا تو نہیں کہ حکیم صاحب رافضیوں کے اس عقیدے ”الغالب علی کل غالب“ (حضرت علیؑ ہر غالب پر غالب ہیں) کو تو اپنائے ہوئے نہیں۔ کیونکہ ہمارے دور کا ملا بھی خطبہ جمعہ میں مزے لے لے کر اس کا پیر چار کرتا رہتا ہے۔ اور اس طرح ان الفاظ کے ذریعہ وہ حضرت علیؑ کو اللہ سے بھی بلند مقام دیدیتا ہے۔ جب معارج النبوت، جیسی کتاب سے جو سراسر رافضیت و شیعیت کا نمونہ ہے سیرت رسول تحریر کی جائے گی۔ تو پھر اس کے علاوہ اور کیا اُمید کی جاسکتی ہے۔ حکیم صاحب آگے لکھتے ہیں۔

اس کے بعد قلعہ سے رجب نکلا جو یہودیوں میں سب سے دلیر شخص تھا۔ وہ یہ رجز پڑھ رہا تھا۔

انا الذی سمعتنی امی مزہ شاکلی اسلاح بطل مجرب  
میری ماں نے میرا نام رجب رکھا ہے میں ہتھیار بند ہوں، اور آزمودہ بہادر ہوں۔  
حضرت علیؑ اس کے مقابلہ میں گئے۔ اور فرمایا۔

انا الذی سمعتنی امی حیدر کلث غابات کریمہ المنظرہ  
میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے میں جنگل کے اس شیر کی طرح ہوں  
جو صورت سے ہیبت ناک ہو۔

یہ کہا اور ایک تلوار ماری کہ اس کا سراڑ گیا۔ ص ۲۳۵ السیر

قارئین کرام کو ہم یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ جب جنگ قلعہ بند ہو کر لڑی جاتی ہے۔ تو کوئی مبارز سامنے نہیں آتا۔ بلکہ قلعہ پر ہی سے تیر زنی کی جاتی ہے۔ اور خائف لشکر کو آگے بڑھنے



سے روکا جاتا ہے۔ مقابلہ کے لئے مبارز اسی وقت نکلتا ہے۔ جب کہ دونوں لشکر میدان کارزار میں آنے سے سامنے کھڑے ہوں۔ یہ مقابلہ کی دعوت اس امر کا ثبوت ہے کہ یہودی لشکر قلعہ میں محصور نہ تھا۔ بلکہ سامنے مد مقابل ڈٹا ہوا تھا۔ یہودیوں کا سردار مرحب جو ایک ہزار سواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ مقابلہ کے لئے نکلا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ کوئی مقابلہ نہ ہو سکا اور بقول حکیم صاحب ایک تلوار ہی میں اس کا سر اڑ گیا۔ کیونکہ اس کے بغیر مشکل کشائی اور حضرت علیؓ کی خدائیت کیسے ثابت ہوتی۔ لیکن یہ مشکل خود حکیم صاحب نے حل کر دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ابن تیمیہ کہتے ہیں کہ صحیح مسلم میں اسی طرح ہے کہ مرحب کو حضرت علیؓ نے قتل کیا۔ مگر موسیٰ بن عقبہ نے امام زہری اور ابوالاسود سے روایت کیا ہے کہ حضرت جابر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ مرحب کو محمد بن مسلمہؓ نے قتل کیا۔ جب مرحب نے نکل کر مبارزت طلب کی تو محمد بن مسلمہ نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ مجھے اجازت دیجیے اس نے میرے بھائی محمود بن مسلمہ کو قتل کیا ہے۔ یہ گئے۔ دونوں کے بیچ میں ایک درخت پڑ گیا۔ دونوں موقعے تلاش کرتے رہے۔ آخر محمد بن مسلمہ نے اسے قتل کر دیا۔ سلمہ بن سلامہ اور عبید بن حارثہ بھی یہی کہتے ہیں کہ مرحب کو محمد بن مسلمہ نے قتل کیا۔

واقعی کا بیان ہے کہ محمد بن مسلمہ کی ضرب سے مرحب کی دونوں ساقیں (پنڈیاں) کٹ گئی تھیں۔ انہوں نے چھوڑ دیا۔ اور کہا کہ تکلیف کا مزاج کم جس طرح میرے بھائی نے تکلیف اٹھائی۔ اس کے بعد اس طرف حضرت علیؓ آئے تو انہوں نے اس کی گردن مار دی۔ اور اس کی تلوار اور سامان لے لیا۔ یہ معاملہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے گیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا۔ ہاں میں نے قتل کیا ہے۔ مگر میرا اس کا پہلے سے کٹا ہوا تھا۔ حضور نے اس کی تلوار مغفرت اور نیزہ و فیرہ سب محمد بن مسلمہ کو دلوا دیا۔ یہ تلوار محمد بن مسلمہ کی اولاد کے پاس موجود تھی۔ اور اس پر مرحب کا نام کھدا ہوا تھا۔ واللہ اعلم۔

مرحب کے بعد اس کا بھائی یا سرنکلا، یہ بھی عظیم الجثہ، طویل القامت اور بڑا شہ زور تھا۔ اس کے مقابل حضرت زبیر بن العوام گئے۔ حضرت صفیہؓ (زبیر کی والدہ) نے کہا کہ یا رسول اللہؐ میرے لڑکے کو قتل کر دے گا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انہیں تمہارا لڑکا اسے قتل کرے گا۔ آخر حضرت زبیرؓ نے اسے قتل کر دیا۔

قلعہ قموں پر تقریباً بیس روز محاصرہ رہا۔ یہ سب سے مستحکم قلعہ تھا۔ اور اس قلعہ پر حضرت علیؓ کے کارناموں کے متعلق بہت سی مبالغہ آمیز روایتیں مشہور ہیں۔ صبح السیرۃ

اس مضمون کو ایک بار پھر غور سے پڑھئے، اور سوچئے کہ اس سے کیا کیا نتائج اخذ ہوتے ہیں۔ ۱۔ اس قلعہ کا محاصرہ بیس دن تک رہا۔ گویا یہ اکیسویں دن فتح ہوا۔ بقول دانا پوری ہر روز ایک نئے صحابی کو علم یا کمان دے کر بھیجا گیا۔ اور سب ناکام رہے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں یہ قلعہ فتح ہوا۔ اس طرح اس قلعہ پر حملہ میں بیس کمانداروں نے حصہ لیا۔ لیکن ناکامی خاص طود پر ابو بکرؓ و عمرؓ کی دکھائی گئی۔ کیونکہ سب انہوں کو اصل بغض تو ان ہی دو سے ہے۔

۲۔ فتح کے روز جھنڈا حضرت علیؓ کو دیا گیا۔ اور اس کی بشارت بھی پہلے سے دیدی گئی۔ گویا اب حضورؐ خواہ کسی کو بھی علم دیتے قلعہ ہر صورت میں فتح ہو کر رہتا۔ کیونکہ بشارت رسول غلط نہیں ہو سکتی۔

۳۔ یہ بھی پہلے سے اعلان کیا گیا کہ جسے جھنڈا دیا جائے گا، اللہ اور اس کا رسول اس سے راضی ہیں، اور وہ اللہ اور اس کے رسول سے راضی ہے۔ اس سے حضرت علیؓ کی فضیلت ثابت ہوئی کہ ان سے اللہ اور اس کا رسول راضی ہے۔

۴۔ جھنڈا یہ معجزہ بھی سامنے آیا کہ آنکھوں میں لعاب دہن لگانے سے آنکھیں ابھی ہو گئیں۔

۵۔ یا سر کے قاتل بالاتفاق حضرت زبیرؓ ہیں۔

۶۔ مرحب کے سلسلے میں اختلاف ہے۔ عام مؤرخین کا دعویٰ ہے کہ اس کے قاتل حضرت

علیؓ ہیں، جب کہ حضرت جابرؓ بن عبد اللہ صحابی۔ مجمع بن حارثہ، مسلمہ بن سلامہ، امام زہری

مورخ موسیٰ بن عقبہ تابعی اور واقفی کا دعویٰ یہ ہے کہ مرحب کے قاتل محمد بن مسلمہ الضمری ہیں۔  
۷۔ واقفی کی اس صورت سے جو دانا پوری نے مرحب کے قتل کے سلسلہ میں بیان کی ہے  
یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس جنگ میں حضرت علیؑ کا کوئی بھی کا زامہ نہیں۔ بجز اس کے کہ اُن کے  
ہاتھیں جھنڈا دیا گیا۔ اور اُن کے لئے رضائے الہی کا اعلان کیا گیا۔

اس موقع پر ہم اولاً یہ غلط فہمی دور کرنا چاہتے ہیں کہ عام لوگ اور ہمارے اردو مؤرخین  
اور مقررین حضرات مرحب کا نام غلط بولتے ہیں۔ وہ رے کو ساکن پڑھتے اور ج پر صرف زبر  
پڑھتے، اور مرکبیم پر زبر پڑھتے ہیں۔ حالانکہ۔ میم پر پیش، رے پر زبر اور رے پر تشدید ہے  
زبر ہے۔ یعنی اس کے اعراب اس طرح ہوں گے مَرْحَب۔ اس نام کو ہر خاص و عام  
غلط بولتا اور پڑھتا ہے۔

حکیم صاحب آگئے لکھتے ہیں۔

مدارج النبوت میں روضۃ الاحباب اور مدارج النبوت سے منقول ہے کہ حضرت  
علیؑ کی سپر گرگئی اس کو سپرد لے بھائے۔ حضرت علیؑ نے قلعہ کا دروازہ اکھاڑ کر اسے سپر لایا جگ  
کے بعد آپ نے اس دروازے کو پھینک دیا۔ تو سات قوی آدمی اس کو پلٹ نہیں سکتے تھے اور  
چالیس آدمیوں نے مل کر اٹھا پا چاہا لیکن نہ اٹھا سکے۔

اجو شخص پیدائش کے پہلے دن دیا کی چھ چادریں اور چڑے کی بیٹیاں ایک جھکے  
سے پھاڑ دے۔ اُس سے تو یہ بھی بعید نہیں کہ وہ پورا قطعہ آبادی کے سر پر اٹھا لے  
معارج سے نقل کیا ہے کہ اس کا وزن آٹھ سوں تھا۔ اور مواہب لدنیہ سے نقل کیا ہے  
کہ حضرت علیؑ نے تنہا اس دروازے کو اکھاڑ لیا لیکن اس کے بعد ستر آدمی مل کر بہ شکل اس کو  
حرکت دے سکے۔ اور حاکم و بیہقی نے نقل کیا ہے کہ جس دروازے کو حضرت علیؑ نے تنہا اکھاڑ  
لیا۔ چالیس آدمیوں نے مل کر تجربہ کیا اسے نہ اٹھا سکے۔ بیہقی نے روایت کیا ہے کہ قلعہ کے  
دروازے کو حضرت علیؑ نے تنہا اکھاڑ دیا۔ اس کے بعد ہم میں سے ستر آدمیوں نے چاہا کہ اٹھا

کہ اس کو اس کی جگہ پر لگا دیں تو اٹھانہ سکے۔ ان سب روایتوں کو نقل کرنے کے بعد عبدالحق  
حدیث دہلوی لکھتے ہیں کہ مواہب لدنیہ میں ہے کہ ہمارے شیخ نے کہا کہ یہ سب روایات واپس  
میں۔ بعض علماء نے اس سے انکار کیا ہے۔ اصح السیرۃ ۲۳۶

شکر ہے کہ عبدالحق دہلوی اور عبدالرؤف دانا پوری نے ان روایات کا خود ہی انکار کر دیا۔  
اور ہم اس فضول درد سری سے بچ گئے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ داستان گو چند باتیں بھول  
گئے تھے۔ وہ پتے کی باتیں ہم بتائے دیتے ہیں۔ تاکہ نئی داستانوں کے لئے کچھ نیا مواد فراہم  
ہو جائے۔

۱۔ بڑائی کے وقت لڑنے والے کے سیدھے ہاتھیں ہمیشہ تلوار ہوتی ہے۔ اگر اس کے  
پاس ڈھال ہوتی ہے تو وہ اسے بائیں ہاتھ میں تھامتا ہے۔ لیکن اُس دور میں ہر مسلمان کے پاس  
ڈھال نہیں تھی اور حضرت علیؑ کے پاس بھی ڈھال نہیں تھی۔ شادی کے موقع پر آپ کے پاس تلوار، گھوڑا، ہونہ ہوتا  
تھا ہے۔ البتہ ڈھال کی جگہ اُن کے بائیں ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ اب دروازے کو ڈھال ہی وقت بنایا  
جاسکتا ہے۔ جب کہ جھنڈا نیچے پھینک دیا جائے۔ یا کسی اور کو دے دیا جائے یا تلوار ہاتھ  
سے گرا دی جائے۔ ہمارے نزدیک ان تمام صورتوں میں یہ حضرت علیؑ کی تعریف نہ ہوگی۔ بلکہ  
خالص تذلیل ہوگی۔ کیونکہ جب ان کے ہاتھ میں جھنڈا دیا گیا تو کسی اور کو دینا۔ یہ حضور کے حکم اور  
آپ کی عطائی تذلیل ہے اور تلوار کو خود سے جدا کر دینا بھی موقع کی نزاکت کے تحت درست نہ تھا۔ ان  
روایات سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ داستانیں تیار کی ہیں۔ انہوں نے کبھی ہاتھ  
میں تلوار نہیں اٹھائی تھی، اور زندگی میں کبھی میدانِ کارزار نہیں دیکھا تھا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یقیناً  
ان داستان گوؤں کا مقصد تو بین اسلام اور حضرت علیؑ کو بدنام کرنا ہے۔ ایسے لوگ حضرت  
علیؑ کے ناداں دوست ہیں۔ اپنی حماقتوں سے انہیں بدنام کر رہے ہیں۔

۲۔ فضول میں اتنے بڑے دروازے کو سپر نایا۔ اسے اٹھا کر دشمنوں پر بھینک دیتے۔

ہزاروں کا صفایا ہو جانا اور زیادہ نام روشن ہوتا۔ اب ان سبائیوں کو اسی قسم کی داستانیں سن کر فی چاہئیں۔

۳۔ اتنا بڑا دروازہ اٹھانے کے بعد انسان نہ خود لڑ سکتا ہے اور نہ دوسرا اس پر حملہ کر سکتا ہے۔ پھر حضرت علیؓ تو پستہ قد تھے۔ دروازہ اٹھالینے کے بعد ان کا منظر بھی نہ آتے ہوں گے۔ کیا ان سبائیوں کا یہ مقصد تو نہیں کہ حضرت علیؓ اپنی جان بچانے کی فکر نہ کر سکتے تھے؟ ہم جنگ قلعے سے باہر لڑی جا رہی تھی۔ اور ایسی صورت میں جب کوئی لشکر پسا ہوتا ہے، اور قلعہ میں محفوظ ہونا چاہتا ہے تو اس کے لئے قلعہ کے دروازے کھولے جاتے ہیں اور فریق مخالف کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ خود دروازے پر قابض ہو جائے۔ تاکہ دشمن قلعہ بند نہ ہو سکے۔ ظاہر ہے یہاں بھی یہی صورت پیش آئی ہوگی۔ اور صحابہ کرام نے دروازے پر حملہ کیا ہوگا۔ رہا حضرت علیؓ کا مسئلہ وہ ہرگز بھی اپنے ہاتھ سے حل نہیں چھوڑ سکتے تھے۔ اور نہ تلوار چھوڑنے کی چیز تھی۔ ایسی صورت میں وہ کیا کارنامہ ہے جو حضرت علیؓ نے انجام دیا؟ اب دانا پوری صاحب اپنی پوری تحریر کا نتیجہ بیان کرتے ہیں۔ وہ بھی ان ہی کی زبان میں لکھے۔

لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس قلعہ کو حضرت علیؓ نے فتح کیا اور اس کے فتح ہو جانے کے بعد یہودیوں کو جم کر بال مقابل لڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اس لئے حضرت علیؓ فاتح خیبر کے نام سے مشہور ہیں۔ (اصح السیرۃ ۲۴)

ہمارے سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیسے ثابت ہو گیا کہ حضرت علیؓ فاتح خیبر ہیں۔ کیونکہ حکیم ماکہ کے نزدیک دروازہ اکھاڑنے کی روایات وہی اور رجب کے قاتل محمد بن مسلمہؓ ہیں۔ اور ان کے نزدیک یہ آخری قلعہ ہے۔ آخر وہ کون سی دلیل ہے۔ جس سے حضرت علیؓ فاتح خیبر قرار پائیں۔ کیونکہ خیبر کے قلعے دیگر صحابہ نے فتح کئے تھے۔ انہیں فاتح قلعوں تو کہا جاسکتا ہے لیکن

فاتح خیبر کہنا ایسی ہی حماقت ہے جیسے کوئی کا نذر کسی ملک غیر کے صرف کسی قصبہ پر قبضہ کر لے اور اسے اس ملک کا فاتح کہا جانے لگے۔ جب کہ دیگر علاقوں پر دوسرے کا نذر لے نے قبضہ کیا ہو۔ جہاں یہ جھوٹ ہے وہاں دیگر کا نذر لے کر غلطی بھی ہے۔ اسی لئے ہمارے نزدیک فاتح خیبر کی اصطلاح ایک مخفی تہرا ہے۔

رہا یہ دعویٰ کہ پھر یہودیوں کو لڑنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ تو جناب اس کے بعد تو یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے اور حضور سے یہ درخواست کی تھی کہ ہمیں ملک بدر نہ کیا جائے۔ ہماری زمینوں پر جتنی پیداوار ہوگی۔ اس کا نصف ہم آپ کو دیا کریں گے۔ اس شرط پر آپ نے یہودیوں کو خیبر میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اور ہر سال حضرت عبداللہ بن رواحہ اور حضرت بلالؓ خیبر جاتے اور نصف پیداوار وصول کر کے لاتے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ تک۔ اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔

اب ہم علامہ شبلی مرحوم کی سیرت النبی سے فتح خیبر کا حال پیش کرتے ہیں۔ شبلی لکھتے ہیں۔ سب سے پہلے قلعہ نام پر فوجیں بڑھیں۔ حضرت محمدؐ بن مسلمہ نے بڑی دلیری سے حملہ کیا۔ اور دیر تک لڑتے رہے۔ لیکن چونکہ سخت گری تھی۔ تھک کر دم لینے کے لئے قلعہ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ گئے۔ کنانہ بن الریح نے قلعہ کی فصیل سے چکی کا پاٹ اُن کے سر پر گرایا۔ جس کے صدمہ سے اُن کی وفات ہوئی۔ لیکن قلعہ بہت جلد فتح ہو گیا۔

نام کے بعد اور قلعے بآسانی فتح ہوتے گئے۔ لیکن قلعہ قموص مرحب کا تخت گاہ تھا۔ اس مہم پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کو بھی بھیجا۔ لیکن دونوں نا کام واپس آئے۔

طبری میں روایت ہے کہ جب خیبری قلعہ سے نکلے تو حضرت عمرؓ کے پاؤں نہجم گئے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی کہ فوج نے نامردی دکھائی لیکن فوج نے خود ان کی نسبت یہی شکایت کی۔

اس روایت کو طبری نے جس سلسلہ سند سے نقل کیا ہے۔ اس کے راوی عوف ہیں۔  
 اُن کو بہت سے لوگوں نے ثقہ کہا ہے لیکن مُبْدَار جب ان کی روایت بیان کرتے تھے تو کہتے  
 تھے کہ وہ رافضی اور شیطان تھا۔ یہ لفظ بہت سخت ہے لیکن اُن کی شیعیت سب کو تسلیم ہے۔  
 گوشیعہ ہونا بے اعتباری کی دلیل نہیں۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ جس روایت میں حضرت عمرؓ کے بھانگنے  
 کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے شیعہ کی زبان سے اُس روایت کا کیا رتبہ رہ جاتا ہے۔ اس کے علاوہ  
 اوپر کے راوی عبداللہ بن بریدہ ہیں جو اپنے والد سے روایت کرتے ہیں۔ لیکن محدثین کو اس  
 بات میں شبہ ہے کہ اُن کی جو روایتیں باپ کے سلسلے سے منقول ہیں۔ صحیح بھی ہیں یا نہیں۔  
 سیرت النبی ص ۲۸۵ ج ۱

عوف کو اگرچہ محدثین کی ایک جماعت نے ثقہ کہا ہے۔ اور اسی باعث صحاح ستہ  
 کے تمام مصنفین نے اس سے روایات لی ہیں۔ لیکن یہ اعلیٰ درجہ کے ثقہ ہرگز نہیں سمجھے جاتے  
 بلکہ کام چلاؤ آدمی ہیں۔ ان کی روایت بطور شہادت تو پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن حجت ہرگز  
 نہیں ہو سکتی۔ امام مسلم اپنی صحیح کے مقدمہ میں فرماتے ہیں کہ جب ابن عون اور ایوب کا تقابل  
 عوف بن ابی حمیلہ اور اشعث الحمرانی کے ساتھ کیا جائے، حالانکہ یہ چاروں حسن بصری کے  
 شاگرد ہیں۔ لیکن ان چاروں میں بن فرق نظر آئے گا۔ عوف اور اشعث کو اگرچہ جھوٹا تو نہیں  
 کہا جاسکتا لیکن روایت کو صحیح طور پر نقل کرنے اور علم و فضل میں ابن عون اور ایوب سے بہت  
 کم ہیں۔

محمد بن عبداللہ الانصاری کا بیان ہے کہ میں نے داؤد بن ابی ہند کو دیکھا کہ وہ اس  
 عوف کو مار رہے تھے اور کہہ رہے تھے اے منکر تقدیر۔

محمد بن عمر المقدسی کہتے ہیں کہ میرے سامنے ایک روز امام ابن المبارک نے جعفر بن  
 سلیمان سے سوال کیا کہ تو نے ابن عون، ایوب اور یونس کو دیکھا ہے۔ لیکن تو نے انہیں جھوٹ  
 کر عوف کی مجلس اختیار کی۔ اللہ کی قسم وہ صرف ایک بدعت پر راضی نہیں ہوتا۔ اُس میں

تو دو بدعتیں جمع ہیں۔ شیعہ ہے اور منکر تقدیر ہے۔ میزان الاعتدال صفحہ ۲۰۵ ج ۲  
شبلی آگے لکھتے ہیں۔

تاہم اس قدر ضرور ہے کہ اس ہم پر پہلے اور بڑے بڑے صحابہ بھیجے گئے۔ لیکن فتح کافر  
کسی اور کی قسمت میں نہ تھا۔ جب ہم میں زیادہ دیر ہوئی تو ایک دن شام کو آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ کل میں اس شخص کو علم دوں گا جس کے ہاتھ پر اللہ فتح دے گا اور  
جو اللہ کے رسول کو چاہتا ہے اور اللہ اور اس کا رسول بھی اس کو چاہتے ہیں۔

یہ اہم نہایت اُمید اور انتظار کی رات تھی۔ صحابہ نے تمام رات اس بے قراری میں کاٹی  
کہ دیکھئے یہ تلخ فخر کس کے ہاتھ آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے قناعت پسندی اور بلند نظری کی بنا  
پر کبھی حکومت اور سرداری کی تمنا نہیں کی تھی۔ لیکن جیسا کہ صحیح مسلم باب فضائل علیؓ میں مذکور  
ہے، اُن کو خود اعتراف ہے کہ اس موقع کی تمنائیں اُن کی خود داری بھی قائم نہ رہ سکی۔

صبح کو یہ آواز دفعۃً کانوں میں آئی کہ علیؓ کہل ہیں! یہ بالکل غیر متوقع آواز تھی۔ کیونکہ  
جناب موصوف کی آنکھوں میں آشوب تھا اور سب کو معلوم تھا کہ وہ جنگ سے معذور  
ہیں۔ غرض حسب طلب وہ حاضر ہوئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھوں  
میں اپنا لعاب دہن لگایا اور دُعا فرمائی۔ جب ان کو علم عنایت ہوا تو انہوں نے عرض کی کہ  
کیا یہود کو لڑ کر مسلمان بنالوں، ارشاد ہوا کہ بے نرمی اُن پر اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمہاری  
ہدایت سے اسلام لے آئے تو وہ سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔

لیکن یہود اسلام یا صلح قبول کرنے پر ماضی نہ ہو سکتے تھے۔ مرحب قلعہ سے یہ جز  
پڑھتا ہوا نکلا۔

قد علمت خیبر ابی مرحب شاکل السلاح بطل مجرب

مرحب کے سر پر مینی زرد رنگ کا مغر اور اس کے اوپر سبکی خود تھا۔ قدیم زمانے  
میں گول پتھریز سے خالی کر لیتے تھے۔ یہی خود کہلاتا تھا۔ (غالباً شبلی کو پتھر کا دور یاد آگیا)



مرحب کے جواب میں حضرت علیؑ نے یہ رجز پڑھا۔

انا الذي سعتني امي حيدرہ کلیث غابات كریه المنظره

مرحب بڑے طمطراق سے آیا۔ لیکن حضرت علیؑ نے اس زور سے تلوار ماری کہ سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی اور حضرت کی آواز فوج تک پہنچی۔ طبری ص ۱۵۹۔ پہلوان کا مارا جانا عظیم الشان واقعہ تھا۔ اس لئے عجائب پسندی نے اس کے متعلق نہایت مبالغہ آمیز افواہیں پھیلا دیں۔ معالم التنزیل میں ہے کہ حضرت علیؑ نے جب تلوار ماری تو مرحب نے سپر پر روکا۔ لیکن ذوالفقار سپر خود اور سر کو کاٹتی ہوئی۔ دانتوں تک اتر آئی۔ (شاید طبری اور بغوی کو اس کا علم نہ تھا کہ تلوار پتھر کو نہیں کاٹ سکتی۔ ورنہ شاید کوئی اور ہی داستان بیان کرتے) مرحب کے مارے جانے پر یہود نے جب عام حملہ کیا۔ تو اتفاق سے حضرت علیؑ کے ہاتھ سے سپر گر گئی۔ آپؑ نے قلعہ کا درجہ ستر پائسنگ تھا۔ لکھاڑ کر اس سے سپر کاٹ لیا۔ اس واقعہ کے بعد البوراخ نے سات آدمیوں کے ساتھ مل کر اس کو اٹھانا پاجا تو اپنی جگہ سے بھی نہ ہل سکا۔ یہ روایتیں محمد بن اسحاق اور حاکم نے بیان کی ہیں۔ لیکن یہ بازاری قصے ہیں۔ علامہ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں تصریح کی ہے کلمہ واہیۃ۔ یہ سب بغور روایتیں ہیں۔ علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال میں علی بن احمد بن فروخ کے حال میں اس روایت کو نقل کر کے لکھا ہے کہ یہ روایت منکوبہ۔ سیرت النبی

اس میں صرف یہی ایک کز حدی نہیں۔ بلکہ اس کے متعدد راوی ناقابل اعتبار ہیں۔ اور اس روایت میں یہ ہے کہ چالینس آدمی بھی اس دروازے کو نہ ہلا سکے تھے۔ یہ روایت طبری کی ہے۔ اس میں علی بن احمد کے علاوہ بنت بن ابی سلیم ضعیف اور اسمعیل بن موسیٰ القزازی رافضی ہے۔ اور سب سے اہم لطیفہ یہ ہے کہ طبری نے یہ روایت ان الفاظ میں نقل کی ہے۔

حدثني اسمعيل بن محمد عن اسمعيل بن موسى الضراري

موسیٰ الضراری۔ نے حدیث بیان کی۔

شبلی اگے لکھتے ہیں۔

ابن ہشام نے جن سلسلوں سے یہ روایتیں نقل کی ہیں ان میں سے ایک روایت میں تویح کے ایک راوی کا نام چھوڑ دیا اور دوسرے میں شترک نقص کے ساتھ بریدہ بن سفیان بھی ایک راوی ہیں۔ جن کو امام بخاری، ابو داؤد، اور دارقطنی قابل اعتبار نہیں سمجھتے۔ میزان الاعتدال ترجمہ بریدہ بن سفیان۔

محمد بن اسحاق، موسى بن عقبہ اور واقدي کا بیان ہے کہ مُرحَب کو محمد بن سلمہ نے مارا تھا۔ مسند احمد بن حنبل اور نودی کی شرح میں بھی ایک روایت یہی ہے لیکن صحیح مسلم اور حاکم مسند ج ۲ میں حضرت علیؓ ہی کو مرحَب کا قاتل اور فاتح خیبر لکھا ہے۔ اور یہی اصح الروایات ہے۔ سیرت البیہ مسند ج ۱۔

اس وقت ہمارے دو برو صحیح مسلم کھلی ہوئی موجود ہے۔ لیکن اس میں فاتح خیبر کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ بلکہ جس قطعہ کے لئے حضرت علیؓ کو جہنم دیا گیا تھا اس کی فتح کا ذکر ہے۔ ہم یہ حدیث خود قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے۔

اب آئے حکیم فیض عظم مرحوم کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ لکھتے ہیں۔

فتح خیبر کے متعلق حضرت علیؓ کا ذکر اس طرح کیا جاتا ہے گویا آپ ہی فاتح خیبر ہیں۔ یہاں اس امر کو ملحوظ رکھیے کہ خیبر میں اسلامی فرج کے کمانڈر خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور یہ بات مسلمات میں ہے کہ کسی جنگ میں کوئی شخص کتنی ہی بہادری یا جواں مردی کا ثبوت کیوں نہ دے، کامیابی کا سہرا کمانڈر ہی کے سر ہوتا ہے جو جنگ کا نقشہ مرتب کرتا، حملے اور دفاع کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ (مثلاً جنگ قادسیہ کا اس کا سہرا آج تک حضرت سود کے سر پر بندھا ہوا ہے۔ جسے اپنے اور دشمن سب قبول کرتے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اپنی بیاری کی وجہ سے اس جنگ میں قطعاً حصہ نہ لیا تھا)۔

اب فتح خیبر کی تفصیل بھی سنئے۔

خیبر کے کل دس قلعے تھے۔ سات ایک دائرہ کے اندر اور تین تین الگ الگ تھے۔  
 نو قلعے مختلف صحابہ کے ہاتھ پر فتح ہوئے۔ جن میں سے حضرت عمرؓ، حضرت سعد بن عبادہ  
 حضرت محمد بن مسلمہ اور حضرت خبابؓ بن المنذر خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔  
 محمد بن مسلمہ نے ہی قلعہ تموص کے یہودی پہلوان مرحب کو قتل کیا۔ (طبری ص ۹۲ ج ۲۔  
 سیرت ابن ہشام ص ۴۶) مگر محمد قلعہ فتح نہ کر سکے۔ قلعہ تموص تین قلعہ جات کے سلسلے میں واقع  
 تھا۔ ان میں سے ایک حضرت ابو بکرؓ کے زیرِ کمان اور دوسرا حضرت عمرؓ کی زیرِ کمان فتح ہوا۔  
 (سیرت ابن ہشام عربی ص ۱۴۵)

جس روایت میں قلعہ تموص کا فتح ہونا حضرت علیؓ کی طرف منسوب ہے وہ بریدہ بن  
 سفیان کی روایت ہے۔ اور بریدہ کو امام بخاری نے ساقط الاعتبار کہا ہے۔ اور اس سے  
 کوئی روایت نہیں لی۔

روایات سے قطع نظر روایت کے طور پر بھی جائزہ لیا جائے تو اس زمانہ کی لڑائیوں  
 کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قلعہ کا دروازہ توڑنا ہی قلعہ کو فتح کرنا ہوتا تھا۔ محصورین  
 کسی حملہ آور کو دروازے کے قریب پھٹکنے نہیں دیتے تھے اور جب دروازے کی ڈھال بن  
 گئی تو لڑائی کا کیا سوال۔ حقیقت مغرب شیعہ ص ۱۶۲

ان تمام مفسنین نے یہ بات تسلیم کی ہے کہ جس روایت میں یہ تذکرہ ہے کہ قلعہ تموص کے  
 حضرت علیؓ فاتح ہیں وہ صرف بریدہ سے مروی ہے۔ بخاری کہتے ہیں اس کی روایت پر  
 اعتراض ہے۔ البوداد کہتے ہیں یہ کچھ نہیں۔ یہ حضرت عثمانؓ پر اعتراضات کیا کرتا تھا۔ دلائی  
 کہتے ہیں یہ ستر وک الحدیث ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ شراب پیا کرتا تھا۔ میزان ص ۲۰۶  
 گویا یہ روایت اس بریدہ دشمن عثمانؓ نے شراب کے نشہ میں تیار کی۔ حضرت ابو بکرؓ  
 عمرؓ کی ناکامی کا ذکر بھی اسی کی روایت میں ہے۔

اب ہم احادیث کی جانب آتے ہیں، اور وہ احادیث پیش کرنا چاہتے ہیں جو غزوہ خیبر

کے بارے میں حضرت علیؓ کے سلسلے میں وارد ہوئی ہیں۔ ہم یہ احادیث بخاری و مسلم سے پیش کرتے ہیں۔ سب سے اول حضرت سلمہ بن اکوع کی حدیث ملاحظہ فرمائیں۔ حضرت سلمہؓ کا بیان ہے۔

کہ علیؓ خیر کے موقع پر پیچھے رہ گئے تھے۔ کیونکہ ان کی آنکھیں دکھنے آرہی تھیں۔ پھل نہروں نے دل میں سوچا کہ میں کیوں حضورؐ سے پیچھے رہوں۔ لہذا وہ حضورؐ کے ساتھ اسی حال میں بھی اگر لشکر میں شامل ہو گئے۔ جب وہ رات آئی جس کی صبح فتح ہوئی۔ تو حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ میں کل ایسے شخص کو رایہ دوں گا۔ جس سے اللہ اور اس کا رسول محبت کرتا ہوگا۔ ہم اس کی امید لے بیٹھے تھے۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رایہ حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا۔ اور ان ہی کے ہاتھ پر فتح ہوئی۔ بخاری ۵۱۵ ج ۱۔ مسلم ۶۷۵ ج ۲۔

اس حدیث میں یہ کہیں تذکرہ نہیں کہ یہ قلعہ کون سا تھا۔ نہ مرحب کے قتل کا ذکر ہے۔ نہ دروازہ اکھاڑنے کا اور نہ حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ کے فرار کا۔ ہاں اس سے چند امور ضرور ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ حضرت علیؓ کے بارے میں اللہ اور اس کے رسول کی رضا کا اعلان۔

۲۔ حضرت علیؓ کو رایہ دھوٹا جھنڈا دینا۔

۳۔ اس رایہ کے لئے لوگوں کی تمنا کرنا۔

۴۔ اُس روز فتح حضرت علیؓ کی علمبرداری میں حاصل ہوئی۔

۵۔ مدینہ سے حضرت علیؓ آنکھوں کی تکلیف کے باعث ساتھ نہ آئے تھے۔ لیکن بعد

میں لشکر گاہ میں پہنچ گئے۔

اب حضرت سہیل بن سعد انصاری کی حدیث ملاحظہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیر کے روز فرمایا۔ میں کل ایک ایسے شخص کو رایہ دوں

گا۔ جس کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ فتح عطا فرمائے گا۔ وہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا

ہوگا۔ اور اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت رکھتا ہوگا۔ رات بھر لوگ یہ سوچتے رہے کہ نہ

معلوم حضور یہ کیا کس کو عنایت فرمائیں گے۔ جب صبح ہوئی تو سب کے سب حضور کی خدمت میں اس امید کے ساتھ حاضر ہوئے کہ اسے یہ راہ عطا کیا جائے گا آپ نے دریافت کیا علیؑ کہاں ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا ان کی آنکھیں دکھ رہی ہیں۔ فرمایا ان کو بلاؤ۔ جب وہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی آنکھ میں لعاب دہن لگایا اور دعا فرمائی جس سے اُن کی آنکھیں بالکل صحیح ہو گئیں۔ اور انہیں کوئی تکلیف باقی نہیں رہی۔ حصہ نے انہیں راہ دیا۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا میں اُن سے اس دقت تک جنگ کر دوں۔ جب تک وہ ہمارے مثل نہ ہو جائیں (یعنی مسلمان) آپ نے فرمایا۔ آگے بڑھو، جب اُن کی سر زمین میں پہنچو تو انہیں اسلام کی دعوت دو، اور انہیں بتاؤ کہ ان پر اللہ کا کیا حق ہے۔ اللہ کی قسم اگر تیرے ذریعہ ایک شخص بھی ہدایت پا جائے تو تیرے لئے سرخ اونٹوں سے بہتر ہوگا۔ بخاری مش ۹ ج ۲۔ ۵۲۵ ج ۱۔ مُسلم ۲۶۹ ج ۲۔

اس حدیث میں صرف چند ہی باتیں سامنے آئی ہیں۔ بقیہ امور مری میں جو پہلی حدیث میں تھے۔

۱۔ حضرت علیؑ کی آنکھوں کا حضور کے لعاب دہن سے اچھا ہونا۔

۲۔ جنگ کے سلسلے میں ہدایت۔

بقیہ امور سے یہ حدیث بھی خاموش ہے۔

یہ تو وہ احادیث ہیں جو بخاری و مسلم دونوں میں پائی جاتی ہیں۔ اب اُن احادیث کو دیکھتے جو صرف مسلم میں پائی جاتی ہیں۔

تیسری حدیث حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے۔ اُن کی حدیث کے الفاظ ہیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے روزِ شاد فرمایا۔ میں یہ راہ ایک ایسے شخص کو

دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت رکھتا ہوگا۔ اور اللہ اور اس کا رسول اس سے

محبت رکھتا ہوگا۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں مجھے کبھی امارت سے محبت نہیں رہی۔ لیکن

اُس روز میں بھی آرزوئے بیٹھا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؑ کو بلوایا۔ اور انہیں

وہ راہ عطا کیا اور ارشاد فرمایا۔ آگے بڑھتے جاؤ اور اس وقت تک پیچھے مڑ کر نہ دیکھنا جب تک اللہ فتح عنایت نہ کر دے۔ پھر حضرت علیؑ نے کچھ خاموشی سے گفتگو کی۔ پھر اپنے مقام پر آکر ٹہرے

اور پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ پھر وہیں کھڑے کھڑے چلا کر ریافت کیا۔  
بات پر جنگ کروں۔ آپؐ نے فرمایا انہیں اللہ کی وحدانیت اور محمدؐ رسول کی رسالت کی دعوت دو۔ اگر وہ ایسے قبول کر لیں تو انہوں نے اپنے خمنوں اور اپنے مالوں کو محفوظ کر لیا۔ اب یہ چیزیں شرعی حق کے ساتھ ہی حلال ہو سکتی ہیں۔ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔ مسلم ص ۲۹۹ ج ۲۔  
اس حدیث میں متعدد امور ایسے بیان کئے گئے ہیں جو پہلی احادیث میں قطعاً نہ پائے جاتے۔

امام مسلم نے اس روایت کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ اور وہ اس روایت سے صرف اتنی بات ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ حضورؐ نے حضرت علیؑ کو خیر کے روز راہ عنایت کیا۔ ان کی آنکھوں میں لعاب وہن لگایا اور ان کے ہاتھ پر فتح ہوئی۔ وہ اصل روایت ہم بعد میں پیش کریں گے۔ لیکن یہ وہ روایت ہے جس کے باعث شبلی نے یہ لکھا ہے کہ اُس روز حضرت عمرؓ کی خوداری بھی قائم نہیں رہی۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ روایت کوئی اعلیٰ پیمانے کی نہیں ہے جس کی تین وجوہات ہیں۔

۱۔ امام مسلم نے مقدمہ میں خود یہ دعویٰ کیا ہے کہ میں بطور شہادت ایسے راویوں کی روایات بھی پیش کروں گا۔ جو حفظ حدیث میں اعلیٰ درجہ کے نہ ہوں گے۔

۲۔ اس روایت کا ایک راوی سہیل بن ابی صالح ہے۔ اگرچہ یہ ثقہ ہے۔ لیکن بعض محدثین کو اس کے حافظہ کے باعث اس پر اعتراض ہے۔ اسی لئے بخاری نے ان سے کوئی روایت نہیں لی۔ امام ذہبی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا شمار ثقہ علماء میں ہوتا ہے۔ لیکن دیگر افراد ان سے بہتر ہیں۔

عباس دوسری نے یحییٰ بن معین سے نقل کیا ہے۔ یہ حدیث میں قوی نہیں۔ ایک بازنطانی اس کی حدیث حجت نہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں اس کی حدیث اچھی ہوتی ہے۔ ذہبی کہتے ہیں اس سے امام مالکؒ اور امام شعبہؒ نے بھی روایات لی ہیں۔ لیکن بعد میں یہ بیمار ہوا۔ جس

کی وجہ سے کچھ احادیث بھول گیا۔ علی بن الدین کا بیان ہے کہ اس سہیل کا ایک بھائی مر گیا تھا۔ جس کا اس پر اتنا غم پڑا کہ یہ بہت سی احادیث بھول گیا۔ ابن ابی خثیمہ نے یحییٰ بن معین سے یہ نقل کیا ہے کہ محدثین ہمیشہ اس کی حدیث سے پختے رہے۔ ایک بار فرمایا یہ کچھ نہیں ہے ایسا مالک نے اس سے جو روایات لی ہیں وہ اس کے مرض سے پہلے لی ہیں۔ حاکم کا بیان ہے کہ امام مسلم نے اس سے بہت سی روایتیں نقل کی ہیں۔ جن میں سے اکثر بطور شہادت ہیں۔

۳۔ حضرت ابو ہریرہؓ جنگ خیبر کے بعد ایمان لائے ہیں۔ وہ اس واقعہ کے شاہد نہیں۔ لہذا اس حدیث میں جتنی نئی باتیں آئی ہیں وہ قطعاً قابل قبول نہیں۔ مثلاً حضرت عمرؓ کی علمبرداری کی تمنا۔ پیچھے ٹکر زد دیکھنا۔ چلا کر حضورؐ سے گفتگو کرنا اور خاموشی سے مازو نیاز کی باتیں کرنا یہ تمام امور دلیل طلب ہیں اور یہ روایت خود دلیل نہیں بن سکتی۔

اب ایک اور حدیث کی جانب آئیے جو حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے مروی ہے۔ وہ حضرت علیؓ کی فضیلت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

میں نے خیبر کی جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ میں کل ایک ایسے شخص کو رایہ دوں گا کہ جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو گا۔ اور اللہ اس کے رسول کو بھی اس سے محبت ہوگی۔ سعدؓ کہتے ہیں ہمیں اس رایہ کی آرزو تھی۔ آپؐ نے فرمایا علیؓ کو بلاؤ۔ انہیں لایا گیا ان کی آنکھیں دکھ رہی تھیں۔ آپؐ نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا جس سے وہ اچھی ہو گئیں۔ پھر انہیں رایہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح عنایت فرمائی۔

مسلم ج ۲ ص ۲۷۸۔

گویا حسب ذیل امور تو متفق علیہ ہوئے۔

۱۔ خیبر کی کسی جنگ میں حضرت علیؓ کو رایہ دیا گیا اور حضرت علیؓ کے ہاتھ پر فتح ہوئی۔ لیکن یہ کسی حدیث میں نہیں کہ یہ کون سا قلعہ تھا۔

۲۔ حضرت علیؓ کو رایہ دیا گیا اور ہونا بھی یہی چاہیے تھا۔ کیونکہ علم تو حضورؐ کے پاس تھا۔

۳۔ پہلے ہی سے اللہ اور اس کے رسول کی محبت کا اعلان کیا گیا۔ جس کی وجہ سے ہر شخص کو رایہ کی تمنا تھی۔

۴۔ حضرت علیؓ کی آنکھیں دکھ رہی تھیں جو حضور کے لعاب دہن لگانے سے ابھی ہو گئیں۔  
۵۔ اس روز دو معجزے ظاہر ہوئے۔ حضرت علیؓ کی نگاہوں کا اچھا ہونا اور فتح حاصل ہونا۔  
بقیہ امور کا ان احادیث میں کوئی تذکرہ نہیں۔

اب صرف ایک حدیث باقی رہ گئی ہے۔ جو حضرت سلمہ بن الاکوعؓ سے سلم میں مروی ہے۔ حضرت سلمہؓ کی ایک حدیث تو بخاری و مسلم کے حوالہ سے پہلے گزر چکی ہے۔ جو بیت مختصر تھی۔ جسے حضرت سلمہؓ سے اُن کے شاگرد یزید بن عبید نے نقل کیا تھا۔ لیکن اُن سے اُن کے صاحبزادے ایاس نے ایک تفصیلی روایت نقل کی ہے۔ جس میں حضرت سلمہؓ نے پہلے بنو فزارة سے اپنی جنگ کا حال بیان کیا ہے۔ پھر عاتر بن الاکوعؓ کا مرحب سے مقابلہ کا تذکرہ کیا اور عامر کی شہادت کا تذکرہ کیا ہے۔ پھر اس کے بعد فرماتے ہیں۔

بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ کو لانے کے لئے مجھے روانہ کیا۔ اور فرمایا میں ایسے شخص کو رایہ دوں گا جو اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہو گا اور اللہ اور اس کے رسول کو بھی اُس سے محبت ہوگی۔ سلمہؓ کہتے ہیں میں علیؓ کو لے کر آیا اور میں انہیں سہارا دے کر لے کر آیا۔ جب میں انہیں لے کر حضورؐ کی خدمت میں پہنچا تو آپؐ نے اُن کی آنکھوں میں لعاب دہن لگایا۔ جس سے ان کی آنکھیں ابھی ہو گئیں۔ آپؐ نے ان کو رایہ دیا۔ اتنے میں مرحب یہ اشعار پڑھتا ہوا نکلا۔

قد علمت خیبہ الیٰ مرحب      شاکلی اسلاح بطل بحرب

خبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، ہتھیار بند اور تجربہ کار بہادر ہوں۔  
جس کے جواب میں حضرت علیؓ یہ رجز پڑھتے ہوئے نکلے۔



انا الذی سمعتنی امی حیدرہ کلیت غابات کربہ المنطوہ  
 میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے میں جنگل کے خوفناک شیر کی طرح ہوں  
 پھر حضرت علیؓ نے مرحب کے سر پر وار کیا۔ اور اسے قتل کر دیا۔ اور ان کے ہاتھ پر فتح  
 حاصل ہوئی۔

اس حدیث میں صرف تین بات مرحب کا قتل ہے بقیہ امور وہی ہیں۔  
 ان تمام احادیث پر غور کیجیے ان میں آپ کو کہیں قلعہ کا دروازہ اکھاڑنے اور اسے سپرنا  
 کا ذکر نہیں ملے گا۔ نہ آپ کو ابو بکرؓ و عمرؓ کی نالامی نظر آئے گی۔ صرف حضور کے معجزات نظر آئیں  
 گے۔ اگر انہیں درمیان سے نکال دیا جائے تو حضرت علیؓ کے لئے تین خوبیاں ثابت ہوتی ہیں  
 آپ کی آنکھوں کا اچھا ہونا۔ اللہ اور اس کے رسول کا آپ سے راضی ہونا اور آپ کو ریاہ مننا اور  
 کامیابی حاصل ہونا۔ یہ امور تو متفقہ ہیں۔ رہا مرحب کا قتل تو اس میں اختلاف ہے۔

اس حدیث سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مرحب کے قاتل حضرت علیؓ ہیں۔ لیکن دوسری جگہ  
 تمام مورخین۔ مثلاً موسیٰ بن عقبہ، محمد بن اسحاق۔ مجمع بن حارثہ، سلمہ بن سلامہ، وادی ابن  
 ہشام۔ طبری۔ امام زہری اور حضرت جابر بن عبد اللہ انصاری اس کے دعویدار ہیں کہ مرحب  
 کو حضرت محمد بن مسلمہ نے قتل کیا۔

حضرت جابرؓ کی روایت موسیٰ بن عقبہ نے زہری اور ابوالاسود کے ذریعہ حضرت جابرؓ  
 سے نقل کی ہے۔ حضرت جابرؓ خود شریک جنگ تھے۔ بقیہ تمام راوی بھی نہایت معتبر ہیں لیکن  
 ہمارے نزدیک یہاں دو مشکلات درپیش ہیں۔

۱۔ موسیٰ بن عقبہ کی کتاب کا آج دنیا میں کوئی وجود نہیں۔ پہلے علماء نے ان کی اس روایت  
 کے حوالہ دئے ہیں۔

۲۔ ان حوالوں پر اس وقت تک اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ جب تک نیچے کی سند بیان  
 نہ کی جائے اور یہ ثابت نہ کیا جائے کہ موسیٰ بن عقبہؓ جتنے راوی ہیں سب ثقہ اور متبرکین اور

جب تک اس کا ثبوت دستیاب نہیں ہوتا اس وقت تک اس روایت کی کوئی پوزیشن نہیں ہے۔  
محمد بن اسحاق یا واقدی تو ان کا تفصیلی حال ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

رہی یہ حدیث جو حضرت سلمہؓ سے مروی ہے جس میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ مرحب کو حضرت  
علیؓ نے قتل کیا۔ اس میں بھی کچھ اشکالات ہیں۔

۱۔ بقیہ احادیث جو ہم نے پیش کیں ان میں اس واقعہ کا نہیں تذکرہ نہیں۔

۲۔ سلمہؓ سے حضرت علیؓ کو آلے معاملے کو دو شخصوں نے قتل کیا ہے۔ ایک یزید بن ابی عبیدہ

اور دوسرے ان کے صاحبزادے ایاس نے۔ یزید مرحب کے قتل کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ صرف  
ایاس ذکر کرتے ہیں۔ ایاس سے اسے قتل کرنے والا عکرمہ بن عمار ہے۔ کوئی اور نقل نہیں کرتا  
گویا اس روایت کا تمام دار و مدار اس پر موقوف ہے کہ ایاس بن سلمہ اور عکرمہ بن عمار کسی حیثیت  
کے لوگ ہیں۔ ایاس تو سلمہؓ کے صاحبزادے ہیں اور تمام محدثین نے انہیں ثقہ اور امام مانا ہے۔ اب  
صرف عکرمہ بن عمار کی ذات کو دیکھنا ہے۔

۳۔ عکرمہ بن عمار یا مہر کا باشندہ تھا۔ قبیلہ بنو عجل سے تعلق رکھتا تھا۔ یحییٰ بن معین فرماتے  
ہیں۔ اگرچہ امی تھا لیکن حافظ الحدیث تھا۔ یعقوب بن شیبہ کا بیان ہے کہ ہم سے متعدد افراد نے یحییٰ  
بن معین کا یہ قول نقل کیا ہے کہ عکرمہ ثقہ ہے۔ حدیث میں ثابت ہے۔ ابو حاتم کہتے ہیں سچا ہے لیکن کبھی  
کبھی دہم کا شکار ہو جاتا ہے۔ عاصم بن علی کہتے ہیں یہ ستجاب الدعوات تھا۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے  
ہیں۔ اس کی وہ روایات ضعیف ہوتی ہیں جنہیں یہ یحییٰ بن ابی کثیر سے نقل کرتا ہے۔ امام احمد فرماتے  
ہیں۔ یہ ضعیف الحدیث ہے۔ لیکن اس کی وہ حدیث اچھی ہوتی ہے جو ایاس سے نقل کرتا ہے۔

(یہ حدیث بھی اس نے ایاس ہی سے نقل کی ہے)۔ علی بن الدینی فرماتے ہیں عکرمہ تو ہمارے نزدیک  
ثقہ ہے اور سلمہ امام ہے۔ حاکم کہتے ہیں کہ مسلم نے اس سے بطور شہادت متعدد احادیث نقل کی ہیں۔

بخاری کہتے ہیں اس کی وہ روایات ضعیف ہیں جو یہ یحییٰ بن ابی کثیر سے نقل کرتا ہے۔ امام احمد  
فرماتے ہیں اس کی یحییٰ والی روایات کمزور ہیں۔ میزان الاعتدال ص ۹ ج ۲

حاصل کلام یہ ہے کہ عکرمہ بن عمار کی صرف وہ روایات قابل قبول ہیں جو یہ بن ابی  
 کثیر سے نقل کرتا ہے۔ بقیہ اس کی یہ انتہائی معتبر ہوتی ہیں اور امام احمد کے نزدیک وہ روایت  
 تو بہت عمدہ ہوتی ہے جو یہ ایس بن سہل سے نقل کرتا ہے۔ اور اتفاق سے اس نے یہ روایت بھی  
 ایس بن سہل سے نقل کی ہے۔ پھر عکرمہ سے اس حدیث کا نقل روایوں نے نقل کیا ہے۔ لہذا مسلم  
 کی اس حدیث کو مؤرخین کی بلا سند باتوں سے روایت کیا جاسکتا۔ لہذا صحیح یہی ہے کہ مرصع کے  
 قائل حضرت علی نہیں۔ حالانکہ ہر ائمہ نے یہی کہا کہ اس جگہ مؤرخین کی بات قبول کی جائے۔ کیونکہ  
 وہ شیعہ تھے۔ اور شیعہ مجبور ہو کر یہی ایسی بات کہہ سکتے ہیں لیکن محدثین نے عکرمہ کی کئی روایتوں  
 کو منکر قرار دیا ہے۔ اس پر غور کیا جائے کہ یہ روایت مشکوک ہے۔

ان احادیث کے ذریعہ قارئین کے سامنے جو امر آئے ہیں۔ ان کے علاوہ سب سبائی  
 داستانیں اور سپید جھوٹ ہیں۔ ان احادیث میں کسی صحابی نے یہ الفاظ نہیں کہے کہ آپ فاتح  
 خیبر ہیں۔ اس لئے کہ یہ تو متعدد صحابہ کے حق پر صریح ڈاکہ ہے۔ بلکہ کانڈرا نجیف ہونے کی  
 حیثیت سے یہ لقب تو حضور کو حاصل ہونا چاہیے۔ نہ کہ صرف ایک قلعہ کے فاتح کو۔ واللہ اعلم

## کیا حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی کو زندہ دفن کر دیا تھا؟

اس قسم کی داستانیں عام طور پر سننے میں آتی رہتی ہیں، اور ہمارے قصہ گو ملان کی تشہیر  
 کرنے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر داستانیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ نہ کسی تاریخ  
 کی کتاب میں وہ نظر آتی ہیں۔ دراصل ان کی ابتدا تو ایک مخصوص طبقہ کی جانب سے ایک سوچی  
 سمجھی اسکیم کے تحت ہوتی ہے۔ لیکن اس کی تشہیر کا ذریعہ ہمارے اہل سنت حضرات بنے  
 ہیں، کیوں کہ اب انہوں نے اس نصب العین کو اپنا رکھا ہے کہ جو بات بھی سنو اس پر بلا تحقیق ایمان  
 لے آؤ، اسی باعث سنی کی تعریف یہ بیان کی جاتی ہے کہ جو سن کر ایمان لائے اور اسی لئے  
 کسی کہانی یا داستان کے سلسلے میں ذرا سا بھی غور و فکر نہیں کیا جاتا۔

شاید ہم اس موضوع پر کوئی قلم نہ اٹھاتے، لیکن جب ہمارے علم میں یہ بات آئی کہ یہ رام کہانی کراچی کے ایک مشہور مفتی اور شیخ الحدیث نے مسجد کے منبر پر دوران تقریر بیان کی ہے۔ تو ہم ان سطور کے لکھنے پر مجبور ہوئے۔ حالانکہ علماء کرام کو یہ سوچنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سنی ہوئی باتوں کے سلسلہ میں یہ حکم دیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ  
فَاسِقٌ بِنَبَأٍ فَتَبَيَّنُوا۔  
اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس فاسق  
خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو۔

یہی وجہ ہے کہ محدثین کرام نے راہوں کے حالات معلوم کرنے اور حقیقت حال معلوم کرنے میں اپنی زندگیوں تھج دیں اور ایک ایسے فن کو وجود بخشا جو آج تک دنیا کی کسی قوم میں نہیں پایا گیا۔ یعنی علم الرجال۔ اسی کام کے لئے علم الروایہ، علم الدرایہ اور علم المخرج والتعذیل وجود میں لائے گئے۔

کاش مفتی صاحب یہ بتا دیتے کہ یہ داستان فلاں کتاب میں پائی جاتی ہے تو ہم اس کی تحقیق کرتے ہم نے تو آج تک حضرت عمرؓ کے حالات میں جتنی کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ہمیں تو آج تک ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آیا کہ حضرت عمرؓ نے اسلام سے قبل اپنی کسی بیٹی کو دنیا یا ہو۔ ہمارے نزدیک نہ صرف یہ خلاف نقل ہے۔ بلکہ خلاف عقل بھی ہے۔ جس کی متعدد وجوہات ہیں۔  
۱۔ ہمیں پوری تاریخ میں بھی آج تک یہ کہیں نظر نہیں آیا کہ خاندان قریش کے کسی فرد نے اپنی بیٹی کو کبھی دفن کیا ہو اور نہ اسے دنیا کا کوئی عالم اور مورخ ثابت کر سکتا ہے۔

۲۔ یہ رسم بنو تمیم خاندان میں پائی جاتی تھی، وہیں سے اس کی ابتدا ہوئی۔ حتیٰ کہ جب قیس بن عاصم جو قبیلہ بنی تمیم کے سردار تھے ایمان لائے۔ تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا اقرار کیا کہ انہوں نے اپنی آٹھ لڑکیاں زندہ دفن کی تھیں۔ یہ واقعہ تفسیر ابن جریر میں پایا جاتا ہے۔

۳۔ اسلام سے قبل اس رسم کے السداد کے لئے ایک دو افراد نے لڑکیوں کی میت دگر

ان کے والدین سے خریدا، اور ان کی پرورش کی اس سلسلہ میں دو افراد نے بہت نام پیدا کیا جن میں سے ایک صعصعہ تھے جو مشہور شاعر فرزدق کے دادا تھے اور دوسری شخصیت زید بن عمرو بن نفیل کی تھی۔

زید بن عمرو بن نفیل بعثت نبوی سے قبل دین ابراہیمی کے پیروکار تھے، وہ اس قسم کی لڑکیوں کو اپنی آغوش شفقت میں لیتے اور ان کی پرورش کرتے۔ جب وہ جوان ہو جاتیں تو ان کے والدین سے جا کر کہتے کہ تم اگر پسند کرو تو اپنی لڑکیاں واپس لے سکتے ہو اور چاہو تو میرے پاس رہنے دو۔ صحیح بخاری ص ۵۴ ج ۱ باب حدیث زید بن عمرو بن نفیل۔  
یہ زید بن عمرو بن نفیل حضرت عمرؓ کے خاندان سے نہ صرف قریبی تعلق رکھتے ہیں۔ بلکہ سگے چچا زاد بھائی ہیں۔ حضرت عمرؓ کی بہن ان کے صاحبزادے سعیدؓ کے نکاح میں تھیں۔ اور ان زید کی صاحبزادی حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔

جس خاندان کے افراد دوسروں کی بچیوں کی جان بچانے کے لئے انہیں خریدتے، ان کی پرورش کرتے اور ان کی تمام ذمہ داریاں پوری کرتے۔ اُس خاندان کی سب سے مایہ ناز ہستی خود اپنی بچی کو دفن کرے۔ یہ تاریخ کے ساتھ نہ صرف بدترین مذاق ہے۔ بلکہ حضرت عمرؓ اور ان کے خاندان کو بنام کرنے کا ایک مضحکہ خیز ذریعہ ہے۔ ایسی بات وہی کینہ پرور افراد کہہ سکتے ہیں جن کا عقیدہ یہ ہو۔

عمر زآل عمر کینہ قدیم است عجم ما

۴۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فتح مکہ کے روز قریش کی عورتوں سے بیعت لی اور یہ ارشاد فرمایا کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی۔ تو حضرت ہندؓ نے عرض کیا تھا۔

ربینا ہم صغارا و ہم نے تو بچپن میں ان کی پرورش کی تھی

قتلتهم کبارا۔ بڑے ہونے کے بعد آپ ہی نے انہیں

قتل کیا۔

بہ واقعہ کتب احادیث اور کتب سیر میں بالتفصیل موجود ہے۔ جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ قریش خاندان اس مرض سے پاک تھا۔ اس کی ناسبت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان سے بھی ہوتی ہے۔

نساء قریش خیر نساء وکسب  
الابل احشاء علی یتیم فی  
صنۃ وارعاہ علی زوجہ فی  
یدہ ۱۰ مسلم ج ۲ ص ۲۸۰  
اوشول پر سوار ہونے والی عورتوں میں  
سب سے بہتر قریش کی عورتیں ہیں۔  
جو بچوں پر بچنے میں بہت مہربان ہوتی  
ہیں۔ اور خاوند کے مال کا بہت خیال  
رکھتی ہیں۔

۵۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ اس وقت حضرت عمرؓ کی عمر ستائیس سال تھی۔ شبلی لکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کا ستائیسواں سال تھا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ سیرت النبی ص ۲۳ ج ۱۔ اور حضرت عمرؓ کے اسلام سے قبل ان کی چھٹی اولاد ہوئی سب حیات تھی۔ مثلاً ام المؤمنین حفصہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔

۶۔ عرب میں ہمیشہ کنیت پہلی اولاد کے نام پر رکھی جاتی تھی۔ جیسے حضور کی کنیت ابراہیمؑ ہے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کی کنیت متفقہ طور پر ابو حفص ہے۔ جو ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کی کنیت ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ حضرت عمرؓ کی پہلی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ تھیں اس قسم کے مفتی صاحبان کہیں یہ تو منصوبہ نہیں بنا رہے ہیں کہ ام المؤمنین حفصہؓ کو حضرت عمرؓ کی اولاد سے خارج کیا جائے۔ اس قسم کی حرکت ایک مجوسی اور سبائی کر سکتا ہے۔ نہ کہ کوئی سنی۔

۷۔ آیتاب ہم اس واقعہ پر ایک اور لحاظ سے نظر ڈالتے ہیں اور وہ یہ کہ حضرت عمرؓ نے کتنی شادیاں فرمائیں اور کس بوی سے ان کی کتنی اولاد ہوئی اور سب سے پہلے کس عورت سے شادی ہوئی اور اس سے کتنے بچے پیدا ہوئے۔ تاریخ نے یہ تمام روداد محفوظ رکھی ہے۔ لیکن ہم

تفصیل امام ابن الجوزی کی حیات فہرست اعظم سے نقل کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے متعدد شادیاں فرمائیں۔ جن سے متعدد اولاد ہوئی۔ سب سے پہلی شادی

حضرت زینب بنت مطعون سے کی۔ یہ مطعون بن حبیب بن مناکہ بن جمح کی صاحبزادی اور حضرت عثمانؓ بن مطعون کی بہن ہیں جو سابقین اولین میں سے تھے، اور حضور کے رضاعی بھائی تھے۔ ان زینبؓ سے حضرت عمرؓ کی تین اولادیں ہوئیں۔ حفصہؓ، عبداللہؓ اور عبدالرحمنؓ

۲۔ عائکہ بنت زید بن عمرو بن نفیل۔ ان سے ایک لڑکا عیاض نامی پیدا ہوا۔

۳۔ جمیلہ بنت ثابت بن الانصاری۔ ان سے ایک لڑکا عاصم پیدا ہوا۔

۴۔ ام کلثوم بنت الحارث بن ہشام۔ ان سے ایک لڑکا فاطمہ نامی پیدا ہوئی۔

۵۔ ام کلثوم بنت جبرول بن مالک بن حبیب۔ ان سے عبید اللہ اور زید الاکبر پیدا ہوئے۔

۶۔ ام کلثوم بنت علی بن ابی طالب۔ ان سے زید الاصفہ اور رقیہ پیدا ہوئیں۔

حضرت عمرؓ کی دو باندیوں سے بھی اولاد ہوئی۔ ان باندیوں کے نام فکیہ اور لبیہ تھیں۔ فکیہ سے

ایک لڑکی زینب پیدا ہوئی اور لبیہ سے عبدالرحمان الاوسط اور عبدالرحمان الاصفہ پیدا ہوئے۔ اس طرح حضرت عمرؓ کی اولاد حسب ذیل ہوئی۔

لڑکے۔ عبداللہ، عبدالرحمان الاکبر، عبدالرحمان الاوسط، عبدالرحمان الاصفہ۔ زید الاکبر۔ زید الاصفہ۔ عبید اللہ۔ عاصم۔ عیاض۔

لڑکیاں۔ حفصہ۔ رقیہ۔ فاطمہ۔ زینب۔

سب سے پہلی زوجہ حضرت زینب بنت مطعون ہیں اور ان سے صرف تین بچے ہوئے

ام المؤمنین حفصہ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عبدالرحمان الاکبر اور ان تینوں میں سب سے

بڑی حضرت حفصہ تھیں۔ اسی لئے حضرت عمرؓ کی کنیت ابو حفص ہوئی جس وقت حضرت

عمرؓ اسلام لائے۔ اس وقت تک ان کے یہی تین بچے ہوئے۔ اب اگر کوئی احمدی اور جاہل

مفتی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اپنی ایک یا متعدد لڑکیوں کو دفن کیا تھا۔ اسے سب

سے اول تو یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ لڑکیاں کس بڑی کے پیٹ سے پیدا ہوئیں، ثانیاً جب انہیں لڑکیوں سے اتنی نفرت تھی تو پھر لڑکی کے نام پر اپنی کنیت کیوں رکھی؛ ظاہر ہے کہ حضرت حفصہؓ پہلی صاحبزادی تھیں اسی مناسبت سے کنیت ان کے نام سے رکھی گئی اور اسی سے مشہور ہوئے۔ ممکن ہے کہ مفتی صاحب وغیرہ کو اس واقعہ سے مغالطہ واقع ہو ہو جو سنن دارمی میں نہیں ہے ان الفاظ میں مروی ہے کہ

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا۔ یا رسول اللہ! ہم جاہل لوگ تھے۔ بتوں کی پوجا کرتے اور اولاد کو قتل کیا کرتے تھے۔ میری ایک بیٹی تھی، میں جب اس کو بلاتا، تو میرے بلانے پر وہ بھاگی آتی، اور بہت خوش ہوتی ایک روز میں نے اسے جو آواز دی، وہ میرے پیچھے لگی چلی آئی۔ قریب ہی میں ایک کنواں تھا، میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کنویں میں دھکا دے دیا۔ اس کی زباں سے جو آخری آواز نکلی وہ یہ تھی۔ اے میرے ابا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر رونے لگے۔ حتیٰ کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھنے والوں میں سے ایک شخص نے اس سے کہا کہ تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو غمگین کر دیا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا یہ اس سے بھی اہم سوال کرنے کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد آپ اس سے مخاطب ہوئے اور فرمایا۔ یہ واقعہ دوبارہ بیان کرو، اس نے اس کا اعادہ کیا۔ حتیٰ کہ حضور اس واقعہ کو سن کر اتنا روئے کہ آپ کی داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر ارشاد فرمایا۔ زمانہ جاہلیت میں ان لوگوں نے جو افعال انجام دیئے۔ وہ اللہ نے اسلام کے ذریعہ مٹا دیئے۔ اب از سر نو عمل کرو۔ سنن دارمی ص ۱۷۲ ج ۱

یہ ایک نامعلوم شخص کا واقعہ ہے۔ یا رسول اللہ نے اسے حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کر دیا۔ حالانکہ یہ واقعہ مرے سے صحت کے ساتھ ثابت نہیں۔ کیونکہ اس واقعہ کا آخری راوی وضیع ہے۔ جو ششہ میں پیدا ہوا۔ اس کی موت ۱۴۱ھ میں ہوئی۔ یہ اوپر کے راوی بیان نہیں کرتا۔ کیا اس نے اپنی پیدائش سے اسی سال قبل ہی اس واقعہ کو سُن اور دیکھ لیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ روایت منقطع



ہے اور اوپر کے دوراوی غائب ہیں۔

پھر یہ وضعیں خود ناقابل اعتبار ہے، بخاری و مسلم اور نسائی نے اس کی روایت نہیں لی۔ ابن سعد کہتے ہیں ضعیف ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں اس کی کچھ روایات تو اچھی ہوتی ہیں اور کچھ بہت ردی۔ جوزجانی کہتے ہیں اس کی روایت وہی ہوتی ہے۔ میزان الاعتدال ج ۲ ص ۳۶۶ حاقط ابن حجر لکھتے ہیں اس کا حافظہ بہت ردی تھا۔ تقریب ص ۳۶۹

جب یہ واقعہ خود مرے سے ثابت نہیں اور پھر اس میں اس شخص کا نام مذکور نہیں۔ اسے حضرت عمرؓ کی جانب منسوب کرنا۔ ایسی حرکت صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جو خالص سبائی ذہن رکھتا ہو، افسوس یہ ہے کہ ہمارے علماء شیعہ ذہن اور ان کی سازشوں کو سمجھنے سے قاصر رہے اور اپنی اس کوتاہی کے باعث سبائی روایات کے پروپیگنڈے میں تن بن دھن سے لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اس سازش کو سمجھنے اور ان کی پھیلائی ہوئی داستانوں کی تحقیق کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

## حضرت حسنؓ کب پیدا ہوئے؟

ہجرت کے تیسرے سال ماہ شوال میں جنگ اُحد واقع ہوئی۔ اس کے بعد حضرت فاطمہؓ کی حضرت علیؓ سے شادی ہوئی۔ حاشیہ بخاری میں کرمانی کے حوالہ سے مذکور ہے۔

انکھما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نخطا فاطمہ کانکاح علیہ وسلم علیا بعد وقعة اُحد علیؓ سے جنگ اُحد کے بعد کیا۔

حاشیہ بخاری ص ۵۳۲ ج ۱

اس طرح یہ شادی ۳ کے آخر میں ہوگی یا ۴ کی ابتداء میں۔ ملا باقر مجلسی ایرانی لکھتے ہیں یہ مزاوجت باسعادت پنجشنبہ اکیسویں ماہ محرم کو واقع ہوئی۔ جلازالعیون اردو ص ۱۶۶ ج ۱

جب یہ نکاح جنگ احد کے بعد ہوا تو اب محرم کا مہینہ سہ کا پہلا مہینہ ہوگا۔ لہذا مؤرخین کا یہ دعویٰ کہ حضرت حسنؑ میں پیدا ہوئے یہ سوائے ایک یہود مذاق کے اور کچھ نہیں۔ اس لئے کہ جب والد محترم کی شادی محرم سہ میں ہو رہی ہے تو وہ سہ میں کیسے پیدا ہو جاتیں گے۔ اس سے زیادہ یہود تبرہ حضرت حسنؑ کی ذات پر اور کیا ہو سکتا ہے۔

حضرت فاطمہؑ کے پانچ بچے ہوئے حسن، حسین، ام کلثوم اور زینب۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ محسنِ بچپن میں انتقال کر گئے تھے اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ رت حسین حضرت حسن سے چھوٹے تھے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ سب سے پہلے حضرت فاطمہؑ کے جو بچہ پیدا ہوا وہ کونسا بچہ تھا۔ سبائوں اور مؤرخین کا دعویٰ یہ ہے کہ سب سے اول حضرت حسنؑ پیدا ہوئے۔ لیکن وہ خود ہی اس قسم کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ جس سے ان کے اس دعوے کی تردید ہو جاتی ہے۔ ملا باقر مجلسی ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

..... یہ یس کر جناب فاطمہؑ کو نہایت صدمہ ہوا، اور متفکر و متزدد ہوئیں۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی۔ جب رات ہوئی امام حسنؑ کو دایں اور امام حسینؑ کو بائیں کاندھے پر بٹھایا۔ اور بایاں ہاتھ ام کلثومؑ کا اپنے ہاتھ میں لیا۔ اور اپنے پدر بزرگوار کے گھر تشریف لے گئیں..... والیسی میں جناب رسول خداؐ نے امام حسنؑ کو اور فاطمہؑ نے امام حسینؑ کو اٹھایا۔ اور ام کلثومؑ کا ہاتھ پکڑ کر گھر سے مسجد میں تشریف لائے۔ جلال العیون ج ۱ ص ۲۱۴، ۲۱۵

خط کشیدہ الفاظ کا غور سے پڑھئے اور سوچئے کہ ان بچوں کی عمر زیادہ ہوگی جنہیں کاندھوں پر اٹھا کر لے جایا جا رہا ہے یا ام کلثومؑ کی عمر زیادہ ہوگی۔ جو ہاتھ تھام کر پیدل چل رہی ہیں۔ یہ واقعہ خود یہ ثابت کر رہا ہے کہ حضرت ام کلثومؑ حضرت حسنؑ و حسینؑ سے عمر میں بڑی تھیں۔ جب سہ میں حضرت علیؑ کی شادی ہوئی تو پہلے جو بچہ پیدا ہوگا وہ ام کلثومؑ نہوں گی۔ گویا حضرت حسنؑ کی پیدائش سہ سے قبل تو ممکن ہی نہیں اور وہ بھی سال کے آخری مہینوں میں یہی وہ ام کلثومؑ میں جو حضرت عمرؓ کے نکاح میں آئیں۔ جن سے حضرت عمرؓ کا ایک لڑکا پیدا اور ایک لڑکی رقیہ

پیدا ہوئی۔ یہ تمام گل اس لئے کھلے گئے کہ تاکہ سبائی یہ ثابت کر سکیں کہ جب ام کلثوم کا حضرت عمرؓ سے نکاح ہوا، تو وہ پانچ سالہ بھی تھیں۔ سبائیوں کے اس دھوکہ میں بڑے بڑے علماء آگئے حتیٰ کہ حافظ ابن حجر نے اصحاب میں اور ابن حجر شیبی نے الصواعق المحرقة میں پانچ سال والی کہانیاں نقل کر ڈالیں۔ حالانکہ مسئلہ بالکل واضح تھا کہ حضرت ام کلثومؓ سگہ میں پیدا ہوئیں اور سگہ میں حضرت عمرؓ کے نکاح میں جب آئیں تو ان کی عمر تیرہ سال سے زیادہ تھی۔ گویا ایک سوچی اور کبھی سازش کے تحت حضرت ام کلثومؓ کی عمر گھٹائی گئی اور حضرت حسنؓ کی عمر بڑھائی گئی۔ اس سے حضرت حسنؓ کی ذات پر تو کوئی خاص اثر پیدا نہیں ہوا۔ لیکن ایک تو سبائیوں کو اس طریقہ سے حضرت عمرؓ کی ذات پر کھینچا چھلانے کا موقع ملا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت حسینؓ کی عمر میں اضافہ ہو گیا۔ جس سے ان کی صحابیت ثابت کرنے کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ تیسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت حسینؓ کے بارے میں جو فرضی روایات وضع کر کے پھیلائی گئی تھیں۔ وہ سینوں کے حلق سے آسانی کے ساتھ نیچے اتر گئیں۔ اس طرح مدعی سست اور گواہ چست والا مسئلہ بن گیا۔

ہمارے تمام مؤرخین اور مجوسی اس پر متفق ہیں۔ کہ جب حضرت حسنؓ پیدا ہوئے تو ان کی دایہ گیری کی خدمات حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے انجام دیں۔ یہ ایک ایسی اہم بنیاد ہے جس سے تمام مسئلہ خود بخود واضح ہو جاتا ہے۔ ملا باقر مجلسی نے یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ لکھا ہے۔ وہ آخر میں لکھتے ہیں۔

حضرت حسنؓ جب سات روز کے ہوئے۔ تو آنحضرتؐ نے دو اہلن کو سفند حقیقتیں ذبح کئے اور اسماء بنت عمیسؓ دایہ کو ایک دامن اور ایک اشرفی عطا فرمائی اور امام حسنؓ کے سر کے بال کوٹ کر برابر چاندی کے تصدق کر دیئے اور امام حسنؓ کے سر مبارک پر غلطی کہ ایک قسم کی خوشبو ہے لگائی اور فرمایا۔ اے اسماءؓ خون عقیقہ پہ کے سر پر ملنا۔ جلا راعیون مثلاً جہاں ہم اس واقعہ کو بدل بجان قبول کرتے ہیں۔ لیکن اپنے قارئین کو یہ بتانا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسماء بنت عمیسؓ اولاً حضرت جعفرؓ کے نکاح میں تھیں جو حضرت علیؓ کے بڑے بھائی تھے

جب غزوہ موتہ میں حضرت جعفرؓ شہید ہوئے تو حضرت ابو بکرؓ نے ان سے نکاح کر لیا۔ حضرت ابو بکرؓ کی وفات کے بعد یہ حضرت علیؓ کے نکاح میں آئیں۔

یہ حضرت اسماءؓ اور ان کے پہلے خاوند حضرت جعفرؓ نبوت کی ابتداء ہی میں ایمان لے آئے اور اہل مکہ کی ایذا رسانی کے سبب نبوت کے پانچویں سال، ہجرت کر کے حبشہ چلے گئے۔ حضرت جعفرؓ ہی کی تبلیغ سے نجاشی شاہ حبش اور دیگر افراد ایمان لائے۔ یہ حضرات کب تک حبشہ میں رہے اور حبشہ سے ان کی کب واپسی ہوئی؟ اسی پر تمام فیصلہ کا دار و مدار ہے۔

تمام علماء اہل سنت، تمام محدثین و مؤرخین اور تمام سبائی اس امر پر متفق ہیں کہ ہاجرین حبش مدینہ اس وقت پہنچے ہیں جب آپؐ خیبر کی جنگ سے فارغ ہوئے۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔  
 کلینی، شیخ طبری اور ابن بابویہ وغیرہ نے حسن، صحیح اور معتبر سندوں کے ساتھ حضرت صادق سے روایت کیا ہے اور امام حسن عسکری کی تفسیر میں مذکور ہے کہ بروز فتح خیبر آنحضرتؐ نے فرمایا۔ میں نہیں سمجھتا کہ ان دونوں نعمتوں میں سے کس پر زیادہ خوش اور مسرور ہوں۔ خیبر کی فتح پر، یا جعفرؓ کی واپسی پر۔ حیات القلوب ص ۶۱۹ ج ۲۔

یہ توشیعہوں کی روایت تھی جو انہوں نے صحیح سند کے ساتھ جعفرؓ اور حسن عسکریؒ اپنے امہ سے نقل کی تھی۔ گویا اب ان کے نزدیک یہ امر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ اور یہ ایک یقینی امر ہے کہ حضرت اسماءؓ بنت عمیس اپنے خاوند حضرت جعفرؓ کے ساتھ خیبر کے موقع پر مدینہ پہنچی ہیں۔

اب اہل سنت حضرات صحیح بخاری کی ایک حدیث بھی سن لیں۔ جو انہوں نے اشعریؒ کی فضیلت میں نقل کی ہے۔ یہ حدیث حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے مروی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔  
 ہمیں جب یمن میں بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت مدینہ کی اطلاع ملی تو ہم لوگ آپؐ کی جانب (یعنی مدینہ کی طرف) ہجرت کے ارادے سے چلے۔ میرے ساتھ میرے دو بھائی ابو بردہؓ اور ابو رہم بھی تھے اور میں ان دونوں سے چھوٹا تھا۔ ہمارے ساتھ میری قوم (یعنی قبیلہ اشعر)۔

کے بادن یا ترپن افراد تھے۔ ہم کشتی میں سوار ہوئے۔ لیکن مخالف ہواؤں نے یہاں کشتی کو بچاشی کے ملک حبشہ پہنچا دیا۔ وہاں ہم جعفر بن ابی طالب سے ملے اور ان کے ساتھ وہیں مقیم رہے۔ حتیٰ کہ ہم سب مل کر مدینہ آئے۔

ہم حضور کی خدمت میں اس وقت پہنچے جب حضور نے خیبر فتح فرمایا تھا۔ ہم اشعر یوں سے مہاجرین مدینہ کہنے لگے کہ ہم نے تم سے پہلے ہجرت کی ہے۔ حضرت ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں اسما بنت عمیس جو ہمارے ساتھ آئی تھیں، ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس چلی گئیں۔ ان اسماؓ نے دیگر مہاجرین حبشہ کے ساتھ حبشہ کی جانب ہجرت کی تھی۔

حضرت عمرؓ اپنی بیٹی ام المؤمنین حضرت حفصہؓ کے پاس گئے۔ تو وہاں یہ اسماؓ بنت عمیس موجود تھیں، حضرت عمرؓ نے جب انہیں دیکھا تو پہچانا نہیں۔ اپنی بیٹی سے سوال کیا یہ کون ہیں؟ انہوں نے جواب دیا اسماؓ بنت عمیس۔ حضرت عمرؓ نے (از روئے مذاق) فرمایا۔ کیا حبشہ، کیا بصرہ؟ (سمندر والی) اسماؓ بولی ہاں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ ہم نے تم سے قبل ہجرت کی ہے۔ اس لئے ہم تم سے زیادہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقدار ہیں۔

یہ سن کر حضرت اسماؓ غصہ میں بھر گئیں۔ بولیں ہرگز نہیں۔ اللہ کی قسم تم لوگ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ تم میں سے کوئی بھوکا ہوتا تو حضور کھانا کھلاتے۔ اور تم میں سے جو جاہل ہوتا اسے حضور نصیحت کرتے۔ ہم تو بہت دور دشمن کی سرزمین حبشہ میں پڑے ہوئے تھے اور ہم نے یہ سب مصائب اللہ اور اس کے رسول کی خاطر اٹھائے تھے۔

اللہ کی قسم ہم ہر وقت خوف میں مبتلا رہتے، اور ہمیں اذیتیں بھی پہنچائی جاتیں۔ اللہ کی قسم میں اس وقت تک کچھ نہ کھاؤں گی، اور نہ پیوں گی۔ جب تک تمہاری یہ بات حضور تک نہ پہنچا دوں اور حضور سے یہ سوال نہ کر لوں۔ اللہ کی قسم میں جھوٹ نہ بولوں گی، نہ غلط بات کہوں گی۔ اور نہ اس بات میں کوئی اضافہ کروں گی۔

جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نشر یف لائے تو اسماؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ عمرؓ نے ایسا

ایسا کیا ہے۔ آپ نے سوال کیا تم نے کیا جواب دیا؟ انہوں نے جواب سنا یا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا عمرؓ رقم سے زیادہ میرے حقدار نہیں رہے۔ کیونکہ اس کی آواز اس کے ساتھیوں کی (یعنی مہاجرین مدینہ) ایک ہجرت سہہ اور اسے کشتی ڈالو تھامی دو ہجرتیں ہیں۔ اسماءؓ کا بیان ہے کہ ابو موسیٰ اشعریؓ اور دیگر کشتی والے گروہ درگروہ میرے پاس یہ آئے اور انہیں کسے لئے بار بار آدی بھیجتے رہتے تھے۔ اُن کے لئے اس سے زیادہ عظیم اور خوش کن کوئی چیز نہ تھی۔ ابوبکرؓ یہ بتا رہے ہیں کہ ابو موسیٰ اشعریؓ بار بار میرے پاس آتے تھے اور بار بار مجھ سے یہ حدیث دریافت کرتے تھے۔

ابو موسیٰؓ فرماتے ہیں: جب ہم فتح خیبر کے فوراً بعد حضورؐ کی خدمت میں پہنچے تو حضورؐ نے مال غنیمت میں سے ہمارے بھی حصے لگائے۔ حالانکہ آپؐ نے کسی اور غیر حاضر شخص کو کوئی حصہ نہیں دیا۔ بخاری ج ۲ ص ۶۰

اب اہل سنت حضرات خود ہی سوچ کر دل سے فیصلہ کر لیں کہ حضرت حسنؓ کب پیدا ہوئے کیونکہ غزوہ خیبر متفقہ طور پر مکہ میں واقع ہوا۔ آپؐ نے عمرؓ کے آخر میں خیبر کی جانب کوچ کیا تھا۔ لہذا حضرت حسنؓ مکہ میں پیدا ہوئے۔ اس سے یہ عقدہ بھی حل ہو گیا کہ محسنؓ نامی بچہ حضرت حسنؓ سے پہلے پیدا ہوا تھا۔

اس کی تائید بخاری کی ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے۔ جس میں حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے زمانہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ بخاری کے الفاظ ہیں۔

صلی البکر العصر ثم نحر ثم عیشی	ابوبکرؓ نے عصر کی نماز پڑھائی۔ پھر رات بھر
فراى الحسن يلعب مع الصبيان	بچے کھلے تو دیکھا کہ حسنؓ بچوں کے ساتھ کھیل
فحملہ علی عاتقہ وقال بابی	رہے ہیں۔ ابوبکرؓ نے انہیں اپنے گامدھے
شبیہ بالنبی صلی اللہ علیہ	پراٹھا لیا۔ اور فرمایا۔ میرے مالِ باپ
وسام لا شبیہ بعلی وعلی	قرابن یہ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے

لیفٹننٹ - مشابہ ہے۔ علی کے مشابہ نہیں۔

بخاری ج ۱ ص ۵۱ اور علی بنس رہے تھے۔

گویا حضرت حسنؓ خلافت ابی بکرؓ میں اتنے کم سن بچہ تھے کہ ابوبکرؓ جیسے ضعیف العمر اور لاغر انسان انہیں کا ندھوں پر اٹھاتے اور کا ندھوں پر زیادہ سے زیادہ چار پانچ سالہ بچے کی کو اٹھایا جاتا ہے۔ نہ کہ نو دس سالہ بچہ کو اور جبکہ بچہ بربات کو سمجھنے لگتا ہے تو عربی میں اسے جی نہیں کہتے بلکہ غلام کہتے ہیں۔ اس روایت کا یہ جملہ یا تعب مع الصبیان اس امر کا ثبوت ہے کہ اُن میں ابھی مجھ بوجھ کا مادہ پیدا نہیں ہوا تھا۔

ان امور سے یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ حضرت حسنؓ صحابی نہ تھے۔ کیا کہ حضرت حسینؓ کی صحابیت۔

یہ امر بھی ذہن میں رہے کہ اگرچہ سات اٹھ سال کی عمر کا ہو تو اس کے حافظہ میں اپنے قریبی اور چاہنے والوں کا حلیہ پورے طور پر محفوظ رہتا ہے۔ لیکن اگر اس سے کم عمر ہو تو آہستہ آہستہ وہ حلیہ اس کے ذہن سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت حسنؓ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ یاد نہ تھا۔ لہذا انہوں نے آپ کا حلیہ اپنے ماموں ہند بن ابی ہالہ سے معلوم کیا۔ یہ ہندؓ حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند کی اولاد تھے۔ اس لحاظ سے یہ حضرت فاطمہؓ کے ماں جائے بھائی ہوئے اور حضرت حسنؓ کے ماموں۔ حضور کا تفصیلی حلیہ حضرت حسنؓ نے حضرت ہندؓ سے ہی دریافت کیا جو شمالی ترمذی اور انساب الاشراف میں مذکور ہے۔ انساب الاشراف ج ۲ ص ۲۸۲۔

ان تمام حقائق سے یہ امر واضح ہو گیا کہ حضرت حسنؓ ۳ؓ میں نہیں بلکہ ۴ؓ میں پیدا ہوئے اور نہ آپ حضرت فاطمہؓ کی پہلی اولاد ہیں اور نہ اصولی طور پر آپ کو شرف صحابیت حاصل ہے۔ ان تمام باتوں کا تعقیب اگر کمپیوٹر کے ذریعہ بھی کیا جائے تو جواب مختلف برآمد نہ کیا جاسکے گا۔

## حضرت حسینؑ کی پیدائش

اس سے قبل کہ ہم اس امر کی وضاحت کریں کہ حضرت حسین کی پیدائش کون سے سن میں ہوئی، ہم اپنے سنی بھائیوں کو وہ رام کہانی بھی سنانا ضروری سمجھتے ہیں جو سبائیوں نے حضرت حسینؑ کی ولادت کے سلسلہ میں بیان کی ہے۔ تاکہ ہمارے سنی بھائیوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ غم حسینؑ میں سینہ کوئی کرنے والے حضرت حسینؑ کے بارے میں کیا نظریات رکھتے ہیں۔ اور حضرت حسینؑ پر ان کے یہاں کس طرح برا کیا جاتا ہے۔ اور سنی بھائیوں کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ بائیس کے دانت کھانے کے اور ہوتے ہیں، دکھانے کے اور۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔

ابن بابویہ نے بسند معتبر جناب صادق سے روایت کی ہے کہ جبرائیل خدمت رسول میں قبل ولادت حسینؑ آئے۔ اور کہا کہ آپ کے ہاں ایک فرزند متولد ہو گا کہ آپ کی امت اسے شہید کرے گی۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے ایسے فرزند کی حاجت نہیں، جب تین مرتبہ یہی خطاب ہوا اور تیسری مرتبہ کہا کہ اس فرزند اور اس کی ذریت اور اولاد میں امامت و وراثت اور آثار پیغمبر الٰہی ہوں گے اور خازنِ علوم اولین و آخرین ہوں گے۔ یہ سن کر جناب رسول خداؐ نے فرمایا۔ جناب امیر کو بلاؤ اور ان سے پوچھو۔ جب حضرت علیؑ آئے تو رسول خداؐ نے کہا جبرائیل نے خدا کی جانب سے مجھے یہ خبر دی ہے کہ ایک فرزند تمہارے یہاں متولد ہو گا کہ میری امت میرے بعد اسے شہید کرے گی۔ جناب امیر نے کہا مجھے ایسے فرزند کی حاجت نہیں۔ یہاں تک کہ تین مرتبہ یہ کلام ہوا۔ اور تیسری مرتبہ فرمایا کہ اس فرزند اور اس کے فرزندوں میں امامت و وراثت و آثار پیغمبر الٰہی اور خازنِ علوم اولین و آخرین ہوں گے۔ تو حضرت علیؑ نے فرمایا فاطمہؑ سے پوچھو پھر جناب فاطمہؑ سے کہلا بھیجی کہ خداتم کو بشارت دیتا ہے کہ تمہارے ایک فرزند ہو گا۔ میری امت اس کو بعد میرے شہید کرے گی۔ جناب فاطمہؑ نے عرض کیا بابا مجھے ایسے فرزند کی حاجت نہیں۔ یہاں تک کہ پھر تین مرتبہ



یہ خطاب واقع ہوا۔ اور ہر مرتبہ جناب فاطمہؑ نے یہی جواب دیا۔ حضرت نے فرمایا وہ فرزند اور اسکی اولاد پیشوایاں دیندار میرے وارث اور میرے علم کے خازن ہوں گے۔ جب یہ سنا جناب فاطمہؑ نے کہا میں اپنے خدا سے راضی ہوئی۔ بعد اس کے حاملہ بچل امام حسین ہوئیں۔ جلال العیون ج ۲ ص ۹۲۔ ملا باقر آگے چل کر لکھتے ہیں۔

جناب رسول خداؐ نے جناب فاطمہؑ کو خبر ولادت امام حسین اور خبر شہادت دی اور جناب فاطمہؑ بکراہت حاملہ ہوئیں۔ حضرت نے فرمایا۔ ہرگز کسی کو تو نے دیکھا ہے کہ اسے ولادت فرزند کی بشارت دیں۔ اور وہ حاملہ بکراہت ہو۔ یعنی اسے خبر ولادت فرزند دیں اور وہ مغموم ہو کر حاملہ ہونے سے کراہت کرے کہ اس وجہ سے کہ حال قتل فرزند معلوم ہو چکا تھا اور واضح حمل بھی بسبب اس سے کراہت کرے۔ جلال العیون ص ۹۲ ج ۲

ملا باقر مجلسی کی ان عبارات سے جو امور سامنے آتے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ شہادت اتنی بری شے تھی کہ اس کا ذکر سن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ کو اولاد بھی قبول نہ تھی۔

۲۔ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ حضرت حسینؑ سے کراہت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ دورانِ حمل حضرت فاطمہؑ ان سے ہمیشہ کراہت کرتی رہیں۔

۳۔ حضرت علیؑ و فاطمہؑ نے حضرت حسینؑ کی ولادت کو صرف اس لئے برداشت کیا کہ حضرت حسینؑ کی اولاد میں امامت و وراثت چلے گی۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ماں باپ کو بیٹے ہی سے کراہت ہے تو بیٹے کی اولاد میں امامت و وراثت سے پیار کیوں پیدا ہو گیا ؟

۴۔ حضرت حسینؑ کی اولاد علومِ اولین و آخرین کی وارث ہوگی اور ان میں آثارِ پیغمبرانِ پائے جائیں گے۔ سوچنے کا معاملہ یہ ہے کہ یہ سلسلہ صرف بارۃ تک ہی کیوں محدود رہا ؟

۵۔ حضرت حسنؑ تو بکراہت پیدا نہ ہوئے تھے۔ پھر ان کی اولاد میں امامت و وراثت

کیوں نہ چلی اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ امامت و درایت اس لڑکے کی اولاد میں چلتی ہے۔ جس سے ماں باپ نفرت کرتے ہوں۔

۶۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہؑ برضا و رغبت اللہ کے حکم کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ بحالتِ مجبوری قبول کرتے ہیں اور وہ بھی بکراہت ہم اس کے جواب میں کچھ عرض کرنا نہیں چاہتے لیکن ہاں ہم اپنے سنی بھائیوں سے یہ سوال ضرور کریں گے کہ کیا یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؑ و فاطمہؑ پر تبرائیں تو اور کیا ہے؟ اور کیا حضرت حسینؑ کو صریح الفاظ میں ایک مکروہ ہستی نہیں بنا دیا گیا؟ تبرائیوں کو ان حضرات کی ذات سے کوئی تعلق نہیں، انہیں تو صرف وراثت چاہئے تاکہ اس کے پردے میں وہ اپنی من مانی کا رونا کر سکیں۔

اب ہم اصل موضوع پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں کہ حضرت حسینؑ کب پیدا ہوئے۔ اس پر تو ہر فریق اور ہر قسم کے لوگوں کا اتفاق ہے کہ حضرت حسینؑ حضرت حسنؑ کے بعد پیدا ہوئے۔ اور جب حضرت حسنؑ کی پیدائش ۳۰ میں ہوئی تو یقینی بات ہے کہ حضرت حسینؑ ۳۱ میں پیدا ہوئے ہوں گے۔

مورخین کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت حسینؑ حضرت حسنؑ کے ایک سال یا چودہ ماہ بعد پیدا ہوئے۔ اگرچہ ملا باقر مجلسی نے جلاء العیون میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے پیٹ میں صرف چھ ماہ رہے اور حضرت حسنؑ کی ولادت کے ایک ماہ بعد ان کا حمل ٹھہرا۔ ساتھ ساتھ مجلسی صاحب نے بھی یہ دعویٰ کیا ہے کہ آج تک روئے زمین پر چھ ماہ کے صرف دو ہی بچے زندہ رہے ہیں۔ ایک حضرت حسینؑ، دوسرے نام کے معاملہ میں مجلسی خود تذبذب کا شکار ہیں۔ کبھی حضرت عیسیٰؑ کا نام لیتے ہیں اور کبھی حضرت یحییٰؑ کا۔ اس لحاظ سے یہ دو بچے نہ ہوں گے بلکہ تین بچے ہوں گے۔

۱۔ اہل کذبہ ماہ کا کہ زندہ رہا۔ ۲۔ اہل کذبہ ماہ کا کہ زندہ رہا۔ ۳۔ اہل کذبہ ماہ کا کہ زندہ رہا۔

ہی دے سکتی ہیں اور یہ کوئی دشوار عمل نہیں۔ ہسپتالوں کے ذریعہ ایسے بچوں کی رپورٹ معلوم کی جاسکتی ہے۔

حاصل کلام یہ کہ حضرت حسینؑ، حضرت حسنؑ کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کا سن پیدائش کیا ہے، چونکہ ہم سنی ہیں۔ لہذا اہل سنت کی کتابوں کے حوالہ ہی سے حقیقت حال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ مشکوٰۃ المصابیح ابن ماجہ اور طبقات ابن سعد میں حضرت ام الفضلؑ کا یہ بیان مذکور ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ رات میں نے بہت بُرا خواب دیکھا ہے۔ آپ کے دریافت کرنے پر میں نے کہا کہ آپ کے جسم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں ڈالا گیا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ یہ خواب بہت اچھا ہے۔ فاطمہؑ کے یہاں لڑکا ہوگا اللہ نے چاہا وہ تیری گود میں رہے گا۔ چنانچہ جب فاطمہؑ کے یہاں حسینؑ پیدا ہوئے تو وہ آپ کی دی ہوئی تعبیر کے مطابق میری گود میں رہے۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۷۲۔ طبقات ابن سعد ج ۸ ص ۲۵۶۔

یہ خواب سنن ابن ماجہ میں ان الفاظ کے ساتھ مروی ہے۔

حضرت ام الفضلؑ فرماتی ہیں میں نے عرض کیا یا رسول اللہؐ میں نے خواب دیکھا ہے کہ آپ کے اعضاء جسم میں سے ایک عضو میرے گھر میں ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا خواب ہے۔ فاطمہؑ کے یہاں بچہ ہوگا۔ تو اسے دودھ پلانے لگی جب حسینؑ پیدا ہوئے تو میں نے انہیں دودھ پلایا۔ اتفاق سے ایک روز میں حسینؑ کو لے کر حضورؐ کے پاس آئی۔ حضورؐ نے انہیں گود میں ڈال لیا۔ انہوں نے پیشاب کر دیا۔ میں نے بچے کے نونڈھے پر ہلکے سے ہاتھ مارا۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا۔ تو نے میرے بچے کو تکلیف پہنچائی۔ سنن ابن ماجہ مترجمہ ج ۲ ص ۴۶۱۔

گویا حسینؑ کو حضرت ام الفضلؑ نے گود لیا اور دودھ پلایا۔ سبائی کہتے ہیں کہ چونکہ فاطمہؑ کو علیؑ بچہ سے نفرت کرتے تھے اس لئے انہیں ام الفضلؑ ہی کی گود میں دے دیں۔

اس سیدہ کی میں یہاں تک مذکور ہے کہ وہ اپنے سبب قیامی غیرت کو نے اپنے ماں کا

دودھ پینا بھی پسند نہیں کیا۔

خیر یہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں۔ ہم تو صرف یہ جانتے ہیں کہ حضرت ام الفضلؓ نے حضرت حسینؓ کو ولادت کے بعد گود لیا۔ اور انہوں نے ہی انہیں دودھ پلایا ہے۔ ان ہی ام الفضلؓ پر تمام کہانی کا دار و مدار ہے۔ جیسا کہ حضرت حسنؓ کے معاملہ میں حضرت اسماءؓ بنت عیسٰی پر دار و مدار تھا۔

حضرت ام الفضلؓ بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؓ کی چچی تھیں اور حضرت عباسؓ کی زوجیت میں تھیں۔ ان کا نام لبابہ بنت الحارث ہے۔ ان کے بڑے بیٹے کا نام فضلؓ ہے اسی لئے ام الفضلؓ کہلاتی ہیں۔ یہ ابتدائے نبوت ہی میں ایمان لے آئی تھیں۔ لیکن ان کے خاندان حضرت عباسؓ نے کھل کر اسلام کا اعلان نہیں کیا۔ اسی لئے فتح مکہ کے وقت تک مکہ میں رہے۔ اور حضرت ام الفضلؓ بھی ان کے ساتھ مکہ میں رہیں۔ یہ دونوں حضرات ہجرت نہ کر سکے۔ لیکن چونکہ یہ پہلے سے اسلام لاپچکے تھے۔ لہذا بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد ان دونوں حضرات کو مدینہ میں رہنے کی اجازت دیدی۔ اس طرح یہ دونوں مدینہ چلے آئے۔

جب سورہ نسا میں یہ آیت نازل ہوئی۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّيْنَا مِنَ الْمَلِكَةِ	يَقِينًا وَهَ لَوْ كُنَّا جُنَّ رَوِّعًا
ظَلَمُوا الْقُسُوفَ قَالُوا فَمَنْ	مِنْ قَبْلِ كُنَّا لَمَّا جَاءُوا مِنْ قَبْلِهِمْ
كُنَّا قَالُوا كُنَّا مُتَضَاعِفِينَ	فِي الْأَرْضِ قَالُوا أَزُحِلُّوا
وَأَسْبَغَتْ فَجَبْرًا فِيهَا	فَأُولَئِكَ مَا وَهُمْ مِنْهُمْ
فَأُولَئِكَ مَا وَهُمْ مِنْهُمْ	سَاءَتْ مَصِيرًا إِلَّا الْمُتَّقِينَ

یقیناً وہ لوگ جن کی رو میں اس حال میں قبض کریں کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہوں انکار کے علاقوں میں رکھا تو فرشتے ان سے سوال کریں گے کہ تم کہاں رہتے تھے۔ وہ جواب دیں گے کہ زمین میں کمزور تھے۔ فرشتے کہیں گے کہ اللہ کی زمین وسیع تھی تم ہجرت کر

مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ  
لَا يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً  
وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا  
جاتے۔ ایسے لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے  
جو برا مقام ہے۔ مگر وہ مرد جو کمزور ہوں  
یا عورتیں اور بچے جو ملک چھوڑنے کا  
کوئی حیلہ نہ پاتے ہیں اور نہ انہیں راستہ  
کا علم ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔ میں اور میری والدہ بھی اُن  
لوگوں میں داخل ہیں جنہیں ہجرت سے معاف قرار دیا گیا۔ تفسیر قرطبی ج ۲ ص ۱۹۶  
مجبور ہو کر حضرت ام الفضلؓ فتح مکہ کے وقت تک مکہ میں مقیم رہیں اور مکہ رمضان  
میں فتح ہوا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد ۶ شوال تک مکہ میں مقیم رہے۔ جیسا کہ بلاذری  
نے النساب الاشرف میں دعویٰ کیا ہے۔ پھر آپ جنین کی جانب تشریف لے گئے۔ اس کے  
بعد طائف کا محاصرہ کیا۔ جو ایک ماہ جاری رہا۔ پھر غزوہ ہوازن پیش آیا۔ غزوہ سے فراغت  
کے بعد تقریباً اُنیس دن تک مقام اطاس میں مقیم رہے۔ اس طرح حضور مدینہ منورہ تقریباً انہی  
ذی قعدہ یا ابتدائے ذی الحجہ میں پہنچے ہوں گے۔ اس کے بعد آپ کے سامنے خواب بیان کیا  
گیا۔ پھر کچھ دن بعد بچہ پیدا ہوا۔ لہذا حضرت حسینؓ یقینی طور پر مدینہ میں پیدا ہوئے۔ اب اگر  
ہمارے مؤرخین اور علماء کو انہیں جلدی ہی پیدا کرنا اور زبردستی اُن کی عمر بڑھانا مقصود ہے تو  
سب سے پہلے اُن کے اور حضرت ام الفضلؓ کے تعلق کو ختم کرنا ہوگا۔ جب کہ انہوں نے حضرت  
حسینؓ کو دودھ پلایا اور اپنی گود میں پرورش کیا۔ اور یہ ایک متفق علیہ مسئلہ ہے۔ اس کا انکار چڑھتے  
سورج کا انکار ہوگا۔

کراچی کے ایک مشہور مدرسہ کے مشہور مفتی اور شیخ الحدیث نے مجھ سے یہ دلیل سُن کر  
فرمایا تھا کہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ ام الفضلؓ فتح مکہ سے قبل مدینہ آئی ہوں اور پھر واپس چلی گئی  
ہوں۔ گویا تاریخ کی بنیاد مفروضات پر رکھی جا رہی ہے۔ میں نے یہ آیت اور عبداللہ بن عباسؓ

کا قول پیش کیا تاکہ انہیں یہ معلوم ہو جائے کہ عبداللہ بن عباسؓ اور ان کی والدہ ام الفضلؓ ان محبوبہ نوگوں میں داخل تھیں جو ہجرت کرنے پر قدرت نہ رکھتے تھے اور اس کا اقرار ام الفضلؓ کے عاجزانہ ابن عباسؓ مکر رہے ہیں۔

اگر وہ پھر بھی حضرت حسینؓ کو گریہ یا شہ میں پیدا کرنے کے لئے مدینہ تشریف لے آئیں تو کیا یہ ممکن تھا کہ وہ ہجرت ترک کر کے مکہ واپس چلی جائیں۔ اور ازدوئے قرآن جہنم کی سختی نہیں۔ اگر مفتی صاحبؒ کے نزدیک یہ ممکن ہے تو پھر ان کے دین کا اللہ ہی حافظ ہے..... لیکن اس مسئلہ پر کہ شاید اللہ تعالیٰ انہیں سبائیت سے نجات عطا فرمائے۔ ہم مزید ایک اور آیت ان کی خدمت میں پیش کئے دیتے ہیں۔ ارشاد الہی ہے۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ  
الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ  
فَاِمْتَحِنُوهُنَّ ۚ اللَّهُ أَعْلَمُ  
بَاِيمَانِهِنَّ ۚ فَإِنْ  
عَلِمْتُمُوهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ  
فَلَا تَرْجِعُوهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ  
اے نبی جب تمہارے پاس مومنہ عورتیں  
(مکہ سے) ہجرت کر کے آئیں۔ تو تم ان  
کا امتحان لو، ویسے تو اللہ انکے ایمان کو  
نوب جانتا ہے۔ لیکن اگر تم یہ جان لو  
کہ یہ مومنہ ہیں تو انہیں کافروں کی طرف  
نہ لوٹاؤ۔

یعنی ام الفضلؓ مکہ چھوڑ کر مدینہ آگئی تھیں تو اگر وہ واقعاً مومنہ تھیں تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے لئے برگزیدہ جائزہ تھا کہ انہیں مکہ واپس جانے دیں، اور اگر انہیں مکہ واپس جانے دیا گیا تو اس کا مستحکم یہ ہوا کہ وہ امتحان میں کامیاب نہیں ہوئیں اور ان کا ایمان ایک دھوکہ تھا۔ کاش کوئی مفتی صاحبؒ سے پوچھے کہ آپ کو ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت منظور ہے حضرت ام الفضلؓ کو جو حضرت خدیجہؓ کے بعد دوسری ایمان لانے والی ہیں، انہیں ایمان سے

خارج کرتا۔ یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے بارے میں یہ تسلیم کرنا کہ انہوں نے قرآن کی مخالفت کی۔ مفتی صاحب کو جو بھی اپنے لئے پسند ہو وہ فتویٰ صادر فرمائیں۔ فی الوقت ہم تو ان کی تاویل سے اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مفتی صاحب جہاں تاریخ سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے، وہاں انہیں قرآن اور اس کی تفسیر کی خوشبو تک بھی نہیں پہنچی۔ ان کا دین و ایمان صرف سبائی روایات ہیں اور جب ان پر اعتراضات ہوتے ہیں تو مفروضات کی دنیا میں جا بیٹتے ہیں اسی لئے آج کل وہ ہر ایک کو خارج جی بنانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔

---

## خَوَاب کے کتے

### اُم المؤمنین حضرت عائشہؓ پر

خَوَاب کے کتوں کا ذکر زیب داستان کے طور پر ہر تاریخ کی کتاب میں موجود ہے اور سبائیوں کی کوئی محفل اس تبرا سے خالی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ اہل سنت والجماعت کا وہ تعلیم یافتہ طبقہ جو محرم کی مجلسوں میں شریک ہونا کا رِثَوَاب اور اپنے لئے باعثِ فخر تصور کرتا ہے۔ یہ طبقہ اس کہانی سے بہت زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔

در اصل یہ واقعہ اس نئے وضع کیا گیا کہ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ خوں عثمانؓ کا جو دعویٰ لے کر کھڑی ہوئیں، اور اہل مکہ نے ان کا ساتھ دیا۔ سبائی طبقہ اس دعویٰ کو برداشت نہ کر سکا۔ کیونکہ اس دعویٰ کو قبول کرنے کا مقصد یہ تھا کہ قاتلین عثمانؓ یعنی سبائیوں کو قتل کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ ٹولہ اس بات کو کیسے قبول کر سکتا تھا۔ لہذا اس نے ام المؤمنینؓ کو گمراہ قرار دینے اور انہیں بدنام کرنے کے لئے ہزار ہا جھوٹی کہانیاں پھیلانیں۔ اس طرح ام المؤمنینؓ کی حیثیت کو گرایا گیا۔ ہمارے مؤرخین جو درپردہ سبائی تھے۔ انہوں نے زیب داستان کے طور پر انہیں اپنی اپنی کتابوں میں جگہ دی اور خاص طور پر ابن جریر طبری نے اس کہانی کو نہایت تفصیل و مبالغہ آرائی کے ساتھ اپنی کتاب میں نقل کیا۔

یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ موروثی صاحبِ مرحوم نے خلافت و ملوکیت میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ تاریخ کے معاملہ میں جرح و تعدیل اور رجال کی چھان بین کی اجازت نہیں دی جاسکتی، ان فنون کا استعمال احکام شرعیہ میں تو درست ہے لیکن اگر تاریخ میں اس کا استعمال کیا گیا تو تاریخ کے دس حصوں میں سے نو حصے ختم ہو جائیں گے۔ لہذا تاریخی واقعات میں سدی، کلبی اور واقعی وغیرم پر اعتماد کلی کیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جب تاریخ کے نو حصے ختم ہو جائیں گے



تو صحابہ کرام پر کھڑا اٹھانے کا موقعہ کیسے دستیاب ہوگا۔ اور پھر کتاب "خلافت و ملوکیت" کیسے وجود میں آتی۔ اُس کے نو حصے برباد نہ ہو جاتے؟ اور مودودی صاحب ان چیزوں کی بقا رہنے کے لئے لازمہ دین تصور کرتے ہیں۔ اسی لئے فرماتے ہیں۔

میں نے اپنی کتاب میں قاضی ابوبکر بن العربی، ابن تیمیہ اور شاہ عبدالعزیز دہلوی کی کتابوں سے اس لئے مدد نہیں لی کہ انہوں نے شیعوں کا رد کیا ہے۔ ان حضرات کی حیثیت وکیل صفائی کی ہے اور وکیل صفائی کے پیش نظر صرف وہ مواد ہوتا ہے۔ جس سے اس کا مقدمہ مضبوط ہو اور ابوبکر بن العربی تو اس میں حد سے تجاوز کر گئے۔ خلافت و ملوکیت ص ۲۲

گویا مودودی صاحب نہ تو اُن اہل سنت علماء کی بات سننا چاہتے ہیں جو شیعوں کا رد کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی حیثیت بھی وکیل صفائی کی ہے اور نہ کسی ایسے شخص کی بات سننا چاہتے ہیں جو ایسی بات کہے جس سے اہل سنت کا مقدمہ مضبوط ہو، کیونکہ ان کی شریعت میں مقدمہ کے فیصلہ کی صورت یہی ہے کہ صرف مدعی کی بات سنی جائے اور مدعا علیہ اگر کچھ کہے تو اسے وکیل صفائی قرار دے دیا جاتے اور اُس کے لئے وہ تمام راہیں بند کر دی جاتیں جس سے وہ مدعی کے دعوے کا رد کر سکے۔ جب کہ دنیاوی لحاظ سے وہ ڈکٹیٹر شپ کی مخالفت کے علمبردار بنے ہوئے ہیں یعنی وہ خود یا تو شیعوں کی بات سنتے ہیں یا ان لوگوں کی سنتے ہیں جو شیعوں کی کسی بات کا رد نہ کریں۔ بالفاظ دیگر انہیں شیعوں کی ہر بات قبول ہے۔ لیکن شیعوں کی کوئی بات قبول نہیں۔ شیعوں کی تو صرف وہی بات قبول کی جاسکتی ہے۔ جو شیعوں کی ہم ذاتی میں ہو تاکہ صحابہ کرام پر دل کھول کر تبرک کیا جاسکے۔ اس صورت میں مودودی صاحب کا مسلک کیا ہے؟ اس کا فیصلہ قارئین خود کر لیں تو بہتر ہوگا۔

ہم یہ واقعہ طبری کے حوالہ سے بالتفصیل پیش کر رہے ہیں۔ کیونکہ مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ طبری نے تمام تاریخی مواد تحقیق کے ساتھ چھان پھٹک کر پیش کیا ہے لیکن اپنی کتاب "خلافت و ملوکیت" میں ایک بھی ایسا واقعہ نقل نہیں کیا، جس میں حضرت علیؑ یا

ان کی اولاد کی ذات پر اعتراض لازم آتا ہو۔ طبری کی اس روایت میں جو ہم پیش کرنے والے ہیں۔ جہاں ام المؤمنینؓ حضرت عائشہؓ کی ذات کو ہدف بنایا گیا ہے۔ وہاں اس روایت میں سودودی صاحب کے معتقد مؤرخ طبری نے حضرت علیؓ کو سادہ لوح، سادہ غرض اور خلافت کا بھوکا بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسی لئے ہم معتقدین سودودی صاحب کو ان کا چہرہ طبری کے آئینہ میں دکھانا چاہتے ہیں۔ طبری لکھتا ہے۔

صفوان بن قیسۃ الاحسی نے عرنی کا یہ بیان ذکر کیا ہے کہ میں اونٹ پر سوار جا رہا تھا کہ میرے سامنے ایک سوار آیا اور مجھ سے سوال کیا کہ اے اونٹ والے کیا تو اپنا اونٹ بیچتا ہے؟

عرنی ہاں

سوار اس کی کیا قیمت ہے؟

عرنی ایک ہزار درہم

سوار کیا تو پاگل ہے؟ کہیں اونٹ ایک ہزار میں بکتا ہے۔

عرنی ہاں، یہ میرا اونٹ ہے

سوار اس میں کیا خوبی ہے؟

عرنی میں نے اس پر سوار ہو کر جب بھی کسی کا پیچھا کیا تو اسے پکڑ لیا۔ لیکن مجھے کبھی کوئی نہ پکڑ سکا۔ اور جب بھی میں اس پر سوار ہو کر بھاگا۔ تو پیچھا کرنے والا مجھے نہ پاسکا۔

سوار تم یہ بھی جانتے ہو کہ ہم یہ اونٹ کس کیلئے خریدنا چاہتے ہیں۔ اگر تمہیں یہ معلوم ہو جائے تو تم کبھی اتنی قیمت طلب نہ کرو۔

عرنی آخر آپ کس کے لئے اونٹ خریدنا چاہتے ہیں؟

سوار تیری ماں کے لئے (ام المؤمنینؓ کہنے سے کس طرح گریز کیا گیا)

عرنی میں اپنی ماں کو تو اپنے گھرنیٹھے چھوڑ آیا ہوں۔ اس کا سفر کا کوئی ارادہ

نہ تھا۔

سوار ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے لئے۔

عرفی تو آپ یہ اونٹ لیجائے۔ اور اب اس کی کوئی قیمت نہیں۔

سوار میں بلا قیمت نہیں لیتا۔ تم میرے ساتھ قیام گاہ تک چلو، میں تمہیں ایک اونٹنی بھی دوں گا اور کچھ درہم بھی دوں گا۔

عرفی کا بیان ہے کہ میں اس سوار کے ساتھ گیا۔ ان لوگوں نے مجھے ایک مہری اونٹنی

دی، اور چار سو یا چھ سو درہم دیئے۔ اس کے بعد اس سوار نے مجھ سے سوال کیا اے عرفی بھائی کیا تم راستوں سے واقف ہو؟

عرفی ہاں میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو دوسروں کو تلاش کر لیتے ہیں۔

(غالباً سراغ رسائی)

سوار تو تم ہمارے ساتھ چلو۔

عرفی کا بیان ہے کہ میں اُنکے ساتھ ہولیا۔ راہ میں جس وادی اور چشمہ سے ہمارا گزر ہوتا

تو یہ لوگ مجھ سے اس مقام کا نام دریافت کرتے۔ چلتے چلتے ہم خَوَّاب کے چشمے پر پہنچے تو وہاں کے کتے ہمیں دیکھ کر بھونکنے لگے۔ ان لوگوں نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کونسا چشمہ ہے؟

عرفی یہ چشمہ خَوَّاب کے نام سے مشہور ہے۔

عرفی کا بیان ہے کہ میرا یہ جواب سن کر حضرت عائشہؓ زور سے چنچیں، اور اپنے اونٹ

کے بازو پر چابک مار کر اسے ہنکایا۔ پھر فرمایا۔ اللہ کی قسم خَوَّاب کے کتوں والی میں ہوں، اے

لوگو مجھے واپس لے چلو، حضرت عائشہؓ نے یہ بات تین بار فرمائی اور اپنا اونٹ ہنکایا۔

لوگوں نے بھی اپنے اونٹ ہنکائے، اوردہ واپس لوٹیں۔ حتیٰ کہ جب اگلاروز ہوا، اور

وہ وقت آیا۔ جس وقت اُن لوگوں کی واپسی شروع ہوئی تھی، تو عبد اللہ بن الزبیرؓ گھبرائے ہوئے

حضرت عائشہؓ کے پاس پہنچے۔ اور چیخ کر بولے، بچاؤ، بچاؤ، علیؓ کا شکر تمہارے سر پر پہنچ

کیا ہے۔

عربی کہتا ہے کہ ان لوگوں نے وہاں سے کوچ کیا۔ اور مجھے بُرا بھلا کہنے لگے۔ میں اُن کے پاس سے واپس چلا آیا۔ تھوڑی دُور چلا تھا کہ حضرت علیؓ اور ان کا لشکر مل گیا۔ اُن کے ساتھ تین سو کے قریب افراد تھے۔ حضرت علیؓ نے مجھے آواز دی کہ اے سوار ادھر آؤ، میں اُن کے پاس گیا تو انہوں نے سوال فرمایا۔ یہ لشکر کہاں ہے؟

عربی فلال فلاں مقام پر مقیم ہے اور یہ اُس کی اُونٹنی ہے۔ میں نے ان لوگوں کے ہاتھ اپنا اونٹ فروخت کیا تھا۔

حضرت علیؓ کیا تم نے بھی اُن کے ساتھ سفر کیا ہے؟

عربی ہاں میں نے اُن کے ساتھ سفر کیا ہے۔ لیکن جب ہم حوаб کے چشے

پر پہنچے تو اُس عورت پر وہاں کتے بھونکنے لگے۔ جس پر اُس عورت نے ایسی ایسی بات کہی تھی۔ لیکن میں نے جب ان میں اختلاف دیکھا تو میں واپس چلا آیا۔ اور یہ لوگ کوچ کر گئے۔

حضرت علیؓ کیا تم ذی قار کا راستہ جانتے ہو؟

عربی ہاں

حضرت علیؓ تو تم ہمارے ساتھ چلو۔

عربی کا بیان ہے کہ میں ان کے ساتھ چلا، حتیٰ کہ ہم ذی قار پہنچ گئے۔ علیؓ نے دواؤمی پکڑا

اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے ملا کر بٹھا دیا۔ اس کے بعد ایک اور شخص طلب کیا گیا اور

اُسے اُن دونوں پر بٹھا دیا گیا۔ پھر حضرت علیؓ اس شخص پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور ایک جانب اپنے

پاؤں ٹکائے۔ اور اللہ کی حمد و ثنا اور درود و سلام کے بعد فرمایا۔ تم لوگوں نے دیکھ لیا کہ اس

عورت نے کیا کیا۔ اور اس قوم نے اس کا ساتھ دیا۔

علیؓ کی یہ بات سُن کر ان کے صاحبزادے حسنؓ کھڑے ہوئے، اور رونے لگے۔

حضرت علیؓ یہ تم لڑکیوں کی طرح کیوں رو رہے ہو؟

حضرت حسنؓ ہاں، میں نے تمہیں ایک بات کا حکم دیا تھا لیکن تم نے میری نافرمانی کی۔ تو تم بھی نہایت مصیبت کے ساتھ قتل کئے جاؤ گے۔ اور تمہارا کوئی حامی و مددگار نہ ہوگا۔

حضرت علیؓ تو نے مجھے جو حکم دیا تھا۔ وہ لوگوں سے بیان کر دے۔

حضرت حسنؓ جب لوگوں نے عثمانؓ کو شہید کیا تھا۔ تو میں نے آپ کو حکم دیا تھا۔ کہ آپ اپنی بیعت کے لئے اس وقت تک ہاتھ نہ پھیلائیے۔ جب تک عرب کے تمام علاقوں کے لوگ آپ کو خلافت پر مجبور نہ کریں۔ اور وہ آپ کے علاوہ کسی کو خلیفہ نہ بنائیں گے۔ لیکن تم نے میرا حکم نہ مانا۔

جس وقت اس عورت اور ان لوگوں نے سراٹھایا۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ مدینہ سے نہ جاؤ۔ اور اپنے ان شیعوں کے پاس جو تمہاری بات قبول کرتے ہیں اپنے پینا مبر بھیج دو۔

حضرت علیؓ اس نے سچ کہا۔ لیکن اللہ کی قسم میں بھوپکی طرح کمزور بنتا نہیں چاہتا۔

..... واقعہ یہ ہے کہ جب بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔ تو میں اپنے سے زیادہ کسی کو خلافت کا حقدار نہ سمجھتا تھا۔ لیکن لوگوں نے ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ تو جیسے لوگوں نے ابوبکرؓ کی بیعت کی تھی تو میں نے بھی ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ پھر ابوبکرؓ ہلاک ہو گئے۔ اُس وقت بھی

میں اپنے سے زیادہ کسی کو حقدار نہ سمجھتا تھا۔ لیکن لوگوں نے عمرؓ کی بیعت کر لی۔ پھر عمرؓ بھی ہلاک ہو گئے۔ اور انہوں نے چھ آدمیوں میں سے ایک مبر مجھے منتخب کیا۔ لیکن اس وقت بھی لوگوں

نے عثمانؓ کی بیعت کر لی۔ جس کی وجہ سے میں نے بھی بیعت کر لی۔ پھر لوگوں نے عثمانؓ کے خلاف بغاوت کی، اور اسے قتل کر دیا۔ اور میرے پاس خوشی سے بیعت کے لئے آئے۔ میں

نے کسی پر زبردستی نہیں کی.... تو اب جو شخص بھی میری اور ان لوگوں کی مخالفت کرے گا جو میرے متبع ہیں تو میں اس سے جنگ کر دوں گا۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ میرے اور ان کے درمیان

فیصلہ فرمادے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ تاریخ طبری مترجم ج ۳ - ۲۔  
 اس افسانہ کے بارے میں کچھ لکھنے سے قبل ہم یہ بتانا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ طبری کے  
 اس حصہ کا ترجمہ میرا ہی کیا ہوا ہے۔ جو تقریباً پچیس سال سے نفیس اکیڈمی سے شائع ہو رہا ہے۔  
 میں نے ترجمہ کرتے وقت حتی الامکان اس امر کی سعی کی تھی کہ طبری کے قلم سے نکلا ہوا کوئی لفظ  
 ایسا نہ بچے۔ جس کا ترجمہ نہ کیا جائے۔ تاکہ کوئی مجھ پر کٹر بیونت کا الزام قائم نہ کرے۔ ساتھ  
 ساتھ میں نے ہر ہر روایت کی تحقیق و تنقید بھی کی تھی۔ لیکن نفیس اکیڈمی نے اپنے تجارتی مفادات  
 کو پیش نظر رکھتے ہوئے، اُن تنقیدات کو شائع نہیں کیا۔ جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی  
 یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ بقول مودودی صاحب اس پر تنقید بھی جائز نہیں۔ کیونکہ ان  
 کے نزدیک طبری اہل سنت کے ایک سلمہ امام ہیں۔ اور انہوں نے ہر روایت تحقیق و تنقید  
 کے ساتھ نقل کی ہے اور تاریخی روایات پر تنقید کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ لیکن اس روایت  
 میں جو حضرت علیؑ کا کردار پیش کیا گیا ہے۔ وہ تو خالص آمرانہ ہے۔ انہیں صرف امیر معاویہؓ  
 کے سلسلہ میں تو اس قسم کی روایات نظر آئیں۔ لیکن اپنے جد امجد کے بارے میں جو روایات تھیں  
 وہ تمام نظر انداز کر گئے۔ کیا یہی وہ نظام عدل ہے جس کا پرچار جماعت ہر وقت کرتی رہتی ہے  
 اگر ہم طبری کی مزید روایات پیش کریں گے تو آپ ہی لوگ گھبرا جائیں گے۔ ہم پر اُن روایات  
 کا کوئی اثر نہ ہو گا۔

اس افسانہ کو ابتداء سے انتہا تک ایک بار پھر پڑھیے، اور سوچئے کہ اس قسم کی روایات وضع  
 کرنے والے کس قسم کے افراد ہوں گے۔ جن کے پیش نظر نہ حضرت علیؑ کی عزت ہے اور نہ  
 ام المؤمنینؑ کا احترام۔ ظاہر ہے کہ ان افسانہ پردازوں کی نظر میں اسلام دشمنی کے باعث سب  
 کا ایک مقام ہے اور ان لوگوں کا مقصود صرف اتنا ہے کہ صحابہ کو بدنام کر کے اسلام سے عداوت  
 نکال دیا جائے۔

اگرچہ اردو مؤرخین اور ملاحین نے یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس حال کی اکیڈمی نے حصہ نہ لیا۔

عائشہؓ کی ہجو سے متعلق تھا۔ اسے تو ہر جگہ بیان کیا۔ لیکن آخری حصہ جس کا تعلق حضرت علیؓ سے تھا۔ وہ شیر مادر سمجھ کر پئی گئے۔

اس روایت میں کیا کیا عیوب پوشیدہ ہیں۔ انہیں ایک ذرا سرسری سی نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔  
 ۱۔ اول تو پہلے ہم یہ عرض کر دیں کہ ہمیں انسانی سیر کی تعمیر کا یہ طریقہ بہت پسند آیا۔ اسے ایک تاریخی شاہکار قرار دیا جاسکتا ہے۔ کاش آج کل کوئی مولوی بھی اس طریقہ پر عمل کر کے دکھائے۔  
 ۲۔ ام المؤمنینؓ کا جہاں بھی تذکرہ کیا گیا۔ وہاں یہ الفاظ استعمال کئے گئے۔ یہ عورت اور وہ عورت۔ جو اس امر کا بین ثبوت ہے کہ طبری اور اس کے راوی نہ صرف سبائی ہیں۔ بلکہ ان کے ذہن خباثتوں سے معمور ہیں۔ جب کہ مودودی صاحب طبری کے بارے میں لکھتے ہیں۔  
 طبری نہ صرف ثقہ بلکہ وہ ائمہ اسلام اور ائمہ اہل سنت میں شمار ہوتے ہیں۔ جن کی اقتدا کی جاتی ہے۔ ان کے بارے میں یہ تصور کہ وہ بغیر چھان پھٹک کے کوئی روایت قبول کریں گے۔ یہ ممکن نہیں۔ خلافت و ملکیت ص ۳۱۳۔

افسوس تو یہی ہے کہ ہمارے علماء نے حسن ظن سے کام لیتے ہوئے ہر کتاب کے بارے میں یہی تصور قائم کر لیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم داستانوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ خیر لفظ مودودی صاحب طبری نے یہ روایت بھی چھان پھٹک کر نقل کی ہے۔ لہذا ہم کہنے پر مجبور رہیں گے کہ آپ کا ام المؤمنینؓ کے بارے میں مسلک وہی ہے جو آپ کے آباؤ اجداد کا تھا۔

۳۔ حضرت علیؓ ابتدائی سے خلافت کے متمنی تھے لیکن ان کا بس نہ چل سکا اور جب ان کو ایک پارٹی مل گئی تو ہر اس ہستی کو جس و خاشاک کی طرح بہانے کے لئے تیار ہو گئے۔ وہ ان کی راہ میں حائل ہو۔ بالفاظ دیگر حضرت علیؓ نے جتنی جنگیں لڑیں۔ وہ اپنے اقتدار کے لئے مڑی ہیں۔

۴۔ یہ بھی مودودی صاحب کی فرضی خلافت راشدہ کا اصول ہے کہ باپ کے بجائے بیٹا باپ کو حکم دیتا ہے۔

۵۔ اس روایت سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ حضرت حسنؓ حضرت علیؓ سے نہ صرف زیادہ سمجھ دار تھے بلکہ غلط بھی تھے۔ جب کہ اس روایت کی رد سے حضرت علیؓ ان دونوں نعمتوں سے محروم تھے۔ استغفر اللہ۔

۶۔ اس کہانی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مکہ سے ام المؤمنینؓ بغیر سواری کے چل دی تھیں راہ میں اتفاقاً عربی مل گیا جس سے اونٹ خریدا گیا۔ تب ام المؤمنینؓ کو سواری میسر آئی اگرچہ عربی نہ ملتا تو بقول اس داستان گو کے انہیں بصرہ تک پیدل ہی سفر کرنا پڑتا۔ جب کہ طبری ص ۷۵ پر لکھتا ہے کہ جب ام المؤمنینؓ نے کوچ کا ارادہ کیا۔ تو یحییٰ بن مینہ نے ایک اونٹ انہی دینار میں خریدا کرام المؤمنینؓ کو پیش کیا۔ اس اونٹ کا نام عسکر تھا اور چھ سواونٹ لشکر کے لئے بدیہ دئے۔

۷۔ اس کہانی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ام المؤمنینؓ ایک عام دیہاتی عورت کی طرح خود اونٹ ہٹا رہی تھیں۔ حالانکہ ام المؤمنینؓ کے لئے اُن کے اونٹ پر پردے کا انتظام کیا گیا تھا اور فداکار اُن کے اونٹ کی ہمارے پڑے چل رہے تھے اور کہتے جاتے تھے۔

یا امنا خیر ام نعام  
اے ہماری ماں، ہم جلتے ہیں آپ  
بہترین ماں ہیں۔

۸۔ بقول عربی اونٹ کے بدلے نقد رقم اور ایک اونٹنی دی گئی۔ جب قافلہ میں پہلے سے ایک اونٹنی موجود تھی اس کو اونٹ سے تبدیل کرنا چاہے معنی دار ہے؟

۹۔ کتوں کی یہ فطرت ہے کہ وہ اجنبی پر بھونکتے ہیں۔ وہ شخصیتیں دیکھ کر نہیں بھونکتے۔ لیکن اس روایت کے راوی یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اپنی فطرت کے خلاف صرف ام المؤمنینؓ پر بھونکے تھے۔ اُس سے قبل یا اُس کے بعد تاریخ میں کبھی کتے نہیں بھونکے۔ یا حوَّاب کے



کتوں کی یہ صفت خاصہ تھی کہ وہ کسی پر نہ بھونکتے تھے۔ بلکہ انہیں صرف ام المؤمنینؓ کے لئے مامور کیا گیا تھا۔

۱۔ ام المؤمنینؓ کو راہبری کے لئے عرنی کے علاوہ کوئی نہ ملا۔ حالانکہ خود طبری یہ بیان کرتا ہے کہ بصرے کے عامل عبداللہ بن عامر کی تجویز کے مطابق بصرہ کے بلوائیوں کی سرکوبی کے لئے آپ نے بصرہ کا رخ کیا۔ آپ کے ساتھ عبداللہ بن عامر بھی تھے۔ وہ راستے کی منزلوں سے خوب واقف تھے۔ بلکہ انہوں نے اس راہ میں اپنے زمانہ گورنری میں حاجیوں اور مسافروں کی سہولت کے لئے جگہ جگہ حوض اور کنوئیں تعمیر کرائے تھے۔ مقام بستان ابن عامر جو آج تک موجود ہے ان سے منسوب ہے۔ عبداللہ بن عامر اور ان کے ساتھیوں کی موجودگی میں ایک مجہول اور نامعلوم شخص کو راہبری کے لئے پکڑنا سراسر فریب ہے۔

۱۱۔ مکہ سے بصرہ تک اکیس منزلیں ہیں۔ قدیم مورخ ابوالفرج قدامت بن جعفر المتوفی ۲۹۰ نے تمام ممالک اسلامیہ کے تمام اہم مرکزی مقامات، راستوں اور منزلوں کے نام درج کئے ہیں۔ مکہ سے بصرہ تک جتنی منزلیں ہیں اس میں کسی منزل کا نام الحواب نہیں۔ اور مورخ قدامت بن جعفر طبری سے پہلے گزرا ہے۔

۱۲۔ جب راہ میں اکیس منزلیں ہوئیں تو کیا کسی اور منزل پر کتوں کا وجود نہ تھا۔ اور اگر وجود تھا تو کیا انہیں نہ بھونکنے کی تلقین کر دی گئی تھی۔ تاکہ حواب کی کہانی وضع کی جاسکے۔

یہ تو وہ خامیاں ہیں جو روایت کے الفاظ ہی سے ظاہر ہو رہی ہیں۔ لیکن آئیے اب اس کے رادیوں پر بھی کچھ نظر ڈال لیں اور علم الرجال کی رو سے دیکھیں کہ اس روایت کا کیا مقام ہے۔ اگرچہ مودودی صاحب کے نزدیک تاریخ میں یہ شجر ممنوعہ ہے۔ لیکن ہم حکم قرآنی کے آگے مجبور ہیں۔ ہم قرآن کی ہرگز خلافت درزی نہیں کر سکتے۔ ارشاد الہی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن  
جَاءَكُمُ فَاسِقٌ بِنَبَأٍ قَبِيحٍ  
اسے ایمان والو! اگر تمہارے پاس  
کوئی فاسق خبر لے کر آئے تو ان کی

أَنْ تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ      تحقیق کر لیا کرو، تاکہ تم کہیں جہالت  
فَتُصِيبُوا عَلَى مَا فَعَلْتُمْ      میں کسی قوم کو نقصان نہ پہنچاؤ اور پھر  
شِدِّ مِئِنَّةٍ      تمہیں اُس پر ندامت اٹھانی پڑے۔

اور چونکہ ہم دنیا و آخرت میں نادم نہیں ہونا چاہتے۔ لہٰذا اس روایت کے ایک ایک راوی کا حال تاریخین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اس روایت کا پہلا راوی اسمعیل بن موسیٰ الغراری ہے۔ جس سے طبری یہ روایت نقل کر رہا ہے۔

اسماعیل بن موسیٰ الغراری | امام ذہبی میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں۔ یہ کوفہ کا باشندہ ہے۔ سترے کذاب کا بھانجا ہے۔ ترمذی

ابوداؤد اور ابن ماجہ نے اس سے روایت لی ہیں لیکن بخاری، مسلم اور نسائی نے اس کی روایت نہیں لی۔ ابوحاتم کہتے ہیں سچا ہے۔ نسائی کہتے ہیں اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ابن عدی لکھتے ہیں حدیثیں کو اس پر سخت اعتراض ہے کیونکہ یہ غالی شیعہ تھا۔ عبدان کا بیان ہے کہ ہم اس کے پاس روایات سننے جایا کرتے تھے۔ تو ہمیں ابوبکر بن ابی شیبہ اور ہناد نے اس سے منع کیا۔ اور فرمایا کہ تم اس فاسق کے پاس جاتے ہو جو صحابہ کو گالیاں دیتا ہے۔ میزان ج ۱ ص ۲۵۵۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں گو اسے سچا کہا جاتا ہے۔ لیکن اس پر رافضی ہونے کا الزام ہے۔ روایت میں غلطیاں بھی کرتا ہے۔ ۲۴۵ میں اس کا انتقال ہوا۔ تقریب ص ۲۵

دوسرا راوی علی بن عابس الازرق ہے۔ حافظ ابن حجر اس علی بن عابس الازرق | کے بارے میں لکھتے ہیں۔ یہ کوفہ کا باشندہ ہے، ضعیف

ہے۔ ترمذی نے اس سے روایت لی ہے۔ تقریب ص ۲۴۷

امام ذہبی لکھتے ہیں۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے یہ کچھ نہیں۔ جوزجانی، نسائی اور ازدی کہتے ہیں یہ ضعیف ہے ابن حبان کا بیان ہے کہ یہ فحش غلطیاں کرتا ہے۔ اس باعث اس کی روایت ترک کر دی گئی۔ میزان۔

تیسرا راوی ابو الخطاب البجری ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ مجہول انسان ہے۔  
تقریب ص ۷۴

چوتھا راوی صفوان بن یزید ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں یہ بھی مجہول ہے۔ لسان  
المیزان ج ۳ ص ۱۹۲۔

آخری راوی عریٰ ہے۔ ن کون نام نہیں۔ بلکہ یہ قبیلہ عریٰ کی جانب نسبت ہے۔  
اس سے کون شخص مراد ہے۔ اس کا نام دہنہ کیا ہے۔ کس جگہ کا باشندہ ہے، کب پیدا ہوا  
کب مرا، آیا عالم وجود میں بھی آیا تھا یا نہیں؟ تاریخ اور رجال کی کتابیں اس سے خاموش ہیں  
ہم نے رجال کی جوچھان بین کی تو اس سے پتہ چلا کہ عریٰ کی نسبت سے منسوب دو شخص ہیں  
ایک حسن بن عبد اللہ العریٰ ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے مرسل روایات نقل کرتا ہے۔  
جو تحفہ طبع سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نے کسی صحابی کو نہیں دیکھا۔

دوسرا قاسم بن حکیم بن کثیر العریٰ ہے۔ یہ بھی ضعیف ہے تقریب ص ۲۶۸۔ اس کا  
انتقال ۲۸۵ھ میں ہوا۔ اور یہ واقعہ ۳۶۱ھ کا ہے۔ اور اگر عریٰ نسبت رکھتے والا کوئی اور شخص  
ہے تو وہ امام غائب کی طرح غائب ہے الغرض اس کہانی کے تین راوی مجہول۔ ایک ناقابل  
اعتبار اور ایک رافضی ہے۔ خود ہی قارئین اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس روایت کا کیا حال ہوگا۔

اب اصل حقیقت حکیم فیض عالم شہید کے الفاظ میں سینے حکیم صاحب ایک جید اہل حدیث عالم  
تھے جو ایک عرصہ دراز سے شیعہ کے خلاف نبرد آرمار ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف  
فرمائیں۔ اندازہ سخن حقائق کا پردہ چاک کیا جنہیں کچھ عرصہ پیشتر عین دوپہر کے وقت محلہ مستریاں  
شہر جہلم کی مسجد المحدثہ کی گیلری میں تنہا پا کر گولیوں کی بوچھاڑ سے شہید کر دیا۔ جنگ لاہور ۲۵ ستمبر ۱۹۴۷ء  
اس طرح حکیم صاحب نے عظمت صحابہ کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

شیعوں کی وضعی اور من گھڑت روایات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بصرہ کے راستہ  
میں ایک مقام حوالبہ نام المومنین حضرت عائشہؓ پر کتے بھونکے۔ نو اُس نے پوچھا یہ کون

سامقام ہے، جواب ملا کہ جواب۔ آپ نے فرمایا مجھے واپس کر دو۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا تھا کہ تم میں سے وہ کون ہوگی جس پر جواب کے کتے بھونکیں گے۔ طبری نے اپنے تفسیر کی آڑ میں اس پر پورا کیا۔ باب باندھا ہے۔ اس روایت کا خالق ہی ابو مخنف (لوطن بنی) ہے جس نے کربلا کے واقعہ سے ۱۲۵ سال بعد کربلا کے واقعات تراشے اور جس کے متعلق "تجانبہ اعظم" کے شیعہ مصنف کو بھی لکھنا پڑا کہ ابو مخنف کا لکھا ہوا کوئی واقعہ صدائے معیار پر پورا نہیں اُترتا۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ ۳ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو ایک سریہ پر متعین کر کے بنو فزارہ کی طرف بھیجا۔ اس سریہ میں ام قریظہ نامی ایک عورت معہ اپنی بیٹی ام زمل سلمیٰ کے ساتھ گرفتار ہو کر آئی۔ ام قریظہ واجب نفس تھی۔ وہ اپنے انجام کو پہنچی۔ سکرام زمل سلمیٰ لونڈی کی حیثیت سے ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو دیدی گئی۔ آپ نے اسے آزاد کر کے اپنے پاس رکھ لیا۔ ایک روز چند عورتیں مع ام زمل سلمیٰ کے آپ کی خدمت میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ کنبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور آپؐ نے فرمایا تم میں سے وہ کون ہوگی، جس پر جواب کے کتے بھونکیں گے۔ پھر یہ عورت اپنی قوم میں چلی گئی، اور مرتد ہو گئی۔ یا قوت حموی، معجم البلدان ج ۲ ص ۳۵۲۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں جب مختلف قبیلوں نے بغاوت کی، تو چنیٹا طالع آزمائوں نے نبوت کا دعویٰ کیا۔ جن میں طلحہ بن خویلد اسدی بھی تھا۔ غطفان ہوازن اسد اور طے کے قبائل کے بہت سے لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ حضرت عائشہؓ نے انہیں شکست فاش دی، اور ان کی قوت کو منتشر کر دیا۔ ام زمل سلمیٰ اس لشکر میں موجود تھیں۔ جس کے دل میں اپنی ماں کے قتل کا کینہ بھرا ہوا تھا۔ طلحہ بھاگ کر یمن چلا گیا۔ غطفان، سلیم اور ہوازن وغیرہ قبائل کے بچے کچھے لوگ خواب کے مقام پر جمع ہوئے۔ اور انہوں نے اسی سلمیٰ بنت مالک کو اپنا سرور بنالیا۔ حضرت خالدؓ کو معلوم ہوا تو وہ اس طرف سو بہا۔ سلمیٰ اپنے لشکر کو لے

کر مقابلہ پڑائی۔ تو اس کی ناقہ کی کوئیں کاٹ ڈالی گئیں۔ ناقہ گری اور سلمیٰ مقتول ہوئی۔ تاریخ  
اسلام، امیر نجیب آبادی ج ۱ ص ۲۹۲

(یہ بھی غور و فکر کا مقام ہے کہ جنگ جمل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے حضرت  
عائشہ رضی اللہ عنہا کے اونٹ کی کوئیں کاٹیں اور انہیں اونٹ سے گرانے کی کوشش کی۔ لیکن ان کے فرزند  
نے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر کے ام المؤمنین کی جان کو محفوظ رکھا۔ غالباً یہ سب حرکات اسی  
لئے انجام دی گئی تھیں کہ ان پر خواب کی کہانی چسپاں کی جا سکے یعنی اس کہانی کو ثابت کرنے  
کے لئے عملی ثبوت بھی فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔)

خواب کے کتے بھونکنے کا اشارہ اسی ام زمل سلمیٰ کی طرف تھا۔

فكانوا يرون انها للستي      مؤرخین کا کہنا ہے کہ بنی کریم صلی اللہ  
غابها النبي صلى الله عليه      علیہ وسلم نے حواری سے اسی عورت  
وسلم - معجم البلدان للحموي ص ۲۵۲ ج ۲ - کو مراد لیا تھا۔

ابو مخنف کی بیان کردہ سند کے علاوہ طبری نے اپنی طرف سے سلسلہ روایت بیان کر  
کے اس روایت کو صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ یعنی اسمعیل بن موسیٰ انصاری، علی بن  
عابس، ابوالخطاب البجری، اور صفوان بن قیسۃ الاحمسی اس کی سند کے راوی ہیں۔ پہلا  
راوی اسمعیل بن موسیٰ انصاری ہے جو بقول امام ذہبی غالی شیعہ اور فاسق تھا۔ جو سلف صحابہ  
پر سب کرتا تھا ۱۴۵ھ میں مراہمیزان الاعتدال ج ۱ ص ۱۱۱

مگر طبری ۲۲۴ھ میں طبرستان میں پیدا ہوا۔ یہ طبری ہی کا کال ہے کہ پیدا ہونے سے تقریباً  
اسی سال پہلے طبرستان سے کوفہ پہنچا۔ اور مرے ہوئے اسماعیل سے اس روایت کی عتاقی۔  
(ہمارے نزدیک یہاں حکیم صاحب کو مغالطہ ہوا ہے۔ اسمعیل کا انتقال ۱۴۵ھ میں نہیں

بلکہ ۲۴۵ھ میں ہے۔ ہم نے خود میزان کا مطالعہ کیا ہے۔ اس میں ۲۴۵ھ ہے۔ ابن حجر نے  
تقریب میں بھی ۲۴۵ھ لکھا ہے۔ پھر یہ امام ترمذی کے استادوں میں شامل ہے۔ اور ترمذی

۲۹ میں پیدا ہوئے اور ان کا انتقال ۲۷۹ میں ہوا۔

دوسرا راوی علی بن عابس ہے جو بقول نسائی ضعیف ہے۔ تیسرا راوی ابو الخطاب  
الہجری بقول حافظ ابن حجر مجہول ہے (تہذیب التہذیب)  
ان مجہولوں کا سلسلہ اسناد و عمریہ قبیلہ کے کسی نامعلوم الاسم اونٹ والے پرنسپی  
بڑا ہے۔ جس سے ام المؤمنینؓ کی سواری کے لئے اونٹ خریدا گیا اور پھر اسے ہی ربی کے  
لئے ساتھ رکھا۔

کتنی حیرانی کا مقام ہے کہ ام المؤمنینؓ جیسی بلند مرتبہ سستی ایک عظیم ترین سفر پر روانہ ہو  
رہی ہیں۔ اور ان کے پاس سواری ہے نہ راہبر۔ وہ سواری کے لئے اونٹ خریدتی ہیں  
اور اونٹ والے ہی کو اپنا بدرقہ بنا لیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایسی بے سرو پا بانٹنے والوں کو ہلاکت  
اصل واقعہ یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ہزاروں کی جمعیت تھی۔ جن میں سے اکثر اسی علاقے  
کے رہنے والے تھے اور ملک کے چپہ چپہ سے واقف تھے۔ مگر شیعہ بزرگین ظاہر کر رہے  
ہیں کہ گویا ایک معمولی قسم کی عورت گھرنے نکلتی ہے اور دوران سفر اونٹ خریدتی ہے۔ اسی اونٹ  
والے کو راستہ بتانے کیلئے ساتھ لیتی ہے۔ اصل واقعات کو اس طرح سوتیلانہ انداز میں بیان  
کرنا شیعوں کے لئے نہ صرف جائز بلکہ باعث ثواب ہے۔ مگر اہل سنت عالموں کی عقل و خرد  
علم و فضل اور سوجھ بوجھ کو کسی بخبوط الحواس کے گدھے چمگتے ہیں۔ جو آئے دن نہایت دل سوزی  
درد مندی اور مایوسانہ سے انداز میں محراب و منبر سے یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ کاش حضرت عائشہؓ  
بصرہ کا سفر نہ کرتیں اور آپ پر خواب کے کتے نہ بھونکتے۔ کوئی ان عقول کے گردلوں سے  
پوچھے کہ اگر تمہیں اصل واقعہ کا پتہ نہیں تو اس درد مندی کے ہلکان میں مبتلا ہونے کے لئے تمہیں  
کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ جب تک تم اس واقعہ سے اپنے مواعظ حسنہ کو زینت نہ دو گے  
تو تمہیں کھایا پیا ہی مضم نہ ہوگا۔

اصل بات یہ ہے کہ بصرے کے عامل عبداللہ بن عامر کی تجویز سے ام المؤمنینؓ اس سفر

پر روانہ ہوئی تھیں، عامل موصوف کی فوج کا ایک دستہ آپ کے ہمراہ تھا۔ اور یہ راستہ کوئی نامعلوم راستہ نہ تھا۔ بلکہ ایک شاہراہ تھی جس پر دن رات قافلے چلتے رہتے تھے۔ اور تمام راستے میں حاصیوں اور مسافروں کی سہولت کیلئے خوض اور کنویں تعمیر کرائے گئے تھے۔ مقام ہستان ابن عاصم آج تک ابن عاصم کی جانب منسوب ہے۔

ام المؤمنینؓ کی سواری کے لئے کس صحرا میں کس بدوسے کس شخص نے اونٹ خریدا؟ کیا ام المؤمنینؓ گھر سے پیدل ہی عازم سفر ہوئی تھیں؟ ایک معمولی آدمی تو گھر سے پورا ساز و سامان لے کر نکلے مگر ام المؤمنینؓ کی سواری کے لئے راستے میں سواری خریدی جاتے۔ ان کی سواری میں مسکرنام کا بہترین اونٹ تھا۔ جو حضرت یعلیٰ بن مینہ نے پیش کیا تھا۔ معارف ابن اثیر ص ۱۲۔ مکہ سے بصرہ تک ایسے منزلیں تھیں۔ مؤلف قدامتہ بن جعفر المتوفی ۲۹۰ نے کتاب الخراج و صنعتہ الکتابہ میں اس دور کے تمام اہم راستوں کی منازل لکھی ہیں۔ مگر ان منازل میں خواب نام کی کوئی بستی سرے سے نہیں۔

کتنے کثر قافلوں اور مسافروں پر بھونکتے رہتے ہیں۔ اگر کتے کہیں بھونک بھی گئے تو صرف طبری اور اس کے مجہول راویوں کو نظر آئے کہ یہ خواب کا مقام ہے۔ اور حضرت عائشہؓ پر کتے بھونک رہے ہیں اور بعد میں آنے والے مؤرخ طبری کی اس ہرزہ سرائی اور زیادہ گوئی کو نقل کرتے چلے گئے۔ انہیں وہ تمام احادیث بھول گئیں جو ام المؤمنینؓ کے لئے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہیں۔

چاہتے تو یہ تھا کہ علمائے اہل سنت شیعوں کی اس بدگوئی سے حرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی محبوبہ زوجہ حقیقی اہل بیت جن کے خلاف میں آرام فرمانے کی حالت میں بھی حضور پر وحی نازل ہوتی رہی، جن کو یا حمیر کہہ کر مخاطب کیا جاتا رہا۔ ان کا دفاع کرتے مگر آج اس واقعہ پر مناسفانہ انداز میں گفتگو کی جاتی ہے اور یہ نہیں کہا جاتا کہ یہ واقعہ سرے سے ہی غلط بیست کی سازش نے بڑی بڑی جلیل القدر ہستیوں کے دماغوں میں غلط اسط نظریات ڈھونڈنا نہیں

کسی امر کی حقیقت سمجھنے سے دور پہنچا دیا ہے۔  
حکیم صاحب آگے تحریر فرماتے ہیں۔

عوام کا لوگ لکھ ہی بے سود ہے۔ اہل سنت کے تمام فرقوں کے مسلمہ بزرگ حضرت شاہ ولی اللہ بھی اس تسامح کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ ازالۃ الخفایں انہوں نے بھی ابوالعلی کے حوالہ سے جواب کے کتے بھونکنے کی جھوٹی روایت کو قیس بن ابی حازم المتوفی ۹۸ھ کی سند سے نقل کر دیا ہے۔ جسے یحییٰ بن سعید نے منکر الحدیث کہا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسرائیلیات کی طرح شیعہ تحریک کی وضع کردہ روایات آج اس طرح اصل میں غلط ملط ہو کر رہ گئی ہیں۔ جس طرح انگلیوں کے گوشت میں ناخن پیوست میں حقیقت مذہب شیعہ از ص ۱۴۵ تا ص ۱۴۹

شاہ ولی اللہ نے قیس بن ابی حازم والی جو روایت نقل کی ہے تو امام ذہبی نے میزان میں اسے منکر قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ محدثین کو قیس پر جو اعتراض ہے وہ اسی بیہودہ روایت کے باعث ہے۔ امام یحییٰ بن سعید نے اس کی متعدد روایات کو منکر قرار دیا ہے۔ اسمعیل بن ابی خالد کا بیان ہے کہ ان کی عمر سو سال سے زیادہ ہو گئی تھی۔ اور بڑھاپے کے باعث دماغ ٹھیکھا گیا تھا۔ یہ حضرت علیؓ پر سخت اعتراضات کیا کرتا تھا۔ میزان ج ۳ ص ۲۹۲ غالباً اسی لئے کہ اس روایت کا آخری حصہ حضرت علیؓ سے متعلق ہے۔

آخر میں یہ بات بتانی بھی ضروری ہے کہ ام المؤمنینؓ نے یہ سفر مکہ سے فرمایا ہے ظاہر ہے کہ مدینہ سے مکہ حج کے وقت کسی سواری ہی پر تشریف لے گئی ہوں گی۔ انہیں راہوں میں اونٹ خریدنے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ حضرت عیسیٰ بن مینہ نے ام المؤمنینؓ سے اظہار محبت کی خاطر عسکر نامی اونٹ خرید کر پیش کیا۔

طبری نے اس سلسلہ میں جو متضاد روایات پیش کی ہیں۔ اگر انہیں پیش کیا جائے تو مضمر بہت طویل ہو جائے گا۔ وہ اسی قسم کی متضاد روایات پیش کرنے کے عادی ہیں تاکہ اہل



سنت بھی خوش رہیں اور سبائی برادری بھی۔ اور کسی مقام پر بھی اپنی رائے کا اظہار نہیں کرتے اور بہت سے صوفیاء نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا۔

عمر باسماں اللہ اللہ بابر بن رام رام

## حضرت عمرؓ کا اپنے بیٹے کو کوڑے مارنا

یہ داستان بھی ہر شخص کی زبان پر جاری ہے بلکہ اچھے اچھے لوگ حضرت عمرؓ کا عدل و انصاف ثابت کرنے کے لئے ہر سبب سے کہانی کو پیش کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس داستان میں جو نہر بھرا ہوا ہے۔ اس سے غوام تو کیا واقف ہوتے، ہمارے علماء کی بھی اس پر نظر نہیں جاتی۔ یہ داستان ایک فریب اور غلاطت کا ڈھیر ہے۔ جس پر سونے کا ورق چڑھا دیا گیا ہے اور ہر شخص صرف اس سونے کے ورق کو دیکھ رہا ہے۔ کوئی اس غلاطت کو کرید کر دیکھنے کے لئے تیار نہیں۔

اس عدل و انصاف کے پردے میں جہاں حضرت عمرؓ کے صاحبزادے کو بدکاریاں کیا گیا ہے، وہاں ساتھ ساتھ حضرت عمرؓ کو احکام شریعت سے جاہل اور ظالم و جاہل بنا کر دکھایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس رام کہانی میں اتنا زبردست اختلاف اور تضاد ہے کہ جس کا رفع ہونا قیامت تک ممکن نہیں کسی فریب کار نے اسے مختصراً بیان کیا ہے اور کسی نے تفصیلاً ہم یہ تمام کہانیاں ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

پہلی روایت سعید بن مسروق کی جانب منسوب ہے۔

سعید کا بیان ہے کہ ایک عورت حضرت عمرؓ کے گھر میں آتی جاتی تھی، اس کے ساتھ ایک بچہ بھی ہوتا۔ ایک روز حضرت عمرؓ نے اس سے اچانک سوال کیا کہ یہ تیرے ساتھ کس کا بچہ ہے؟ بولی یہ آپ کے لڑکے ابو شحمہ کا بیٹا ہے۔ جس نے میرے ساتھ غلط حرکت کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے ابو شحمہ کو بلوایا۔ اس نے اقرار کیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت علیؓ سے فرمایا اس کے کوڑے مارو، الغرض بیچاس کوڑے حضرت علیؓ نے لگائے اور بیچاس کوڑے خود حضرت عمرؓ نے مارے۔ اس کے بعد اس لڑکے کو حضرت عمرؓ کے سامنے لایا گیا۔ وہ دم توڑ رہا تھا کہنے لگا۔ اے میرے باپ آپ نے مجھے قتل کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا جب تو اللہ عزوجل سے ملاقات کرے تو بارگاہِ الہی میں عرض کرنا کہ تیرا باپ حدودِ الہی کو قائم رکھتا ہے۔

یہ واقعہ مختلف صورتوں میں مروی ہے اور ہر ایک قصہ گو نے اپنے اپنے تخیل کے مطابق اس میں رنگ آمیزی کی ہے۔ جس کی تفصیل اسدہ سطور میں پیش کی جائے گی۔ لیکن اس مختصر سی روایت سے جو جو امور سامنے آ رہے ہیں پہلے وہ سن لیجئے۔

۱۔ یہ گناہ عورت ایک عرصہ تک اپنے بچہ کو لے کر حضرت عمرؓ کے گھر آتی جاتی رہی۔ اور حضرت عمرؓ کے سوال کرنے سے قبل اتنے عرصہ تک اس نے کسی پر یہ ظاہر نہیں کیا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟

۲۔ یہ عورت شادی شدہ تھی، اگر کنواری ہوتی تو بچہ پیدا ہوتے ہی لوگ اس سے پوچھ گچھ شروع کر دیتے لیکن یہاں معاملہ ایسا نہیں ہے۔

۳۔ عورت کا بچہ کو لے پھرنا اور پھرنا سوش رہنا اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ جرم میں برابر کی شریک تھی۔ لہذا فردِ جرم اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ کنواری تھی تو اس کے بھی سو کوڑے لگنے چاہئیں تھے۔ اور اگر وہ شادی شدہ تھی تو اسے سنگسار کرنا چاہیئے تھا اور یہاں ان میں سے کوئی صورت عمل میں نہیں آئی۔ گویا راوی یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حضرت

عمر رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام اتنے لاعلم لوگ تھے کہ ایسے معمولی دینی مسائل سے بھی واقف نہ تھے۔ اسی لئے سب صحابہ خاموش رہے۔

۴۔ اگر اس عورت کے ساتھ زبردستی کی گئی تھی تو اسی وقت اس عورت نے حضرت عمرؓ کے سامنے پیش ہو کر دعویٰ کیوں نہیں کیا۔ پہلے تو زنا ماہ تک یہ گناہ پیٹ میں چھپائے بیٹھی رہی۔ پھر بچہ پیدا ہونے کے بعد یہ گناہ کی پوٹلی لئے پھرتی رہی۔

۵۔ یہ عورت کون تھی۔ اس کا نام کیا تھا۔ کس خاندان سے تعلق رکھتی تھی اور کہاں کی رہنے والی تھی؟ یہ امور کوئی راوی بیان نہیں کرتا۔ ہمارے خیال میں یہ کوئی ایرانی النسل ہوگی جو حضرت عمرؓ کے صاحبزادے پر حرج جاری کرانے کے لئے دجود میں لائی گئی ہوگی۔

۶۔ حضرت ماعزؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں غلطی سے زنا کر بیٹھے۔ بعد میں شرمندہ ہوئے۔ حضورؐ کے رد و رد پیش ہو کر اقرار جرم کیا۔ حضورؐ نے منہ پھیر لیا۔ انہوں نے تین بار اسی طرح اقرار کیا۔ آپ ہر بار منہ پھیرتے رہے۔ آخر میں حضورؐ نے اُن سے فرمایا کیا تو پاگل تو نہیں ہے؟ انہوں نے عرض کیا نہیں۔ آپ نے فرمایا تو نے ایسے ہی چٹا لیا ہوگا۔ الغرض آپ آخر تک یہ کوشش کرتے رہے کہ ماعزؓ اپنے اقرار سے مغرور ہو جائیں۔

اس سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا ہے کہ حتی الامکان اس کی سہی کرنی چاہیے کہ کسی پر حرج جاری نہ ہو، اسی لئے یہ حکم دیا گیا۔

اور اذالحدود ما استطعتم۔ جہاں تک ہو سکے حد سے درگزر کرو۔

لیکن یہاں حضرت عمرؓ بیٹے سے زبردستی اقرار کرا رہے ہیں جو سراسر خلاف شریعت ہے۔

۷۔ حد جاری کرنے کا مقصد جان سے مارنا نہیں۔ بلکہ سزا دینا اور ذلت و رسوائی مقصود

ہے۔ سورہ نور میں جہاں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ وہاں ساتھ ساتھ فرمایا گیا ہے۔

نَكَالَ الْمُؤْمِنِ اللَّهُ يَهْدِي اللَّهُ كَيْفَ يَشَاءُ

یہ اللہ کی جانب سے رسوائی ہے۔

الغرض ہم جس پہلو سے اس روایت کو دیکھتے ہیں۔ ہمیں یہ روایت عدل و انصاف کے

پوشیدہ اوراق میں حضرت عمرؓ اور صحابہ کرام پر تبرانظر آتی ہے۔ اسی لئے تمام ناقدین حدیث اس روایت کو موضوع قرار دیتے ہیں۔ امام ابن الجوزی فرماتے ہیں۔

هذا حديث موضوع وضعه  
القصاص وقد شرح فيه  
واعادوا قد شرحوا واطالوا  
موضوعات ج ۳ ص ۲۴۹  
یہ روایت موضوع ہے۔ اسے قصہ گوؤں  
نے وضع کیا۔ اس میں فضولیات کو داخل  
کیا۔ بعض باتوں کی تکرار کی کہیں تشریح  
کی۔ اور کہیں بلاوجہ لایا گیا۔

علامہ محمد طاہر ثنی اور جلال الدین سیوطی لکھتے ہیں۔

حديث ابی شحمة ولد عمر  
رضی اللہ عنہ وزناہ واقامہ  
عمر علیہ الحد وموتہ بطایہ  
یصح بل وضعه القصاص  
تذکرہ الموضوعات ص ۱۸۔ اللالی  
المصنوعہ فی احادیث الموضوعہ  
الوشحمة حضرت عمر کے بیٹے کے سلسلہ  
میں یہ روایت کہ انہوں نے زنا کیا پھر  
حضرت عمر نے ان پر حد قائم کی جس  
سے ان کی موت واقع ہوئی۔ یہ صحیح  
نہیں بلکہ قصہ گوؤں نے اسے وضع  
کیا ہے۔

ج ۲ ص ۱۹۲۔

اس روایت کے کئی راوی مثلاً محمد بن عبید اللہ سی، اور ابو عبد اللہ حسن بن علی مجہول  
ہیں۔ اور آخری راوی سعید بن مسروق ہیں۔ جن کا انتقال ۱۲۶ھ میں ہوا۔ یہ تبع تابعی ہیں۔ امام عیسیٰ  
کے شاگرد ہیں۔ اور امام سفیان ثوری کے والد ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کسی صحابی کو نہیں دیکھا  
اس لحاظ سے اوپر کے راوی غائب ہیں، اور روایت منقطع ہے اور چونکہ امام سفیان ثوری کو فہ  
کے مشہور اہل سنت محدث و فقیہ اور ماہر رجال تھے۔ وہ خود ما معتبر راویوں پر جرح کرتے  
رہتے تھے۔ لہذا اس روایت کو ان کے والد کی جانب منسوب کرنے کی سیاقی برادری نے اپنا کج  
کوشش کیا ہے۔ جہاں تک حضرت عمرؓ اور ان کی اولاد کا سوال ہے تو سبائیوں کا دین و مذہب

تو یہ ہے۔

ع۔ زآلِ عمر کینہ قدیم است عجم را

تفصیلی روایت حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی جانب منسوب کی گئی ہے۔ جو کسی صورت میں بھی داستان ہوشربا سے کم نہیں ہے۔ آپ حضرات بھی پڑھیں، اور لطف اندوز ہوں۔

امام مجاہد کا بیان ہے کہ کچھ لوگ ایک دن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی خدمت میں بیٹھے مصروف گفتگو تھے۔ اتفاق سے حضرت ابو بکرؓ کے فضائل کا بیان شروع ہوا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کی فضیلت کا ذکر چل نکلا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے جب حضرت عمرؓ کا ذکر سنا تو اتنے روئے کہ بیہوش ہو کر گر گئے۔ پھر جب ہوش آیا تو فرمانے لگے۔ اللہ اس شخص (حضرت عمرؓ) پر رحمت نازل فرمائے۔ جس نے اللہ کے معاملہ میں کبھی کسی ملامت کرتے والے کا خوف نہیں کیا۔ اللہ اس شخص پر رحمت نازل فرمائے۔ جس نے قرآن کو پڑھ کر اس پر عمل کیا۔ اللہ کی حدود کو اسی طرح قائم کیا۔ جس طرح اللہ نے حکم دیا تھا اور اس معاملہ میں انہوں نے کبھی اپنی قرابت داری کا خیال نہیں کیا اور نہ کبھی کسی کی دشمنی سے خوف کھایا۔

اللہ کی قسم عمرؓ نے اپنے بیٹے پر حد قائم کی۔ اور اس حد میں اسے قتل کر دیا۔ پھر ابن عباسؓ رونے لگے۔ انہیں دیکھ کر لوگ بھی رونے لگے۔ ہم نے عرض کیا۔ اے رسول اللہ کے چچا کے بیٹے۔ ہم سے آپ وہ واقعہ بیان کیجئے کہ عمرؓ نے اپنے بیٹے پر کس طرح حد قائم کی تھی۔ ابن عباسؓ نے فرمایا تم نے مجھے وہ بات یاد دلادی جو میں بھول گیا تھا۔ مجاہد کہتے ہیں میں نے عرض کیا۔ آپ کو مصطفیٰ کا واسطہ۔ ہم آپ کو قسم دیتے ہیں کہ آپ ہم سے اس واقعہ کی تفصیل بیان کریں۔

انہوں نے فرمایا۔ اے لوگو! میں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت عمرؓ بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ہجوم بھی ان کے ارد گرد جمع تھا۔ امیر المؤمنینؓ لوگوں کو نصیحت کر رہے تھے اور لوگوں کے معاملات کے فیصلے کر رہے تھے۔ انہوں نے

مسجد کے دروازے سے ایک لڑکی داخل ہوئی اور مہاجرین و انصاری گردنوں کو پھیلا گئی ہوئی حضرت عمرؓ کے روبرو جا کر کھڑی ہوئی۔ اور بولی - السلام علیک یا امیر المؤمنین ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا وعلیک اسلام، اے اللہ کی بندی کیا مجھ سے کچھ کام ہے؟ وہ بولی سب سے بڑا کام تو آپ ہی سے ہے۔ یہ اپنا لڑکا آپ مجھ سے لے لیجئے۔ کیونکہ اس کے آپ مجھ سے زیادہ حقدار ہیں۔ پھر اس لڑکی نے نقاب اٹھا دی۔ اس کے ہاتھ میں چند روز کا بچہ تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس لڑکی کو دیکھا اور فرمایا۔ نقاب ڈال لو، پھر حضرت عمرؓ لا حول پڑھنے لگے۔ پھر بولے میں تجھے نہیں پہچانتا۔ تو یہ میرا لڑکا کیسے بن گیا۔ اس بات پر ردہ رونے لگی۔ حتیٰ کہ اس کی اور ہنسی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ پھر بولی، اے امیر المؤمنین اگر یہ آپ کا بیٹا نہیں تو بیٹے کا تو بیٹا ہے۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا۔ کون سے بیٹے کا؟ اس نے جواب دیا ابو شحمہ کا۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا یہ بیٹا حلال سے ہے یا حرام سے۔ بولی میری جانب سے حلال کا ہے۔ اور اس کی جانب سے حرام کا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ کہنے لگی۔ اے امیر المؤمنین میری بات غور سے سنئے۔ اللہ کی قسم میں ایک حرف بھی کی بیشی نہ کروں گی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اللہ سے ڈرا اور سچ بول۔ وہ بولی سچ بات تو یہ ہے کہ میں ایک روز بنو نجار کے ایک احاطہ سے گزر رہی تھی کہ میں نے اچانک اپنے پیچھے سے ایک چنچ سنی دیکھا تو آپ کا بیٹا ابو شحمہ نشہ میں جھوم رہا تھا۔ اور اس نے ایک یہودی کی بھٹی سے شراب پی تھی۔ جب وہ جھومتا ہوا میرے قریب آیا تو مجھے ڈرایا دھمکایا اور احاطہ میں کھینچ کر لے گیا۔ میں گر پڑی اور بے ہوش ہو گئی۔ مجھے جب ہوش آیا تو وہ میرا سب کچھ لوٹ چکا تھا۔ میں نے اس بات کو اپنے چچا اور پڑوسیوں سے چھپایا۔ جب حمل کے دن مکمل ہو گئے۔ اور مدت پوری ہو گئی اور مجھے زچگی کا احساس ہونے لگا۔ تو میں فلاں جگہ چلی گئی۔ اور اس غلام (بچے) کو جنم دیا۔ پہلے تو میں نے اسے مار ڈالنے کا ارادہ کیا۔ لیکن میں اس پر نادم ہوئی۔ اب میرے اور اپنے بیٹے کے درمیان حکم الہی کے مطابق

## فیصلہ کیجئے۔

عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے منادی کو حکم دیا کہ لوگوں کو اعلان کر کے جمع کرے۔ لوگ دوڑ دوڑ کر مسجد میں جمع ہونے لگے۔ لوگوں کے جمع ہونے کے بعد حضرت عمرؓ اپنی جگہ سے اٹھے۔ اور لوگوں سے فرمایا اے مہاجرین و انصار یہاں سے نہ ہٹنا جب تک میں خبر لے کر نہ آؤں، پھر مسجد سے نکلے، اور میں آپ کے ساتھ تھا۔ پھر میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اے ابن عباسؓ میرے ساتھ جلدی چل۔ حضرت عمرؓ تیزی سے گھر کے دروازے تک گئے۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک خادمہ نکل کر آئی۔ جب اُس نے آپ کے چہرے کو غفنا دیکھا۔ تو بولی۔ اے امیر المؤمنینؓ کیا معاملہ ہے۔ امیر المؤمنینؓ نے دریافت کیا۔ کیا میرا بیٹا ابو شحمہ ہے؟ بولی ہاں کھانا کھا رہا ہے۔ حضرت عمرؓ گھر میں داخل ہوئے اور بیٹے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے۔ اے میرے بیٹے کھائے۔ شاید یہ تیرا دنیا میں آخری کھانا ہو۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں میں نے غلام (لڑکے) کو دیکھا کہ اُس کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اور وہ کپکپا رہا تھا اور لقمہ اس کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے سوال کیا۔ اے میرے بیٹے میں کون ہوں؟

ابو شحمہ آپ میرے والد اور امیر المؤمنینؓ ہیں۔

حضرت عمرؓ کیا تجھ پر میری اطاعت کا حق نہیں؟

ابو شحمہ جی ہاں۔ دو حق فرض ہیں۔ اول یہ کہ آپ میرے والد ہیں۔ دوم آپ امیر المؤمنینؓ ہیں۔

حضرت عمرؓ تجھے تیری نبی اور تیرے باپ کا واسطہ۔ میں تجھ سے ایک سوالی کروں گا۔ تو درست جواب دینا۔

ابو شحمہ ہاں۔ میں بالکل صحیح جواب دوں گا۔

حضرت عمرؓ کیا تو یہودی کی بھٹی پر مہمان بن کر نہیں گیا تھا؟ تو نے وہاں شراب پی

اور نشہ میں مست ہوا؟

جی ہاں۔ واقعاً ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن اب میں نے توبہ کر لی ہے۔  
 حضرت عمرؓ گناہگاروں کا اصل سرمایہ توبہ ہی ہے۔ لیکن میں تجھے اللہ کی قسم دے  
 کر سوال کرتا ہوں، کیا تو اس روز نہ ہوا انبار کے احاطہ میں گیا تھا۔ اور پھر  
 تو نے ایک عورت دیکھی۔ اور اس کے ساتھ غلط حرکت کی؟  
 اس پر وہ لڑکا خاموش ہو گیا۔ اور رونے لگا اور اپنے چہرے کو ہاتھوں  
 سے پیٹ رہا تھا۔

حضرت عمرؓ سچ بتا۔ کیونکہ اللہ سچ بولنے والوں کو پسند کرتا ہے۔  
 ابو شحمہ ہاں میرے باپ۔ مجھ سے ایسی حرکت ہوئی تھی۔ شیطان نے مجھے درغلا  
 دیا تھا۔ جس پر میں اب تائب اور نادم ہوں۔  
 حضرت عمرؓ نے جب یہ الفاظ سنے تو اس کا ہاتھ پکڑا۔ گردن دبوچی اور  
 کھینچ کر مسجد لے جانے لگے۔ جس پر وہ بولا۔  
 اے میرے باپ مجھے دنیا کے سامنے رسوا نہ کیجیے۔ یہیں میرا ایک ایک  
 جوتہ کاٹ دیجیے۔

حضرت عمرؓ کیا تو نے اللہ عز و جل کا فرمان نہیں سنا۔

وَلَيْشَفْهُدْ عَذَابُهُمَاطِئِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝

ان کی مزا کے وقت مؤمنین کی ایک جماعت موجود رہنی چاہیے  
 پھر اے کھینچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے سامنے لے گئے  
 اور فرمایا عورت سچ کہتی ہے۔ ابو شحمہ نے اقرار کر لیا ہے۔ حضرت عمرؓ  
 کا ایک غلام تھا جس کا نام افلح تھا۔ اس سے مخاطب ہو کر فرمایا۔

حضرت عمرؓ اے افلح میرا تجھ سے ایک کام ہے۔ اگر تو وہ انجام دے دے تو ان کے



لئے آزاد ہے۔

امیر المؤمنینؑ حکم دیجئے۔

افلح

حضرت عمرؓ

اس کے سو کوڑے مار۔ اور اس مار میں کوئی کوتاہی نہ کر۔

افلح

میں یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ پھر افلح رد نے لگا اور بولا کاش میری ماں نے مجھے اس دن کے لئے نہ جنا ہوتا۔ کہ میں اپنے مالک کے بیٹے کے کوڑے مل دوں۔

حضرت عمرؓ

میری اطاعت رسول کی اطاعت ہے۔ لہذا اس کے کپڑے اتار۔ اور میرے حکم پر عمل کر۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں اس پر لوگوں نے چنچنا اور رونا شروع کر دیا۔ غلام رڑکا، اپنی انگلی سے اپنے والد کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا اے میرے باپ مجھ پر رحم کیجئے۔

حضرت عمرؓ

اللہ تجھ پر رحم کرے۔ اور خود حضرت عمرؓ بھی رد رہے تھے۔ پھر افلح سے فرمایا کوڑا مار۔ اُس نے پہلا کوڑا مارا۔

ابو شحمہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم۔

حضرت عمرؓ

اے میرے بیٹے تجھ نے اچھا نام لیا۔

جب دوسرا کوڑا پڑا تو ابو شحمہ کہنے لگا۔ اے ابا معاف کر دیجئے۔

حضرت عمرؓ

جس طرح تو نے گناہ کیا تھا۔ اسی طرح صبر کر۔ جب تیسرا کوڑا لگا تو اس کی زبان سے نکلا امان۔

حضرت عمرؓ

تیرا رب تجھے امان دے گا۔

جب چوتھا کوڑا پڑا تو اس کی زبان سے بے ساختہ نکلا۔ واغوثاہ

حضرت عمرؓ

عذر تو معیشت کے ذلت دیتا ہے۔

پانچویں کوڑے پر اس نے اللہ کی حمد کی۔

حضرت عمرؓ ہاں حمد کے لائق اللہ ہی کی ذات ہے۔

جب دسواں کوڑا لگا۔ تو کہنے لگا اے میرے باپ آپ نے مجھے قتل کر دیا ہے۔

حضرت عمرؓ تجھے تیرے گناہ نے قتل کیا ہے۔ جب تیسواں کوڑا پڑا۔ تو کہنے لگا اللہ کی قسم۔ آپ نے تو میرا دل جلا دیا۔

حضرت عمرؓ دوزخ کی گرمی اس سے زیادہ ہوگی۔ جب چالیسواں کوڑا پڑا۔ تو وہ کہنے لگا۔ اے میرے باپ مجھے اجازت دیجیئے کہ میں اپنے منہ کے بل داپس چلا جاؤں۔

حضرت عمرؓ جب تجھ پر حد پوری ہو جائے تو تیرا جہاں جی چاہے جا۔ جب پچاسواں کوڑے کی نوبت آئی۔ تو وہ حضرت عمرؓ کو قرآن کی قسم دے کر بولا مجھے چھوڑ دیجیئے۔

حضرت عمرؓ کیوں نہ تو نے قرآن سے نصیحت حاصل کی اور کیوں نہ تو اللہ کی نافرمانی سے محفوظ رہا۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ نے افلح سے فرمایا اے غلام کوڑے مار۔

جب اس نے ساٹھواں کوڑا مارا۔ تو ابو شحمہ کہنے لگا۔ اے میرے باپ میری مدد کیجیئے۔

حضرت عمرؓ اے میرے بیٹے جب اہل جہنم دہائی دیں گے۔ تو ان کی دہائی کی کوئی شنوائی نہ ہوگی۔ جب سترہواں کوڑا پڑا تو اس نے پانی مانگا۔

حضرت عمرؓ اگر اللہ تعالیٰ تجھے پاک کر دے گا تو تجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایسا پانی پلائیں گے کہ اس کے بعد تجھے کبھی پیاس نہ لگے گی۔ اے غلام

کوٹے۔ مار۔ جب اس کی دھڑکیاں ٹوٹ گئیں تو وہ بولا۔ اے میرے باپ  
آپ پر سلام ہو۔

حضرت عمرؓ تجھ پر بھی سلام ہو۔ اگر تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے تو میرا سلام عرض  
کرنا اور کہنا میں نے عمرؓ کو قرآن پڑھتے اور حد و دالہی قائم کرتے چھوٹا  
ہے۔ اے غلام کوڑے مار۔ جب نوے کوڑے لگے تو اس کی زبان  
بند ہو گئی۔

اس پر تمام صحابہ اس کی جانب دوڑے۔ اور بولے۔ اے امیر المؤمنین  
بقیہ حد کو موخر کر دیجیے۔

حضرت عمرؓ جس طرح گناہ میں تاخیر نہیں کی گئی۔ اسی طرح سزا میں بھی تاخیر نہیں  
کی جاسکتی۔ اس چیخ و پکار کی آواز ابو شحمہ کی ماں تک پہنچی۔ وہ روتی  
بیختی باہر آئی۔ اور کہنے لگی۔ اے عمرؓ میں ہر کوڑے کے بدلے پیدل  
جج کروں گی۔ اور اتنا اتنا صدقہ دوں گی۔

حضرت عمرؓ جج اور صدقہ حد کا کفارہ نہیں بن سکتے۔ اے غلام حد پوری کر۔ جب  
آخری کوڑا پڑا تو غلام (لڑکا) مر کر گر گیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اے  
لڑکے اللہ نے تجھ سے گناہ مٹا دیا۔ پھر اس کا مرانی گود میں رکھ کر دینے  
لگے۔ اور بولے میرا باپ اس پر قربان جو حق کی خاطر قتل ہو جائے  
میرا باپ اس پر قربان جو حد کو پورا کرنے میں جان دیدے۔ میرا  
باپ اس پر قربان جس پر نہ باپ رحم کھائے اور نہ اعزام و اقارب  
لوگوں نے لڑکے کی جانب نگاہ اٹھا کر دیکھی تو لڑکا مر چکا تھا۔ اس دن سے زیادہ کوئی  
نعمتیں دن نہ تھا۔ لوگ رد رہے تھے اور ان کی حینیں نکل رہی تھیں۔

جب اس واقعے کو چالیس دن گزر گئے۔ تو جمعہ کا دن تھا تو حدیفہ بن الہیاء

کہنے لگے۔ امیر المؤمنینؑ میں رات جب اپنا وظیفہ ختم کر کے لیٹا۔ تو میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ کے ساتھ ایک جوان تھا۔ جو وہ سبھلے پہنے ہوئے تھا۔ حضور نے مجھ سے ارشاد فرمایا۔ میرا عمرؑ سے سلام کہنا اور اس سے کہنا۔ اللہ نے تجھے اسی طرح قرآن پڑھنے اور حد قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے بعد لڑکا بولا۔ میرا بھی میرے والد کو سلام کہنا اور اُن سے کہنا۔ اللہ آپ کو اسی طرح پاک کرے۔ جس طرح آپ نے مجھے پاک کیا تھا والسلام۔ الموضوعات ج ۳ ص ۲۶۹

امام ابن الجوزی اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ یہ روایت موضوع ہے۔ خواہ کسی طرح اور کسی سند سے بھی مروی ہو۔ اسے جاہل قصہ گوؤں نے عوام الناس اور خورتوں کو رولانے کے لئے وضع کیا ہے۔ متعدد باتیں اپنے دل سے گھڑ کر حضرت عمرؓ اور صحابہ کرام کی جانب منسوب کی ہیں۔ حالانکہ اس واقعہ کے الفاظ اور جملے اتنے سیوہ اور رکیک ہیں۔ جو اس واقعہ کے موضوع ہونے کا کھلا ثبوت ہیں۔ اور اس امر کا ثبوت ہے کہ اس قصہ کا گھڑنے والا اول درجہ کا جاہل ہے۔ جو معمولی سے فقہی مسائل سے بھی واقفیت نہیں رکھتا۔

اس داوی نے حضرت عمرؓ کی جانب یہ منسوب کیا ہے کہ انہوں نے قسم دے کر بیٹھے سے اقرار جرم کرایا۔ جو حضرت عمرؓ کی شان سے بہت بعید ہے۔ کیونکہ حضرت ماعزؓ اسلمی نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اقرار کیا۔ تو آپ نے اُن سے اعراض فرمایا۔ وہ بار بار اقرار کرتے رہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعراض کرتے رہے۔ حتیٰ کہ آپ نے ماعزؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ کیا تو پاگل تو نہیں ہے؟

یہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جہاں تک ہو سکے حد جاری کرنے سے گریز کرو۔ اور خود حضرت عمرؓ نے ایک ایسے شخص سے جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے خود اقرار جرم کیا تھا۔ فرمایا تھا۔ جب اللہ نے تیری پردہ پوشی کی تھی تو تو نے اپنی پردہ پوشی کیوں نہیں کی۔ ایسی صورت میں حضرت عمرؓ اپنے بیٹے کو اقرار زنا کے لئے کیسے قسم دے

لکھتے ہیں۔

پھر ہر کوڑے پر یہ مکالمات اس کا ثبوت ہیں کہ یہ روایت کسی جاہل بازاری شخص نے وضع کی ہے۔ پھر ان جاہل راویوں نے یہ بھی بیان کیا کہ صحابہ کرام نے حد روکنے کا مشورہ دیا۔ اسی طرح لڑکے کی ماں کا قول یہ کہ میں ہر کوڑے کے بدلہ پیدل حج کروں گی۔ اس قسم کی لغویات صحابہ کرام کی ذات سے بہت بعید ہیں۔ اسی طرح حضرت حذیفہؓ کا خواب نہایت مبہل ہے۔ الموضوعات ج ۳ ص ۲۴۲۔

سیوطی لکھتے ہیں کہ یہ روایت موضوع ہے۔ اس کے کئی راوی مجہول ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں مجاہد والی روایت صحیح نہیں الا کی المصنوعہ فی احادیث الموضوعات ج ۲ ص ۱۹۵۔ اس قصہ میں جو خامیاں ہیں۔ اُن میں سے کچھ کی جانب پہلی روایت میں اشارہ کر چکے ہیں کچھ کی امام ابن الجوزی نے وضاحت فرمادی۔ اب ہم مزید اور چند عیوب جو اس روایت میں پائے جاتے ہیں۔ پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ اس کہانی کے راوی نے لفظ غلام جگہ جگہ استعمال کیا ہے اور یہ بھی مختلف معنی میں کسی جگہ یہ لفظ خادم کے معنی میں استعمال کیا۔ اور کسی جگہ لڑکے کے معنی میں۔ جو اس امر کا ثبوت ہے کہ اسے وضع کرنے والا کوئی ایرانی ہے۔ جس کی مادری زبان عربی نہیں۔ لہذا وہ اس لفظ کو کبھی عربی معنی میں استعمال کرتا ہے۔ اور کبھی فارسی معنی میں۔ فارسی میں غلام بمعنی خادم آتا ہے۔ الفلح کے لئے اس راوی نے ہر جگہ اسی معنی میں استعمال کیا۔ لیکن عربی میں غلام نابالغ لڑکے کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ البوشحمہ کے لئے لفظ غلام کا استعمال خادم کے معنی میں نہیں ہو سکتا۔ لہذا جہاں جہاں البوشحمہ کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے اس سے عربی معنی مراد ہیں۔ یعنی لڑکا۔ لیکن ہر عمر کے لئے اس کا استعمال نہیں ہوتا۔ صرف نابالغ لڑکے کے لئے اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس روایت کو وضع کرنے والا کوئی ایرانی ہے جو عربی زبان سے بہت معمولی سی شہید رکھتا ہے۔

۱۔ جب ابو شحمہ نابالغ ہوا تو یہ تمام کہانی خود بخود باطل ہو گئی۔

۲۔ حضرت عمرؓ کے کسی غلام کا نام افلح نہیں بلکہ اُن کے غلام کا نام اسلم ہے۔ افلح تو مسجد

نبوی کے مؤذن کا نام تھا۔ ان کو حضرت عمرؓ نے مسجد نبوی میں اذان دینے پر مامور کیا تھا۔

۳۔ پہلی روایت میں یہ ذکر تھا کہ یہ عورت تھی اور امیر المؤمنین کے یہاں بچہ کو لے کر آتی

جاتی۔ سچی تھی جب کہ اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ کنواری لڑکی تھی۔ اور امیر المؤمنین

اسے جانتے بھی نہ تھے اور پہلی مرتبہ مسجد نبوی میں آنا سامنا ہوا۔

۴۔ دونوں روایتیں اس پر متفق ہیں کہ خواہ وہ عورت بویالڑکی، دونوں نے بچہ پیدا ہونے

سب اس امر کا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کام برضا و رغبت ہوا۔ لہذا

سزا و دوزخ کو سنبھلی چاہئے تھی۔ صرف لڑکے کو اس صورت میں مزا دی جاتی ہے۔ جب کہ

زنا یا خیر ثابت ہو جائے۔ یا یہ بہتان ہو۔

۵۔ ابو شحمہ کینٹ ہے۔ نام نہیں۔ اور ان دونوں روایتوں میں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ اس

کا نام کیا تھا۔

۶۔ پہلے قصہ میں مذکور تھا کہ حد حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے جاری کی۔ اس میں یہ بیان

کیا گیا ہے کہ یہ حد افلح نامی غلام نے جاری کی تھی۔ جس کا کوئی وجود نہیں۔

۷۔ پہلی روایت میں شراب کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ اس روایت میں یہ ایک نیا الزام وارد

کر دیا گیا۔

۸۔ پہلی روایت میں نہ خواب کا ذکر تھا۔ نہ مکالمات کا جوہر تھا اور نہ ابو شحمہ کی ماں کی

منت کا ذکر تھا۔ لیکن اس کہانی میں کچھ مزید اضافات کئے گئے۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے

کہ کہانی کسی نے وضع کی تھی اور بعد میں اُن کے واسطے لوگوں نے مزید حاشیہ آرائی کی۔ جس طرح

آج کا مولوی یہ کہتا ہے کہ ابو شحمہ اسی کوڑوں میں مر گئے تھے اور میس کوڑے اُن کی لاش پر

لگائے گئے۔ آگے آگے دیکھئے کہ یہ جاہل ملا کیا کیا تماشے دکھاتے ہیں۔

۱۔ اس روایت کو پڑھ کر اور سن کر تاری اور سات کے ذہن پر یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں مدینہ منورہ میں شراب عام تھی۔ جگہ جگہ بھٹیاں قائم تھیں۔ اور صحابیوں و اولاد بھی اس ام النجاشی سے محفوظ نہ تھی۔ یہ امیر المؤمنین حضرت عمرؓ کی خلافت کا کتنا گھناؤنا تصور ہے۔

۱۱۔ حضرت عمرؓ نے یہود کو سرزمین عرب سے منکب بدر کر دیا تھا۔ تو اب یہودیوں نے وہاں شراب کی بھٹیاں کیسے قائم کر لیں۔ کہیں یہ قصہ کسی یہودی نے تو وضع نہیں کیا؟

۱۲۔ ابو شحمہ نے جو یہ حرکت کی۔ تو یہ بنو النجار کے علاقے میں کی تھی۔ غالباً شراب بھی اسی کے قرب و جوار میں پی گئی۔ ہمارے مولوی کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ اس احاطہ سے کون سا احاطہ مراد ہے۔ قبیلہ بنو النجار اسلام سے پہلے سے اُس جگہ آباد تھا۔ جو آج مسجد نبویؐ کا علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ حضرت ابوالوہب النضلیؒ ہیں رہائش پذیر تھے۔ اسی علاقہ میں مسجد نبویؐ کی تعمیر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مسجد کے قرب و جوار کی آبادی بنو النجار پر مشتمل تھی۔ گویا ساری حرکات مسجد نبویؐ کے قرب و جوار میں ہوئیں۔ چنانچہ اس قسم کی بات وہی کہہ سکتا ہے جو اسلام کا بدترین دشمن ہو۔ ہمارے ملاؤں کی آنکھوں پر اگر نذر دیناز کے پردے پڑ گئے ہیں۔ اور عقلیں ماری گئی ہیں تو ہمارے پاس اس کا کوئی علاج نہیں۔ لیکن ہم اپنے عوام سے ناامید نہیں ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وہ ناواقف ہیں۔

۱۳۔ شروع کہانی میں بیان کیا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ ابن عباسؓ کو اپنے ساتھ لے کر گئے۔ اور پھر گھر میں داخل ہوئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ابن عباسؓ بھی گھر میں داخل ہوئے یا نہیں۔ اگر داخل ہوئے تھے تو وہ نا محرم تھے گھر میں کیسے گئے۔ اور حضرت عمرؓ نے اسے کیسے گوارا کیا۔ اگر اندر نہیں گئے تھے تو اندر کی رام کہانی کس نے بیان کی اور ابن عباسؓ نے کس سے سنی ہے۔ کوئی مافی کالاس ہے جو اس کا اتہ پتہ بتائے؟

۱۴۔ یہ بھی عجیب سہمہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے بیٹے سے پوچھ گچھ سے پہلے ہی تمام اہل مدینہ کو جمع کر لیا۔ گویا وہ اپنے بیٹے کو قتل کرنے کے لئے ادھار کھاتے بیٹھے تھے۔

اس روایت میں اور بھی بہت سے عیوب بھرے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ داستان ایک اور

شخص کی زبانی سنتے۔ جس کا نام عبدالقدوس ہے۔ وہ اس کہانی کو صفوان کے ذریعہ نقل کر رہا ہے

کہ راتِ عمر کے دو بیٹے تھے۔ ایک کا نام عبداللہؓ اور دوسرے کا نام عبید اللہ تھا۔ اسی کو ابو شحمہ کہا جاتا تھا۔ راوی کا بیان ہے کہ یہ ابو شحمہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھا۔ اور ہر وقت تلاوتِ قرآن میں مشغول رہتا۔

ایک بار شدید بیمار ہوا اس کی عیادت کے لئے اہلِ ایمان آئے اور انہوں نے حضرت عمرؓ سے کہا اے عمرؓ تو بھی ایسی ہی نظر مان لے، جس طرح علیؓ نے حسنؓ و حسینؓ کے لئے نظر مانی تھی۔ تو اللہ نے انہیں صحت دی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے یہ نذر مانی کہ اگر اللہ نے میرے اس بیٹے کو صحت دیدی تو میں تین روزے رکھوں گا۔ یہی نظر ابو شحمہ کی والدہ نے مانگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اچھا ہو گیا اور صحت پانے کے بعد ایک یہودی کی بھٹی میں جا گھسا اور وہاں نمبید پی کر نشہ میں مست ہو گیا۔ پھر بنو نجار کے احاطہ میں گھسا۔ تو وہاں ایک عورت سو رہی تھی۔ یہ اسے چپٹ گیا۔ اور اپنے نفس کی آگ بجھائی۔ جب کھڑا ہوا تو اس عورت نے اسے گالیاں دیں۔ اور اس کے کپڑے پھاڑ ڈالے۔ اس راوی نے پیر اگے پورا پہلا والا واقعہ نقل کیا۔

امام ابن الجوزی فرماتے ہیں، اول تو ان لوگوں نے ابو شحمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ قرار دیا۔ پھر بدکاری کا الزام بھی عائد کیا۔ اس کا راوی عبد اللہ بن الحجاج ہے جو کذاب ہے۔ ابن حبان کہتے ہیں اس کی روایت بیان کرنا بھی حلال نہیں۔ الموضوعات ج ۳ ص ۲۷۵۔

اس تیسری روایت سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی کہ اس کے واضعین کس قسم کے لوگ ہیں۔ ان کا مقصود نہ صرف حضرت عمرؓ اور ان کی اولاد پر تبرہ ہے۔ بلکہ انہوں نے چند الفاظ کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس پر حملہ کیا۔ اور چونکہ سبائی طبقہ اس قرآن کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس لئے قرآن پڑھنے والوں کا بھی مذاق اڑایا گیا کہ یہ ابو شحمہ ہر وقت تلاوت کیا





۶۔ یہ کہانی تین طریقوں سے مروی تھی جو ہم نے قارئین کے سامنے پیش کر دیئے۔ لیکن کسی طریقہ میں کسی جگہ اور کسی راوی نے یہ بیان نہیں کیا کہ وہ عورت کون ذاتِ شریف تھی؛ اُس کا تعلق یہودیوں سے تھا۔ یا یہ کہانی تیار کرنے کے لئے اسے ایران سے درآمد کیا گیا تھا۔ دراصل ابو شحمہ عبدالرحمان الاوسط کی کنیت ہے۔ اور وقوعہ کی اصل صورت یہ ہے کہ عبدالرحمان الاوسط حضرت عمرو بن العاص کے ساتھ مصر کے جہاد میں شریک تھے۔ ایک روز انہوں نے بمبئی پالتاق سے انہیں نشہ پیدا ہو گیا۔ یہ صبح کو حضرت عمرو بن العاص کے پاس گئے۔ اور ان سے عرض کیا مجھ پر شراب کی حد جاری کیجئے۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس وقت نہ نشہ کا اثر تھا اور نہ گواہ موجود تھے۔ اس پر عبدالرحمان بولے کہ اگر تم نے مجھ پر حد نہ لگائی تو میں اپنے والد کو تمہاری اس حرکت سے مطلع کر دوں گا۔ مجبور ہو کر حضرت عمرو بن العاص نے اپنے خیمہ میں اُن پر حد جاری کر دی۔ اور کسی کو خبر بھی نہ ہونے دی۔

جب حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع ملی تو انہوں نے عمرو بن العاص کو تنبیہ کی تم نے حد سب کے روبرو کیوں جاری نہیں کی۔ اور انخفا سے کیوں کام لیا۔ جب عبدالرحمان فتح مصر کے بعد مدینہ پہنچے تو حضرت عمرؓ نے تربیت کی غرض سے ان کے چند کوڑے مارے اتفاق سے کچھ دن بعد وہ بیمار ہو گئے اور اسی بیماری میں اُن کا انتقال ہو گیا۔ امام ابن الجوزی اور سیوطی لکھتے ہیں۔ یہ ہے اصل واقعہ جسے قصہ گوؤں نے کچھ کا کچھ بنا کر پیش کر دیا ہے۔

الموضوعات ج ۳ ص ۲۷۵۔

ہمارے نزدیک یہ سب نجوسیت اور سبائیت کی کارفرمایاں ہیں۔ قصہ گو اور صوفیاء تو صرف ٹیپ کا کام انجام دیتے رہے ہیں۔ یہ ہاتھ کی صفائی ان ہی کا کام ہے کہ اس ایک داستان کے ذریعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر بھی تبر کیا گیا۔ آل عمرؓ کو بھی بنام کیا گیا۔ اور ساتھ ساتھ حضرت علیؓ کے نقش قدم پر چلنے کی تلقین بھی کی گئی۔

لیکن چونکہ یہ سب افراد ایک ذہن کے مالک نہ تھے۔ اس لئے اس داستان میں اختلاف

پیدا ہوا۔ کسی نے ابو شحمہ کو افلح کے ذریعہ پٹوایا۔ اور کسی نے حضرت علیؑ کے ہاتھوں کسی نے اس نامعلوم فاحشہ کو کنواری بیان کیا۔ اور کسی نے شادی شدہ عورت۔ لیکن ہر ایک کے پیش نظر عمرؓ اور ان کی اولاد کو بدنام کرنا تھا۔ اور خاص طور پر عبید اللہ بن عمر کو۔ لیکن ان سے غلطی یہ سرزد ہوئی کہ انہوں نے عبید اللہ کو ابو شحمہ قرار دے دیا۔ یا یہ کہتے کہ عمداً ایسا کیا گیا۔ تاکہ کوئی ان پر اٹایہ الزام ثابت نہ کر سکے۔ کہ عبید اللہ جنگ صفین تک حیات تھے۔ اس لئے اتنی قلابازیاں کھانے کی ضرورت پیش آئی۔

## قصہ شہر بانو

آج کے دور کے تمام لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یزدگرد شاہ ایران کی بیٹی حضرت حسینؑ کے نکاح میں آئی۔ جس سے امام زین العابدینؑ پیدا ہوئے۔ اور اسی لئے شیعہ انہیں فخر العرب والعم کہتے ہیں۔ سبائیوں کا اولاد حسینؑ سے جو تعلق ہے اور جس ناتے یہ بارہ امام وجود میں آئے۔ اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حسینؑ کی اولاد نہضیالی رشتہ سے یزدگرد سے تعلق رکھتی ہے اور چونکہ ایران میں حکومت ایک خاندان کے ساتھ مخصوص تھی جو نسلاً پہلی آ رہی تھی۔ یزدگرد کے خاتمہ سے ساسانی خاندان کے افراد ختم ہو گئے۔ لیکن چونکہ حضرت حسینؑ کی اولاد میں وہ خون گردش کر رہا ہے۔ اس لئے خلافت و امامت کے وہی مستحق ہیں۔ اور اسی لئے حضرت علیؑ کی خلافت کے چکر چلائے گئے۔ تاکہ اندر دنی سازش پر پردہ پڑا رہے۔ گویا مجوسیت پر پردہ ڈالنے کے لئے حضرت علیؑ کی خلافت کے جھگڑے۔ کھڑے کیئے اور چونکہ حضرت عمرؓ نے ایران کو تباہ کیا تھا۔ اس لئے ان سے بغض بھی لازمہ مجوسیت رہا۔ اسی لئے اس قسم کی کہانیاں وضع کی گئیں جتنی کہ ردی نے اس بات کو قبول بھی کیا ہے وہ کہتا ہے۔

شکست پشت ہر برانِ عجم را      برباد و فنا و اد تختِ جسم را  
ایں عربدہ ز غصبِ غفلتِ علی نیست      ز آلِ عمر کینہِ قدیم است عجم را

جس نے عجم کے بہادروں کی کمر توڑ دی۔ جس نے جمشید کے تخت کو برباد و فنا کر دیا۔ یہ ہمارا جھگڑا علی کی خلافت کا جھگڑا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ عجم کو عمر کے خاندان سے پرانا کینہ ہے۔ جو کبھی حضرت عمرؓ کے بیٹے پر بدکاری کا الزام قائم کر کے اور کبھی شہر بانو کا وادیا لپچا کر انہیں بدنام کیا جاتا ہے۔ یہ شہر بانو کون تھیں اور کب مدینہ منیں اور پھر زین العابدین کو پیدا کر کے تاریخ سے کہاں غائب ہو گئیں۔ غنقا کی طرح آج تک یہ تاریخ سے غنقا ہیں۔

زین العابدین کی والدہ کا نام سلفہ تھا جو ایک باندی تھیں۔ ہاں اس میں ضرور اختلاف ہے کہ یہ کہاں کی باشندہ تھیں اور اس پر اتفاق ہے کہ یہ افریقہ سے گرفتار ہو کر آئی تھیں۔ اسی لئے انہیں کوئی بربری اور کوئی سودانی قرار دیتا ہے۔ ابن حزم نے جمہرہ میں ایک قول یہ نقل کیا ہے کہ عبداللہؓ ابن ابی سرح اموی نے جب حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں افریقہ پر حملہ کیا تو یہ سودان سے گرفتار ہو کر آئیں۔ لیکن نسلا یہ سندھی تھیں۔ خیر پہلے ہم حکیم فیض عالم شہید کی تحقیق پر نظر ڈال لیں۔ پھر اس کے بعد ہم مجوسی طبقہ کی داستانیں پیش کریں گے۔ حکیم صاحب نے بھی ان داستانوں کی جانب کچھ اشارات کئے ہیں۔ بقیہ کی ہم خور و وضاحت کر دیں گے حکیم صاحب مرحوم لکھتے ہیں۔

نامعلوم اس داستان کو کس نے جنم دیا کس نے پروان چڑھایا اور ابتدائی طور پر کن لوگوں نے اسے شہرت دی۔

حسین کاظم زاہد نے بھی اس داستان سے اپنی مایہ ناز تصنیف کو زینت دیتے ہوئے خا۔ فرسائی کی ہے کہ یزدگرد آخری ساسانی بادشاہ کی دختر شہر بانو ایرانی قیدیوں کے ساتھ عمر بن الخطابؓ کے سامنے پیش ہوئی۔ انہوں نے دوسرے قیدیوں کے ساتھ لے بھی بازار میں فروخت کئے جانے کا حکم دیا حضرت علیؓ مانع ہوئے۔ اور کہا شاہزادگان اور نجار

کو ننگے سر بازار میں لے جانا خلاف ادب ہے۔ بالآخر شہر بانو حضرت حسینؑ فرزند علیؑ کے حصہ میں آئی۔

اس داستان سرائی کے بعد مصنف لکھتا ہے کہ اس سبب سے خاندان علی، ایرانیوں کی نظر میں اصل نسب کے اعتبار سے ساسانی نسب رکھتا تھا۔ (لاحول ولاقوہ) اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ کی بنا پر شرافت اور امتیاز سے بھی مخصوص تھا۔ تنہا اسی سبب سے یہ خاندان جائز طور پر تخت و تاج کیانی کا وارث ہو سکتا تھا۔ نیز اسی بنا پر علی (زین العابدین) جو امام حسینؑ کے فرزند ارجمند شہر بانو کے بطن سے تھے۔ فخر العرب والعجم کہلاتے تھے۔ کیونکہ باپ کی طرف سے ان کا سلسلہ نسب بزرگ ترین عرب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ماں کی طرف سے روئے زمین کے عجیب ترین سلاطین یعنی عجم کے بادشاہوں پر منتہی ہوتا ہے۔

یہی داستان جب کہ بلا تک پہنچتی ہے تو اس پر جو مزید حاشیہ آرائیاں ہوتی ہیں۔ وہ بھی حیران کن ہی نہیں، بلکہ پریشان کن بھی ہیں۔ ایک صاحب فرماتے ہیں۔

شہادت حسینؑ کے بعد ان کا گھوڑا خیمہ کے دروازے پر آکر کھڑا ہو گیا۔ اور حضرت شہر بانو اس پر سوار ہو کر ایران کی طرف چل نکلیں۔ رستہ میں انہیں اپنا بھائی مل گیا۔ جو حضرت حسینؑ کی مدد کے لئے آ رہا تھا۔ وہ حضرت شہر بانو کو ہمراہ لے کر واپس چلا گیا۔ ایک اور صاحب فرماتے ہیں کہ آپ دریائے فرات میں ڈوب کر مر گئیں۔ گویا خود کشی کی حرام موت سہی۔

میں سخت حیران ہوں کہ شیعہ تو رہے درکنار۔ اہل سنت والجماعت کا سمجھ دار طبقہ بھی اپنے مواعظ حسنہ میں شہر بانو کے حالات کو اس طرح بیان کر کے سامعین کو روتا رہے۔ گویا یہ بھی دین کا ایک اہم حصہ یا جزو ہے۔ حالانکہ تاریخی نقطہ نظر سے شہر بانو کا وجود محل نظر ہی نہیں۔ بلکہ بالکل عفا ہے۔ شہر بانو نام کی کوئی بیوی حضرت حسینؑ کے حرم میں سرنے سے تھی ہی نہیں۔ چہ جائیکہ وہ یزدگرد کی لڑکی ہو۔ دراصل یہودی ٹیکنیک اور مجوسی عصیت سے مل کر شیعیت

کا جو بیوی کھڑا کیلیا اس میں نہایت چابکدستی سے اس قسم کی روایات کو اس طرح سمویا کہ آج بڑے سا بڑا مورخ اور محقق بھی جھوٹ اور سچ کی تیز میں اپنے آپ کو معذور پایا ہے۔

اب آئیے ذرا چند لحظات کے لئے ہم تاریخ ایران کا مطالعہ کر کے شہر بانو کو تلاش کریں کہ یہ کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ کس کی بیٹی تھی، یا سرے سے تھی ہی نہیں؟

شہر یار کا بیٹا یزدگرد ۱۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اس وقت سولہ سال تھی (اخبار الطوال ص ۱۲۵)۔ گن نے پندرہ سال لکھی ہے۔ یہی سال فاروق اعظم کی خلافت کا پہلا سال ہے۔ جب ۱۷ء میں اس کی عمر اٹھارہ سال تھی۔ قادیسیہ کا معرکہ لڑا گیا۔ یزدگرد یہ سنتے ہی مدائن چھوڑ کر بھاگ نکلا اور حلوان پہنچ گیا۔ (ملخص فتوح البلدان بلاذری ص ۲۵۔ اخبار الطوال ص ۱۳۲) اسلامی لشکر نے جب حلوان کا رخ کیا۔ تو وہ مع اپنے اہل و عیال کے۔ خالقان، ثم اور قاشان بھاگتا پھرا۔ آخر ۲۹ء میں جب اس کی عمر بتیس سال تھی خراسان پہنچا اور شہر میں بعد خلافت عثمانی اس کا خاتمہ ہو گیا۔

غرضیکہ یزدگرد پر اسلامی لشکر نے کہیں بھی قابو نہیں پایا۔ پھر شہر بانو کہاں گرفتار ہوئی اور کس نے گرفتار کیا؟ اصل میں اس قصہ کا خالق زرخشری معتزلی جیسا تاریخ سے ناواقف انسان ہے۔ ابن خلکان بھی زرخشری کے چکر میں آ گیا۔

زرخشری کے سوا طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری اور ابن قتیبہ وغیرہ کسی نے اس واقعہ کو نہیں لکھا۔ گویا یہ چھٹی صدی کی پیداوار ہے۔ اور لکھتے بھی کیسے، جب کہ یزدگرد مع اہل و عیال آگے آگے بھاگتا رہا۔ اور کسی مقام پر مسلمانوں کے قابو میں نہیں آیا۔ اگر اس کے عیال میں سے کوئی گرفتار ہو کر آیا ہو گا تو وہ زمانہ خلافت عثمانی کا تھا۔ نہ کہ خلافت فاروقیہ کا۔

مگر مجوسیوں نے خود ایک داستان تصنیف کی۔ اور اسے حضرت علیؑ کے نام سے جملہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے پھیلا دیا۔ تاکہ عوام حضرت علیؑ کے ہم نوا بن کر آپ کے نام کی آڑ میں اسلام دشمنی پر ہر معرکہ سر کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کے پہلے

سال یعنی ۳۱ میں یزدگرد کی عمر چودہ یا پندرہ سال ہے۔ محرم ۳۱ میں قادیسیہ کا معرکہ لڑا گیا۔ اور اس کے بعد مسلمان آگے بڑھنے شروع ہوئے۔ مگر یزدگرد آگے آگے بھاگتا رہا۔ سترہ اٹھ سال کی عمر میں اس کے گھر لڑکی پیدا کر کے جوان کرنا۔ اسے گرفتار کر کے مدینہ لانا اور حضرت حسینؑ کے نکاح میں دینا یہ معجزہ شیعوں ہی کا کام ہے۔ حقیقت مذہب شیعہ ۲۶۶۔

یزدگرد کی اولاد میں سے خواہ وہ اس کی پوتی ہو یا داسی ایک لڑکی کا پتہ چلتا ہے جس کا نام شیریں دخت ہے۔ یہ خلافت بنی امیہ کے دور میں ولید بن عبدالملک بن مروان کی خلافت کے زمانہ میں ترکستان سے گرفتار ہو کر آئی۔ اور خلیفہ ولید بن عبدالملک کے حرم میں داخل ہوئی۔ جس سے ولید کا بیٹا یزید بن ولید بن عبدالملک بن مروان پیدا ہوا۔ جو بعد میں ایک عرصہ بعد ۱۱۶ میں خلیفہ ہوا۔ علامہ ابن حزم نے اپنی جملہ الاساب میں اس کی وضاحت کی ہے۔

یہ لڑکی اس لحاظ سے یکتائے زمانہ ہے کہ یہ کسی ہونے کے حرم میں داخل ہوئی۔ اس لڑکی کے علاوہ کوئی اور ایسی ایرانی لڑکی نظر نہیں آتی جو کسی اموی کے حرم میں رہی ہو۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اس لڑکی شیریں دخت کو شہر بانو بنا کر پیش کر دیا گیا ہو۔

بحوسی طبقہ داستانیں وضع کرنے میں خود تو ماہر فن تھے ہی۔ لیکن انہوں نے ہندو پاکستان کے سنی ذہنوں کو بھی اس طرح تربیت دی کہ وہ ان سے بھی آگے نکل گئے۔ انہوں نے تو شہر بانو کو پیدا کر کے، پھر ان سے زین العابدینؑ کی پیدائش کا کام لے کر میدان کر بلا سے غائب کیا تھا۔ لیکن ہمارے سنی داستان سراؤں نے کر بلا سے چار بیٹیوں کو غائب کر دیا۔ جس کی صورت حال کچھ اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ حضرت حسینؑ کی چار صاحبزادیاں حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد میدان کر بلا سے فرار ہو گئیں۔ اور کسی نہ کسی طرح سرزمین پنجاب پہنچ گئیں۔ اتفاق سے وہاں کا راجہ چاروں پر عاشق ہو گیا۔ اور اُس نے ان کے ساتھ دست دمازی کرنی چاہی۔ انہوں نے زمین کو حکم دیا کہ ہمیں نکل لے۔ زمین نے ان چاروں بہنوں کو

ایک ساتھ نکل آیا۔ لیکن ان کی اوڑھنیوں کے کنارے باہر رہ گئے۔ جس پر راجہ نے ان کا تقرب بنایا۔ اور راج پاٹ چھوڑ کر خود مجاور بن بیٹھا۔ آج تک ان کے مزارات نیک بلی یوں کے مزار کے نام سے مشہور ہیں۔ جولاہور سے قصور جاتے ہوئے راہ میں پڑتے ہیں اور لوگ ان کی زیارت کو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ کچھ عرصہ قبل اخبار جنگ کے جمعہ اڈیشن میں سنا تھا۔

قطع نظر اس امر کے کہ وہ کس طرح یہاں پہنچیں۔ کیسے ابن زیاد کے ساتھیوں کی نگاہوں سے غائب ہوئیں۔ یہ سفر سیدل طے کیا یا سواری پر سوار ہو کر۔ ہم تو یہ جانتے ہیں کہ ملا باقر مجلسی جلا الراعیوں میں اور دیگر شیعہ اور سنی مورخین لکھتے ہیں کہ حضرت حسینؑ کی صرف دو صاحبزادیاں تھیں۔ ایک سلیمہ اور ایک فاطمہ۔ اور ان دونوں کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا۔ یہ چاروں لڑکیاں کسی حسین خاں کی اولاد ہوں گی۔ لیکن حسین بن علیؑ کی اولاد ہرگز نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ یہ شوشہ بھی سبائی برادری کا چھوڑا ہوا ہو یا یہ لڑکیاں ساسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ آدم برسر مطلب۔ رہا یہ سوال کہ شہر بانو کا قصہ سب سے اول زرخشری نے ذکر کیا زرخشری مشہور مفسر ہیں۔ ادب و لغت اور صرف و نحو کے امام ہیں۔ لیکن جہاں تک احادیث و روایات کا تعلق ہے تو وہ بے پر کی اڑانے میں مشہور ہیں۔ ان کی کتاب میں کسی صحیح حدیث یا تاریخ کے کسی صحیح واقعہ کا تلاش کرنا۔ ایسا ہی ہے جیسا کوئی تاریک رات میں ہوتی تلاش کرے۔ اور ان کی پیش کردہ کہانی کو کسی چیز کے ثبوت میں پیش کرنا۔ اسی قسم کی حماقت ہے۔ جیسے کوئی بیمار ڈاکٹر کو چھوڑ کر وکیل کے دروازے پر حاضری دے۔ اس کے قول کو لغت و ادب اور صرف و نحو میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ ذکہ حدیث و تاریخ میں۔ ہر کارے و ہر دے۔ ویسے بھی ماشاء اللہ شیعہ ہونے کے ساتھ ساتھ معتزلی بھی ہیں۔ مجھے تو ابن خلکان پر حیرت ہے کہ انہوں نے ان کی روایت کیسے نقل کر دی۔

آئیے۔ اب اس شہر بانو کی داستان کو ملا باقر مجلسی اور محمد بن یعقوب کلینی کے الفاظ میں ملاحظہ کیجئے۔



شیخ کلینی نے ب: معتبر امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ جب دختر نذر گرد کو عمر بن الخطاب کے پاس لائے۔ دختر ان کے بیٹے ان کے جہاں کے مشابہ کے لئے کوٹھے پر بیٹھ آئیں۔ جب ان کو با میں آئے۔ ان کے بیٹے نورانی سے مسجد دشمن ہو گئی عمر بن الخطاب نے چاہا ان کے چہرے پر نظر کرے۔ اس شہزاد نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اور کہہ مزا ف ہو کہ اس کے فرزند تیرے اسیر ہوں۔ عمر بن الخطاب نے کہا۔ اے گھبراہٹ منجھے دشنام دیتی ہے۔ اور چاہا ایذا رسانی کرے جناب امیر نے فرمایا یہ شہزادی بزرگ زادی ہے۔ تجھے سزاوار نہیں ہے کہ اس سے بد سلوکی کرے۔

اور بروایت دیگر فرمایا۔ جناب رسول خدا نے فرمایا ہے۔ لازم ہے کہ ہر قوم کے بزرگ کو بزرگ جاتو۔ اور تعظیم کرو۔ ہر چند کافر ہو۔ اور فرمایا جناب امیر نے اسے اختیار دید کہ مسلمانوں میں سے جسے چاہے اختیار کرے اور جسے چاہے پسند کرے۔ اس کے حصہ غنیمت میں محسوب کر دے۔ جب اس سعادت مند شہزادی نے ان سب لوگوں کو دیکھا اپنا ہاتھ امام حسین کے سر پر رکھ دیا۔ اس وقت جناب امیر نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ کہا جہاں شاہ۔ جناب امیر نے فرمایا۔ بلکہ چاہیے کہ تمہارا نام شہر بانو ہو۔ پھر امام حسین سے فرمایا۔ اے ابو عبد اللہ (عبداللہ کے باپ) اس دختر سے تمہارے یہاں ایک ایسا فرزند پیدا ہو گا کہ وہ بہترین اہل زمین ہو گا۔ پس امام زین العابدین اس سے متولد ہوتے اسی وجہ سے حضرت کو ابن الخیرین کہتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام عرب میں برگزیدہ خدا حضرت ہاشم تھے۔ اور برگزیدہ عجم بادشاہ فارس تھا۔ اور نسب شریف آنحضرت زین العابدین اور دوزں سے متصل ہے۔ جلال المیون ج ۲ ص ۲۵۹۔ اصول کافی ج ۱ ص ۵۹۰

اس روایت کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے کہ حضرت عمرؓ کو کس طرح تو اور تیرا سے مخاطب کیا جا رہا ہے اور اس کافرہ کی تعریفوں کے بل بانی سے جا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ ایسی تھی۔ اور حضرت عمرؓ عرب تھے لیکن انہوں نے انہوں پر توبہ میں گفتگو کریں گے ہمیں تو

ملاباقر مجلسی کا ایک جملہ بہت پسند آیا ہے۔ انہوں نے ہماری دل لگتی بات کہہ دی ہے  
 کیونکہ روانی تحریر میں وہ سب اپنا اگا اچھا بھول گئے۔ کہتے ہیں اس کے حصہ غنیمت میں  
 اسے محسوب کر دے۔ یعنی جس پر عجمی یہ لڑکی ہاتھ رکھے۔ اسی کی باندی سمجھی جائے گی اور  
 بقیہ مال غنیمت میں سے اسے کچھ نہ ملے گا۔ اس نے حضرت حسینؑ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔  
 اس طرح یہ حضرت حسینؑ کی باندی ہوئی۔ گویا ملاباقر کو یہ تسلیم ہے کہ زمین العابدین ایک  
 باندی کی اولاد ہیں۔ کسی آزاد عورت کی اولاد نہیں۔

ہمارے اس دعوے پر کسی کو اعتراض کرنے کا حق حاصل نہیں۔ سبائیوں کو تو اس  
 لئے کہ یہ ان کے امام کا فرمودہ ہے۔ اور ان کے خلاف زباں سے کچھ نکالنا کفر ہے۔ اور  
 سنیوں کو اس لئے اعتراض کا حق نہیں کہ امام باقرؑ اپنی وادی کے حال کو ان لوگوں سے زیادہ  
 جانتے ہوں گے۔ کیونکہ یہ ان کا گھروں کا معاملہ ہے۔ لیکن ذرا یہ تو بتا دیجئے کہ آج کل کے سید  
 زادے نجیب الطرفین کیسے بن گئے۔ کیونکہ ان کا اصول تو یہ ہے کہ سید زادی سید زادے  
 کے ہی نکاح میں جاسکتی ہے۔ اور غیر سید سے نکاح جائز نہیں۔ یہاں تو پہلی بنیادی غلطی ہے۔  
 پھر اتفاق سے جعفر بن محمد کی ماں بھی غیر سید ہے۔ کیونکہ وہ ابو جعفر صدیقؑ کی پوتی ہے۔ اور  
 ان کے بعد تمام ائمہ کی مائیں ایرانی باندیاں ہیں۔

بقول ملاباقر یہ لوندیا اتنی خوبصورت تھیں کہ دختران مدینہ اس کے مشاہدے کے لئے  
 کوٹھے پر چڑھ آئیں۔ اور اس کے چہرے کی روشنی سے مسجد منور ہو گئی۔ تو ممکن ہے کہ دختران  
 مدینہ اس لئے کوٹھے پر چڑھی ہوں، تاکہ اس سیاہ فام سودالی عورت کا مشاہدہ کر سکیں جو  
 افریقہ سے پھر کر لائی گئی تھی۔ کیونکہ ایرانی لڑکیوں کا تو وہ مشاہدہ کرتی آتی تھیں۔ بقول ملاباقر مدینہ  
 یہاں ان کی ایک باقاعدہ منڈی تھی۔ جس میں دختران اہل انصاف فروخت ہوتی تھیں۔ لیکن یہ  
 سب خاندان بنی ہاشم کے حصہ میں آتی تھیں۔

اس لڑکی نے ایران سے مدینہ تک بے پردہ سفر کیا۔ لیکن حضرت عمرؓ کو دیکھ کر متحہ

پھیلا کیا کیونکہ روئے زمین پر ان کے علاوہ کوئی اس لڑکی کا نام نہ تھا۔ واہ رہے بھائی  
تیرا کرشمہ۔

جناب امیر اسے بزرگ اور بزرگ زادی بتاتے ہیں حالانکہ لفظ بزرگ فارسی  
ہے اور فارسی میں اس کا استعمال بوڑھے کے لئے ہوتا ہے۔ اگرچہ مجازاً صاحب علم اور  
صاحب تقویٰ پر بھی بول دیا جاتا ہے۔ لیکن ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ اس جگہ یہ لفظ بوڑھے  
کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ سر پر ہاتھ ایک بوڑھا ہی رکھتا ہے۔ اور بقول ملا با  
اس نے حضرت حسینؑ کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ گویا وہ حضرت حسینؑ سے عمر میں بہت  
بڑی تھیں۔ اور حضرت حسینؑ ہنوز بچہ تھے۔ لیکن ملا باقر امدان سے قبل زرخشری نے یہ  
تلا بازی کھائی کہ جھٹ جناب امیر کی زبانی حضرت حسینؑ کو ابو عبد اللہ کہلویا۔ یعنی عبد اللہ  
کا باپ۔ گویا حضرت حسینؑ اُس وقت صاحب اولاد تھے۔ اور ان کے ایک لڑکے کا عبد اللہ  
نامی پیدا ہو چکا تھا۔ جب کہ ان مجوسیوں کا دعویٰ یہ ہے کہ حضرت حسینؑ سکے یا شہ میں  
پیدا ہوئے اور ہماری تحقیق کے بقول ۹ میں۔ خیر ملا باقرؒ کے مدعی ہیں اور یہ واقعہ  
۱۰ کا ہے۔ گویا دس سال کی عمر میں حضرت حسینؑ کے لڑکا پیدا ہو چکا تھا۔ جس طرح یزدگرد  
کے ۱۰۔۱۱ سال کی عمر میں ترکی پیدا ہو کر جوان ہو گئی تھی۔ لیکن ان تمام معجزات سے بڑھ کر  
ہمارے نزدیک سب سے بڑا معجزہ یہ ہے کہ وہ دغ گور حافظہ نباشد کے مصداق  
ملا باقر ایک صفحہ قبل لکھتے ہیں کہ حضرت حسینؑ کا ایک لڑکا عبد اللہ تھا۔ جو حالت طغولیت  
میں اپنے پٹائی مقام کے دامن میں تیرے شہید ہوئے جی کو لوگ علی اصغر کہتے ہیں۔  
جلال العیون ج ۲ صفحہ ۲۰۰ یعنی جلد ۲ سے قبل پیدا ہو چکا تھا۔ وہ ۱۰ سالہ میں ذودہ  
پلی رہا تھا۔ اور میدان جنگ میں والد کی گود میں تھا یہ چھیالیس سال کا ذودہ پٹا پٹہ میں  
مارغ میں کر بلا ہی میں نظر آیا۔ یہ کتنا بڑا معجزہ ہے۔ جو چاہے تیرے لڑکے کرشمہ ساز کرے۔  
ہمیں اس معجزے کے وجود میں کوئی شک نہیں اس لئے کہ یہ امام باقرؑ کا ارشاد ہے۔ اور

بقول ملا مجوسی بسند معتبر مردی ہے۔ اگرچہ ہمارے نزدیک سگل میں اس بچہ کی پیدائش ہی ایک معجزہ ہے۔ اس لئے کہ حضرت حسینؑ کی عمر اس وقت چھ سال تھی۔ اور مؤرخین کے نزدیک دس سال تھی۔

اس لڑکی کا نام جہاں شاہ تھا۔ لیکن حضرت علیؑ نے تبدیل کر کے شہر بانو رکھا۔ غالباً حضرت علیؑ نے فارسی کی تعلیم سلطانؑ فارسی سے حاصل کی ہوگی۔ اس لئے کہ وہ علوم اولین و آخرین کے مالک تھے۔ کیونکہ یہ مجوسی اس کے دعویدار ہیں کہ حضورؐ کی وفات کے بعد پانچ افراد کے علاوہ بقیہ تمام صحابہ مرتد ہو گئے تھے اور ان پانچوں کا بھی یہ حال تھا کہ اگر سلمان کے سامنے بقیہ چار کا علم پیش کیا جاتا تو بقیہ چار بھی کافر قرار پاتے۔ گویا قابل امتداد صرف سلمانؑ ہیں۔ کیونکہ وہ ایرانی ہیں۔ اور وہی علوم اولین و آخرین کا خزانہ ہیں۔ اسی لئے ان کی عمر کبھی ڈھائی سو سال، کبھی پانچ سو سال اور کبھی سات سو سال بیان کی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ بارہ لوگوں نے ان کا شمار حواریں میں عیسیٰؑ تک میں کر ڈالا ہے۔

خیر یہ تو اتنے اہم امور نہ تھے۔ سب سے اہم امر اور خطرناک بات تو یہ ہے کہ حسینؑ کا نام نہ اس نے یہ دعویٰ کیا تھا۔ کہ علی بن الحسین کو نذر العرب واجب ہے اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ دور بہترین، سستیوں کی اولاد تھے۔ ایک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک شاہ ایران۔ لیکن ملا باقر مجلسی کو حضورؐ سے یہ تعلق گوارا نہیں ہو رہا کہتے ہیں کہ انہیں ابن الخیرین دو بہترین انسانوں کی اولاد اس لئے کہا جاتا ہے کہ تمام عربیں برگزیدہ خدا حضرت ہاشم تھے۔ اور برگزیدہ عجم با۔ شاہ فارس تھا۔ ہاشم، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت علیؑ کا چڑا دادا تھا۔ ملا باقر نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بھائے ہاشم کا نام لیا گیا۔ گویا کہ مجوسیوں کے نزدیک یہ دونوں کافر برگزیدہ نہ تھے۔ اور برگزیدہ عرب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بلکہ ہاشم تھا۔

ملا باقر کا یہ دعویٰ بلا وجہ نہیں ہے۔ اس کے پیچھے مزید دوسرا شیش کار فرمایا ہے۔ اہم جیسا کوئی سرچھرا یہ کہہ سکتا تھا کہ زمین العابدین کا حضورؐ سے دو عیالی تعلق ہے۔

پیدا ہوا، اگر کہتے ہو کہ حضرت فاطمہؑ کے واسطے سے پیدا ہوا۔ تو پھر وہ نہ خیالی ہوا، دو خیالی کیسے ہوا۔ اور چونکہ اہل تشیع ایرانی قومیت کے باعث اپنی نہ خیالی ایران کے ساسانی خاندان کو قرار دے چکے تھے۔ اور ایرانی قومیت کے ناتے اس سے انحراف ممکن نہ تھا۔ اسی لئے ملا باقر نے حضور سے رشتہ نہیں جوڑا۔ بلکہ ہاشم سے ناتہ پیدا کیا۔

۲۔ ہاشم سے ناتہ پیدا کرنے میں فائدہ یہ ہوا کہ ایک جانب تو عبد مناف یعنی ابو طالب جو بارہ اماموں کا باپ تھا۔ اس سے رشتہ باقی رہا۔ اور دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ حضرت علیؑ کی والدہ فاطمہ بھی ہاشم کی اولاد میں سے تھیں اور ملا باقر ان فاطمہؑ کو سیدہ النساء اہل الجنتہ قرار دیتا ہے۔ لہذا وہ بھی ہاتھ سے نہ گئیں اس طرح حضور سے تعلق کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ حتیٰ کہ تاریخ یہ ثابت کرتی ہے کہ جب نفس ذکیہ نے منصور عباسی کے خلاف خردوج کیا۔ اور پھر باہم انہام و تفہیم کے لئے خط و کتابت ہوئی تو نفس ذکیہ نے اپنے ایک خط میں جواب میں لکھا تھا کہ میں باپ کی جانب سے بھی ہاشمی ہوں، اور ماں کی جانب سے بھی ہاشمی ہوں۔ مجھے دو فاطمادوں نے جنم لیا ہے۔ اس لحاظ سے میں مغربی ہاشم ہوں، اور منصور نے جواب دیا تھا کہ اپنے کا نر باپ دادوں پر فخر نہ کرو۔ گویا حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ اور ان کی اولادوں کا نر باپ دونوں کی جانب سے ہاشمی ہیں۔ لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم صرف باپ کی جانب سے ہاشمی ہیں۔ کیونکہ آپ کی والدہ نوزہرہ خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور ماں کی جانب سے ہاشمی ہونا اس لئے ضروری ہے کہ سبائیتوں کے نزدیک فاطمہ بنت اسد جو حضرت علیؑ کی والدہ تھیں سیدۃ النساء تھیں۔ جب ہی تو کعبہ میں جا کر انہوں نے بچہ کو جنم دیا تھا۔ اور ان پر باقاعدہ وحی نازل ہوئی تھی۔ جیسا کہ مولود کعبہ کے ذیل میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اور مزید تفصیل سیدۃ النساء کے تحت گزر چکی ہے۔ ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے۔ یہ تعلق حضور کے بجائے ہاشم سے جوڑا گیا ہے۔

اتفاق سے جلال العیون ترجمہ مطبوعہ لاہور پر حواشی بھی چڑھے ہوئے ہیں۔ جس کے

حاشیہ نگار بقول خود سید الواعظین، رئیس المتکلمین، زبدۃ العلماء، جناب ابوالیان، مولانا  
 السید ظہور الحسن صاحب قبلہ کو تر بھر ملوی خطیب شیعہ ملتان جیسی یگانہ روزگار سستی ہے۔  
 یگانہ روزگار اس لئے کہ جس کے القاب ہی چھ فٹ لمبے ہوں۔ وہ خود کتنے لمبے تر نگم ہو گئے  
 اور ان کی عقل کتنی لمبی چوڑی ہو گئی۔ ہم تو ان چھ فٹے القابات ہی سے متاثر ہو گئے ہیں۔ کیونکہ  
 سبائی برادری ہمیشہ القاب ہی کے ذریعہ لوگوں کو شخصیت پرستی کے مرض میں مبتلا کرتی رہی  
 ہے۔ یہ کوئی نیا حربہ نہیں ہے۔ بلکہ ہندو پاکستان میں سکھ رائج الوقت کی طرح یہ طریقہ کار عام  
 طور پر رائج ہے۔ ان بھرملوی صاحب کو یہ خطرہ محسوس ہوا۔ کہ اگر کسی سنی نے عقل سے کام  
 لے کر اس واقعہ کی پول کھول دی تو ہماری تمام سیاست پر پانی پھر جائے گا۔ بلکہ خطرہ نہیں۔  
 یہ چیز حقیقت بن کر ان کے سامنے آگئی تھی۔ یعنی علامہ شبلی مرحوم نے الفاروق میں اس واقعہ  
 کی مختصر تردید کر ڈالی تھی۔ لہذا ان بھرملوی صاحب نے حاشیہ میں اس واقعہ کا رد کرتے  
 ہوئے اپنی برادری کے لئے ایک نیا لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے۔ لہذا ہمارے قارئین بھی  
 اسے ملاحظہ کر لیں۔

حضرت شہر بانو کا دور عمر میں آنا غلط ہے۔ جس کی تردید علمائے اہل سنت نے بھی کی  
 ہے۔ تیز مند رجہ بالا شیعہ روایت کے حضرت شہر بانو کی عمر تین چار سال دو راز قیاس ہے۔ یہ روایت  
 درایت و روایت دونوں اعتبار سے غلط ہے۔ اور علمائے امامیہ نے اس نازک دور میں  
 نزاکت و دقت کے پیش نظر ہر طرح کی احادیث و روایات ذکر اہل بیت کو محفوظ کرنے کے  
 لئے نقل فرمادیں۔ تاکہ آئندہ آمیزائی نسل ان کتب سے صحیح روایات لے کر معرفت اہل بیت حاصل  
 کریں۔ لہذا آنے والی نسلوں کا فریضہ ہے کہ کتب رجال اصول روایت و درایت سے احادیث  
 و روایات لے کر عمل کریں۔ اس لئے بندے نے اس کتاب مستطاب کا حاشیہ دیدیا۔ تاکہ  
 مخالفین ان مقامات کو لے کر امامیہ پر اعتراض کی جسارت نہ کریں۔ حاشیہ جلالہ العیون ج ۲ ص ۳۵۸  
 ملا باقر مجلسی ص ۲۵۷ پر زین العابدین کی پیدائش کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

کہ ولادت آنحضرت ۳۲ دو سال قبل شہادت جناب امیر (حضرت علی) واقع ہوئی۔  
دس سال امام حسنؑ کی وفات تک اور دس سال اپنے پدر بزرگوار کی شہادت تک رہے  
اور زمانہ امامت آنحضرت ۲۵ سال اور عمر شریف آنحضرت ستادین سال تھی۔ اور مادر  
آنحضرت موافق مشہور بالودختر زید جرد بادشاہ عجم تھیں۔ اور بعضوں نے شاہ زنان لکھا ہے۔  
ملا باقر مجلسی کی اس عبارت سے ایک مسئلہ تو حل ہو گیا۔ کہ کربلا کے موقعہ پر زین العابدین  
کے بارے میں جو یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ہنوز وہ بچہ تھے اور بیمار تھے۔ تو اس عبارت سے یہ  
ثابت ہوا کہ کربلا کے موقعہ کے وقت ان کی عمر تیس سال تھی۔ جب کہ ان کے بیٹے باقر کی  
عمر چار سال تھی۔ کیونکہ ملا جو سی امام باقر کے حالات میں لکھا ہے کہ وہ ۵۷ میں پیدا ہوئے۔  
یہاں جو بات بیان کرنی مقصود ہے۔ وہ یہ ہے کہ اس مفروضہ لڑکی کے نام ہی کا  
مسند کھائی میں پڑ گیا ہے۔ شہر بائو۔ جہاں شاہ، اور شاہ زنان ہم حیران ہیں کہ اس فرضی  
لوٹہ کو کس نام سے یاد کریں۔ جب کہ اس کے پجاری بھی اس کا صحیح نام بتانے سے معذوریں۔  
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوثر بھرپوری صاحب کا کسی سنی نے ناطقہ بند کر دیا ہے۔ اس  
لئے وہ یہاں مزید ایک حاشیہ لکھنے پر مجبور ہوئے۔ اور ملا باقر کی اس کہانی سے نجات  
حاصل کرنے کا ایک ذریعہ پیدا کیا۔ اور وہ اس طرح کہ اعتراضات بھی رفع ہو جائیں۔ اور اس  
دیوئی جی کی پوجا بھی ان کے ہاتھ سے نہ جائے اور الٹا چور کو تو الٹ کو ڈانٹے، کو پیش نظر رکھتے  
ہوئے انہوں نے فرمایا یہ کہانی ہم لوگوں نے وضع نہیں کی۔ بلکہ اہل سنت نے وضع کر کے  
ہماری کتابوں میں شامل کر دی ہے۔ اگرچہ آج تک کسی سبائی نے یہ دعویٰ نہیں کیا تھا کہ  
ہماری کتابوں میں فلاں بات سینوں نے شامل کی ہے۔

ہم تو چودہ سو سال سے یہ دعویٰ کرتے آئے تھے کہ سبائی برادری نے ہماری کتابوں  
میں ہزاروں روایات گھڑ کر شامل کر دی ہیں۔ لیکن فریق مخالف کی جانب سے یہ نیا دعویٰ  
ہے۔ جو اس امر کی دلیل ہے کہ اب یہ سبائی اتنے عاجز آچکے ہیں کہ انہیں اب اس کے علاوہ

فرار کی کوئی راہ نظر نہیں آتی لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ اب بچ چکا کہ کون سا ٹھکانہ تلاش کرتے ہیں۔ آئیے اُن کا ٹھکانا اُن ہی کے ذریعہ معلوم کیجیے۔ بھریوی صاحب اپنا ٹھکانہ خود ہی بتاتے اور فرار کی وجہ بھی بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

یہ روایت مخالفین اہل بیت کی تیار کردہ ہے۔ یہ صرف اہل بیت کی تذلیل اور عمر بن الخطاب کی افضلیت کے لئے وضع کی گئی۔ خود اس واقعہ کے متعلق مورخ اہل سنت علامہ شبلی، الفاروق ص ۲۸ میں اس طرح رقم طراز ہیں۔

حضرت شہر بن ابی قحطہ جو غلط طور پر مشہور ہو گیا ہے۔ اس کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر مشہور ہے۔ جب فارس فتح ہوا۔ تو یزید جرد کی بیٹیاں گرفتار ہو کر مدینہ آئیں۔ حضرت عمرؓ نے لونڈیوں کی طرح بازار میں بیچنے کا حکم دیا۔ لیکن حضرت علیؓ نے منع کیا کہ شاہی خاندان کے ساتھ ایسا سلوک جائز نہیں۔ ان لڑکیوں کی قیمت کا اندازہ کر لیا جائے۔ پھر یہ لڑکیاں کسی کے اہتمام اور سپردگی میں دیدی جائیں۔ اور اُن سے اُن کی قیمت اعلیٰ سے اعلیٰ خرچہ لے لی جائے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے خود اُن کو اپنے اہتمام میں لیا۔ ایک امام حسینؓ کو، ایک محمد بن ابی بکرؓ کو اور ایک عبداللہ بن عمرؓ کو خلیفہ کی۔ اس غلط قصہ کی حقیقت یہ ہے کہ زخشری نے جس کو فن تاریخ سے بچھ جی واسطہ نہیں۔ ربيع الاول برابر میں لکھا ہے۔ ابن طولون نے امام زین العابدینؓ کے حالات میں یہ روایت اس کے حوالہ سے نقل کر دی۔ لیکن یہ محض غلط ہے۔

اولاً تو زخشری کے سوا طبری، ابن الاثیر، یعقوبی، بلاذری اور ابن قتیبہ وغیرہ نے اس کو نقل نہیں کیا۔ اور زخشری کا فن تاریخ میں جو پایہ ہے وہ ظاہر ہے۔ اس کے علاوہ تاریخی قرائن بالکل اس کے خلاف ہیں۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں یزید جرد اور خاندان شاہی پر مسلمانوں کو مطلق تسلط حاصل نہیں ہوا۔ نیز مجھے یہ بھی شبہ ہے کہ زخشری کو یہ معلوم تھا یا نہیں کہ یزید جرد کا قتل کس کے عہد میں ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جس وقت کا یہ واقعہ ہے حضرت حسینؓ کی عمر دس برس تھی۔ کیونکہ جناب مدوح، ہجرت کے پانچویں سال پیدا ہوئے اور



نارس ۱۹ میں فتح ہوا۔ اس سے یہ امر مستبعد ہے کہ حضرت علیؓ نے نابالغی میں اُن پر ایسی عنایت کیوں کی۔

شبلی کا یہ بیان بھرپوری صاحب نے مخبر جملہ العیون کے حاشیہ میں نقل کیا ہے۔ جس کے باعث بھرپوری جہاں بے بس ہوئے۔ وہاں علامہ شبلی کی ایک غلطی کے باعث انہیں راہ نرادر مل گئی۔ اور انہوں نے سینوں پر یہ الزام قائم کر دیا کہ سینوں نے یہ روایت وضع کر کے شیعوں کی کتابوں میں شامل کر دی۔ دراصل علامہ شبلی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے یہ کہہ دیا کہ زنجیری کے علاوہ اسے کسی اور نے بیان نہیں کیا۔ زنجیری کا نام محمد بن عمرو جار اللہ لقب ہے۔ اس کا انتقال ۱۲۷ھ میں ہوا۔ اور بظاہر وہ سنی تھا۔ لہذا بھرپوری کو یہ جیلہ ہاتھ آگیا۔ کاش علامہ شبلی شیعہ مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کر لیتے تو اُن پر یہ عقدہ کھل جاتا کہ زنجیری نے یہ کہانی کلینی سے نقل کی ہے۔ اس کا نام محمد بن یعقوب ہے۔ جو ۱۵۲ھ میں پیدا ہوا۔ اصول کافی کا مصنف یہی ہے۔ جس نے سب سے اول اپنی کتاب میں یہ روایت نقل کی دیں سے ملا باقر مجلسی نے اسے نقل کیا اور وہیں سے زنجیری نے۔ زنجیری تو صرف نقل کے گناہ گار ہیں۔ یہ کرشمہ سازی تو سبائیوں کے سب سے بڑے محدث کلینی نے دکھائی ہے۔ سینوں نے آپ کی کتاب میں کوئی روایت شامل نہیں کی۔ بلکہ آپ لوگوں کی کتابوں سے سینوں نے لے لی ہیں۔

بھرپوری صاحب لکھتے ہیں۔

نیز علامہ قطب راوندی کی حضرت امام باقر علیہ السلام کی بیان کردہ روایت کہ جب یہ دجربہن شہر یا ر آخر بادشاہان عجم کی دختر کو عمر کے پاس لائے۔ یہ روایت اصول کافی سے ہے۔ علمائے شیعہ خواہ مجلسی ہوں یا محمد بن یعقوب صاحب اصول کافی کے ماننے والے۔ تمام نے اس وقت جب کہ زمانہ دشمنی اہل بیت پر تلا ہوا تھا۔ شیعیت نازک دور سے گزر رہی تھی۔ ان کتب کو مرتب کیا۔ اور وہ ہر روایت جو ملی خواہ کہیں سے ملی ہو تحریر فرمادی

اب اس کے صحیح، ضعیف یا موضوع کو دیکھنے کے لئے عقل اور علم الرجال سے دیکھنا پڑتا ہے۔ کیونکہ اہل اسلام کے نزدیک یہ دونوں طریقے مستند ہیں۔ لہذا پہلے اس حدیث پر عقل تبصرہ کرتے ہیں۔

ولادت شہربانو ۱۳ اور ۱۴ کے درمیان ہوتی ہے۔ اگر ۱۳ میں فرض کی جائے تو عہد عمر میں مدائن ۱۶ میں فتح ہوا۔ تو شہربانو کی عمر چار یا ساڑھے چار سال ہوگی اور یہ بعید از عقل ہے کہ ایک چھوٹی سی نابالغ بچی عمر ۴ سے منہ چھپائے۔ (لیکن نکاح ام کلثوم میں یہ نطق ضرور برسبائی کو یاد آتی ہے) اور پانچویں پشت میں اپنے بندہ ہرمز کا نام لے کر فریاد کرے۔ اور عمر دشنام محمدؐ کو منزا دینے پر تلبیہوں، جب کہ نابالغوں کو شرعاً منزا دینا درست نہیں حضرت علیؑ اس بچی کو شوہر منتخب کرنے کا اختیار دلوایں۔ اور وہ اختیار کرے۔ اور حضرت علیؑ نابالغی میں چھوٹی بچی کا امام حسینؑ سے نکاح کریں۔ (نکاح کیسا؟ ان کی تزئین لگائی گئی تھی) عقلیہ روایت بالکل غلط اور ناقابل اعتماد ہے۔

نیز اصول کافی میں اس روایت کے چار راوی ہیں۔ ابراہیم بن اسحاق الاحمر، عبدالرحمان بن عبداللہ خزاعی۔ عمرو بن شمر، نصر بن مزاحم۔ ابراہیم بن اسحاق کے متعلق شیخ طوسیؒ نے لکھا ہے کہ وہ علم حدیث میں ضعیف اور دین کے لحاظ سے متہم تھا (یعنی شیعہ نہ تھا) رجال کشی میں شیخ نے اس کا شمار اُن لوگوں میں کیا جنہوں نے اہل بیت سے روایت نہیں کی۔ ابن عضائری نے لکھا ہے کہ اس کی احادیث میں ضعف اور دین میں غلو پایا جاتا ہے۔

عبدالرحمان بن عبداللہ خزاعی بالکل مجہول الحال ہیں۔ نہ شیعہ کتب میں اُن کا تذکرہ نہ اہل سنت کے کتب رجال میں اس کا کوئی ذکر ہے۔

عمر بن شمر، علامہ نجاشی شیعہ المقال میں فرماتے ہیں۔ یہ امام صادق سے روایت کرتا ہے۔ مگر بیت ضعیف ہے۔ ابن عضائری نے بھی اس کو ضعیف اور ناقابل اعتماد کہا ہے۔ نیز احب مرآة العقول بھی اس کی تضعیف کے قائل ہیں۔

نصر بن مزاحم: تنقیح المقال نے علامہ نجاشی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ یہ راہِ راست پر تھا  
 (یعنی کٹر سبائی تھا) مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ ضعیف روایت (یعنی سنیوں) سے بھی روایت  
 کرتا تھا۔ نیز خود علامہ مجلسی نے اپنی کتاب مرآۃ العقول شرح اصول کافی میں اس روایت کو  
 ضعیف قرار دیا ہے۔ پس جو روایت درایت و روایتاً ناقابل اعتبار ہو اس کا سہارا لینا جائز نہیں  
 دوسری روایت یہ کہ دور عثمان میں عرب آئی ہوں، جو کہ بخارا لائوار سے پیش کی جاتی  
 ہے۔ جس کے راوی محمد بن یحییٰ صولی، اور عون بن محمد الکندی ہیں۔ یہ روایت بھی روایت کے  
 اعتبار سے ناقابل اعتبار ہے۔ ان راویوں کا شیعہ کتب رجال میں کہیں تذکرہ نہیں۔ اہل سنت  
 کتب میں جو تذکرہ ہے وہ یہ ہے ابو احمد بن عثمان کے ذریعہ یہ خبر ملی ہے کہ ابو احمد عسکری کی  
 طرف غلط روایات منسوب کرتا تھا۔ جس طرح صولی خود غلابی کی طرف اغلاط کو نسبت دیتا تھا  
 اور جس طرح غلابی تمام محدثین کی طرف سے خود غلط روایتیں بیان کرتا تھا۔ لسان المیزان ج ۲ (۵۲۷)  
 عون بن محمد یہ صاحب اخباری تھے۔ یعنی مورخ۔ ان سے سوائے صولی کے اور کسی نے  
 روایت نہیں لی۔ لسان المیزان ج ۲ ص ۴۸۸۔ جلاء العیون ج ۲ ص ۲۵۹۔

اس تحریر سے ہمارے قارئین یہ تصور نہ کر لیں کہ شہر بانو کی کہانی سے خود سبائی نالاں  
 یا اس کے منکر ہیں۔ حاشا وکلاً۔ یہ تصور تو ایک امر محال ہے کہ جس کہانی کو وہ وجود میں لے  
 آئیں۔ اور وہ کہانی اُن کی ایرانیّت کی آئینہ دار ہو تو وہ اس سے کلیتہً منحرف ہو جائیں۔ بلکہ یہ  
 ہوتا ہے کہ جب اعتراضات کی بوچھاڑ ہوتی ہے اور اس کا جواب ملنا شروع ہو جاتا ہے تو  
 کہانی کا رنگ دروپ بدل دیا جاتا ہے اور اصل پلاٹ باقی رہتا ہے۔

بھریطوی صاحب نے اپنے پیش روؤں کا یہ قول تو ضرور رد کر دیا کہ فیہ دگردی مٹی نہ  
 تو دور عثمان میں آئی اور نہ دور عثمان میں۔ لیکن انہوں نے ہرگز اس کا اقرار نہیں کیا کہ اس کا کوئی وجود  
 نہ تھا۔ اور وہ سرے سے مدینہ آئی ہی نہیں۔ یادہ زین العابدین کی ماں نہ تھی۔ وہ ان تمام بانو  
 کو نظر انداز کر گئے۔ اور شبلی مرحوم نے دور عثمان والے واقعات پر لغادوق میں جو اعتراضات کئے

تھاس سے گھبرا کر دورِ عمر کی کہانی سے منکر بن گئے۔

ہاں انہوں نے ہمارے کام کی یہ بات ضرور کہہ دی ہے کہ شیعہ مذہب کی روایات کو بھی عقل اور اسما الرجال کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیے۔ ان کے پہلوں نے بلا سوچے سمجھے روایات نقل کر دی تھیں۔ جو ان کی غلطی تھی۔ ورنہ اعتراضات واقع نہ ہوتے۔ اسی لئے ہم روایت و درایت دونوں اصول سے اس کہانی پر بحث کر رہے ہیں۔ اور غالباً مودودی صاحب نے تاریخ میں راویوں پر جرح کو اسی لئے ممنوع قرار دیا ہے۔ کیونکہ وہ محمود احمد عباس کی جرح سے گھبرا اٹھے تھے۔

کوثر بھرمیلوی صاحب نے ایک اور روایت کی جانب بھی اشارہ کیا ہے اور خود ہی اس کی تردید بھی کر دی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ شہر بانو دورِ عثمانؓ میں مدینہ منجی۔ ہم یہ روایت ملاحظہ فرمائی۔ مجلسی کی زبانی جلاء العیون سے پیش کرتے ہیں۔ مجلسی لکھتے ہیں۔

ابن بابویہ نے بسند معتبر حضرت امام رضاؑ سے روایت کی ہے کہ جب عبداللہ بن عامر (اموی) نے خراسان فتح کیا۔ یزدجرد بادشاہِ عم سے دو بیٹیاں لے کر عثمانؓ کے واسطے بھیجیں۔ اُس نے ان میں سے ایک حضرت حسنؑ اور دوسری حضرت حسینؑ کو دیدی۔ اور جو حضرت امام حسینؑ کے پاس تھیں اُن سے زین العابدینؑ پیدا ہوئے اور جب حضرت اُن سے پیدا ہوئے۔ اُس وقت حالتِ زچگی میں انہوں نے انتقال کیا۔ اور دوسری دختر نے بھی فرزندوں کی ولادت کے وقت انتقال کیا۔ حضرت امام حسینؑ کی ایک کینز نے حضرت امام زین العابدینؑ کی پرورش کی حضرت اس کو مادر کہتے تھے جب امام حسینؑ شہید ہوئے۔ امام زین العابدینؑ نے اس کینز کا کسی شیعہ مؤمن سے عقد کر دیا۔ اس اشتباہ سے مشہور ہو گیا۔ کہ حضرت امام زین العابدینؑ نے اپنی مادر کا ایک شیعہ سے عقد کر دیا۔

مؤلف (مجلسی) فرماتے ہیں کہ یہ حدیث اس سے مخالفت رکھتی ہے جو کچھ احوالِ اولادِ امام حسینؑ میں زری۔ کہ حضرت شہر بانو عبدعزیز بن الخطابؓ میں لائی گئی۔ اور شاید کسی راوی نے

اس روایت میں شبہ کیا ہو۔ اور وہ روایت جس کا یہاں ذکر ہوا ہے مشہور و اتوی ہے۔

چنانچہ قطب راوندی نے بسند معتبر امام محمد باقر سے روایت کی ہے کہ جب نیر و مجرد بن شہر یا آخر بادشاہان عجم کی دختر کو عمر کے پاس لائے۔ جمیع دختران مدینہ اس کے تماشا کے حسن و جمال کو دیکھنے کے لئے آئیں۔ اور جب عمر نے قصداً اس کے دیکھنے کا کیا۔ وہ مانع ہوئی اور کہا ہرگز کا منہ سیاہ ہو کہ تو اس کی اولاد کی طرف ہاتھ بڑھائے۔ عمر نے کہا اے گرزادی تو مجھے دشنام دیتی ہے۔ اور چاہا کہ اسے ایذا پہنچائیں۔ جناب امیر نے فرمایا۔ اس کی بات تم کیوں کر سمجھ کر یہ تم کو دشنام دیتی ہے۔ پھر عمر نے حکم دیا۔ کہ اس کے فروخت کرنے کی سب کو اطلاع کرو، حضرت نے فرمایا۔ دختران سلاطین کا بیع کرنا ہر چند کہ کافروں جائز نہیں۔ لیکن اس سے کہو کہ ان مسلمانوں میں سے کسی کو قبول کرے۔ اور کہا کہ کس کو اہل مجلس میں سے اختیار کرتی ہے۔ اس سعادت مند لے دوش مبارک امام حسینؑ پر رکھ دیا۔ جناب امیر نے بزبان فارسی اس سے پوچھا کہ تمہارا نام کیا ہے؟ اُس نے کہا جہاں شاہ حضرت نے فرمایا میں نے تمہارا نام شہر بانو رکھا۔ اس شہزادی نے کہا یہ نام میری خواہر کا ہے۔ حضرت نے بزبان فارسی فرمایا۔ تم سچ کہتی ہو، پھر حضرت امام حسینؑ سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ اس سعادت مند سے بیشکی سلوک کرنا اور اس کی حفاظت کرنا۔ کیونکہ اس سے ایک ایسا فرزند پیدا ہوگا جو بعد تمہارے بہترین اہل زمین ہوگا۔ اور یہ میرے اوصیاء و ذریت طیب کی ماں ہے۔ چنانچہ زمین العابدین اُن سے پیدا ہوئے۔

اور منقول ہے کہ قبل اس کے کہ مسلمانوں کا شکر اُن کی طرف جائے۔ شہر بانو نے یہ خواب ایک شب دیکھا کہ حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع حضرت امام حسین اُن کے گھر آئے۔ اصناف کو ان سے ترویج کی۔ شہر بانو کہتی ہیں جب صبح ہوئی۔ اس خورشید فلک امامت کی محبت میرے دل میں مستحکم ہو گئی۔ اور مجھے ہر وقت ہمیشہ آنحضرت کا خیال رہتا تھا۔ جب وہ صبح شب میں سوئی فاطمہ صلوات اللہ علیہا کو میں نے خواب میں دیکھا کہ میرے پاس شریف

لائیں۔ اور اسلام کی مجھے ہدایت و دعوت کی۔ میں نے خواب ہی میں اسلام قبول کر لیا۔ بعد اس کے فرمایا کہ لشکر اسلام تمہارے پدر پر غالب ہوگا۔ اور تم اسیر ہو کے بہت جلد میرے فرزند حسینؑ کے پاس پہنچو گی۔ اور خدا یہ امر ناگوار کرے گا۔ کہ تم تک کسی غیر کا ہاتھ پہنچے۔ یہاں تک کہ میرے فرزند تک پہنچو۔ پس حق تعالیٰ نے میری حفاظت کی کہ کسی غیر شخص کا ہاتھ مجھ تک نہ پہنچا۔ یہاں تک کہ مجھے مدینہ میں لائے۔ اور جب میں نے امام حسینؑ کو دیکھا تو پہچان لیا۔ کہ یہ وہی ہیں جو حضرت رسول کے ہمراہ خواب میں میرے پاس آئے تھے اور حضرت نے انہیں مجھ سے ترویج کیا تھا۔ اسی سبب سے میں نے ان کو قبول کیا۔ جلالہ العیون ج ۲ صفحہ ۳۶۸ ہم اپنی رائے ابھی محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔ ویسے کوثر بھڑلوی صاحب اس روایت کا بھی انکار کر چکے ہیں۔ اب ان مجوسیوں کا آخری حربہ بھی ملاحظہ ہو۔ ملا مجلسی لکھتے ہیں۔

شیخ مفید نے روایت کی ہے کہ جناب امیر (حضرت علیؑ) صلوات اللہ علیہ نے حریت بن جابر کو بعض بلاد مشرق کا عامل کیا۔ اس نے یزدجرد بادشاہ کی دو لڑکیاں حضرت (علیؑ) کے واسطے بھیجیں۔ جناب امیر نے ایک ان میں سے کہ شاہ زنان نام تھا حضرت امام حسینؑ کے لئے تجویز فرمائیں اور ان سے حضرت امام زین العابدین پیدا ہوئے۔ دوسری محمد بن ابی بکر کو دی۔ جس سے قاسم پیدا ہوئے۔ حضرت قاسم اور حضرت امام زین العابدین خالہ زاد بھائی تھے۔ بھڑلوی لکھتے ہیں۔

حضرت شہر بانو کا نامک خواران سقیفہ نے افسانہ بنا دیا۔ عزت رئیس سقیفہ بلند کرنے کے لئے شبلی جیسے موزع نے الفاروق میں اس قصہ کو غلط قرار دیا ہے۔ خلافت علیؑ میں ہونی امام حسینؑ اس وقت تیس سال کے تھے۔ آپ نے حریت بن جابر صفی کو خراسان کا گورنر بنا کر روانہ کیا۔ حریت نے یزدجرد کی دو بیٹیاں شہر بانو اور گیسبان بالو حضرت علیؑ سے پاس بھیجیں آپ نے شہر بانو امام حسینؑ کو اور گیسبان بالو محمد بن ابی بکر کو دیں۔ شہر بانو سے امام زین العابدین پیدا ہوئے۔ اور گیسبان بالو سے قاسم بن محمد پیدا ہوئے۔ (روقتہ الصفاق ص ۸۵) جامع التواریخ

۱۴۱۔ کشف الغمہ ص ۳۱۔ نیز عقل بھی اس روایت کو تسلیم کرتی ہے۔ لہذا صحت کا گمان اسی پر ہوتا ہے۔ بلکہ ہوتا کیا صحیح یہی ہے۔ حاشیہ جلال العیون ج ۲ ص ۲۶۳۔  
اب آخر میں شیخ کلینی کا ایک فیصلہ بھی سن لیجئے جو اس نے اصول کافی میں بیان کیا ہے  
کلینی لکھتے ہیں۔

علی بن الحسین ۳۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۵ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ ان کی عمر ستادین سال ہوئی۔ ان کی والدہ سلامہ بنت یزدجرد شہر یاربن شبرویہ بن کسری پر دیز ہے اصول کافی مترجمہ ج ۱ ص ۵۷۷

ان تمام روایات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو خاکہ سامنے آتا ہے۔ وہ خاصا طویل ہے۔ اس لئے ہم اس کے ضروری اجزاء بیان کئے دیتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل شریعت کے ایک اصول کو ملحوظ خاطر رکھتے۔ ورنہ قدم قدم پر آپ لوگ ڈگمگاتے رہیں گے۔

شرعی اصول یہ ہے کہ صرف ان لوگوں کو گرفتار کیا جاتا ہے جو میدان جنگ میں ہاتھ آتے ہیں۔ اگر عورتیں بھی فوج کے ساتھ ہیں تو وہ بھی گرفتار ہوتی ہیں۔ یہ سب جنگی قیدی متصور ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ کسی پر ہاتھ نہیں ڈالا جاتا۔

اس دور میں ہر لشکر کے ساتھ کچھ عورتیں ضرور ہوتی تھیں کچھ زخمیوں کی مرہم پٹی اور بالائی کاموں کے لئے اور کچھ کو بعض کفار اپنی عیاشی کے لئے ساتھ لے کر آیا کرتے تھے۔ گرفتاری کے بعد تمام مرد اور عورتوں کو خلیفہ وقت کی خدمت میں بھیج دیا جاتا تھا۔ خلیفہ وقت کو از روئے شریعت یہ اختیار دیا گیا ہے کہ ان جنگی قیدیوں کو اگر زیادہ خطرناک ہیں تو ان میں سے مردوں کو قتل کر دیا جائے اور عورتوں کو چونکہ وہ بے سہارا ہو چکی ہیں۔ مجاہدین پر تقسیم کر دیا جائے اگر خلیفہ مناسب سمجھے تو سب کو آزاد کر سکتا ہے یا سب کو دوسروں کی غلامی میں دے سکتا ہے۔ اور مناسب سمجھے تو قیدی لے کر رہا کر دے۔ لیکن کسی ایسے شخص کو جس نے جنگ میں حصہ نہ لیا ہو، گرفتار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسی طرح اگر گرفتاری کے بعد تقسیم سے قبل وہ ایمان لے آیا۔ اب وہ

رہا ہو کیا اس سوال کو سمجھ لینے کے بعد کچھ تاریخی معروضات بھی ملاحظہ کر لیجئے۔

۱۔ یہ لڑکیاں کس جنگ میں ہاتھ آئی تھیں اور میدان جنگ میں یہ کس حیثیت سے آئی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں کم سن ہونے کے باعث ان کا میدان جنگ میں آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ رہا حضرت عثمانؓ کا زمانہ تو جب تک ان کا باپ زندہ رہا تو اس وقت تک شہزادوں کے آنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ شہزادیاں خدمت کے لئے نہیں ہوتیں، وہ دوسروں سے خدمت لیتی ہیں۔ جب ۱۲ھ میں یزیدؓ جرہ در گیا تو اب ان کا میدان جنگ میں آنے کا امکان پیدا ہوتا ہے۔ کہ ممکن ہے کسی مقام پر انہوں نے جنگ کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی ہو۔ اور اس طرح جنگی قیدی بن کر آئی ہوں۔ لیکن اول تو یہ صورت آج تک کسی نے بیان نہیں کی۔ ددتم بھر ملوی صاحب اس سے انکار کر چکے ہیں کیا یہ واقعہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں پیش آیا ہو۔ اب رہا حضرت علیؓ کے زمانہ کا مسئلہ تو جب خراسان ۱۹ھ میں فتح ہو چکا تھا۔ اور وہاں اسلامی حکومت قائم تھی اور ایرانیوں کی حیثیت ذمیوں کی تھی۔ ایسی صورت میں انہیں ۲۰ھ میں گرفتار کر کے بھیجا اور پھر حضرت علیؓ کا انہیں تقسیم کرنا ہر دو امور حرام تھے۔ ہم اہل سنت حضرت علیؓ کے بارے میں اس قسم کا تصور بھی کرنے کے لئے تیار نہیں کہ جن ذمیوں کی حفاظت اسلام نے ان کے سر ڈالی ہو، وہ اس ذمہ داری کو پس پشت ڈال کر حریت کے ذریعہ ان لڑکیوں کو گرفتار کرائیں۔ جو حکومت اسلامیہ کی پناہ میں ہیں اور پھر انہیں تقسیم کریں۔ ہم تو ایسی سوچ رکھنے والوں پر بھی لعنت بھیجتے ہیں۔

۲۔ سب سے اول فیصلہ یہ ہونا چاہیے کہ یہ لڑکی کس زمانہ میں گرفتار ہو کر آئی۔ ۱۲ھ میں حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یا ۱۹ھ میں فتح خراسان کے بعد یا ۲۰ھ میں یزیدؓ گرد کے مرنے کے بعد یا ۲۱ھ میں حضرت علیؓ کے زمانہ میں۔

۳۔ یزیدؓ گرد کی ایک لڑکی گرفتار ہو کر آئی۔ یاد دل لڑکیاں گرفتار ہو کر آئیں یا تین لڑکیاں۔ یہ سوال اس لئے انتہائی اہم ہے۔ تاکہ یہ معلوم کیا جاسکے کہ بقیہ لڑکیوں کی اولاد کوئی کون میں



تاکہ شہنشاہان ایران سے اُن کا بھی رشتہ جوڑا جاسکے۔

۴۔ سبائی یہ تو تسلیم کر چکے ہیں کہ قاسم بن محمد بن ابی بکر اور ان کی اولاد میں شہنشاہان فارس کا خون دوڑ رہا ہے۔ کیوں نہ ابو بکر صدیق کی اس اولاد کو جو قاسم بن محمد کی نسل سے ہو، امامت و ولایت سپرد کی جائے۔ آخر انہیں کب تک محروم رکھا جائیگا۔ ہم ایسے بہت سے حضرات سے واقف ہیں جو اُن کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوگا کہ شیعہ سنی اتحاد کی راہ بھی کچھ ہموار ہوگی۔ کہیں نہ سمجھ لیجئے گا کہ ہم اپنا نام پیش کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہم عبدالرحمان بن ابی بکر کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں۔

۵۔ زین العابدین کی ماں کا آخر کیا نام تھا۔ شاہ جہاں۔ شاہ زمان یا اسلامہ۔ اس لئے کہ شہر بانو تو بقول ان کے حضرت علیؑ نے رکھا۔ اور اس لڑکی کے بقول وہ اس کی بہن کا نام تھا جو دوسرے کے حصہ میں آئی۔

۶۔ دوسری لڑکی اور جس روایت میں تین کا ذکر ہے۔ آخر وہ کس کے حصہ میں آئیں اس کا فیصلہ درکار ہے۔ اس لئے کہ مرد بہر صورت تین ہیں۔ اور سبائی چار مردوں میں ایک یا دو عورتیں یا تین تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے کہ آٹے والی ایک ہے۔ دو ہیں۔ یا تین ہیں اور جن مردوں کے درمیان ان کا بٹوارہ ہو رہا ہے وہ چار ہیں یعنی حضرت حسینؑ، حضرت حسنؑ، محمد بن ابی بکر اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ۔ ہمارے لئے تو یہ میسائیوں کی تشکیث سے بھی زیادہ دشوار مسئلہ ہے۔ لہذا اس مسئلہ کو حل فرما دیجئے۔

۷۔ شہر بانو تو بقول آپ کے دریا میں ڈوب کر مرے، بچہ کی پیدائش کے وقت مری یا خاوند کی لاش میدان میں چھوڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ بقیہ دو کا حال معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کہاں گئیں۔

۸۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے یہاں اس شہزادی سے کون سی اولاد ہوئی تاکہ فاروقؓ

۹۔ ایک لڑکی حضرت حسنؑ کو دی گئی۔ جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لیکن نہ تو اس لڑکے کا نام بیان کیا گیا۔ اور نہ اُن سے سلسلہ امامت چلایا گیا۔

۱۰۔ یہ لڑکیاں بطور مالِ غنیمت تقسیم ہوئیں۔ یا اُن کا نکاح ہوا۔ پھر یہ نکاح عام لوگوں کے رُو برد ہوایا عالم خواب میں ہوا۔

۱۱۔ کیا عالم خواب میں نکاح درست ہو سکتا ہے؟

۱۲۔ کیا خواب میں ایمان قبول کرنے سے کوئی مومن بن جائے گا۔ اگر اس کا جواب اثبات میں ہے تو پھر گرفتار کرنا، اور مدینہ یا کوفہ سے جانا ایک لغو حرکت ہوئی۔

۱۳۔ کینی نے علی بن حسین کی ماں کا نام سلامہ بتایا ہے۔ سبائیوں کے نزدیک اس روایت کی کیا پوزیشن ہے؟ کہیں یہ سلافہ کی ف کو میم سے تو نہیں بدلا گیا۔

۱۴۔ جب علی بن حسین اس لڑکی کی اطلاع تھے۔ تو وہ اپنے والد کی باندی سلافہ کو کیسے ماں کہہ کر پکارتے رہے۔ جسے خود سبائیوں نے قبول کیا ہے۔ یہ صورت کم عمری میں تو ممکن ہے۔ لیکن بڑے ہونے کے بعد ممکن نہیں۔

۱۵۔ حضرت حسینؑ کی شہادت کے بعد زین العابدین نے اپنی والدہ کا نکاح ایک شیعہ مومن سے کر دیا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے آج تک اُس شیعہ مومن کا اتنا سا تک نہیں بتایا پھر اُس دور تک شیعہ مومن صرف کوفہ میں بستے تھے۔ یہ مدینہ میں کون سا مومن پیدا ہوا تھا۔ جس کا یہ لوگ نام تک لینا پسند نہیں کرتے۔

۱۶۔ حضرت علیؑ بقول ان کے نہایت شہسہ فارسی بولتے تھے۔ یہ فارسی انہوں نے کس سے سیکھی تھی۔ یا بطور معجزہ انہیں حاصل ہو گئی تھی۔ یا امام کے لئے فارسی جاننا ضروری ہے۔

۱۷۔ مدینہ منورہ میں وہ منڈی کس جگہ واقع تھی جہاں لڑکیاں فروخت ہوتی تھیں۔ یا صرف اس واقعہ کو وجود میں لانے کے لئے یہ منڈی وضع کی گئی۔

۱۸۔ ایرانیوں کے سلسلہ میں جتنی سفارشات ہوتی ہیں۔ وہ سب حضرت علیؑ کے حصّہ

میں کیوں آتی ہیں۔

۱۹۔ یہ واقعات صرف اس لئے وضع کئے گئے کہ اسلام اور عربوں میں ایرانیت کو بھلیا جائے۔ اور حضرت علیؓ اور ان کی اولاد کا نام لے کر یانں سے کام لے کر اسلامی حکومت کا تختہ الٹا جائے۔ جیسا کہ بعد کے واقعات اسے ثابت بھی کرتے ہیں۔

۲۰۔ حضرت عمرؓ اس ظالم تھے کہ باوجودیکہ فارسی نہ جانتے تھے۔ چار سالہ بچی کو ایذا پہنچانے کے لئے تیار ہو گئے۔

۲۱۔ حضرت علیؓ اتنے بد اخلاق تھے کہ امیر المؤمنینؓ سے تو تیرا سے باتیں کر رہے ہیں اور ہر منزل پر انہیں ٹوکتے رہتے ہیں۔ وہ ایسا اگر عداوت کے باعث انجام دے رہے تھے۔ تو پھر امیر المؤمنینؓ اس لڑکی کو حضرت حسینؓ کو نہ دیتے۔ یا یہ حرکات کسی تعلق خاطر کے باعث کی جا رہی تھیں؟

۲۲۔ یہ واقعہ خواہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں پیش آیا ہو یا حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں بہر صورت جب حضرت عمرؓ نے ایک لڑکی حضرت حسینؓ اور حضرت عثمانؓ نے ایک لڑکی حضرت حسنؓ اور ایک حضرت حسینؓ کو دی۔ اس عطلے سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان دونوں حضرات کو حضرت علیؓ اور ان کی اولاد سے بہت زیادہ انتہیت تھی۔ کہ انہوں نے اپنے بیٹوں کو چھوڑ کر یہ لڑکیاں حضرت علیؓ کے بیٹوں کو دیدیں۔

۲۳۔ خراسان کے فاتح حضرت عبداللہؓ بن عامر اموی ہیں۔ یہ وہی صحابی ہیں جن کے باعث یہ سبائی اور ان کے ہم نوا حضرت عثمانؓ پر قرابت داری کے الزام قائم کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ مودودی صاحب نے بھی سبائی کہانیاں نقل کر کے انہیں بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا اس کے پس پردہ یہ کینہ تو نہیں ہے کہ انہوں نے خراسان فتح کیا۔ اور اسی کینہ کے نتیجے میں پورے سو سال بعد ابو مسلم خراسانی نے خلافت نبی امیہ کو ختم کیا۔ لیکن ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ یہ سبائی برادری عبداللہؓ بن عامر کے گیت گا تے نہ وہ ان لڑکیوں کو گرفتار کر کے بیعتے اور

نہ علی بن الحسین کا ایرانیوں سے کوئی رشتہ پیدا ہوتا۔ یہ تو احسان فراموشی کی بدترین مثال ہے۔  
 ۲۲۔ حضرت عبداللہ بن عامر نے یہ لڑکیاں حضرت عثمانؓ کے لئے بھیجی تھیں لیکن انہوں نے حسنؓ و حسینؓ کو دے کر اپنی محبت کا ثبوت پیش کیا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی موت تک کی خوشی منائی جاتی ہے۔

۲۵۔ بھریلوی صاحب اور شیخ مفید نے اس امر کو صحیح تسلیم کیا ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں حضرت علیؓ کے زمانہ میں ۳۱ء میں آئیں۔ لیکن انہوں نے ان دونوں لڑکیوں کا انجام بیان نہیں کیا کہ وہ کہاں گئیں یا کیسے مریں۔ آخر اس میں کیا راز ہے؟

۲۶۔ حضرت علیؓ نے ایک لڑکی ۳۱ء میں محمد بن ابی بکر کو دی۔ ۳۲ء میں اُن کا لڑکا قاسم پیدا ہوا۔ اور ۳۳ء میں محمد بن ابی بکر قتل کر دیئے گئے۔ ان کے قتل کے بعد قاسم کی پرورش ان کی پھوپھی ام المومنین حضرت عائشہؓ ہی نے فرمائی۔ آخر ان کی ماں یعنی گیسبان بالو کہاں غائب ہو گئی تھیں۔ کیا ایرانی لڑکیوں کا یہی دستور رہا ہے کہ پہلو ٹاچہ پیدا کر کے گھر سے فرار ہو جائیں؟  
 ۲۷۔ گیسبان بالو محمد بن ابی بکر کو کس صلہ میں دی گئیں۔ یا سبائتوں نے اس خوشی میں اُن کے ہاتھ میں تھمائی کہ حضرت عثمانؓ کے خلاف جو سازش تیار ہوئی تھی اس کے ایک سرغنہ یہ بھی تھے۔ رہا قاسم سے پیار کا مسئلہ تو کیا وہ اس مجبوری کے باعث تو نہیں ہے کہ اُن کی لڑکی جعفر کی ماں تھیں۔

۲۸۔ کیا سبائی مسلک میں چار سال کی بچی بھی کسی پر عاشق ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب اثبات و نفی میں سوچ سمجھ کر دیجئے۔

۲۹۔ بھریلوی صاحب نے اپنی تحریر میں ایک مقام پر دو نئے حملے بطور تبرا استعمال کئے۔ لیکن ہم یقین ہے کہ ہمارے سنی بھائی ان جملوں کو سمجھ بھی نہ سکے ہوں گے۔ آئیے ہم ان دونوں جملوں کی ذرا وضاحت کر دیں کیونکہ یہ خالص سبائی جملے ہیں۔ یہ جملے یہ ہیں۔ نمک خوران عزت رئیس سقہ ان جملوں کو سمجھنے کے لئے آپ تاریخ کے اس موڑ پر پہنچئے۔

کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی۔

اُس وقت اکثر اہل عرب مرتد ہو گئے تھے۔ خاندان نبی ہاشم حضرت علیؑ کی خلافت کے لئے حضرت فاطمہؑ کے گھر جمع تھا اور انصار مدینہ میں محلہ نبی ساعدہ کے ایک احاطہ میں جمع تھے اور اپنی خلافت کے مدعی تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اس کی اطلاع ملی۔ وہ حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کو ساتھ لے کر انصار کے پاس پہنچے۔ اور ان سے گفتگو شروع کی۔ اور ان کے سامنے یہ بات بیان کی کہ چونکہ حضور بھی قریش کے تھے۔ لہذا خلافت قریش کا حق ہے۔ انصار نے اس بات کو قبول کر لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے فرمایا۔ یہ ابو عبیدہؓ اور عمرؓ موجود ہیں۔ ان میں جس کی چاہو بیعت کر لو۔ لیکن عمرؓ نے آگے بڑھ کر ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔

اس واقعہ کو ذہن میں رکھئے۔ اور پھر سوچئے یہ جملے کیسے ہیں۔ سبائیوں کے نزدیک حضرت علیؑ کو جو خلافت ذمہ مل سکی۔ اس کا سبب حضرت عمرؓ ہیں۔ نہ وہ ابوبکرؓ کی بیعت کرتے۔ اور نہ یہ خلافت علیؑ کے ہاتھ سے جاتی۔ لہذا رئیس سقیفہ سے مراد حضرت عمرؓ ہیں۔ جن سنیوں نے یہ اقدام کر کے سبائیوں کی کتابوں میں شامل کیا ہے، وہ صرف رئیس سقیفہ یعنی حضرت عمرؓ کی عزت بڑھا کے لئے کیا ہے۔ ورنہ ان سبائیوں کی تو اس واقعہ سے کوئی غرض و غایت نہ تھی۔ اور جو لوگ اس خلافت کو درست تسلیم کرتے ہیں۔ وہ ملک خواران سقیفہ ہیں۔ یعنی اہل سنت۔ اتنی دور کی کوڑی لانا یہ سبائیوں کا ہی کمال ہے۔ ہمارے سنی بھائی تو اپنی لاعلمی کے باعث ان باتوں کو سمجھنے پر بھی قدرت نہیں رکھتے۔ اور پھر بھی بھاگے بھاگے ان کی محفلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح ان کے ذہنوں میں تشیع کا زہر مزید بھرتا رہتا ہے۔

الغرض اعتراضات کا ایک سیلاب ہے جو رکنے میں نہیں آتا۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے قارئین کے لئے یہ بھی بہت ہے۔ اگر ہمارے لوگوں نے اتنی باتیں بھی سمجھ کر لیں تو سمجھ لیجئے کہ ہماری محنت کا اگر ہو گئی۔ اور ہم بھی آئندہ مزید کچھ لکھ سکیں گے۔

## حضرت حسنؑ کی زہر خورانی کا قصہ

حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق تمام کتب شیعہ اور کتب اہل سنت میں یہ واقعہ بڑی اندوگیاں داستان کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ معاویہؓ اور زید نے آپؑ کی زوجہ جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ آپؑ کو زہر دلوادیا تھا۔ اور اسے لالچ یہ دیا تھا کہ زید جعدہ سے شادی کر لے گا۔ لیکن زہر دینے کے بعد زید نے صاف انکار کر دیا۔

جن لوگوں نے یہ خرافات وضع کی ہیں۔ وہ سب اس پر تو متفق ہیں کہ حضرت حسنؑ نے مرتے وقت یہ فرمایا تھا کہ مجھے زہر دیا گیا۔ بلکہ ایک روایت میں فرمایا کہ مجھے بار بار زہر دیا گیا ہے۔ لیکن حضرت حسینؑ اور ان کے خاندان کے اصرار کے باوجود یہ بتانے پر راضی نہیں ہوئے کہ انہیں کس نے زہر دیا۔ اور انہوں نے اس کا فیصلہ اللہ پر چھوڑ دیا۔ بلکہ حضرت حسینؑ کو یہ وصیت فرمائی۔

فانا اخاصمہ الی اللہ تعالیٰ      میں اس سے اللہ کے روبرو جھگڑوں  
فبصحتی علیک لانکلمت فی      گا۔ میرا تجھ پر حق یہ ہے کہ تو اس سلسلہ  
ذلک لبشی۔ الصواعق المحرقةؑ      میں کوئی بات نہ کرے۔

لیکن کاش کوئی ابن حجر شمش جیسے اشخاص سے یہ پوچھتا کہ حضرت حسنؑ نے جب خود یہ نہیں بتایا۔ اور ان کے چھوٹے بھائی حضرت حسینؑ اور ان کے اہل خاندان کو زہر دینے والے کا علم نہیں تو کیا آپؑ کے پاس اس سلسلہ میں کوئی وحی آئی تھی جو آپؑ نے یہ فیصلہ دیدیا۔ بعینہ یہی کام سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں کیا ہے۔ ان حضرات نے جو بلا سوچے سمجھا اور بلا ثبوت یہ فیصلہ دیئے ہیں کیا یہ عند اللہ مقبول ہو سکتے ہیں۔ اور کیا دنیا کی کوئی عدالت اس طرح شنی

سنائی باتوں پر فیصلہ دے سکتی ہے کہ خاندان کا کوئی فرد نہ دعویٰ کرتا ہے۔ اور نہ کسی کا نام لیتا ہے۔ لیکن صدیوں بعد فیصلہ کرنے والے پیدا ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ فیصلہ ہر تاریخ کی کتاب کی زینت بن جاتا ہے۔

اس سے قبل کہ ہم اس واقعہ پر کچھ تبصرہ کریں۔ سبائیوں کا یہ اصول ذہن میں رکھئے۔ کہ انہیں آلِ عمر اور خاندانِ بنی امیہ سے دل بغض ہے۔ جس کی جانب ہم متعدد مقامات پر اشارے بھی کر چکے ہیں۔ اور ان حضرات کو بدنام کرنے کے لئے سبائیوں نے کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں گنوا یا۔

ساتھ ساتھ یہ ذہن میں رہے کہ سبائیوں کے ہاں یہ ایک اصولی شے ہے کہ ان کے امام کو یا تلوار سے قتل ہونا ہے۔ یا زہر سے مرنا ہے۔ لہذا جو قتل ہو کر نہیں مرا۔ لازماً اس کی موت زہر سے واقع ہوگی۔ غالباً اسی لئے ان کے بارہویں امام پیچھے ہی میں بھاگ کھڑے ہوئے۔ کہ اگر میں قتل نہ کیا گیا تو مجھے زہر سے مارا جائے گا۔ اس کا ثبوت کہ ان کے امام ہمیشہ تلوار یا زہر سے مریں گے۔ ملا باقر مجلسی کی یہ روایت پیش خدمت ہے۔

اور فرمایا مجھے جناب رسول نے خبر دی ہے کہ بعد ان کے بارہ خلیفہ اور امام ہوں گے گیارہ امام فرزندِ علیؑ و فاطمہؑ ہیں اور یہ سب تیغ یا زہر سے شہید ہوں گے <sup>۲۹۸</sup>جلال العیون ج ۲ ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اس روایت کی موجودگی میں یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی امام ان دو حال سے خالی ہو۔ لہذا جو امام تلوار سے قتل نہیں ہوا۔ وہ یقیناً زہر سے مرے گا۔ تلوار سے قتل ہونے والے صرف دو امام ہیں۔ یعنی حضرت علیؑ اور حضرت حسینؑ۔ ایک امام زہر سے بچ کر بھاگ گئے۔ گویا کہ بقیہ نو اماموں کو زہر دیا گیا۔

لہذا جب یہ اصول طے پا گیا تو اب تو زبردستی بھی اس کے لئے زہر خورانی کی مانتا تیار کرنا ہوگی۔ اتفاق سے جن اماموں نے دورِ اموی میں انتقال کیا۔ انہیں بنو امیہ نے زہر دیا۔ اور جنہوں نے دورِ عباسی میں انتقال کیا۔ انہیں بنو عباس نے زہر دیا۔ مثلاً موسیٰ کاظم اور

علی رضا کو مامون نے زہر دیا حالانکہ علی رضا کے نکاح میں مامون کی بیٹی تھی۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ زہر کس نے دیا۔ اور کیوں دیا؟ ہمارے سنی حضرات تو ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ زہر دلوانے والا کون ہے۔ کچھ مؤرخین امیر معاویہ کا نام لیتے ہیں اور کچھ یزید کا۔ لیکن سبائی یہ جرم امیر معاویہ پر قائم کرتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلہ میں یزید کا قطعاً نام نہیں لیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت حسنؓ کا انتقال امیر معاویہ کے زمانہ میں ۴۹ء یا ۵۰ء میں ہوا۔ یزید ان کی وفات کے دس سال بعد اقتدار میں آیا۔ لہذا یزید پر اس لحاظ سے کوئی الزام قائم نہیں ہوتا۔ ہمارے سینوں کا وہ طبقہ جو اس واقعہ کو تسلیم کرتا ہے لیکن اس کو منسوب یزید کی جانب کرتا ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ اس کا ذہن قبول کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ایک صحابی رسولؐ اس قسم کی حرکت کر سکتا ہے اور دوسری جانب اس نے شیعہ روایتوں کو وحی الہی تصور کر لیا ہے۔ لہذا انہوں نے واقعہ کو تو قبول کیا لیکن مجرم یزید کو گردانا آئے ہم سب سے پہلے اپنے قارئین کے سامنے ملا باقر مجلسی کے ذریعہ اس زہر خورانی کا تفصیلی واقعہ پیش کرتے ہیں۔ مجلسی صاحب لکھتے ہیں۔

ابن شہر آشوب نے جناب صادق سے روایت کی ہے امام حسنؓ نے اپنے اہل بیت سے فرمایا۔ واضح ہو کہ میں زہر سے شہید ہوں گا۔ جس طرح جناب رسول خدا زہر سے شہید ہوئے۔ اہل بیت نے کہا کون آپ کو زہر دے گا۔ کہا میری کینز یا میری زوجہ مجھے زہر دے گی اہل بیت نے کہا اس ملعونہ کو اپنے ملک سے باہر کر دیجئے۔ حضرت نے فرمایا اسے کیوں کر باہر کر دوں، حالانکہ میری موت اسی کے ہاتھ سے ہوگی۔ اور اس سے چارہ نہیں، اور اگر اسے باہر کر دوں، بجز اس کے مجھے اور کوئی زہر نہ دے گا۔ ایسا ہی مقدر ہوا ہے۔

پس بعد تھوڑے زمانہ کے معاویہؓ نے زہر آحضرت کے پاس زہر بھیجا امام حسنؓ نے اپنی زوجہ سے پوچھا، تھوڑا دودھ کا شربت ہے۔ اس نے کہا ہاں ہے۔ پس وہ زہر حو



معاویہؓ نے بھیجا تھا دودھ میں ملا کر امام حسنؓ کو دیا۔ جب حضرت نے نوش کیا۔ اپنے بدن میں اسی وقت زہر کا اثر دیکھا۔ فرمایا اے دشمن خدا تو نے مجھے مارا۔ قسم بخدا تجھے میرے مارنے کا عوض ملے گا۔ اور تو معاویہؓ دشمن خدا سے برگز نفع نہ پائے گی۔ جلاء العیون ج ۱ ص ۳۶۶  
اس روایت سے چند امور ظاہر ہوتے ہیں۔

۱۔ زہر دینے والی کا اس میں کوئی نام نہیں۔

۲۔ زہر دینے والی کوئی بیوی ہے یا کوئی باندی اس کا بھی کچھ علم نہیں۔

۳۔ یہ روایت جناب جعفر صادق سے مروی ہے۔ جو انسی خاندان کے ایک فرد ہیں۔

اور وہ زہر دینے والی کا نام بیان نہیں کرتے۔ لہذا یہ دعویٰ کہ جعدہ نے آپ کو زہر دیا تھا۔ یہ غلط ہوا۔

۴۔ حضرت حسنؓ نے پہلے ہی دعویٰ کیا تھا کہ میں زہر سے شہید ہوں گا اور میری کنیز یا میری بیوی مجھے زہر دے گی اور اسے اپنے سے اس لئے جدا نہیں کر سکتا کہ میری موت نہر سے اسی کے ہاتھوں مقدر ہے۔ اور اس عورت سے بچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ اور اگر میں اسے جدا کر دوں گا تو مجھے زہر کون دے گا۔

لہذا وہ مطالبے کے لئے اُس عورت کا میرا پاس رہنا ضروری ہے۔ کیونکہ کوئی اور مجھے زہر دے نہیں سکتا۔ اور میری موت زہر سے مقدر ہے۔ لہذا میرے لئے زہر بیٹا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر میں نے زہر نہ پیا تو میں ہمیشہ زندہ رہوں گا۔ اور میری موت واقع نہ ہو سکے گی۔ تو پھر بقیہ دس امام کیسے ظہور میں آئیں گے۔ اور جب وہ ظہور میں نہ آئیں گے تو امام غائب کیسے غائب ہوں گے۔ اور پھر اس کے سلسلے میں داستانیں کیسے وضع ہوں گی۔ لہذا میرا زہر بیٹا از بس ضروری ہے۔ اور تلوار کے ذریعہ میرا قتل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں نے خود صلح کی ہے۔ اور خود قتل کو ہاتھ سے رکھا ہے۔ قارئین کرام خط کشیدہ الفاظ کو لیک بار پھر غور سے پڑھئے۔ اور سوچئے کہ اسکے علاوہ کوئی اور متجدد عبارت کا شکل سکتا ہے اگر شکل سکتا ہو تو ہمیں ضرور آگاہ کر دیجئے گا ہم قارئین کے شکر گزار ہوں گے۔

اب ایک اور روایت ملاحظہ کیجئے جو کلینی نے جناب صادق سے روایت کی ہے۔  
 کہ اشعث بن قیس جناب امیر (حضرت علیؓ) کے خون میں شریک تھا۔ اور اس کی دختر ابو جعدہ  
 نے امام حسنؓ کو زہر دیا۔ اور بیٹا محمد خون حسینؓ میں شریک ہوا۔ جلاء العیون ج ۱ ص ۳۶  
 پہلی روایت میں جناب صادق نے کسی مجرم کا نام نہیں بتایا تھا۔ اس روایت میں  
 تین مجرم گنا دیئے گئے۔ کہ جعدہ نے حضرت حسنؓ کو زہر دیا۔ اس کے باپ اشعث بن قیس حضرت  
 علیؓ کے قتل میں شریک ہوئے۔ اور جعدہ کا بیٹا محمد خون حسینؓ میں شریک ہوا۔

اس روایت میں یک عجیب لطیفہ یہ پایا جاتا ہے کہ کلینی نے جعدہ کے بجائے اشعث  
 کی بیٹی کا نام ابو جعدہ بیان کیا ہے۔ حالانکہ ابو کے حنیٰ باپ کے آتے ہیں یعنی جعدہ کا باپ۔  
 پھر یہ دختر کیسے ہوئی۔ یعنی ان کی لغت میں باپ اور بیٹی ہم معنی ہیں۔

اب جناب صادق کی ایک اور روایت بھی ملاحظہ کیجئے۔ جو قطب راوندی نے نقل کی ہے۔  
 امام حسنؓ نے اپنے اہل بیت سے فرمایا۔ میں مثل رسول خدا زہر شے شہید ہوں گا۔ اہل  
 بیت نے کہا کون شہید کرے گا۔ امام حسنؓ نے فرمایا۔ میری زوجہ جعدہ بنت اشعث  
 بن قیس مجھے زہر دے گی۔ اور معاویہؓ اس کے پاس پوشیدہ زہر بھیجے گا۔ اور حکم دے گا وہ مجھے  
 زہر ملا دے۔ اہل بیت نے کہا اس کو اپنے گھر سے نکال دیجئے۔ اور اپنے پاس سے علیحدہ کر  
 دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کیوں کر اسے گھر سے نکال دوں۔ حالانکہ ابھی کوئی نعل واقع نہیں  
 ہوا۔ اور اگر اسے نکال بھی دوں، تو بغیر اس کے مجھے اور کوئی زہر نہ دے گا۔

پس بعد ایک مدت کے معاویہؓ نے زہر ملا اہل اور بہت سامان جعدہ پاس بھیجا۔ اور کہا  
 کہ اگر یہ زہر امام حسنؓ کو ملا دے گی۔ تو میں تجھ کو سو ہزار درہم دوں گا۔ اور اپنے فرزند نذیر سے  
 تیرا عقد کروں گا۔

ایک روز امام حسنؓ روزے سے تھے۔ اور گرمی بشت تھی، اور دقت افطار آنحضرت  
 بہت پیاسے تھے۔ جعدہ ملعونہ حضرت کے لئے دودھ کا شربت لائی۔ اور وہ زہر اس میں

ملا دیا تھا۔ جب امام حسن نے وہ شربت نوش فرمایا۔ اور فرمایا اے دشمن خدا تو نے مجھے مارا۔ خدا تجھے مارے۔ قسم بخدا غلطی میں کسی کو مجھ سے بہتر نہ پائے گی۔ معاویہ نے تجھے فریب دیا۔ خدا تجھے اور معاویہ کو اپنے عذاب سے معذب کرے۔ پس دو روز امام حسن درود الم میں زندہ رہے۔ اور بعد اس کے اپنے جد بزرگوار اور پدر عالی مقدار سے ملے۔ اور معاویہ نے اس ملعونہ سے اس عہد پر وفانہ کی۔ بروایت دیگر انعام اس ملعونہ کو نہ دیا اور نیرید سے ترقیح نہ کیا۔ اور کہا جس نے امام حسنؑ سے بھی وفانہ کی وہ میرے فرزند سے بھی وفانہ کرے گی۔  
جلال العیون ج ۱ ص ۲۶۷

یہ تینوں روایتیں جناب صادق سے مروی ہیں اور تینوں میں زیر دست تضاد ہے جن کا رفع ہونا بھی ممکن نہیں۔ ان روایات سے یہ بات ضرور سامنے آتی ہے کہ حضرت حسن کو پہلے سے یہ علم تھا کہ مجھے زہر دیا جائے گا۔ وہ زہر دینے والے سے بھی واقف تھے، اور دلوانے والے سے بھی۔ لیکن اس کے باوجود وہ جعدہ کو اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہ تھے کیونکہ جعدہ کے بغیر ان کی موت ممکن نہ تھی۔ اور اس ممکن کو ممکن بر صورت میں بنانا تھا۔ ورنہ وہ ہمیشہ کے لئے دنیا میں باقی رہتے۔ لہذا اس لئے اسے پاس رکھنا ضروری تھا۔ بالفاظ دیگر آپ خود اس بات کے خواہاں تھے کہ جعدہ آپ کو زہر دے۔ ورنہ تقاضائے عقل تو یہ تھا کہ جہاں آپ تین سو عورتوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ وہاں اسے بھی طلاق دے کر علیحدہ کر دیتے۔ تاکہ یہ خطرہ ٹل جاتا۔ یہ تو ایک قسم کی خودکشی ہوئی۔

ہم تو ان روایات کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حضرت حسن کو جعدہ بنت اشعث سے انتہا سے زیادہ پیار تھا۔ انہوں نے دنیا جہاں کی عورتوں کو طلاق دینا لیکن اللہ طلاق نہیں دی تو جعدہ کو نہیں دی۔ سبائیں کو یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ بوکر صدیق کی بجائے اسے اس پیار و محبت کا اظہار ہو۔ لہذا اس طبقہ نے انہیں بظاہر کرشمہ کی ٹھان لی اور ان کے ساتھ امیر معاویہ سے بھی اپنا دیرینہ بغض نکال لیا۔

یہ روایتیں جناب جعفر بن محمد پر جا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ جب کہ جناب جعفرؑ میں پیدا ہوئے۔ اور یہ واقعہ ۵۰ کا ہے۔ یعنی ان کی پیدائش سے تیس سال قبل کا۔ اوپر کے راوی کہاں غائب ہیں۔ اور جناب جعفرؑ سے نقل کر لئے والے، ابن شہر آشوب اور راوندی وغیرہ ان کی وفات کے صدیوں سال بعد وجود میں آئے۔ اور کئی تیسری صدی میں پیدا ہوا۔ جب کہ جناب جعفرؑ میں انتقال کر چکے تھے۔

جب حضرت حسنؑ یہ بات جانتے تھے کہ ان کی موت زہر کے بغیر نہ ہوگی۔ جو ایک سبائی اصول ہے۔ ایسی صورت میں سبائیوں کا امیر معاویہؓ اور جعدہ کا احسان مند ہونا چاہیے کہ انہوں نے اس اصول کو عمل میں لانے کے لئے راہ ہموار کی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو حضرت حسنؑ ہمیشہ زندہ رہتے اور یہ طبقہ نہ صرف دس اماموں سے محروم رہ جاتا بلکہ کر بلا کی کہانی بھی وجود میں نہ آتی کیونکہ حضرت حسنؑ ہرگز بھی حضرت حسینؑ کو اس بات کی اجازت نہ دیتے۔ کہ وہ امام وقت کے خلاف کوئی اقدام کریں۔ لہذا یہ لازم تھا کہ وہ زہر پیئیں۔ اور وہ بھی جعدہ بنت اشعث کے ہاتھوں۔ اور بقیہ اماموں کے لئے راہ ہموار کریں۔

یہ بھی ذہن نشین رہے کہ ان روایات کو نقل کرنے والے سب ایران اور عراق وغیرہ کے باشندہ ہیں۔ انہیں گھر بیٹھے ساری روداد کا علم ہو جاتا ہے۔ لیکن مدینہ کا کوئی باشندہ اس قسم کی کوئی کہانی نقل نہیں کرتا، اس لئے کہ واقف ہی نہیں ہوتا۔ اب کلینی کی ایک اور روایت ملاحظہ ہو۔

کلینی نے بلند معتبر روایت کی ہے کہ جعدہ دختر اشعث نے امام حسنؑ کو زہر دیا۔ اور کینزان آنحضرتؑ میں سے ایک کینز کو بھی زہر دیا۔ اس کینز نے قے کی اور اچھی ہو گئی۔ اور امام حسنؑ کے شکم میں وہ زہر رہ گیا۔ اور جگر کو پارہ پارہ کر ڈالا۔ کتاب احتجاج میں روایت کی ہے کہ ایک شخص امام حسنؑ کی خدمت میں آیا اور کہا

..... ہماری گردنوں کو آپ نے ذلیل کیا۔ اور ہم شیعوں کو غلام بنی امیہ بنایا حضرت نے فرمایا کیوں کرائس نے کہا اس وجہ سے کہ خلافت آپ نے معاویہ کو دیدی۔ حضرت نے فرمایا۔ قسم بخدا میں نے کوئی ناصر دیا اور نہ پایا۔ اگر میں ناصر دیا اور پاتا رات دن معاویہ سے جنگ کرتا۔ یہاں تک کہ خدا میرے اور اس کے درمیان حکم کرتا۔ لیکن میں نے اہل کوفہ کو بھینچا اور امتحان کیا۔ اور جان لیا کہ یہ لوگ میرے کام نہ آئیں گے۔ اور ان کے عہد و پیمان پر وفا نہ کرے ان کے گفتار و رفتار پر اعتماد نہیں۔ ان کی زبانیں میرے ہمراہ اور ان کے دل بنی امیہ کے ساتھ ہیں۔

یہ باتیں حضرت کر ہی رہے تھے۔ ناگاہ خونِ معلق مبارک سے جاری ہوا۔ پس آیا سے طشت منگایا۔ وہ طشت خون سے بھر گیا۔ راوی نے کہا یا ابن رسول اللہ یہ خون کیسا ہے۔ حضرت نے فرمایا معاویہ نے زہر بھیجا تھا۔ اور وہ مجھے کھلادیا ہے۔ وہ زہر میرے جگر میں بچھا۔ اور یہ ٹکڑے میرے جگر کے ہیں۔ جو طشت میں گرے ہیں۔ میں نے کہا یا حضرت کچھ دوا کیجیے۔ امام حسنؑ نے فرمایا۔ اس سے قبل مجھے دوسرے زہر دیا تھا۔ اور یہ تیسری دفعہ زہر دیا ہے۔ اس دفعہ قابل دوا نہیں۔

معاویہؓ نے بادشاہ روم کو لکھا تھا کہ زہر کشندہ بھیج دے۔ بادشاہ روم نے اسے لکھا کہ ہمارے مذہب میں جائز نہیں۔ کہ جو ہم سے نہ لڑیں۔ ہم اس کے قتل پر اعانت کریں معاویہؓ نے لکھا میں جس شخص کو اس زہر سے مارنا چاہتا ہوں۔ وہ اس شخص کا فرزند ہے جو مکہ میں ظاہر ہوا۔ اور دعویٰ پیغمبری کیا۔ اب اُس نے خروج کیا ہے۔ اور اپنے پدر کی بادشاہی طلب کرتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ زہر اسے کھلا دوں اور خلالت کو راحت پہنچاؤں۔ اور ہلایا و تحائف اس کے لئے بھیجے۔ پس بادشاہ روم نے یہ زہر بھیجا۔ اور اس زہر کے عوض میں عہد و شرائط اس سے لئے۔ جلا ر العیون ج ۱ ص ۳۶۶۔

۳۱۔ روایت کوڑھنے کے چند نئے سہلے سامنے آتے ہیں۔

۱۔ اس داستان کے آخری حصہ کا ابتدائی حصہ سے کوئی تعلق نہیں۔

۲۔ شیعان علی اور اہل کوفہ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت حسنؓ ہر دو سے بغض رکھتے تھے۔ حضرت حسنؓ سے اس لئے کہ انہوں نے امیر معاویہؓ سے صلح کی اور اس اختلاف کو جو پانچ سال سے چلا آ رہا تھا ختم کیا۔ اور ملت اسلامیہ کو از سر نو ایک پلیٹ فلام پر جمع کیا جس کے نتیجے میں سبائی اور ایرانی سازش ناکام ہوئی۔ اسی ناکامی کو دیکھتے ہوئے شیعان علیؓ نے حضرت حسنؓ کو تخت پر سے دھکا دیا۔ اُن کی ران میں نیزہ مارا۔ اُن کے خیمے کو آگ لگائی۔ انہیں ذلیل و رسوا کیا۔ انہیں مسودہ وجہ التومنین (مؤمنوں کے چہروں کا سیاہ کرنے والا) اور مذل التومنین (مؤمنوں کو ذلیل کرنے والا) جیسے ذلیل کن خطابات دیئے۔

۳۔ حضرت حسنؓ کے نزدیک یہ تمام لوگ بے ایمان، دھوکہ باز اور غدار تھے، ان کے عہد و پیمان پر کسی قسم کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا تھا۔ بظاہر تو یہ حسب اہل بیت کے دعویدار تھے۔ لیکن باطن نبی امیہ کے ساتھ تھے۔ گویا یہ حافظ شیرازی کے بقول۔ باسماں اللہ اللہ بابرہن رام رام کے قائل تھے۔ جب کہ اس کے برعکس حضرت حسنؓ کو امیر معاویہؓ پر اعتماد تھا۔ اگر اُن پر اعتماد نہ ہوتا تو ہرگز بھی صلح نہ کرتے۔

۴۔ یہ کہانی بیان کرنے والا بھی ایک عراقی ہے۔ جس کا نام وپتہ کچھ معلوم نہیں۔ ہاں یہ اپنی زباں سے دعویٰ ضرور کر رہا ہے کہ وہ حضرت حسنؓ کے اس فعل سے ناراض ہے۔ حتیٰ کہ آپ کے سرخ الموت میں اپنی طعن و تشنیع سے باز نہیں آ رہا ہے۔ ہم تو ایسی صورت میں یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت حسنؓ کو اگر زہر دیا گیا۔ تو لازماً وہ اُن غداروں نے دیا ہو گا جو حضرت حسنؓ کے دشمن تھے۔ جنہوں نے انہیں زخمی کیا۔ اور موت کی کشمکش کے وقت بھی انہیں ذلیل کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔

۵۔ یہ طبقہ امیر معاویہؓ کو کافر دے دین تصور کرتا ہے اور اس روایت کے فوراً یہ

ثابت کیا گیا ہے کہ امیر معاویہؓ حضورؐ کے دشمن تھے۔ اسی لئے آپ کی اولاد کو زہر دیا۔ لیکن اپنی

حماقت سے یہ بھی ظاہر کر رہا ہے کہ حضرت حسنؑ نے امیر معاویہ کے خلاف بغاوت کی۔ اور اپنی کھوئی ہوئی سلطنت واپس لینی چاہی۔ اس لئے یہ نہ بردیا گیا۔ حالانکہ اگر وہ بغاوت کرتے یا خلافت کے خواہاں ہوتے تو انہیں صلح کرنے کی کیا ضرورت پیش آتی تھی۔ اور ان سے ناراضگی کی وجہ بھی یہی ہے۔ اسی لئے ان کی اولاد سے امامت چھینی گئی۔ اور دنیا کے کسی فرد واحد نے آج تک یہ دعویٰ نہیں کیا کہ حضرت حسنؑ نے صلح کے بعد کوئی بغاوت کی ہو۔

۶۔ بقول راوی زہر قیصر دم سے طلب کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں باہم خط و کتابت ہوئی اور عہد و پیمان ہوئے۔ اور اس زہر نے قسطنطنیہ سے دمشق تک اور دمشق سے مدینہ تک مہینوں کا سفر طے کیا۔ اور سبائیوں کے علاوہ کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ نہ کسی شامی کو اس کی خبر ہوئی اور نہ کسی اہل مدینہ کو۔ حالانکہ اتنے عرصے میں یہ بات پر لگا کر پوری مملکت اسلامیہ میں پھیل جاتی۔ لیکن حیرت یہ ہے کہ حضرت حسنؑ کے خاندان اور اہل مدینہ تک کو خبر نہ ہوئی۔ ہوئی تو ایک ایسے عراقی کو ہوئی جو حضرت حسنؑ کا دشمن تھا۔ لیکن اس کا نام و پتہ کسی کو معلوم نہیں۔

۷۔ قیصر دم سے زہر منگانے کا مقصد یہ ہے کہ راوی یہ دعویٰ کرنا چاہتا ہے کہ مملکت اسلامیہ میں زہر کا کہیں وجود نہ تھا۔ حالانکہ اس وقت مملکت اسلامیہ کا بل و مکران تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور ساسانی دور حکومت میں زہر خوردانی کے قصے عام تھے اور سبائیوں کے لئے ایران سے زہر منگانا کوئی دشوار نہ تھا۔ اس کے لئے قیصر دم سے خط و کتابت کی کیا ضرورت تھی۔ اس کام کے لئے تو یہودی بھی کافی تھے جو عراق میں بستے تھے، اور جنہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی زہر دیا تھا۔ گویا سبائیوں کے لئے اس کا حصول بہت آسان اور امیر معاویہ کے لئے دشوار تھا۔ ہمارے نزدیک یہ قیصر کی کہانی اس لئے وجود میں آئی کہ امیر المؤمنین امیر معاویہؓ نے قسطنطنیہ پر حملے کے لئے اپنے بیٹے یزید کو لشکر دے کر بھیجا تھا اور اس جہاد میں حضرت حسینؑ نے یزید کی ماتحتی میں شرکت کی تھی۔ اس کے پیچھے نماز پڑھتے رہے۔ سبائی اس بھائی چارے اور محبت کو کیسے برداشت کرتے۔ لہذا انہوں

نے یہ معاویہؓ کے ساتھ قیصر کو بھی گھسیٹ لیا۔

۸۔ یہ نہر زورانی کا واقعہ صرف ایک بار نہیں۔ بلکہ اس روایت کی دوسری بار اور ایک روایت کی دوسری بار، اود ظہور الحسن صاحب بھریلوی کے بقول۔ حضرت حسنؓ نے حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد تین سو نکاح کئے۔ لیکن ہر ایک کو اس لئے طلاق دینی پڑی کہ معاویہؓ نے بہکا کر ان عورتوں کو زہر دینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ اس طرح تین سو بار زہر دینے کی کوشش کی گئی۔ سبحان اللہ آخر اس کی وجہ کیا ہے کہ کوئی عورت حضرت حسنؓ سے نکاح کرنے کے باوجود ان کی جانب راغب نہیں ہوتی۔ بلکہ دوسروں کے اشارے پر انہیں زہر دینے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔ کیا امیر معاویہؓ ان تین سو عورتوں کو زہر دینے کے تکل میں دینا چاہتے تھے؟ یا کوئی زنا نہ فورس تیار کرنی تھی اور اتنے تجربات کے باوجود حضرت حسنؓ بعدہ کو چھوڑنے پر رضا مند نہ تھے۔ بلکہ اس کے ہاتھ سے برضا و رغبت زہر کھانے کے لئے تیار تھے۔ کیونکہ اس کے بغیر ان کی موت واقع نہ ہوتی۔ اور جب ان کی موت واقع نہ ہوتی تو بارہ اماموں کا نافر مولا کیسے وجود میں آتا۔ لہذا ضروری تھا کہ انہیں زہر دیا جائے خواہ وہ زہر ایک داستان کے طور پر ہی سہی۔ دراصل یہ طبقہ اس کا قائل ہے کہ جھوٹ اس حد تک بولو کہ لوگ اسے سچ مانتے پر مجبور ہو جائیں۔

اب ایک اور روایت کتاب کفایہ سے ملاحظہ کر لیجیے۔ ملا باقر مجلسی لکھتے ہیں۔ کتاب کفایہ میں بسند معتبر جنابہ بن ابی امیہ سے مروی ہے کہ جس مرض میں امام حسنؓ نے دنیا سے رحلت کی میں حضرت کی خدمت میں گیا۔ دیکھا کہ سامنے طشت رکھا ہے۔ اور حضرت جگر کے ٹکڑے اس میں اگل رہے ہیں۔ میں نے کہا اے میرے مولا۔ آپ اس کا کیوں علاج نہیں کرتے۔ حضرت نے فرمایا۔ اے بندہ خدا موت کا علاج کس چیز سے کر سکتے ہیں۔ جلا را یعون ج ۱ ص ۳۶۸

یہ کافی طویل داستان ہے۔ اس میں حضرت حسنؓ کے پند و نصائح مان کیے گئے ہیں۔



لیکن اس روایت میں نہ مرنے کے سلسلے میں ایک لفظ بھی موجود نہیں۔ امیر معاویہؓ یا جعدہ کا کیا تذکرہ ہوتا۔ یہ روایت اس کا ثبوت ہے کہ حضرت حسنؓ کا انتقال مرض سے ہوا۔ نہ کہ زہر سے اور بقول ملا باقر یہ بسند معتبر مروی ہے۔ اگرچہ سبائیوں کے ہاں ہر روایت بسند معتبر ہوتی ہے کوئی غیر معتبر سند سے مروی نہیں ہوتی۔ پہلی روایات بھی بسند معتبر مروی تھیں۔ اور یہ بھی بسند معتبر مروی ہے۔ لیکن اس روایت سے یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ حضرت حسنؓ کا انتقال کسی مرض میں ہوا۔ اور ایسا مرض جس میں منہ سے خون آتا ہو اور وہ مرض سل ہے اور مرض بھی کافی عرصہ رہا۔ جس کی خبر شام تک پہنچی۔ اور وہاں سے جنادہ بن ابی امیہ عیادت کے لئے آئے۔ یعنی مرض کئی ماہ تک قائم رہا۔ کیوں کہ شام تک خبر پہنچنے کے لئے بھی ایک عرصہ چاہیئے اور پھر دمشق سے مدینہ آنے تک۔ ہم یہ بات اس لئے کہہ رہے ہیں کہ سبائی راوی نے اپنی نادانی سے جنادہ بن ابی امیہ کا نام لیا ہے۔ جنادہ بن ابی امیہ نام کے دو شخص ہیں اور دونوں شام میں سکونت پذیر تھے جن میں سے ایک صحابی رسول تھے۔ اور ایک تابعی تھے اور دونوں امیر معاویہؓ کے ساتھی تھے۔ گویا شامیوں اور صحابہ و تابعین کے نزدیک حضرت حسنؓ کا انتقال مرض سل میں ہوا۔ زہر خورانی کے قصے تو صرف سبائی داستانیں ہیں۔

اب ایک اور روایت ملاحظہ کیجئے جو کتاب کشف الغمہ میں عمرو بن اسحاق سے مروی ہے۔ کہ میں ایک شخص کے ہمراہ عیادت امام حسنؓ کو گیا۔ حضرت نے فرمایا اجوچا ہو مجھ سے سوال کرو۔ میں نے کہا قسم بخدا سوال نہ کروں گا۔ جب تک خدا آپ کو صحت نہ عطا فرمائے۔ حالت صحت میں آپ سے سوال کروں گا۔ پس اٹھ کر میں کسی کام کو چلا گیا۔ اور پھر حاضر ہوا۔ حضرت نے فرمایا مجھ سے سوال کرو۔ قبل اس کے کہ سوال کا موقع نہ پاؤ۔ میں نے عرض کی۔ خدا جب آپ کو صحت عطا کرے گا۔ اس وقت میں سوال کروں گا۔ حضرت نے فرمایا اس وقت میرے جگر کا حکم کٹ کہ گر پڑا۔ مجھے کئی مرتبہ زہر دیا تھا اور کسی دفعہ کا زہر ایسا نہ تھا۔ جب دوسرے روز میں حضرت کی خدمت میں گیا۔ دیکھا حضرت کا وقت آنسی

ہے۔ امام حسینؑ سرہانے بیٹھے ہیں۔ امام حسینؑ نے پوچھا اے برادرِ نبرد گوار آپ کا گمان اس زہر دینے میں کس کی طرف ہے۔ امام نے فرمایا کیوں پوچھتے ہو۔ آیا منظور ہے کہ اسے قتل کرو۔ کہا ہاں یہی غرض ہے۔ امام حسنؑ نے کہا اگر وہ ہے جس کی طرف میرا گمان ہے۔ پس غضبِ خدا اس کے لئے عقوبت دینے سے سخت تر ہے اور اگر وہ نہیں تو میں نہیں چاہتا کہ کوئی میرا وجہ سے بے گناہ مارا جائے جلا ر العیون ج ۱ ص ۳۶۹۔

یعنی امنہ سے خون آنے کے باعث حضرت حسنؑ کو یہ گمان پیدا ہوا کہ انہیں کسی نے زہر دیا۔ اور یہ بھی صرف ایک گمان تھا یقین نہ تھا۔ اسی لئے وہ زبان سے کسی کا نام لینے پر تیار نہ تھے کہ بلا ثبوت کسی پر فرد جرم عائد کی جائے۔ اور وہ قتل ہوا اور ایک بے گناہ کے قتل کا گناہ حضرت حسنؑ یا ان کے چھوٹے بھائی کے ذمہ واقع ہو۔ اور جب انہوں نے کسی کا نام نہیں لیا تو صدیوں بعد یہ نام سبائیوں کو کیسے معلوم ہوئے؛ اور ان کا تو صرف گمان ہی گمان تھا لیکن بعد کے لوگوں نے اسے بالیقین کیسے بیان کر دیا۔

جہاں تک زہر دینے کے سلسلہ میں قتل کا تعلق ہے۔ تو اگر اس سے مراد امیر معاویہؓ ہیں۔ تو ان کے قتل پر حضرت حسینؑ تو کجا تمام نبی ہاشم بھی قدرت نہ رکھتے تھے۔ اور اگر اس سے مراد جعدہ ہیں۔ تو بے شک حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بھانجی کو قتل تو کیا جاسکتا تھا۔ لیکن ان کے قصاص میں جو تلوار نکلتی تو مدینہ منورہ میں دوسری جنگِ جمل کا نقشہ کھینچ جاتا۔ کیونکہ بنو ہاشم کے خلاف بیک وقت دو خاندانوں کی تلواریں نکل آتیں۔ جعدہ کے باپ کا خاندان اور ماں کا خاندان یعنی ام المومنینؓ عائشہ اور خاندانِ نبی تیم۔ اس سلسلہ میں کون کون سے خاندان کے کتنے افراد کی جانیں جاتیں۔ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ اسی لئے حضرت حسنؑ نے کسی کا نام نہیں لیا۔ اور سبائیوں کو بھی تین سو سال بعد نام لینے کی جرأت ہوئی۔ اس کا اہام بھی سب سے پہلے مسعودی السوفیؒ کو ہوا۔ یہ وہ دور ہے کہ جب بنو بویہ بغداد پر قابض ہو گئے تھے۔ اور خلافت ان کے اشاروں پر ناچ رہی تھی۔ یہ بنو بویہ کثر افضی تھے۔ انہوں نے کھلے عام

صحابہ پر تبرکرایا۔ محرم کے جلوس کی بنیاد انہوں نے رکھی۔ موجودہ مشہد حسین اور مشہد علی انہوں نے ہی تعمیر کرایا۔ انہوں نے مساجد کے دروازوں پر امیر معاویہ اور دیگر صحابہ پر لعنت لکھوائی۔ امیر معاویہؓ اور جعدہ کو بدنام کرنے کے لئے اس سے بہتر موقعہ کون سا فراہم ہو سکتا تھا۔ لہذا مسعودی نے جو خود بھی ایک رافضی تھا۔ اس کی بنیاد رکھ دی۔ اور بعد کے مصنفین نے اس پر مزید حاشیہ آرائی شروع کر دی۔ تاریخن خود ہی اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہ روایات کتنی باہم متضاد ہیں۔ ہم نے صرف ایک کتاب جلال العیون سے یہ روایات نقل کی ہیں۔ اور اس پر بھی غور کیجئے کہ یہ واقعہ شک یا شبہ کا ہے۔ جب کہ مسعودی کا انتقال ۲۴۱ھ میں ہے۔ گویا تین سو سال تک کسی کو اس کی خبر نہ تھی کہ حضرت حسنؓ کو زہر دیا گیا۔

اب ملاحظہ فرمایا لیجئے۔

روایت کی ہے کہ جب وقت وفات امام حسنؓ غیبی آیا۔ فرمایا مجھے صحرا میں لے چلو۔ کہ میں اطراف آسمان پر نظر کروں جب آپ کو صحرا میں لے گئے فرمایا۔ خداوند میں اپنی جان کو کہ عزیز ترین جانوں کی میرے نزدیک ہے۔ اسے میں نے تیری رضا میں دیا۔ اور اپنے قصاص سے تیری رضا کے لئے درگزر کیا۔ کہ کسی کو میرے لئے قصاص کریں۔

اس سے پہلی حدیث میں یہ فرمانا کہ میں نہیں چاہتا کہ کوئی بے گناہ میری وجہ سے مارا جائے۔ اس کا صاف مطلب پچھلی حدیث میں بیان فرما دیا۔ کہ میں جانتا ہوں قاتل کو مگر رضائے خدا کے لئے قصاص نہیں لیتا۔ اگر وہ چاہے تو ضرور خود میرے خون ناحق کا قصاص لے گا۔ جلال العیون ج ۱ ص ۳۷

شیخ مفید، شیخ طوسی و دیگر علماء نے ابن عباسؓ سے روایت کی ہے کہ معاویہ نے جعدہ سے دو ہزار درہم اور بہت سے مواضعات حلدہ و کوفہ کا وعدہ کیا تھا۔ اور اس کے پاس زہر بھیجا کہ امام حسنؓ کے طعام میں ملا دے۔ جب جعدہ ملعونہ طعام امام حسنؓ کے سامنے لائی اور بروایت دیگر بعد تناول فرمانے کے امام حسنؓ نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون

..... اے برادر میں نے اپنا جگر طشت میں دیکھا اور جانا کہ کس نے یہ کام کیا ہے اور اصل اس کی کہاں سے ہوئی ہے؟ اگر میں تم سے کہوں تم اس کے ساتھ کیا کرو گے۔ امام حسینؑ نے فرمایا قسم بخدا میں اس کو قتل کروں گا۔ یہ سن کر امام حسنؑ علیہ السلام نے فرمایا میں تم سے وہ خبر نہ کہوں گا۔ یہاں تک کہ میں اپنے نانا رسول خدا سے ملاقات کروں گا۔ جلازلایعون ص ۲۴۱  
یعنی حضرت حسنؑ تو نہ ہر دینے والے کا نام بتانا نہیں چاہتے۔ اور نہ بتایا بلکہ اللہ کی رضا کے لئے اسے معاف کیا۔ کیونکہ وہ صرف گمان پر قصاص لینا یا کسی کا نام لینا پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن شیخ مفید اور شیخ طوسی صاحب نے چھ سو سال بعد یہ حقیقت معلوم کر لی کہ وہ کون افراد تھے۔ اس لئے کہ انہیں علم باطن حاصل تھا۔ کیونکہ طوسی باطنیہ گروہ سے تعلق رکھتا تھا۔ جو تاریخ میں قرامطہ اور فدائین کے لقب سے مشہور ہوا۔ یہ وہ طبقہ ہے جو آج اسماعیلیوں کے نام سے مشہور ہے۔ جب ہلاکو خاں نے قرامطہ کے گڑھ کو ختم کیا۔ تو طوسی اس کا شیر بن گیا اور اسے بغداد پر چڑھا لایا۔ تاریخ میں جو بغداد کی تباہی مشہور ہے اس کے سرغنہ سی حضرت تھے۔ جو خلافت عباسیہ کے خاتمہ کا سبب بنے۔ یہ لوگ چھٹی صدی کی پیداوار ہیں۔

ان تمام روایات کو پڑھنے کے بعد جو نتائج ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ہم اس کا خاکہ قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

۱۔ حضرت حسنؑ کو امیر معاویہؓ کے کہنے سے جعدہ بنت اشعث نے زہر دیا۔ اور سو ہزار درہم اور زریہ سے نکاح اس کا معاوضہ قرار پایا۔ لیکن معاویہؓ نے کوئی معاوضہ نہیں دیا۔ یعنی اگر وہ جعدہ کو معاوضہ دیدیتے تو ان سبائیوں کا دل ٹھنڈا ہو جاتا۔ انہیں غم زہر دینے کا نہیں ہے۔ بلکہ معاوضہ نہ ملنے اور زریہ سے نکاح نہ ہونے کا ہے۔

۲۔ اس زہر دینے پر صرف دو ہزار درہم کے مواضعات دینے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ زریہ سے نکاح کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔ زریہ سے نکاح کی کہانی صرف ابن الراددن نے نقل کی ہے۔

۳۔ عام روایت ہے کہ زہر شربت میں دیا گیا۔ طوسی وغیرہ کی روایت ہے کہ کہانے میں دیا گیا۔

۴۔ ایک بار زہر دیا گیا۔ یا تین بار دیا چھ بار یا تین سو بار۔

۵۔ زہر مملکت اسلامیہ میں نہیں پایا جاتا تھا۔ لہذا قسطنطنیہ سے قیصر روم کے پاس سے درآمد کیا گیا۔

۶۔ زہر دینے کی حقیقی روایات ہیں اس کے ناقل تیسری صدی کے بعد کے لوگ ہیں۔

۷۔ حضرت حسنؑ کا انتقال زہر سے نہیں ہوا۔ مرض سل میں ہوا۔ اور کئی ماہ بیمار رہے۔

۸۔ زہر دینے کے بعد صرف ایک دن بقول بعض دو دن اور بقول بعض چند دن زندہ رہے۔

۹۔ حضرت حسنؑ کو اہل عراق سے نفرت تھی۔ وہ انہیں بے وفا، غدار، دھوکے باز

اور بکاؤ مال تصور کرتے تھے۔

۱۰۔ اہل عراق کو حضرت حسنؑ سے نفرت تھی۔ کیونکہ انہوں نے امیر معاویہؓ سے صلح کر

کے است میں اتحاد پیدا کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں سبائی اور مخبوسی سازش ناکام ہو کر رہ گئی۔

۱۱۔ حضرت حسنؑ اور اہل عراق کی باہمی نفرت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا دشوار

نہیں۔ کہ اگر حضرت حسنؑ کو زہر دیا گیا تو پھر زہر دینے والے یہی حضرات ہیں۔ نہ کہ امیر معاویہؓ

اور جعدہ بنت اشعث۔

امیر معاویہؓ کے سلسلہ میں ان کی جانب بدگمانی اسی وقت کی جاسکتی ہے۔ جب کہ

اس صلح کے بعد حضرت امیر معاویہؓ کے حضرت حسنؑ سے تعلقات انتہا سے زیادہ کشیدہ

ہو گئے ہوں۔ اور باہمی نفرت و عداوت پیدا ہو چکی ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کے اسباب کیا تھے؟

ہم جب اس لحاظ سے اس پر غور کرتے ہیں تو ہمیں تاریخ میں جو کچھ نظر آتا ہے۔ وہ ہم اپنے

قارئین کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔ لیکن اس سے قبل ابن ابی الحدید شارح منہج البلاغہ کا ایک

قول پیش کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ اس سے حقیقت حال واضح ہو جائیگی۔ ابن ابی الحدید ایک

مشہور شیعہ عالم ہیں۔ جنہوں نے منہج البلاغہ کی شرح لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :-

ان اصل الا کا ذیب فی احادیث الفضائل کی احادیث میں اصل جھوٹ

الفضائل کان من جهة الشیعوں کی جانب سے شروع ہوا۔

الشیعة فانهم وضعوا فی کیونکہ انہوں نے ابتدائی دور میں

مبداء الامر احادیث مختلفہ اپنے ساتھ رکھی (یعنی حضرت علی) کی

فی صاحبہم حملہ علی وضعہا فضیلت میں مختلف احادیث وضع

عداوتہ خصوصہم۔ شرح کہیں جس کی وجہ اپنے دشمنوں کی

ابن ابی الحدید ص ۷۳ ج ۱۔ عداوت تھی (اور دشمنوں کی عداوتیں)

مثل مشہور ہے کہ گھر کا بھیدی لٹکا ڈھائے۔ ابن ابی الحدید نے یہ تسلیم کر لیا۔ کہ شیعوں

نے امیر معاویہؓ اور دیگر صحابہ کی عداوت میں دل کھول کر جھوٹ بولا۔ اور روایتیں وضع کی

ہیں۔ لہذا خود ان کے عالم کے بقول ان کی بیان کردہ کسی روایت پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا

اسی لئے تو ان روایات میں اتنا تضاد پایا جاتا ہے۔

اب آئے اس موضوع پر کہ امیر معاویہؓ اور حضرت حسنین کے باہمی تعلقات کیسے

تھے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

فلما استقرت الخلافة جب امیر معاویہ کیلئے خلافت قائم

لمعاویہ کان الحسین یترد ہو گئی۔ تو حضرت حسین اپنے بھائی

والیہ مع اخیه الحسن حضرت حسن کے ساتھ امیر معاویہ

فی کبر مہما معاویہ کے پاس جاتے اور معاویہ ان کی انتہا

اکراما زائدًا ویقول طعما سے زیادہ تکریم کرتے۔ انہیں مرجاہتے

مرحبا واهلا یعطیہما اور بڑے بڑے انعامات دیتے حتیٰ

عطاء جزیلًا وقد اطلق لیوم کہ ایک ایک سوت میں انہیں بیس بیس

واحد مائتی الف - البدایۃ لاکھ پیش کرتے۔

والنہایۃ ج ۲ ص ۱۵

علامہ ابن کثیر نے متعدد جگہ ان گراں قدر وظائف و عطیات کا ذکر کیا ہے جو امیر المومنین معاویہؓ حضرت حسنؓ و حسینؓ اور دیگر بنی ہاشم کو دیا کرتے تھے۔ زید بن الجباب کی روایت ہے۔

تقدم الحسن بن علی علی حضرت حسن بن علی امیر معاویہؓ کی  
معاویۃ فقال له لا حیرتک خدمت میں گئے۔ انہوں نے فرمایا  
بجائزۃ لم یجزها احد کان میں آج تمہیں اتنا بڑا عطیہ دوں گا کہ پہلے  
قبلی فاعطاہ اربع مائۃ الف کسی نے بھی نہ دیا ہو گا۔ پھر امیر معاویہؓ  
الف و فدا الیہ الحسن و نے ان کی خدمت میں چالیس لاکھ پیش  
الحسین فاجازہما علی الفور کئے۔ اور جب بھی حضرت حسنؓ اور حضرت  
بمائتی الف الف - حسینؓ ان کے پاس جاتے وہ ان دونوں  
کو بیس بیس لاکھ پیش کرتے۔

البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۳۷

حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ بدستور امیر المومنین معاویہؓ کی خدمت میں ہر سال تشریف لے جاتے اور عطیات حاصل کرتے۔ حافظ ابن کثیر کا بیان ہے۔

ولما توفي الحسن کان جب حضرت حسنؓ کی وفات ہو گئی  
الحسین یفد الی معاویۃ تو حضرت حسینؓ ہر سال امیر معاویہؓ  
فی کل عام فی عطیہ و کے پاس جاتے۔ وہ ان کے ساتھ عورت  
یکرمہ۔ البدایۃ والنہایۃ ج ۸ ص ۱۵۱ پیش آتے اور مال پیش کرتے۔

ابن ابی الحدید جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ شرح منج البلاغہ میں ان عطایا کا ذکر کیا ہے جو  
امیر المومنین امیر معاویہؓ حضرت حسنؓ و حسینؓ اور دیگر بنی ہاشم کے اکابر کو دیا کرتے تھے۔  
ومعاویۃ اول رجل فی الارض اور معاویہؓ روئے زمین پر سب سے

وہب الف الف وابنہ یزید  
 اول من ضاعف ذلك كان  
 یحییٰ الحسن والحسین بن علی  
 فی کل عام لکل واحد  
 منهم بالف الف درہم و  
 كذلك كان یحییٰ عبد اللہ  
 بن عباس و عبد اللہ بن  
 جعفر۔ شرح ابن ابی الحدید ج ۲ ص ۸۲۳  
 پہلے شخص ہیں جنہوں نے لوگوں کو  
 دس دس لاکھ عطا کئے۔ اور ان کے  
 صاحبزادے یزید سب سے پہلے  
 وہ شخص ہیں جنہوں نے اس تعداد  
 کو دوگنا کیا۔ وہ حضرت حسنؓ، حضرت  
 حسینؓ، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ  
 اور حضرت عبد اللہ بن جعفرؓ کو ہر سال  
 دس دس لاکھ عطا کرتے۔

اور تو اور ابو مخنف جیسا غالی رافضی جس نے کہ بلا کی داستانیں وضع کیں، اس نے بھی  
 اس امر کی تصریح کی ہے کہ حضرت امیر معاویہؓ، حضرت حسینؓ کو ہدایا کے علاوہ دس دس لاکھ  
 دینار سالانہ بھیجا کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں۔

وكان معاویة یبعث الیہ  
 (الحسین) فی کل سنة  
 الف الف دینار سوی الہدایا  
 من کل صنف۔ مقتل ابی مخنف ص ۱۷  
 امیر معاویہ ہر سال حضرت حسینؓ  
 کو دس دس لاکھ دینار بھیجتے۔ اور اس  
 کے علاوہ ہر قسم کے ہدایا بھیجتے رہتے۔

ان روایات سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ امیر معاویہؓ اور حضرات حسنؓ و حسینؓ کے باہمی  
 تعلقات بہت ہی عمدہ تھے۔ اور امیر معاویہؓ انہیں مال عطا کرتے۔ اور ان کے علاوہ ان کے  
 صاحبزادے یزید کا بھی یہی سلوک تھا۔ حضرت حسنؓ کی وفات کے بعد حضرت حسینؓ ہر سال  
 دمشق جاتے رہے۔ امیر معاویہؓ انہیں ہدایا کے علاوہ دس دس لاکھ پیش کرتے۔ امیر المؤمنینؓ  
 یزید کا بھی یہی دستور تھا اور جس سال حضرت حسینؓ دمشق نہ جاتے تو امیر معاویہؓ ان کی  
 خدمت میں یہ عطیہ مدینہ بھیجتے۔ امیر المؤمنینؓ معاویہؓ اور ان کے صاحبزادے یزید کا یہ سلوک



حضرات حسنؑ و حسینؑ کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباسؑ اور حضرت عبداللہ بن جعفرؑ کے ساتھ بھی تھا اور یہ دونوں افراد خاندان نبی ہاشم کے سربراہان اور وہ افراد تھے۔ ایسی صورت میں یہ دعویٰ کہ امیر معاویہؓ نے حضرت حسنؑ کو زہر دیا۔ ایک کھلے جھوٹ کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آیا تھا۔ اور حضرت حسینؑ اور دیگر ہاشمیوں کو اس کا علم تھا تو یہ کیسے امیر معاویہؓ کی خدمت میں حاضریاں دیتے رہے اور کس طرح ان سے ملا وصول کرتے رہے۔ آخر ان حضرات کی حمیت و غیرت کہاں چلی گئی تھی؟ کیا سبائی ٹولہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ امیر معاویہؓ تو قاتل تھے ہی۔ لیکن خاندان نبی ہاشم کے یہ تینوں سربراہان افراد اتنے بے غیرت اور لالچی تھے۔ کہ اپنے بھائی کو مروا کر بھی پیسہ حاصل کرتے رہے۔ استغفر اللہ ربی من کل ذنب والوب الیہ۔

اس قسم کی ذہنیت کسی ایرانی، مجوسی اور یہودی کی تو ہو سکتی ہے۔ لیکن عربوں کے بارے میں یہ سوچنا بھی اُن کی تاریخ کو مسخ کر دیتے کے مترادف ہے جن لوگوں میں ایک ایک قتل کے پیچھے صدیوں جنگیں چلی ہوں۔ کیا اس قسم کی فطرت صرف نصف صدی میں مسخ ہو کر رہ جائے گی۔ یہ فطرت اس قوم کی ہو سکتی ہے جو ہزار ہا سال تک ساسانی بادشاہوں کے دسترخوان چاٹتی رہی۔ اور جنہوں نے ان بادشاہوں کی خوشنودی کے لئے مانی مذہب اختیار کر لیا۔ جس میں ماں بہنیں بھی حلال تھیں۔ جو آج تک عید غدیر کی شکل میں موجود ہے۔

اب ہم حکیم علی احمد عباسی صاحب کی تحقیق تاریخین کے سامنے پیش کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت امیر معاویہؓ کی ذات پر سبائیوں کی جانب سے جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اُن کا ایک کتابی صورت میں رد تحریر کیا۔ اس کتاب کا نام ہے۔ ”امیر معاویہ کی سیاسی زندگی اُس کا مقدمہ مولوی احتشام الحق صاحب مرحوم نے لکھا۔ یہ کتاب ۱۹۶۳ء میں شائع ہوئی۔ لیکن سبائیوں کے اشارے پر چند ہی دن بعد ضبط کر لی گئی۔ اور آج تک ضبط ہے۔ حکیم صاحب ایک محقق عالم ہیں۔ اور تاریخ پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ آئیے آپ حضرات بھی اُن کی تحریر

کے مزے لوٹتے۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں۔

صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی راہ سے ہٹ کر چلنے والوں نے جہاں اور قسم قسم کی باتیں سلف صالحین کے متعلق وضع کی ہیں۔ وہاں ایک یہ بھی ہے کہ آپ کو امیر المؤمنین معاویہؓ کے اشارے سے زہر دیا گیا تھا۔ جس سے آپ نے وفات پائی۔ بعض لوگ اس کو ایک دوسرے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے۔

توفی الحسن رضی اللہ عنہ حضرت حسن کی وفات مدینہ میں ہر

بالمدينة سنة مسموماً سمته سے ہوئی۔ یہ زہر انہیں جعدہ بنت

زوجة جعدہ بنت الاشعث اشعث بن قیس نے دیا تھا۔ اور

بن قیس دس الیمہانیزید یزید نے اسے یہ بہکایا تھا کہ اگر تو

بن معاویہ ان تسم حسن کو زہر دے دیگی تو وہ اس سے

فتینہ زوجہا ففعلت فلما نکاح کر لے گا۔ جب حضرت حسن کی

مات الحسن بعثت الی یزید وفات ہو گئی۔ تو جعدہ نے وفا کا

تسالہ الوفاء بما وعدھا مطالبہ کیا۔ لیکن یزید نے جواب دیا

فقال لم نرضك بالحسن ہم تو تیرے حسن کی زوجیت میں بنے

افرضك للانفسا۔ پر راضی نہ تھے۔ تو اپنی ذات کیلئے

تاریخ الخلفاء از مصری ص ۷۴ تجھے کیسے پسند کر سکتے ہیں۔

اب ان صاحب سے پوچھا جائے کہ اتنی تفصیلات جب انہیں معلوم ہیں تو سیدنا

حسین رضی اللہ عنہ کو بھی معلوم ہوں گی۔ بلکہ سیدنا حسنؓ کو بھی اور سب اہل بیت اور

صحابہ کرام اس سے واقف ہوں گے کہ آپ کو زہر دیا گیا، فلاں شخص نے دیا ہے اور فلاں

مقصود سے دیا ہے۔ چنانچہ اب دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو سیدنا حسن اور اہل بیت کو یہ باتیں

معلوم تھیں۔ اور قاتل کو معاف کر دیا گیا تو پھر اس کا تذکرہ کیوں؟ اور اگر معلوم نہیں تھیں

تو بعد کے لوگوں پر یہ راز کیسے کھل گیا؟

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ یہ بات معلوم تھی اور معاف بھی نہیں کی گئی، تو پھر قاتل کے خلاف کیا کارروائی کی گئی؟ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ اور ضعیف سے ضعیف بلکہ کوئی موضوع روایت بھی ایسا نہیں جس سے معلوم ہو کہ سیدنا حسینؑ نے زہر خورانی کا مقدمہ امیر مروان دیکھ کر وہ اس وقت مدینہ کے گورنر تھے یا امیر معاویہؓ کی عدالت میں پیش کیا تھا۔ اور اس سلسلہ میں یہ کارروائی ہوئی تھی۔ یعنی سیدنا مروان اور اموی خلفاء چونکہ اہل بیت کے ازلی دشمن تھے۔ اس لئے یہ مقدمہ خارج کر دیا گیا۔

اگر ایسی کوئی بات نہیں تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا۔ کہ یہ سب بعد کی وضع کی ہوئی باتیں ہیں۔ اہل بیت کو ان میں سے کسی بات کا علم نہ تھا۔ اور انہوں نے سیدنا حسن رضی اللہ عنہ کی وفات کو مکمل طور پر طبعی سمجھا۔ اسی لئے قطعاً کسی قسم کی کوئی کارروائی نہیں ہوئی۔ اور نہ کسی پر انہوں نے زہر خورانی کا شبہ کیا۔

دائرہ معارف اسلامیہ اردو کے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ آپ کی وفات مرضِ سل میں واقع ہوئی تھی۔ یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ سیدنا حسن کے متعلق محقق ہے۔ کہ آپ خوشبو کا استعمال بہت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ جدھر سے گزر جاتے تھے۔ مدینہ کی گلیاں، مکہ اٹھتی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو نزلہ ہوا ہو۔ اور احتیاط نہ کرنے سے بگڑ گیا ہو۔ یہ جو روایت میں منہ سے خون آنے کا ذکر ہے۔ اس کی یہی وجہ ہو سکتی ہے۔

پھر ہمیں یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ امیر المومنینؑ یرید کے ساتھ اہل بیت کا بڑا دیکھا تھا۔ اگر اس قسم کا کوئی شبہ ان حضرات کو ہوتا تو انہیں سیدنا حسنؑ کی وفات کا قصہ یاد آتا۔ اور ان کی ہمدردیاں ان سے اٹھ جاتیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ حضرات بغاوتِ اہل مدینہ (واقعہ حرہ) سے محض الگ ہی نہیں رہے۔ بلکہ انہوں نے امیر المومنینؑ کی طرف سے مدافعت کی۔ اور ان کے کردار پر حرف رکھنے والوں کو جھٹلایا۔ انہیں متبع سنت اور متلاشی خیر باور کرایا۔ اور

دین کی بنیاد پر ان کے خلاف خردِ ج کو حرام چانا۔ پھر ان کی وفات کے بعد نہ اُن لوگوں سے واسطہ رکھا جو خونِ حسینؑ کا نام لے کر کھڑے ہوئے تھے۔ اور نہ حضرت ابن الزبیرؓ کا ساتھ دیا جو اُموی خلافت کے طاقت ور مخالف تھے۔

پھر ہمیں یہ نظر نہیں آتا۔ کہ جو لوگ خونِ حسینؑ کا بدلہ لینے کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے امیر المومنین یزیدؑ کے فرضی جرم میں سیدنا حسنؑ کو زہر دینا بھی شامل کیا ہو، اور اپنے پوپگینڈے میں کسی جگہ اشارہ بھی اس جرم کو بیان کیا ہو۔ کیسے تعجب کی بات ہے کہ بعد کے مؤرخوں کو اس زہر خورانی کے تمام واقعات اور تفصیلات کا علم ہے۔ لیکن نہ ہم عصر لوگ اس سے واقف تھے۔ اور نہ اُن کے فوراً بعد آنے والے حضرت معاویہ کی سیاسی زندگی ص ۲۵۵

حکیم صاحب کی تحریر نے ہمارے ذہن کو کسی اور جانب متوجہ کر دیا ہے۔ حکیم صاحب نے سیوطی کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے۔ اس کا آخری جملہ انتہا سے زیادہ خور طلب ہے کہ یزید نے یہ جواب دیا کہ ہم تو تجھے حسن کے لئے بھی پسند کرتے تھے تو اپنے لئے کیسے پسند کر سکتے ہیں۔ گویا معاملہ زہر خورانی کا نہیں تھا۔ بلکہ قصہ تو صرف اتنا تھا کہ یزید یہ پسند کرتا تھا کہ جعدہ حضرت حسنؑ کے نکاح میں رہے۔ لہذا ہونا تو یہ چاہیے کہ اگر جعدہ اس لائق نہ تھی کہ وہ حضرت حسنؑ کے نکاح میں رہے تو حضرت حسنؑ کو اسے طلاق دینے کا مشورہ دیا جاسکتا تھا۔ جب وہ تین سو عورتوں کو طلاق دے سکتے تھے۔ تو جعدہ کے سلسلہ میں آخر کیا بات پیدا ہوئی تھی کہ وہ اسے اپنے سے جدا کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ اب ذرا ابن حجر شمشٰی التوفیٰ ص ۹ کے خیالات بھی ملاحظہ فرمایا لیجئے۔ ابن حجر شمشٰی لکھتے ہیں۔

وکان سبب موته ان زوجته	حضرت حسن کی موت کا سبب یہ ہے
جعدۃ بنت الاشعث بن	کہ جعدہ بنت اشعث بن قیس الکندی
قیس الکندی دس الیہا	نے انہیں زہر دیا۔ اسے یزید نے حکم دیا
یزید ان تسمہ ویتزوجہا	تھا کہ وہ حسن کو زہر دیدیں تو وہ اُن

وبذل طعاماته الف درهم  
ففعلت فمريض الرعين  
يوما فلما مات بعثت  
الی یزید تسالہ الوفا  
بما وعدہا فقال  
لہا انال نوضک للحسن  
فنرضاک لانفسنا۔ و  
بموتہ مسموما شهید  
اجزم غیر واحد من  
المتقدمین کقتادة و  
ابی بکر بن حفص والمتأخرین  
کالزین العراقی فی مقدمۃ  
شرح التقریب۔

سے نکاح کر لے گا اور ایک لاکھ درہم  
اس کے پاس بھیجے۔ اس نے یزید کے  
کہنے پر عمل کیا۔ حضرت حسن چالیس  
دن بیمار رہے۔ جب ان کا انتقال  
ہو گیا۔ تو جعدہ نے یزید سے وعدہ  
نہا بنے کو کہا۔ اس نے جواب دیا  
ہم تو تجھے حسن ہی کے لئے پسند  
کرتے تھے۔ اب اپنے لئے کیسے پسند  
کر سکتے ہیں۔ حضرت حسن کی موت نہر  
سے شہید ہو کر ہوئی۔ متقدمین سے  
قتادہ اور ابوبکر بن حفص اور متأخرین میں  
سے حافظ عراقی کا قول یہی ہے۔ جیسا  
کہ انہوں نے شرح تقریب کے مقدمہ  
میں لکھا ہے۔

تقریباً یہی بات سیوطی نے لکھی تھی۔ لیکن ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ سبائی تو امیر  
معاویہ کا نام لیتے ہیں۔ اور سنی یزید کا۔ حالانکہ یزید اس وقت برسرِ اقتدار نہ تھا۔ اور نہ اسے  
حضرت حسنؓ سے کوئی خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔ جب ابن الرافضی کی روایت کو من و عن قبول  
کیا گیا تو اس نام میں ترمیم کی کیا ضرورت پیش آگئی تھی۔

اس روایت سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ معاملہ زہر دینے کا نہیں تھا۔ بلکہ یزید  
جمعہ کا ان کے نکاح میں رہنا پسند کرتا تھا۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک لاکھ جعدہ کو دیا  
گیا تھا۔ اور حضرت حسنؓ اسے طلاق دینا نہیں چاہتے تھے تو خود خلع طلب کر لیتی اس طرح

معاملہ صفائی کے ساتھ حل ہو جاتا۔

ابن حجر ہشبی نے آگے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ حضرت حسینؑ نے حضرت حسنؑ سے بہت اصرار کیا کہ زہر دینے والے کا نام بتائیے۔ لیکن انہوں نے نام بتانے سے انکار کر دیا جب حضرت حسنؑ نے انکار کر دیا تو کیا ابن حجر ہشبی کے پاس کوئی فرشتہ اس کی خبر لے کر آیا تھا کہ یہ یزید اور جعدہ کی حرکت ہے۔ حالانکہ قرآن کا حکم ہے۔

الامن شہد بالحق دھم مگر جو شخص حق کی شہادت دے اور  
یلعلمون ۵ وہ جانتے بھی ہوں۔

یہ بغیر علم کے ناحق شہادت کس بل بوتے پر دی جا رہی ہے۔ ہم تو یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ان لوگوں کے ذہنوں کو سبائی روایات نے اتنا مادف کر دیا ہے کہ ان حضرات کو اپنی آنکھ کا شبہ تیر بھی نظر نہیں آتا۔

پھر ابن حجر کا دعویٰ یہ ہے کہ متقدمین میں سے اسکے قائل قتادہ ہیں۔ اور متاخرین میں سے حافظ زین الدین عراقی۔ جہاں تک قتادہ کا معاملہ ہے تو اول تو ہماری نظر سے اُن کا قول نہیں گننا کیا خبر وہ بھی بلا سند ہو، دوسرے قتادہ حضرت حسنؑ کی وفات کے بہت زمانہ بعد پیدا ہوئے۔ اُن کا انتقال ۱۷۱ھ میں ہے۔ جب تک وہ اس کی سند بیان نہ کریں تو اُن کے قول کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے۔ اور قتادہ کے بعد کن حضرات نے اس واقعہ کو نقل کیا۔ ابن حجر ہشبی نے کسی کا نام نہیں لیا۔ بلکہ سیدھے زین الدین عراقی پر پہنچ گئے۔

جہاں تک حافظ عراقی کا تعلق ہے تو انہوں نے تمام لوگوں کی جانب سے ایک اصل بیان کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

ولیعلم الطالب ان السیرا ماصح وما قد انکرا  
(طالب علم کو جان لینا چاہیے کہ سیرت کی کتابوں میں صحیح و منکر ہر قسم کی روایات جمع

کی جاتی ہیں)

لہذا دستور یہ رہا ہے کہ سیرت و تاریخ کے معاملہ میں کوئی تحقیق نہیں کی جاتی تصور  
تو ہم ہیں کہ ہم نے ان لغویات کی تحقیق شروع کر دی۔ ہم اس موقع پر ان سنی حضرات کے اسرار  
گرامی پیش کرنا چاہتے ہیں جنہوں نے یہ واقعہ تحریر کیا۔ یا اس سلسلہ میں ان کا نام لیا گیا۔  
۱۔ قتادہ بن عامر المتونیؒ۔

۲۔ حافظ ابو الفضل زین الدین عبد الرحیم بن الحسین العراقی المتونیؒ۔

۳۔ حافظ شہاب الدین ابو الفضل احمد بن علی المعروف بابن حجر عسقلانی المتونیؒ۔

۴۔ جلال الدین ابو الفضل عبد الرحمن بن الکنال السیوطی المتونیؒ۔

۵۔ ابو العباس شہاب الدین احمد بن محمد بن علی المعروف بابن حجر ہمشمیؒ۔

اس خاکہ کو دیکھنے کے بعد یہ نقشہ سامنے آتا ہے کہ قتادہ کے علاوہ بقیہ تمام افراد  
نویں اور دسویں صدی کے افراد ہیں۔ گویا نویں صدی تک سنی اس کے قائل نہ ہوئے تھے۔  
سینیوں میں تو یہ کہانی نویں صدی کے بعد مشہور ہوئی۔ اور خاص طور پر اس کی وجہ سیوطی ہیں  
کیونکہ ہمارے ہندو پاکستان کے تمام علماء یہ سمجھتے ہیں کہ سیوطی کی تاریخ القلاء کا مطالعہ  
کر لینے کی بعد مزید تاریخ کی کسی کتاب کے مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ گویا ہماری تاریخ اسلام  
صرف ایک کتاب پر ختم ہو جاتی ہے۔ جو دسویں صدی میں وجود میں آئی۔

ہمشمی نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ حضرت حسنؑ اس زہر کھانے کے بعد چالیس دن علیل  
رہے۔ ہم اس کی تفصیل اوپر بیان کر چکے ہیں لیکن اُس وقت تک دنیا جس زہر سے شناس  
تھی۔ وہ سانپ کا زہر تھا۔ جس سے انسان کی موت چند لمحات میں ذہبی لیکن چند  
گھنٹوں میں یقینی تھی۔ آخر یہ سلویا تیزن کہاں سے آگیا تھا۔ جس کے بعد حضرت حسنؑ چالیس  
روز تک حیات رہے۔ اور بعض روایات کے مطابق دو ماہ سلویا تیزن کی صورت میں انسان  
کو زہر کا احساس نہیں ہو سکتا۔ اور تیز زہر کی صورت میں زیادہ سے زیادہ دو چار خورق  
کی لیاں ہو جانے کے بعد زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چالیس دن یا دو ماہ تک انسان حیات

سل ہی میں خون تھوکہ سکتا ہے۔

اب ذرا منہ کا مزہ لینے کے لئے حکیم فیض عالم صدیقی شہید کے خیالات بھی ملاحظہ فرمائیں۔  
حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے متعلق شیعوں کی تمام کتب اور سنیوں کی اکثر کتب میں یہ واقعہ بڑی اندوہ گیں داستان کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ معاویہؓ اور یزیدؓ نے آپؐ کی زحہ جعدہ بنت اشعث کے ذریعہ آپؐ کو زہر دلوایا تھا۔ باقی جھوٹی داستانوں اور من گھڑت روایتوں کی طرح اس داستان پر وہ حاشیہ آرائش کی گئی ہیں کہ الامان اور عجیب بات یہ ہے کہ کسی نے نہیں لکھا کہ یہ روایت چلی کہاں سے ہے۔

ایک بار ابوجعفر منصور عباسی نے محمد مہدی الحسنی (نفس ذکیہ) کے خروج کو فرد کرنے کے بعد ایک مجمع عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ علیؑ خلیفہ ہوئے تو اس میں وہ خون سے لت پت ہو گئے۔ پھر ان ہی کے مددگار شیعوں نے اُن پر یورش کی اور انہیں قتل کر دیا۔ اُن کے بعد حضرت حسن بن خلیفہ ہوئے۔ مگر وہ اس میدان کے مرد ہی نہ تھے۔ انہیں روپیہ پیش کیا گیا تو وہ خلافت سے دستبردار ہو کر عورتوں سے تمتع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ (ماخوذ از طبری)

زہر خوردگی کی داستان سراسر جھوٹ اور کذب ہے۔ میرے خیال میں ابوجعفر منصور نے جس انداز سے حضرت حسنؓ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے بھی تو قلبی بغض اور عناد کی بوا آتی ہے۔ (یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ خطبہ طبری کے مادیوں نے تیار کیا ہو، یا اُس میں نمک مرچ ملا یا ہو) منصور کے بھائی نے مجمع عام میں یہ کہنے سے بھی گریز نہ کیا تھا کہ خلافت ہمارا حق تھا سو ہم کو مل گیا اور غاصبوں کو اللہ تعالیٰ نے رسوا کیا۔

شیعوں نے سیدہ جعدہ پر اس لئے تہمت لگائی کہ وہ حضرت صدیق اکبرؐ کی بھانجی تھیں، ”ہمارے عام مقررین اور واعظین“ اس لئے اس من گھڑت روایت کو لے اڑے کہ وہ اکثر امور اور نظریات میں شیعوں کے ہم نوا ہیں۔



حضرت حسنؑ جتنا پراسن صلح کن اور آرام طلب آدمی جس نے خود ہی سب کچھ معاویہؓ کے سپرد کر دیا تھا۔ ایسے آدمی کو زہر دینے کی کسی کو کیا ضرورت تھی؟ حضرت حسنؑ البتہ عورتوں کی صحبت کے دلدادہ تھے۔ مدائنی کہتا ہے کہ آپؐ نے نوے نکاح کئے۔ ابن سیرین نے ایک دفعہ بیان کیا کہ ایک خاتون سے نکاح کیا تو سو کینروں کے ذریعہ اسے روپیہ بھیجوا اور ہر کنیز ایک ایک لاکھ روپیہ لے کر گئی۔ تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۳۲۴

حضرت معاویہؓ کے ساتھ صلح کے وقت یہ بھی معاہدہ ہوا تھا کہ کوفہ کے بیت المال کی تمام نقدی حضرت حسنؑ کو دیدی جائے۔ چنانچہ وہاں سے پانچ کروڑ نقد ملا۔ بیس لاکھ سالانہ وظیفہ تھا۔ یہ تمام کچھ خرچ کر دیتے بلکہ اکثر قرض لیتے۔ تاریخ الخمیس ج ۲ ص ۳۲۶

ملا باقر مجلسی نے جلال العیون میں خوب بے پرکی اڑائی ہے کہ حضرت حسنؑ نے دوسو پچاس عورتوں سے نکاح کیا۔ پھر خود ہی دوسری جگہ تین سو لکھتے ہیں۔ اور یہ تمام نکاح حضرت علیؑ کی حیات میں ہوئے۔ چنانچہ ایک بار حضرت علیؑ نے مہر پر چڑھ کر فرمایا کہ حسنؑ بہت زیادہ طلاق دیتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہماری لڑکیوں کا ایک رات اُن کے گھر رہنا ہمارے لئے موجب شرف ہے۔ جلال العیون مطبوعہ تہران ص ۳۰۹

ملا صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ حضرت حسنؑ نے عفتی عورتوں کو طلاقیں دی تھیں۔ وہ سب آپؐ کے جنازے پر تنگے سر روٹی بیٹھی حاضر ہوئیں (یہ عرب عورتیں نہ ہوں گی۔ بلکہ ایرانی النسل ہوں گی)۔ ابن ابی الحدید شامخ بیج البلاغہ نے ستر نکاح اور پیردیسرتی نے سو نکاح بیان کئے ہیں۔

آپؐ کی موت کے متعلق تاریخ الخمیس میں ہے کہ بیماری سے چالیس دن بستر پر پڑے رہے۔ ج ۲ ص ۳۲۶

دوسری نے مدت علالت دو ماہ بیان کی ہے۔ ذیابیطس کا عارضہ تھا اور شہد کاشترت پینے سے بڑھ گیا۔

ابن قتیبہ المتوفی ۲۴۶ھ، البیہقیہ وینوری ۲۸۱ھ، صاحب البحر المتوفی ۲۴۵ھ نے زہر خورانی کا کوئی تذکرہ تک نہیں کیا۔ بلکہ ابن جریر طبری المتوفی ۳۱۰ھ جس نے بے حساب موضوعات کو بڑے وثوق اور یقین سے بیان کیا ہے۔ اس نے بھی کہیں زہر خورانی کی طرف اشارہ نہیں کیا۔

زہر خورانی سے متعلق سب سے پہلا الہام سعودی المتوفی ۳۴۶ھ کو ہوا۔ گویا چوتھی صدی کے ربیع اول تک حضرت حسنؓ کی زہر خورانی کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہ تھا۔

مسعودی نے زہر خورانی کی داستان وضع کرتے وقت بہترے ہاتھ پاؤں مارے۔ لیکن کسی کا نام نہ مل سکا۔ تو مجبوراً لکھنا پڑا کہ کہا جاتا ہے کہ جعدہ نے معاویہؓ کے ایمار سے حضرت حسنؓ کو زہر دیا تھا۔ حقیقت مذہب شیعہ ص ۳۰۵

لفظ کہا جاتا بھی غور طلب ہے۔ یہ لفظ ثابت کر رہا ہے۔ کہ اس قول کے قائل کا کوئی یقین نہیں۔ بلکہ یہ بے پرکی گپ ہے۔ پھر بھی اس نے یہ الزام امیر معاویہؓ کے سر تھوپ دیا۔ لیکن بعد کے سنی علما نے سنی ہونے کے ناتے امیر معاویہؓ کے بجائے اسے یزید کی جانب منسوب کر دیا۔

یہ مسعودی وہی حضرت یحییٰ میں جنہوں نے حضرت عبداللہ بن رقیہ یعنی حضور کے نواسے کو شرابی اور زانی قرار دیا ہے۔ فلعلنہ اللہ علی الذین۔

اس کے بارے میں علی احمد عباسی صاحب لکھتے ہیں۔

رب آتے ہیں وہ اصحاب کذب و افتراء جنہوں نے خاص مقاصد کے تحت تصنیف و تہریف کا پیشہ اختیار کیا۔ مثلاً مسعودی کہ اس شخص کو نہ روایت سے بحث ہے نہ روایت سے بلکہ عدل کے ساتھ وہ کوئی بات خوش دلی سے نہیں کہہ سکتا۔ جن چیزوں کو پوشیدہ رکھنا ممکن نہیں انہیں تو بیان کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا مقصد تصنیف و تالیف سے محض یہ نظر آتا ہے کہ کسی طرح اخلاف کو اسلاف سے برگشتہ کر کے امت کی تاریخ میں ہر ممکن خلا پیدا کر دے۔ پھر بھی عجیب بات یہ ہے کہ اسے کذاب و مغتری سمجھنے کے بجائے لوگوں نے

محقق و مؤرخ سمجھ لیا اور اس کی کتابوں سے استناد کر کے معتبر بننے کی کوشش کی۔ حضرت معاویہؓ کی سیاسی زندگی ۱۵

اب ذرا قرآن مجید کی روشنی میں اس واقعہ کو دیکھئے۔ قرآن صحابہ کرام کے بارے میں کہتا ہے۔

أُولَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ  
الْإِيمَانَ  
ان لوگوں کے دلوں میں اللہ نے ایمان  
لکھ دیا ہے۔  
نیز ارشاد ہے۔

وَكُرْهُ الْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ  
هُمُ الرَّاشِدُونَ  
اور اللہ نے تمہارے لئے کفر، فسق  
و فجور اور معصیت کو مکروہ بنا دیا ہے۔  
یہ سب ہدایت یافتہ ہیں۔

ان آیات کی رو سے تمام صحابہ راشد ہیں اور ان میں سے نہ کوئی عدا کفر کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ نہ فسق و فجور کا اور نہ کوئی صحابی اللہ کی نافرمانی کر سکتا ہے۔ بھول چوک اور خطا ایک علیحدہ شے ہے۔ جب قرآن کا یہ فیصلہ ہمارے سامنے آگیا تو ایک ایک پتہ جاتا ہے کہ قتل گناہ کبیرہ ہے۔ بلکہ حقوق العباد میں اس سے بڑھ کر کوئی معصیت نہیں۔ ارشاد الہی ہے

وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا متعمداً  
فَجَزَاءُ ۙ جَهَنَّمَ خَالِداً فِيهَا  
وَعُذِّبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعْنَةُ  
وَأَعَدَّ لَهُ عَذَاباً  
اور جو کسی مؤمن کو جان کر قتل کرے گا۔  
اس کی سزا جہنم ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ  
رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس  
کی لعنت ہے۔ اور اس نے اس کے  
لئے عذاب عظیم تیار کیا ہے۔

اگر ان روایات کو قبول کیا جائے کہ معاویہؓ نے حضرت حسنؓ کو مار دیا اس طرح ایک کبیرہ گناہ کے مرتکب ہوئے اور جہنم ہمارے تو عیاذ باللہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں جو صحابہ

کے بارے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ہم نے ان کے لئے فسق و فجور اور معصیت کو مکروہ بنا دیا ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ سراسر جھوٹ پر مبنی قرار پاتا ہے۔ اور کوئی صاحب ایمان حالت ایمان میں اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لہذا وہ تمام تاریخی روایات جن سے کسی صحابی کے سلسلہ میں کفر فسق و فجور اور معصیت الہی ظاہر ہوتی ہو۔ وہ سب سبائی کذب و افتراء ہے۔ مثلاً حضرت عمرؓ بن العاص کی جانب دھوکہ دہی کی نسبت، حضرت مغیرہؓ بن شعبہ کی اقتدار کی بھوک اور سیاسی رشوت کی داستان یا کسی کی جانب بیت المال میں خیانت وغیرہ اسی قسم کی ہزار تاریخی روایات ہیں۔ جو قطعاً خلاف قرآن ہیں۔ ایسی صورت میں تاریخی روایات کو اختیار کرنا اور قرآن کو ترک کرنا۔ یہ کام صرف ایسے ہی اشخاص انجام دے سکتے ہیں جن کا اس قرآن پر ایمان نہ ہو۔ اور جن کا قرآن پانچ سال کا بچہ لے کر غائب ہو گیا ہو۔ یہی تو وہ سبائی ذہنیت ہے جس نے ہمارے دماغوں کو ماؤف کر رکھا ہے۔ اس تحریر کا مقصد بھی یہی ہے کہ تاریخ میں سبائیوں نے کیا کیا فریب کاریاں کی ہیں۔ اور کس کس طرح صحابہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس پر سے پردہ اٹھایا جائے تاکہ اہل سنت حضرات اس مسیختہ و خوش رنگ زہر کو سمجھیں اور اس سے بچنے کی کوشش کریں۔

## قرآن نیزوں پر اٹھانا

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو عام طور پر اور خاص طور پر امیر معاویہؓ اور حضرت سہیل بن العاص وغیرہ کو بدنام کرنے کے لئے یہ کہانی بڑی شد و مد سے بیان کی جاتی ہے۔ کہ جب میدان صفین میں امیر معاویہؓ کے لشکر کو شکست ہونے لگی۔ تو امیر معاویہؓ نے اپنے لشکریوں کو نیزوں پر قرآن اٹھانے کا حکم دیا۔ اور اس طرح امت کو ایک قریب میں مبتلا کیا۔ یہ قصہ اتنا عام ہے کہ آج ہر سستی کی زبان پر جاری ہے۔ بلکہ پاکستان میں اسلام کے ٹھیکہ دار تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ معاویہؓ اور عمرؓ بن العاص نے امت کو قریب میں مبتلا کیا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اس عمل سے قریب کاشکار حضرت علیؓ کے ساتھی ہی کیوں بنے۔ اور شایسوں میں اختلاف کیوں رقع نہیں ہوا۔

اس سے تو یہ بات نمودار ہوتی ہے کہ اہل مزق اور سبائیوں کی یہ صفت خاص تھی کہ وہ اپنے امیر کی بھی نہ سنتے تھے۔ ان کے پیش نظر کسی وقت بھی اسلام اور اتحاد نہیں رہا۔ لہذا یہ ہر اس موقع کی تلاش میں رہتے تھے جس کی بنیاد پر یہ اختلاف کی عمارت کھڑی کر سکیں۔ یہ ہمیشہ دھوکہ دہی، قریب کاری اور غداری کے مرض میں مبتلا رہے۔ جب کہ شامی اس مرض سے پاک رہے۔ جس کی وجہ ظاہر ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ جتنے افراد تھے۔ یہ سب تخریب کار اور فتنہ انگیز لوگ تھے، جنہوں نے بظاہر اسلام کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ اور اس لبادے میں انہوں نے حضرت عثمانؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کو شہید کیا۔ ام المؤمنین عائشہؓ اور ام المؤمنین ام حبیبہؓ کی بے حرمتی کی۔ اور پھر مدینہ کی مرکزیت کو ختم کیا۔ تاکہ اسلام کا سیلاب جو بڑی بڑی سلطنتوں پر چھا رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح اُس کو ختم کیا جائے۔

امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں سے انہیں یہ عداوت تھی کہ وہ ان کی چال بازی اور فتنہ انگیزی کے مقابلہ میں سینہ سپر بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اور اس طبقہ کا ان پر داؤ نہ چلتا تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ اس طبقہ نے امیر معاویہؓ کے مقابلہ میں شکست ہی کھائی ہے۔

اس واقعہ کو مودودی صاحب اپنی "خلافت و ملکیت" میں ایس الفاظ نقل کرتے ہیں۔  
حضرت عمارؓ کی شہادت کے دوسرے روز دس صفر ۳۵ کو سخت معرکہ برپا ہوا۔ جس میں حضرت معاویہؓ کی فوج شکست محمے غریب پہنچ گئی۔ اس وقت حضرت عمرو بن العاص نے حضرت معاویہؓ کو مشورہ دیا کہ اب ہماری فوج نیزوں پر قرآن اٹھالے۔ اور کہے ہذا حکم بیننا و بینکم (یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے) اس کی مصلحت حضرت عمروؓ نے خود یہ بتائی کہ اس سے علیؓ کے لشکر میں پھوٹ پڑ جائے گی۔ کچھ کہیں گے کہ یہ بات مان لی جائے۔ اور کچھ کہیں گے کہ نہ مانی جائے ہم مجتمع رہیں گے۔ اور ان کے درمیان تفرقہ برپا ہو جائے گا۔ اگر وہ مان گئے تو ہمیں ہلکت مل جائے گی..... اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ یہ محض ایک جنگی چال تھی قرآن کو حکم بنانا سرے سے مقصود نہ تھا۔

اس مشورے کے مطابق لشکر معاویہؓ میں قرآن نیزوں پر اٹھایا گیا۔ اور اس کا وہی نتیجہ ہوا جس کی حضرت عمرو بن العاص کو اُمید تھی۔ حضرت علیؓ نے عراق کے لوگوں کو لاکھ سمجھایا کہ اس چال میں نہ آؤ۔ اور جنگ کو آخری فیصلہ تک پہنچے دو مگر ان میں پھوٹ پڑ کر رہی۔ اور آخر کار حضرت علیؓ مجبور ہو گئے کہ جنگ بند کر کے امیر معاویہؓ سے محکم کا معاہدہ کریں خلافت

و ملکیت ص ۱۳۹

مودودی صاحب مرحوم کو دوا سر کا افسوس ہو رہا ہے۔ ایک تو یہ کہ تائیلین عثمانیہ کا اختلاف کیوں واقع ہوا، اگر یہ اختلاف واقع نہ ہوتا تو حضرت علیؓ کو فتح حاصل ہوتی۔ اور وہ تمام مملکت اسلامیہ کے امیر المؤمنین ہوتے۔ اور خاندان نبی امیہ کا خاتمہ ہو جاتا۔ دوم نہ یہ ذال انہماک جاتا۔ یہ حکمین پر فیصلہ چھوڑا جاتا۔ اور نہ حکمین حضرت علیؓ کو خلافت سے معزول کرتے۔ اور نہ

قاتلین عثمانؓ میں پھوٹ پڑتی۔

اتفاق سے ایرانیوں اور سبائیوں کو آج تک اسی کا درد ہو رہا ہے۔ ہمیں افسوس تو یہ ہے کہ جو تکلیف چودہ سو سال سے رافضیوں کو چلی آرہی تھی۔ وہی تکلیف مودودی صاحب کو کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی صرف دو ہی وجوہات ہو سکتی ہیں۔

۱۔ چونکہ وہ حضرت علیؓ کی اولاد سے تعلق رکھتے ہیں اور فرزند ہونے کے ناتے اپنے والد کی وکالت انہوں نے اپنے ذمہ لے لی ہے۔

۲۔ چونکہ وہ تصوف کے سلسلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد میں مودودیؒ جیسی ایک سجادہ نشین صوفی گزرے ہیں۔ اور صوفیاء کو علم باطن کے سلسلہ سے حضرت علیؓ کے علاوہ کوئی اور نظر نہیں آتا۔ اور علم باطن کے لحاظ سے حق خلافت حضرت علیؓ کو حاصل تھا۔ اسی لئے مودودی صاحب کو حضرت عثمانؓ میں بھی خامیاں نظر آئیں۔ اور دیگر خلائین صحابہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

انہوں نے یہ روایت طبری کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ اور ان کا دعویٰ یہ ہے کہ طبری حدیث و تاریخ، تفسیر اور فقہ کے مسلمہ امام ہیں۔ وہ بغیر چھان پھٹک کے کوئی روایت نقل نہیں کرتے۔ لہذا ان کی تمام روایات مسلم ہیں۔ ان میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ رہا راویوں کی تنقید کا مسئلہ تو تاریخ میں اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی کیونکہ اسما

الرجال، علم الروایہ، علم الدرایہ، اور علم المرح والاعتدیل جیسے علوم احکامات اور فقہی مسائل کی تحقیق کے لئے وجود میں لائے گئے تھے۔ تاریخی روایات کو ان کسوٹیوں پر پرکھنے کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہماری تاریخ کے دس حصوں میں سے فوجہ ضائع ہو جائیں گے۔ اگر آج مودودی صاحب مرحوم حیات ہوتے تو میں ان کے سامنے طبری کی وہ روایات ضرور رکھتا۔ جن میں طبری نے حضرت علیؓ پر تبر کیا ہے۔ اور پھر ان سے دریافت کرتا کہ ان روایات کے بارے میں آپ کا کیا نظریہ ہے؟ کاش مودودی صاحب اپنی وفات سے قبل اس کا ازالہ

فرمادیتے ہیں۔ اُن کی اس غلطی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب اُن کی جماعت کلی طور پر شیعوں کی ہم نوا بن گئی۔ اب زبان اُن کی ہوتی ہے۔ اور خیالات شیعوں کے ہوتے ہیں۔ شیعوں کی اس ہم نوائی سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ اب اُن جماعتوں کے ساتھ بھی وہ اتحاد کے لئے تیار ہیں جنہیں کل تک وہ کافر کہتے تھے۔ اور جن کے مقابلہ کے لئے چند سال پیشتر علم بلند کیا تھا۔

اب آیتے طبری کی روایت کی جانب ہم سب سے پہلے طبری کی اصل روایت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ طبری لکھتے ہیں۔

**البوخنف** کا بیان ہے کہ جب عمرو بن العاص نے یہ دیکھا کہ عراقی غالب آتے جا رہے ہیں۔ اور انہیں ہلاکت کا خوف پیدا ہوا۔ تو انہوں نے میر معاویہ سے کہا کہ میں آپ کے سامنے ایک راتے پیش کرتا ہوں جس سے ہم میں اتحاد بڑھ جائیگا اور دشمنوں میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔ معاویہ نے کہا ہاں بیان کرد۔ عمرو بن العاص نے کہا وہ تدبیر یہ ہے کہ ہم قرآن اٹھالیں۔ اور یہ کہیں قرآن جو فیصلہ کرے، وہ نیکو میں اور تمہیں منظور ہونا چاہیے۔ اگر مخالفین میں سے چند لوگوں نے بھی اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا تو آپ دیکھیں گے کہ ان میں ایک گروہ پیدا ہو جائے گا۔ جو اس فیصلہ کو قبول نہیں کرے گا۔ اس طرح ان میں تفرقہ پیدا ہو جائے گا اور اگر سب نے یہ کہا کہ ہمیں یہ فیصلہ مستفقہ طور پر منظور ہے۔ تو ایک مدت تک یہ جنگ ہمارے سروں پر سے دور ہو جائیگی اس بات پر شایموں نے قرآن نیزوں پر اٹھائے اور بولے ہمارے اور تمہارے درمیان یہ کتاب اللہ فیصلہ کن ہے۔ شایموں کا فیصلہ اہل شام پر واقع ہو گا اور عراقیوں کا فیصلہ تمام اہل عراق پر نافذ ہو گا۔ عراقیوں نے جب یہ دیکھا کہ قرآن اٹھائے گئے ہیں تو بولے کہ ہم اللہ عز وجل کی کتاب کو قبول کرتے اور اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ طبری جلد سوم ج ۲ صفحہ ۳۵۸۔

مرد دمی صاحب نے یہ دعویٰ فرمایا تھا کہ یہ عمل صرف دھوکہ دہی کے لئے



انجام دیا گیا تھا۔ اور اس چالبازی میں جسے مودودی صاحب نے جنگی چال سے تعبیر کیا۔ عمرو بن العاص کامیاب ہوئے اور عراقیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔۔۔۔۔ لیکن طبری یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ عراقیوں نے بھی اس بات کو قبول کر لیا۔

حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے چالبازی دکھائی یا نہیں لیکن ہم یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ یہاں مودودی صاحب نے چالبازی سے کام لیا۔ اس اہمیت میں اختلاف کا کوئی تذکرہ نہ تھا۔ لیکن ایک اور روایت میں موجود تھا۔ وہاں سے اس نتیجہ کو حاصل کر کے اس کے ساتھ جوڑ دیا۔ جس سے لوگ یہ تصور کر بیٹھے کہ یہ پوری ایک روایت ہے۔ اسے اگر علمی بددیانتی نہ کہئے تو پھر کیا کہئے۔ ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ مودودی صاحب وہ روایت بھی پیش کرتے جس سے اختلاف ثابت ہوتا ہے۔ لیکن وہ ایسا کرنے سے معذور تھے۔ کیونکہ اگر وہ دیگر روایات پیش کر دیتے تو حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی۔ اور خود حضرت علیؓ کا گروہ مورد الزام بن جاتا۔ آئیے ہم قارئین کے سامنے وہ روایات پیش کئے دیتے ہیں جو مخنف نے عبدالرحمان بن جندب کے ذریعہ جندب الازدی سے روایت کیا ہے۔ کہ جس وقت یہ صورت حال رونما ہوئی۔ حضرت علیؓ نے لوگوں سے فرمایا۔

اے اللہ کے بندو تم اپنے حق و صداقت اور اپنے دشمنوں سے جنگ پر قائم رہو، کیونکہ معاویہؓ، عمرو بن العاصؓ، عقبہ بن ابی معیطؓ، حبیب بن مسلمہؓ، عبداللہ بن ابی مرثد اور ضحاک بن قیس دیندار لوگ اور قرآن پر چلنے والے نہیں ہیں۔ میں تم سے زیادہ ان لوگوں سے واقف ہوں، میں تو بچپن میں بھی ان کے ساتھ رہا۔ اور بڑے ہو کر بھی ان کے ساتھ رہا۔ یہ بچپن میں نہایت شرمینچے تھے۔ اور بڑے ہو کر بھی نہایت شرمی آدمی نکلے۔ تم پر انہوں نے وہ شے نازل پڑا اٹھائی ہے۔ جسے یہ کسی اور وقت باتھ بھی نہیں لگاتے۔ اور یہ تک نہیں جانتے کہ اس میں کیا لکھا ہوا ہے۔ انہوں نے صرف تمہیں دھوکہ دینے اور قریب میں مبتلا کرنے کے لئے قرآن اٹھایا ہے۔

طرف داران علیؑ نے جواب دیا یہ کیسے ممکن ہے کہ ہمیں اللہ عزوجل کی کتاب کو قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔ اور ہم اسے قبول کرنے سے انکار کر دیں؟

حضرت علیؑ نے فرمایا۔ میں نے ان سے اسی لئے جنگ کی تھی، تاکہ وہ کتاب کے احکام پر عمل پیرا ہوں۔ انہوں نے اللہ عزوجل کے ان احکامات کی نافرمانی کی۔ جو انہیں دیئے گئے تھے۔ اور انہوں نے اللہ عزوجل سے جو عہد کیا تھا اسے بھٹا دیا۔ اور اس کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔

اس پر سحر بن فذک الیمسی اور زید بن حصین الطالی جو بعد میں تازیوں کی ایک جماعت کے ساتھ خارجی بن گئے تھے بولے۔

اے علیؑ! تجھے کتاب اللہ کی دعوت دی جا رہی ہے تو اسے قبول کر۔ ورنہ تم تجھے اور تیرے مخصوص ساتھیوں کو ان لوگوں کے ہاتھوں میں دیدیں گے۔ یا جو سلوک ہم نے عثمان کے بیٹے کے ساتھ کیا تھا وہی تیرے ساتھ کریں گے۔ (ابن الاثیر میں ہے کہ جس طرح ہم نے عثمان بن عفان کو قتل کیا تھا۔ اسی طرح تجھے بھی قتل کر دیں گے)، ہم پر یہ لازم ہے کہ ہم اللہ عزوجل کی کتاب پر عمل پیرا ہوں، اور ہمیں شامیوں کی یہ دعوت قبول ہے۔ اللہ کی قسم یا تو مجھے اس پر ضرور بالظہور عمل کرنا ہوگا۔ یا ہم تیرا بھی ضرور وہی حشر کریں گے (یعنی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جیسا حشر)

حضرت علیؑ نے فرمایا۔ تم میری اس غیر رضا مندی کو دماغ میں محفوظ کر لو۔ اور میری یہ بات یاد رکھو کہ اگر تم میری اطاعت کرتے ہو تو تمہیں جنگ کرنی چاہیئے۔ اور اگر تم میری نافرمانی کرتے ہو تو تم جو بہتر سمجھو کرو۔

ان لوگوں نے جواب دیا یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ آپؑ آدمی بھیج کر اشتر کو میدان جنگ سے واپس بلا لیجئے۔ طبری سوم ج ۲ ص ۲۵۵

یہ تھی وہ روایت جس سے نتیجہ اخذ کر کے مولود بنی صاحب نے حضرت عمرؓ کو بنی العاص

پر چال بازی کا الزام قائم کیا تھا۔ اور خود اس روایت کو شیر مادر سمجھ کر پی گئے تھے۔ اس روایت کے خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے۔ اور ذرا دل سے سوچ کر بتائیے۔

کہ حضرت امیر معاویہؓ، حضرت عمرؓ بن العاص، حضرت عبید بن ابی معیط، حضرت عبداللہؓ بن ابی سرح، حضرت ضحاکؓ بن قیس اور حضرت عبید بن مسلمہؓ الضہری صحابہ نے کیا واقعاً قرآن کو چھوڑ دیا تھا؟ کیا یہ لوگ یہ بھی نہ جانتے تھے کہ قرآن میں کیا ہے۔ کیا یہ ہمیشہ شریر رہے تھے۔ کیا حضرت علیؓ نے ان سے جنگ اس لئے کی تھی کہ یہ قرآن کو چھوڑ بیٹھے تھے؟ کیا ان حضرات نے قرآن دھوکہ دہی کے لئے اٹھایا تھا؟ اگر مودودی صاحبؒ اور ان کے ہم نوا تصور کرتے ہیں۔ تو ہم اللہ کی قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ اُس دور سے لے کر آج تک اہل سنت والجماعت میں سے کسی کا یہ عقیدہ نہیں رہا ہے۔ بلکہ یہ خالص با فضیل کا عقیدہ ہے اور یہ روایت خالص تبرائے۔ جن لوگوں کو ایسی صورت میں طبری پر اعتماد ہے۔ تو ان کے دین و مذہب کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ہم اس شخص میں اُن کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہیں کر سکتے اور نہ کسی مسلمان کو کرنا چاہیے۔

اس روایت سے یہ حقیقت بھی کھل کر سامنے آگئی کہ عراقیوں کے نزدیک حضرت علیؓ کی حیثیت کیا تھی۔ وہ تو اپنی خنزیر کا رے کے لئے انہیں استعمال کر رہے تھے۔ ان کے پاس ذقوت فیصلہ تھی اور نہ وہ اپنی رائے پر عمل کر سکتے تھے۔ اُن کی حیثیت ایک کٹھنہ کی تھی۔ عراقی جس طرف چاہتے اُن کا رخ موڑ دیتے۔ اسی لئے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں۔ کہ تاریخ کی سب سے مظلوم ترین ہستی تو حضرت علیؓ ہیں۔ بظاہر اُن کے پاس اقتدار اور لاؤ لشکر ہے۔ لیکن وہ پانچ سال تک ان لشکریوں کے ہاتھ میں بے بس بنے رہے۔

مودودی صاحب کے بقول اس روایت میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کیونکہ یہ مورخ طبری نے چھان بین کرنا شروع کیا ہے۔ اور وہ مسلمہ اہل سنت کے امام ہیں۔ اور اتفاق سے یہ دونوں روایتیں انہوں نے ابو مخنف سے نقل کی ہیں۔ ولی تو یہ چاہتا تھا

کہ ہم ان روایات پر کوئی تبصرہ نہ کریں۔ اور مودودی سے دریافت کریں کہ طبری کی اس روایت کا آپ کے پاس کیا جواب ہے؛ لیکن ہمیں یہ خطرہ ہے کہ اہل سنت حضرات کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس لئے ہم اس پر زیادہ نہیں صرف مختصر سا تبصرہ کئے دیجئے۔

۱۔ اس روایت میں جن صحابہ کے نام آئے ہیں وہ سب حضرات ہم عمر نہ تھے۔ اور ان میں سے ایک شخص بھی حضرت علیؓ کا ہم عمر نہ تھا۔ مثلاً حضرت عمرو بن العاص حضرت علیؓ سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ جب کہ حضرت ضحاک بن قیس ان سے بہت چھوٹے تھے۔ کیا ان سب حضرات کا ایک ساتھ کھیلنا ممکن تھا۔ افسوس کہ بغض معاویہ میں مودودی صاحب اتنی معمولی سی بات کی جانب بھی توجہ نہ دے سکے۔

۲۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں جب قرآن کی مختلف نقلیں تیار ہوئیں تو ان میں سے صرف ایک نقل شام بھیجی گئی تھی۔ آخر اس وقت اتنی نقلیں کہاں سے آگئیں جو لاتعداد افراد قرآن نیردوں پر اٹھا کر آگئے۔

۳۔ جب ان حضرات صحابہ نے قرآن کو پس پشت ڈال دیا تھا۔ اور یہی نہ جانتے تھے کہ قرآن میں کیا ہے۔ اور ہمیشہ یہ شریر رہے تھے۔ تو ان میں سے حضرت عمرو بن العاص کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی عہدہ عطا فرمایا تھا۔ پھر ابو بکر صدیقؓ نے انہیں فلسطین کی جانب امیر بنا کر بھیجا۔ پھر حضرت عمرؓ کے زمانہ میں انہوں نے مصر فتح کیا۔ اور بعد میں وہاں کے گورنر متعین ہوئے۔ امیر معاویہؓ کو حضرت عمرؓ نے حص کا امیر متعین کیا۔ بقیہ حضرات کو حضرت عثمانؓ نے مختلف عہدے دیئے۔ اب ہمیں یہ بتایا جائے کہ ابو بکرؓ و عمرؓ اور عثمانؓ اگر ان کی اس جہالت سے واقف تھے۔ تو انہوں نے ان حضرات کو یہ عہدے کیسے دیئے۔ اور اگر نادان تھے۔ تو اس نادانیت کی بھی ایک حد ہوتی ہے جو تجربہ کے بعد دور ہو سکتی تھی۔ اور ان حضرات کی حالت سے چوبیس سال تک کوئی صحابی واقف نہ ہو سکا۔ نیا للجب۔

در اصل یہ روایات سبائیوں کی وضع کردہ ہیں طبری نے ان دونوں روایتوں کو

ابو مخنف سے نقل کیا ہے۔ یہ حضرت کون ہیں؟ تو ان کا حال محدثین کی زبان سے۔

ابو مخنف۔ اس کا نام لوط بن یحییٰ ہے۔ یہ روئے زمین پر سب سے پہلا شخص ہے جس نے عربی داستانیں وضع کیں۔ اور انہیں کتابی شکل دی۔ اُس کی کتاب کا نام "مقتل حسین" ہے۔ یہ کتاب سبائیوں کے نزدیک نہایت متبرک سمجھی جاتی ہے۔ مجالس محرم میں اس کتاب کی کہانیاں ہر مجتہد کی زبان پر ہوتی ہیں۔ فن رجال کے امام عبدالرحمان بن ابی حاتم رازی فرماتے ہیں۔ امام یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ ثقہ نہیں ہے۔ میرے والد امام ابو حاتم رازی فرماتے تھے۔ یہ متروک الحدیث ہے۔ المخرج والتعديل ج ۷ ص ۱۸۲۔

حافظ ابن حجر لسان الیزان میں فرماتے ہیں۔ یہ ابو مخنف ایک مؤرخ ہے۔ تاریخ پر اس کی متعدد تالیفات ہیں۔ یہ قابل اعتماد نہیں۔ ابو حاتم وغیرہ اسے متروک قرار دیتے ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں یہ ثقہ نہیں۔ ایک بار فرمایا یہ کچھ نہیں۔ یہ صعق بن زبیر اور جابر جعفی رافضی سے روایات نقل کرتا ہے۔ اس سے مؤرخ مدائج وغیرہ روایات نقل کرتے ہیں۔ مثلاً سے پہلے اس کا انتقال ہوا۔ ابو عبیدہ الأجرى کا بیان ہے کہ میں نے ابو حاتم رازی سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ وہ ہاتھ جھاڑ کر کہنے لگے۔ کہ اس جیسے شخص کے بارے میں بھی کوئی سوال کیا جاتا ہے؛ یعنی یہ تو اس قابل بھی نہیں کہ اس کے بارے میں کوئی سوال کرے۔ عقیلی نے اس کا کتاب الضعفاء میں ذکر کیا ہے۔ ابن عدی کامل میں فرماتے ہیں یہ تو آگ لگانے والا شیعہ ہے۔ اور شیعوں ہی کا مؤرخ ہے۔ لسان الیزان ج ۲ ص ۴۹۲۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۴۱۹۔

گویا اس روایت کا تمام تر دار و مدار ابو مخنف لوط بن یحییٰ پر ہے۔ اور وہ خالص شیعہ اور ناقابل اعتبار ہے۔ اور پہلی روایت جو مودودی صاحب نے نقل کی ہے۔ اس میں ابو مخنف نے اوپر کے کسی راوی کا نام ذکر نہیں کیا۔ اس کا انتقال مثلاً کے قریب ہوا۔ اور واقعہ مثلاً کا بیان کر رہا ہے۔ اُس وقت تک تو اس کے ان بھی عالم وجود میں نہ آئے ہوں گے۔

اس لفظ سے جو روایت مودودی صاحب نے نقل کی ہے۔ اسے تو خالص ابو مخنف کی گپ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

پھر طبری نے بھی اس گپ میں کچھ اضافہ ہی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم سے یہ واقعہ ابو مخنف نے بیان کیا۔ حالانکہ طبری ۱۲۴ھ میں پیدا ہوا۔ اور ابو مخنف ۱۰۰ھ سے پہلے مر گیا۔ بالفاظ دیگر طبری یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں نے یہ کہانی پیدائش سے پچھن سال قبل سنی تھی۔ ایسی روایات کو تو وہی شخص قبول کر سکتا ہے۔ جس کے ذہن کو شیعیت نے مادف کر کے رکھ دیا ہو۔ کوئی سمجھ دار انسان ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔

اگر مودودی صاحب کا کوئی حامی یہ کہے کہ ہو سکتا ہے کہ طبری نے یہ روایت ابو مخنف کی کسی کتاب سے نقل کی ہو، تو اول تو جناب اوپر کے راوی کہاں ہیں۔ اور اس صورت میں طبری کو اس بات کی وضاحت کرنی چاہیے تھی کہ ہم نے ابو مخنف کی فلاں کتاب سے نقل کی ہے طبری کا یہ کہنا کہ ہم سے ابو مخنف نے بیان کیا۔ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طبری نے یہ روایت خود ابو مخنف سے سنی ہے۔ جو ایک کھلا جھوٹ ہے۔ اور اس سے طبری کا جھوٹا ہونا اور روایات وضع کرنا ثابت ہوتا ہے۔

طبری کو اگرچہ امت مسلمہ کے بیشتر علمائے ثقہ اور امام تسلیم کیا ہے۔ لیکن اس امر کو وہ بھی قبول کرتے ہیں کہ جنہلی علماء اس کے سخت مخالف تھے۔ اور جو علماء طبری کے ہم نوا ہیں وہ بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ان میں تھوڑا سا تشیع پایا جاتا تھا۔ اگرچہ اکثر علماء نے ان کی دکالت کی کوشش کی ہے۔ اور مودودی صاحب نے تو دکالت کا پورا پورا حق ادا کیا ہے۔ لیکن بعض علماء یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ امامیہ کا امام تھا۔ اور حافظ سلیمانی نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ یہ رافضیوں کے لئے روایات وضع کیا کرتا تھا۔ میزان الاعتدال ج ۳ ص ۲۹۸۔ لسان المیزان۔

ہم اگر ان تمام امور کو نظر انداز کر دیں تو اس سے بڑا جھوٹ کیا ہو گا کہ طبری اس شخص کے

بار۔ میں جو اس کی پیدائش سے پچیس سال قبل مرچکا یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے مجھ سے یہ روایت بیان کی۔ حالانکہ طبری کے جتنے مداحین ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ طبری ۲۲۴ یا ۲۲۵ میں طبرستان میں پیدا ہوئے۔ اور ۲۳۶ میں حصول علم کے لئے سفر شروع کیا۔ جب کہ ان کی عمر اہرہ دس سال تھی۔ اور ابو مخنف کو قہ کا باشندہ تھا۔ اس سے ملاقات تو اسی وقت ممکن تھی جب یہ کم زکرت ۲۳۶ تک زندہ رہتا۔ جب کہ یہ حضرات خود ہی یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ابو مخنف کا انتقال ۲۳۶ سے قبل ہو چکا۔ عقل حیراں ہے کہ اس حماقت کو کیا کہئے۔

یہ تو سہی۔ روایت کا حال تھا جو علامہ مودودی نے نقل کی تھی۔ دوسری روایت جسے ہم نے نقل کیا۔ اور جو پہلی روایت کے فوراً بعد ہے۔ اور جسے مودودی صاحب نے عمدۃ القائل نہیں کیا۔ کیونکہ اس سے حضرت علی کا حال ظاہر ہو رہا تھا۔ اب اس کا حال بھی ملاحظہ فرمایا جائے۔

طبری نے یہ روایت ابو مخنف سے نقل کی ہے۔ ابو مخنف نے عبدالرحمان بن جندب سے اور عبدالرحمان نے جندب الازدی سے۔ گویا اس روایت کی ابو مخنف نے سند بیان کی ہے۔ لیکن طبری نے تب بھی بے پرکی اڑائی کہ اس روایت کا ابو مخنف سے اپنا سننا بیان کیا۔ راوی درمیان سے تب بھی حذف ہوئے اور اس کے مجرم طبری ہیں۔ یہ ابو مخنف کا یہ دھوٹی کہ یہ روایت عبدالرحمان بن جندب سے مروی ہے۔ تو حافظ ابن حجر عبدالرحمان بن جندب کے بارے میں لکھتے ہیں۔ یہ مجہول ہے۔ لسان المیزان ج ۲ ص ۴۰۸۔

جہاں تک جندب الازدی کا تعلق ہے۔ تو وہ واقعہ اس وقت کا بیان کر رہا ہے۔ جب قرآن اٹھائے گئے اور جنگ بند ہو گئی۔ حالانکہ حافظ ابن حجر ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ابو عبیدہ کا بیان ہے کہ یہ جنگ صفین میں قتل ہوئے۔ تقریب ص ۵۷۔

قرآن جلئے اس داستان کے کہ طبری سے ابو مخنف یہ روایت اپنی موت کے پچیس

سال بعد اگر بیان کرتا ہے۔ اور جنذب الازدی اپنے قتل کے چند دن بعد اگر حالات کا مشاہدہ کرتا اور پھر بعد میں اپنے بیٹے عبدالرحمان سے آکر بیان کرتا ہے۔ یہ ہے اُن روایات کا حال جو بقول مودودی صاحب طبری نے چھان پھٹک کر نقل کی ہیں۔

آئیے اب ہم طبری کی ایک اور کہانی پیش کئے دیتے ہیں۔ جو اسی مضمون سے متعلق ہے۔ اور طبری نے اسے بھی ابو مخنف سے سنا ہے۔ اور طبری میں یہ تینوں روایات اسی ترتیب سے موجود ہیں۔ جس ترتیب سے ہم نے انہیں نقل کیا ہے۔

ابو مخنف نے فضیل بن حدّج الکندی کے ذریعہ قبیلہ نخع کے ایک شخص سے نقل کیا ہے کہ اس نے دیکھا کہ ابراہیم بن الاشر مصعب بن زبیر کے پاس گئے۔ مصعب نے کہا جس وقت لوگوں نے حضرت علیؑ کو حکیم پر مجبور کیا۔ میں بھی حضرت علیؑ کے پاس تھا۔ ان لوگوں نے حضرت علیؑ کو مجبور کیا۔ کہ کسی شخص کو بھیج کر اشتر کو میدان سے واپس بلائیے۔ مصعب کہتے ہیں کہ حضرت علیؑ نے یزید بن ابی السبیعی کو اشتر کے پاس روانہ کیا۔ اور کہلویا فوراً میرے پاس آؤ۔ قاصد نے یہ پیغام اشتر کو پہنچا دیا۔ اشتر نے جواب دیا کہ میری جانب سے حضرت علیؑ سے کہنا یہ وقت ایسا نہیں ہے۔ جس میں آپ مجھے میری جگہ سے ہٹائیں۔ آپ قطعاً جلدی نہ کیجئے۔ کیونکہ مجھے امید ہے کہ میں فتح حاصل کروں گا۔ یزید بن ابی واپس آیا۔ اور حضرت علیؑ کو اس جواب سے مطلع کیا۔

اس پر ایک شور و شر بلند ہوا۔ اور اشتر کے بارے میں لوگ چیخنے لگے۔ اور حضرت علیؑ سے کہا خدا کی قسم ہمیں یقین ہے کہ تو نے ہی اسے جنگ جاری رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت علیؑ نے فرمایا تمہارے لئے یہ رائے قائم کر لینا مناسب نہیں۔ کیا تم نے مجھے اس سے سرگوشیاں کرتے دیکھا ہے۔ کیا میں اشتر سے تمہارے سامنے اعلانیہ گفتگو نہیں کرتا؟ کیا جب میں اُس سے باتیں کرتا ہوں تم نہیں سنتے؟ ان لوگوں نے جواب دیا یا تو آپ آدی بھیج کر اسے فوراً بلوائے۔ ورنہ اللہ کی قسم ہم تجھے معزول کر دیں گے۔



حضرت علیؑ نے یزید بن ابی بنی سے کہا اے یزید اشتر سے جا کر کہو کہ فوراً میرے پاس آجائے۔ یہاں فتنہ پیدا ہو چکا ہے۔ یزید نے اشتر کو یہ پیغام پہنچایا۔ اشتر نے سوال کیا کیا قرآن اٹھانے کی وجہ سے فتنہ پیدا ہوا ہے۔ یزید نے جواب دیا ہاں؛ اشتر نے کہا میں تو پہلے ہی جب قرآن اٹھائے گئے تھے سمجھ گیا تھا کہ عنقریب زنا انقلاب اور نئی فرقہ بندی پیدا ہوگی۔ کیونکہ یہ عاہرہ کے بیٹے کا مشورہ ہے۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ اللہ نے ہمارے لئے کیا عیب سے مدد فرمائی ہے؛ کیا مناسب ہے کہ ایسے وقت میں دشمنوں کو چھوڑ کر میدان سے واپس لوٹ جاؤں۔ یزید نے جواب دیا کیا تو یہ چاہتا ہے کہ یہاں میدان جنگ میں تو کامیابی حاصل کرے۔ اور وہاں امیر المؤمنین ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں کہ یا تو ان کی فوری مدد کی جائے۔ یا انہیں بھی دشمنوں کے سپرد کر دیا جائے۔ اشتر نے جواب دیا اللہ کی قسم یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ (سبحان اللہ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے) یزید نے کہا شیعیان علیؑ تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یا تو آپ کسی شخص کو بھیج کر اشتر کو فوراً واپس بلا لیجئے۔ ورنہ ہم تجھے بھی اسی طرح قتل کر دیں گے۔ جیسے ہم نے ابن عفان کو قتل کیا ہے۔ اشتر یہ سن کر فوراً واپس ہوا۔ اور ان لوگوں کے پاس پہنچا۔ اشتر نے ان لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

اے عراقریب، اے ذلیل اور بزدلو! کیا تم نے قوم کی پشت کو نیچا کر دکھایا کیا تم یہ سمجھتے و تم شایموں کے مقابلے میں زبردست ہو۔ ان لوگوں نے جو قرآن اٹھائے ہیں، اور قرآن فیصلہ پر عمل پیرا ہونے کی دعوت دے رہے ہیں تو اللہ کی قسم انہوں نے خود اللہ کے ان حکام کو چھوڑ رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کتاب میں نازل فرمائے ہیں۔ یہ اس سنت خدا ناک میں جو بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی۔ تم ان کی اس دعوت کو ہرگز قبول نہ کرو۔ درکم از کم مجھے اتنی دیر کی جہلت دیدو۔ جتنی دیر میں گھوڑا رک جاتا ہے۔ (ابن اثیر میں ہے) سن دیر میں اونٹنی کا درد دھ دھ جاتا ہے کیونکہ مجھے فتح سامنے نظر آرہی ہے۔

اس روایت کے آخر میں ہے (ان لوگوں نے اشتر سے کہا ہم نہ تیرے بیٹے ہیں۔

نہ تیرے امیر کے مطیع ہیں تو ہم سے علیحدہ ہو جا۔ تاریخ طبری جلد سوم ج ۲ ص ۳۶۲  
 اس روایت میں بھی وہی اختلاف کی کہانی نقل کی گئی ہے۔ لیکن اس روایت سے یہ  
 بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت علیؓ ان لوگوں میں بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ انہیں قدم قدم  
 پر حضرت عثمانؓ کی طرح قتل کرنے کی دھمکیاں دی جاتی تھیں۔ ان کا اپنا کوئی فیصلہ نہ تھا۔  
 فیصلہ وہ ہوتا جو شیعیان علیؓ کرتے۔ حتیٰ کہ حضرت علیؓ کسی سے تنہائی میں مشورہ بھی نہیں  
 کر سکتے تھے۔

اس روایت میں اشتر نے حضرت عمرو بن العاصؓ پر ایک نیا الزام بھی قائم کیا ہے۔ ان  
 کی والدہ کو غاہرہ (بدکارہ) قرار دیا ہے۔ یعنی حضرت عمرو بن العاصؓ ناجائز اولاد میں۔ اور  
 پھر یہ جبیست قرآن پر چلنے کا دعویٰ کر رہا ہے حالانکہ از روئے قرآن تو اس پر اس الزام کے  
 جرم میں حد قذف جاری ہونی چاہیے تھی۔ افسوس تو یہی ہے کہ مودودی صاحب نے  
 شیعہ نوازی میں قرآن اور فقہ سب کو بھلا دیا۔

سب سے زیادہ حیرت تو اس پر ہے کہ اشتر ایک تابعی ہے۔ اور صحابہ کے بارے  
 میں یہ کہہ رہا ہے کہ وہ قرآن پر عمل نہیں کرتے۔ یہ وہ شخص ہے کہ جس نے اہل کوفہ کو حضرت  
 عثمانؓ کے خلاف اکسایا۔ اور ان کی ٹولی لے کر مدینہ پہنچا اور امیر المؤمنین عثمانؓ کو شہید کرایا۔  
 عراقیوں اور شیعہوں کی اصل طاقت یہی ہے۔

اس روایت کا راوی بھی وہی ابو مخنف ہے۔ یہ روایت بھی طبری نے اس سے سنی  
 ہے۔ (غالباً کشف قبر کے ذریعہ)۔ ابو مخنف نے اسے فضیل بن غزّاج سے نقل کیا ہے۔ جو  
 اسی اشتر کا غلام تھا۔ لیکن یہ مجبوس شخص ہے۔ اس کا کچھ حال معلوم نہیں۔ اور یہ قبیلہ نخع کے  
 ایک نامعلوم شخص سے نقل کرتا ہے۔ اور وہ مصعب بن زبیر سے۔ اور وہ اپنا مشاہدہ  
 بیان کر رہے ہیں۔

مصعب بن زبیر حضرت زبیر بن العوامؓ کے صاحبزادے ہیں۔ حضرت زبیرؓ اور ان

کے بڑے صاحبزادے عبداللہ بن زبیر جنگ جمل میں حضرت علیؓ کے مد مقابل تھے۔ ان کی بقیہ اولاد نے ان جنگوں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ یہ میدان صفین میں کیسے پہنچ گئے تھے۔ تاریخ اس کا نام نہیں کہ تاریخ میں سے صرف ایک پہلو کو پیش کر دیا جائے جو لکھنے والے کی منشا کے مطابق ہو اور دیگر واقعات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسے شخص کو ہرگز بھی مورخ نہیں کہا جاسکتا۔

پھر مودودی صاحب کو یہ بھی سوچنا چاہیے تھا کہ جہاں تک صحابہ کرام کا تعلق ہے تو انہیں صرف تاریخی نقطہ نگاہ سے دیکھنا اور پھر اس کے مطابق فیصلہ کرنا، ایسی حرکت ایک سبائی ہی کر سکتا ہے۔ لیکن اہل سنت تو پہلے انہیں قرآن کی نظر سے دیکھیں گے اور اس لحاظ سے بھی اُن پر نظر ڈالی جائے گی۔ کہ یہ حضرات حضورؐ کی صحبت میں رہنے کی وجہ سے جہاں علم و فضل اور تزکیہ نفس میں اعلیٰ درجہ پر پہنچے ہوئے تھے۔ یہ دین اسلام اور قرآن و سنت کے اصل شاہد بھی ہیں۔ جب ان کی ذات پر حرف آجائے گا تو یہ شہادت باطل ہو جائے گی۔ نہ کتاب اللہ باتی رہے گی اور نہ سنت رسولؐ، پھر یہ حضورؐ کے تربیت یافتہ ہیں۔ جب یہی حضرات قرآن سے جاہل اور دین سے ناواقف ہوں گے تو پھر کتاب اللہ اور سنت رسولؐ کو جاننے والا کون ہوگا؟ اور کیا اس سے یہ ثابت نہ ہوگا کہ حضورؐ کسی شخص کی بھی صحیح طور پر تربیت نہ کر سکے۔

در اصل ان سبائیوں نے صحابہ کرام کے خلاف طرح طرح کی کہانیاں وضع کیں تاکہ آہستہ آہستہ یہ زہرزد ہنوں میں سرایت کر جائے۔ تو پھر قرآن و سنت کے انکار میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ افسوس تو یہی ہے کہ مودودی صاحب جیسی ہستی بھی ان کا شکار بن گئی۔ کاش وہ شیعہ مذہب کی کتابوں کا مطالعہ کر لیتے۔ یا طبری اور دیگر مؤرخین پر اُنکھیں بند کر کے ایمان نہ لاتے۔ اللہم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ۔

چلے نہ سہ کہ اتنی بک زاریہ عمر زبیر ان سے قرآن سے پاس ملد مرانہ کیا مامل

اور ان کے پیش نظر وہی مقصد تھا جو ابو مخنف اور اس کے ہم نوا مودودی صاحب نے بیان کیا۔ لیکن شاید انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس سے قبل جنگ جمل میں ۳۱ میں قرآن اٹھایا گیا۔ اور اس کی ابتدا حضرت علیؑ نے فرمائی تھی۔ اگر یقین نہیں آتا تو اپنے محبوب مورتی طبری سے سن لیجئے طبری لکھتا ہے۔

حضرت علیؑ نے اپنے ساتھیوں سے فرمایا۔ تم میں سے کوئی شخص اپنے آپ کو اس کام کے لئے پیش کر سکتا ہے کہ وہ قرآن اٹھا کر فریقین کے درمیان کھڑا ہو جائے اور انہیں قرآن پڑھنے کی دعوت دے۔ اگر اس کا وہ ہاتھ کاٹ دیا جائے تو دوسرے ہاتھ میں قرآن لے لے۔ اور اگر دوسرا ہاتھ بھی کاٹ دیا جائے تو قرآن دانتوں سے تھام لے۔ ایک نوجوان نے اس کام کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا۔ حضرت علیؑ کی خواہش تھی کہ کوئی اور شخص اس کام کو انجام دے۔ اس لئے آپ تمام لشکر میں گھومے اور ہر ایک کے سامنے یہ بات پیش کی۔ لیکن اس نوجوان کے علاوہ کوئی بھی اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنے کے لئے تیار نہیں ہوا۔

حضرت علیؑ نے اس نوجوان سے فرمایا یہ قرآن ان کے سامنے پیش کر دو۔ امدان سے کہو کہ قرآن اول سے آخر تک ہمارے اور تمہارے خونوں کا فیصلہ کرے گا لیکن مخالفین کے شکر نے اس نوجوان پر حملہ کر دیا۔ قرآن اسکے ہاتھ میں تھا۔ انہوں نے اس کے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے تو اس نے قرآن دانتوں سے تھام لیا۔ حتیٰ کہ یہ نوجوان شہید کر دیا گیا۔ اس پر حضرت علیؑ نے فرمایا اب تمہارے لئے جنگ حلال ہو گئی ہے۔ تم ان سے جنگ کر دو۔ اس روز ستر آدمی۔ اونٹ کی ہار (حضرت عائشہؓ کا اونٹ) تھامے ہوئے مارے گئے۔ جب اونٹ کی کوچیں کٹ گئیں اور لوگوں کو شکست ہوئی تو حضرت طلحہؓ کے ایک تیراگر لگا جس سے وہ شہید ہو گئے۔

طبری نے یہ واقعہ مختلف جگہوں پر بیان کیا ہے۔ ہم نے اسے صرف ایک جگہ پر

کی ہے اس کے بارے میں طبری فرماتے ہیں کہ یہ روایت مجھے سری بن اسمعیل نے لکھ کر بھیجی۔ بے شک ضرور بھیجی ہوگی۔ لیکن عالم قبر سے۔ اس لئے کہ سری۔ امام شعبی کا شاگرد اور ان کا چچا زاد بھائی ہے۔ امام شعبی کا انتقال ۱۲۰ھ میں ہوا۔ اب اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ سری امام شعبی کے بعد پچاس سال تک زندہ رہا تب بھی طبری ۲۲۴ھ میں پیدا ہوئے۔ اب یہی صورت ہو سکتی ہے کہ جس طرح امام غائب نے اصول کافی لکھ کر عالم غیب سے روانہ کی تھی۔ اسی طرح سری نے بھی یہ روایات عالم غیب سے لکھ کر۔ طبری کے پاس روانہ کی ہوں۔

ہم سبائیوں اور ان کے ہم نواؤں سے یہ دریافت کرنا چاہتے ہیں کہ آخر تاریخ سے صرف امیر معاویہ والا ہی واقعہ کیوں پیش کیا جاتا ہے، جنگ جمل والا واقعہ کس لئے نظر انداز کیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے ان کا کوئی مفاد حاصل نہیں ہوتا جبکہ زیر بحث واقعہ سے امیر معاویہ اور ان کے ساتھیوں کو ہدف بنانے کا موقع ملتا ہے۔ اسی لئے خلافت و سلوکیت میں صرف اسی واقعہ کو پیش کیا گیا۔ اور اس کی سبائی تفصیل بھی پوری حذف کر دی گئی۔ یہ طریقہ کار صرف اس لئے اختیار کیا گیا تاکہ ایک فریق کا تو گھناؤنا فرضی کردار پیش کر کے لوگوں کی نظروں میں ان کی حیثیت گرائی جائے۔ اور وہ امور جن سے حضرت علیؓ کی پوزیشن پر حرف آتا تھا۔ انہیں نظر انداز کر دیا جائے۔ ہم تو اس کے قائل ہیں کہ ہر ایسی روایت جس سے کسی صحابی کا کردار مشکوک ہوتا ہو، یا ان کا فسق و فجور معصیت الہی بددیانتی، خیانت، ظلم اور اقربا و نوازی ثابت ہوتی ہو وہ سب جھوٹ ہیں۔ ان راویوں اور مؤرخوں کو جھوٹا مان لینا آسان ہے۔ لیکن ان صحابہ کے کردار پر حرف لانا جن کے مناقب سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ بہت دشوار عمل ہے۔ یہ تو ہمارے نزدیک سراسر انکار قرآن ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن اٹھانے سے اہل علق میں ہی اختلاف کیوں پیدا ہوا۔ اہل عرب میں کیوں نہ پیدا ہوا جو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ تھے۔ آخر اس کے پس

پردہ کون سارا نہ کار فرما ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ علاقوں کو شکست کا سامنا ہو۔ اور اسے اس  
داستان کے پردے میں چھپایا گیا ہو یا یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت علیؓ کے لشکر میں پہلے سے  
اختلاف پایا جاتا ہو، کیونکہ ان کا لشکر مختلف قسم کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ ان کے ساتھ عرب  
بھی تھے اور عراقی بھی۔ ہو سکتا ہے کہ عراقی اپنی کثرت کے بل بوتے پر عربوں کو اپنا تابع تصور  
کرتے ہوں۔ کیونکہ اس لشکر سے علیؓ ہرگز جوڑ ٹولی سامنے آئی، ماد جو بعد میں خارجی کے  
لقب سے مشہور ہوئے۔ وہ سب عرب تھے، ان کے ساتھ کوئی عراقی، ایرانی اور یہودی  
نہ تھا۔ اور حضرت علیؓ کو بقول مورخین اشتر پر زیادہ بھروسہ تھا۔ جیسا کہ گزشتہ روایات سے  
ظاہر ہوتا ہے، یہ کچھڑی اندرون خانہ پہلے سے پک رہی ہو۔ اور ان کو صرف بہانہ کی ضرورت  
ہو جو ان کو اس وقت میسر آگیا۔ ورنہ اس سے قبل جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ نے بھی  
قرآن اٹھوایا تھا لیکن اس وقت کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ خود طبری کا بیان ہے۔

یہ حال دیکھ کر حضرت عائشہؓ نے کعب بن سور کو حکم دیا کہ سواری سے نیچے اترو،  
اور قرآن اٹھاؤ، اور انہیں کتاب اللہ کی دعوت دو، حضرت عائشہؓ نے اپنا قرآن کعب  
بن سور کو دے دیا۔ کعب قرآن لے کر آگے بڑھے۔ اور مخالفین کے سامنے گئے۔ لیکن  
لشکر علیؓ میں آگے آگے سبائی تھے۔ انہیں برابر یہ خطرہ لاحق تھا کہ صلح نہ ہو جائے کعب  
جب قرآن لے کر آگے بڑھے تو یہ کعب کے سامنے آگئے۔ حضرت علیؓ پیچھے لشکر میں تھے۔  
وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ مخالف جنگ کے علاوہ کسی اور چیز پر تیار نہیں۔ جب کعب نے  
ان کے سامنے قرآن پیش کیا۔ تو ان لوگوں نے انہیں نیزے مار مار کر ختم کر دیا۔ اور حضرت  
عائشہؓ کے ہودج کو تیروں کا نشانہ بنالیا۔ طبری جلد سوم ج ۲ ص ۱۹۳۔

اس واقعہ سے چند امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ دونوں جنگ پسند نہ کرتے تھے۔ اور ہر صورت میں

صلح کے خواہاں تھے۔

۲۔ سبائی یہ چاہتے تھے کہ صلح نہ ہو۔

۳۔ سبائیوں نے جنگِ جمل میں قرآن کا کوئی احترام نہیں کیا۔ کعب بن سور کو قتل کیا۔ اور حضرت عائشہؓ کے ہودج پر تیر برسائے۔ جس سے جنگ چھڑ گئی۔

۴۔ جنگِ جمل میں قرآن اٹھانے سے عراقیوں پر کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا۔ اور نہ ان میں کوئی اختلاف واقع ہوا۔ تو جنگِ صفین میں آخر یہ اختلاف کیوں واقع ہوا۔

۵۔ کیا اس کی یہ وجہ تو نہیں کہ جنگِ جمل میں انہیں اپنی فتح کا یقین تھا۔ اس لئے کوئی اختلاف واقع نہیں ہوا اور کعب بن سور کو قتل کر دیا گیا۔ لیکھ شامیوں نے جب قرآن اٹھائے تو ان میں اتنی قوت ہی نہ تھی کہ انہیں قتل کر سکتے۔ دوسری جانب وہ عربوں کی صلح بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔ لہذا سوچی سمجھی اسکیم کے تحت۔ آپس میں اختلاف پیدا کر کے جنگ سے جان چھڑائی۔ اور الزام امیر معاویہؓ اور ان کے ساتھیوں کے سر رکھ دیا۔ اگر واقعہً یہ ایسے ہی ایماندار اور باادنا ہوتے تو حسنؓ امیر معاویہؓ سے صلح کر کے ان سے اپنی جان کیوں چھڑاتے۔

۶۔ امیر معاویہؓ کے پیش نظر اس عمل سے وہی مقصد تھا۔ جو حضرت حسنؓ کی صلح سے قبل تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ جب ادھر کے لوگ بھی ختم ہو جائیں گے اور ادھر کے افراد بھی ختم ہو جائیں گے۔ تو یو اؤں کا معاملہ کس طرح حل ہوگا۔ مقتولین کے چھوڑے ہوئے اموال کا کون بندوبست کرے گا؟ (ج ۲) یہی فکر اس وقت بھی دامن گیر ہوگی۔

ہاں، ہم مودودی صاحب سے یہ سوال ضرور کریں گے کہ آپ یہاں ذرا۔ نیزے پر تر آن اٹھا کر تو دکھائیں۔ چلے آپ ایک نوک دار چھری پر اپنے گھر ہی میں قرآن اٹھانے کی مشق فرما لیں آپ کو حقیقت کا خود اندازہ ہو جائے گا۔ یہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ نیزے کو قرآن پر مار کر اس کے عین درمیان میں داخل نہ کر دیا جائے۔ طبری اور ابو مخنف نے جہاں

اور تلشہ دکھائے ہیں۔ وہاں یہ تماشا بھی عجیب ہے۔ کہ جنگ جمل میں تو قرآن ہاتھوں میں اٹھوایا۔ پھر اٹھانے والوں کو شہید کر دیا۔ لیکن جب امیر معاویہ کا معاملہ آیا۔ تو قرآن نیزوں پر اٹھوایا گیا۔ اس لئے کہ عراقی شایموں کے قتل کی طاقت ہی نہ رکھتے تھے۔ اسی لئے اختلاف اسیانہ تلاش کیا گیا۔

ہمارے قارئین ذرا یہ بھی سوچ لیں کہ جنگ جمل کے وقت حضرت علیؑ اور حضرت امیرؑ کو اٹھانے کے لئے صرف ایک قرآن دستیاب ہوا۔ جب کہ امیر معاویہ کے بہت سے قرآن اٹھائے ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ شایموں میں سے ہر ایک کے پاس قرآن موجود تھا۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ شامی سب ہی قرآن کی تلاوت کرتے اور عربی بڑے سمجھتے ہوں گے۔ نہ کہ اشتر جیسے تخریب کار۔

ہماری اس تحریر سے جہاں تاریخ کا سیاہ رخ ہمارے سامنے آیا۔ وہاں یہ بات بھی کھل گئی کہ علامہ مودودی نے ”خلافت و ملکیت“ میں دل و جان سے سبا تیوں کی وکالت کیا ہے۔ اسی لئے انہوں نے امام ابن العربی، امام ابن تیمیہ، امام ابن حزم، شاہ ولی اللہ اور علامہ عبد العزیز کی کتاب سے استفادہ کرنا پسند نہیں کیا۔ کیونکہ بقول مودودی صاحب یہ سنت اہل سنت کے وکیل صفائی ہیں۔ اور مودودی صاحب نے سبا تیوں کی وکالت نہیں کی۔ وہ رکھی تھی۔ اب وہ وکیل صفائی کی بات کیسے برداشت کرتے۔ لیکن ہم تب بھی ان کے شکر گزار ہیں کہ نہ وہ کتاب تحریر فرماتے اور نہ اہل سنت کی آنکھیں کھلتیں۔



## سیدۃ النساء کون؟

متقدمین علمائے اہل سنت میں یہ مسئلہ مختلف فیہ رہا ہے کہ اس امت کی عورتوں میں سب سے زیادہ افضلیت کسے حاصل ہے۔ بعض حضرات اس کے قائل ہیں کہ سبقت اسلام اور حضور کے ساتھ مصائب برداشت کرنے کے سبب ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کو سب پر فضیلت حاصل ہے، بعض حضرات ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو فضیلت دیتے ہیں۔ اور بعض حضرات اس میں اس طرح تطبیق دیتے کہ سبقت اسلام کے باعث ام المؤمنین حضرت خدیجہؓ کو، اور بلحاظ علم ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو فضیلت حاصل ہے۔ تمام ائمہ محدثین اور فقہاء ان تین مسلکوں میں سے ایک نہ ایک مسلک کے قائل ہیں۔ متقدمین میں سے کوئی اس کا قائل نہ تھا کہ حضرت فاطمہؓ کو ان اہیات المؤمنین میں سے کسی پر فضیلت حاصل ہے۔ سبائیل کا مسلک اس سلسلہ میں ہمیشہ جداگانہ رہا ہے۔ ان کے نزدیک پنج تن اس دنیا کی مٹی سے پیدا ہی نہیں ہوئے۔ بلکہ ان یا پانچوں کا مادہ نور الہی ہے۔ اور حضرت فاطمہؓ جنت کے اُس سیب کھانے کے باعث پیدا ہوئی تھیں۔ جو حضور نے معراج میں کھایا تھا۔ اور پھر اگر حضرت خدیجہؓ سے ہم بستر ہوئے جس سے حضرت فاطمہؓ عالم وجود میں آئیں۔ سبائیل کا دعویٰ ہے کہ انہیں نہاتون جنت اسی لئے کہا جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت خدیجہؓ معراج سے قبل انتقال فرما چکی تھیں۔ اب یہ ان ہی سے پوچھئے کہ حضرت فاطمہؓ کس کی اولاد ہیں؟

نیز معراج ہجرت سے ایک سال قبل واقع ہوئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہوا کہ حضرت فاطمہؓ ہجرت سے کچھ روز پیشتر پیدا ہوئیں۔ اور شادی کے وقت اُن کی عمر تین سال و چھ مہینے

سلاں تھی۔ اگر آپ سبائیوں کے اس مفروضہ کو تسلیم نہ کریں گے۔ یا آپ کو اس میں کوئی شکال واقع ہوا۔ تو یہ آپ حضرات جانیں اور سبائی جانیں، ہاں اس کا نتیجہ یہ ضرور برآمد ہوگا کہ حضرت فاطمہؓ خاتونِ جنت باقی نہ رہیں گی۔ اور انہیں خاتونِ جنت باقی رکھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ آپ حضرات اس داستان پر ایمان لے آئیں۔ کیونکہ سنی دہی ہوتا ہے جو ہر سنی سنائی بات پر ایمان لے آئے۔

ہمارے نزدیک اس قسم کی تمام روایات جہاں موضوع ہیں۔ وہاں وہ صرف اس مقصد کے لئے وضع کی گئی ہیں کہ اہل سنت حضرات کو ان کے صحیح مسلک سے ہٹا کر انہیں داستانوں میں گم کر دیا جائے۔ ورنہ خود ان سبائیوں کے نزدیک سیدہ النسا حضرت فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہیں، بلکہ فاطمہ بنت اسد مراد ہیں۔ اس کی تشریح ہم آخر مضمون میں پیش کریں گے۔

اس وقت ہمارا روئے سخن اہل سنت حضرات کی جانب ہے۔ ایک جانب تو وہ اس کے دعویدار ہیں کہ تمام جہاں میں سب سے افضل حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہؓ ہیں۔ دوسری جانب وہ حضرت فاطمہؓ کو سیدۃ النساء العالمین اور سیدۃ النساء اہل الجنۃ کے خطابات سے نوازتے ہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا کوئی خطبہ اس ذکر سے خالی نہیں ہوتا۔

اس سلسلہ میں اہل سنت تضاد کا شکار ہیں۔ جس کی وجہ اول تو یہ ہے کہ سبائی پروپیگنڈہ مشنری جو چودہ سو سال سے یہ راگ الاپتی آرہی ہے۔ تو اس طویل پروپیگنڈے کے باعث ہم ذہنی طور پر خود سبائی بن چکے ہیں۔ دوسری جانب ہم میں روایت پرستی کا مادہ اتنی گہری جڑ پکڑ چکا ہے کہ ہم کسی روایت پر غور کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور پھر بخاری و مسلم کی ایک روایت نے اس تخیل کو مزید گہرائی عطا کر دی ہے۔ اور ان حضرات نے یہ تصور کر لیا ہے کہ بخاری و مسلم کی کسی روایت میں کسی غلطی کا کوئی امکان نہیں۔ اور یہ تک نہیں سوچتے کہ یہ حضرات انسان تھے خواہ وہ اپنی جانب سے صحت کی کتنی بھی سعی کریں لیکن انسان

ہونے کے سب غلطی اور بھول سب کچھ ممکن ہے۔

پھر ان دونوں حضرات نے یہ روایات بہر صورت انسانوں سے نقل کی ہیں اور ان میں سے ہر راوی کے ساتھ غلطی اور بھول کا امکان ہے۔ اور عام طور پر بخاری و مسلم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان چار پانچ راوی ہوتے ہیں۔ گویا کہ پانچ احتمالات تو بھول کے پیدا ہوئے۔ اور پانچ احتمالات خطا کے پیدا ہوئے۔ اس طرح کوئی روایت دس احتمالات سے خالی نہیں ہوتی۔ یہ احتمالات تو اس وقت ہیں جب کہ تمام راوی ثقہ ہوں۔ اور کسی راوی کی ثقافت میں اختلافات پیدا ہو جائے تو مزید احتمالات پیدا ہو جاتے ہیں۔

کاش ہمارے علماء یہ بھی سوچیں کہ ہم جب کسی شخص کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ فلاں شخص معتبر ہے۔ زبردست عالم ہے۔ سچا ہے اور قابل اعتماد ہے، یا فلاں شخص کذاب ہے اور ناقابل اعتبار ہے۔ یہ بھی ہمارا فیصلہ ظنی ہوتا ہے۔ جو کبھی سنی سنائی بالکل پر مبنی ہوتا ہے۔ اور کبھی تجربات پر۔ لیکن یہ ضروری تو نہیں کہ جس کے بارے میں ہم فیصلہ دے رہے ہیں کہ وہ نہایت سچا اور دیندار انسان ہے۔ اس کا ظاہر و باطن یکساں ہو۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ ڈھونگ ہو۔ اسی طرح جب کسی کو کذاب کہا جاتا ہے تو یہ کوئی ضروری نہیں کہ اس نے زندگی میں ہر موقع اور ہر مقام پر جھوٹ ہی بولا ہو۔ کبھی نہ کبھی تو اس نے سچ بات بھی کہی ہوگی۔ یہ امور اس کا بین ثبوت ہیں کہ جب کسی کتاب یا کسی حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ یہ صحیح ہے تو ہمارا یہ فیصلہ بھی ظنی ہوتا ہے۔ قطعی علم تو صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔ اسی لئے تمام فقہاء و محدثین اس کے قائل رہے ہیں کہ قطعی شے تو صرف کتاب اللہ ہے۔ اور احادیث جتنی بھی ہیں ظنی ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی حدیث میں ظن زیادہ پایا جاتا ہے۔ اور کسی میں کم۔ جس حدیث میں ظن کم پایا جائے گا۔ اس کے بارے میں اغلب گمان صحت کا ہوگا۔ اور جس میں زیادہ پایا جائے گا۔ اس میں اغلب گمان ضعف کا

ہوگا۔ دنیاوی امور میں بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ بلکہ یہ کاروبار عالم طغیانیات پر چل رہا ہے۔ اس سر پر ایک اور طرح غور کیجیے کہ ایک راوی ایسا ہے۔ جس کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض محدثین اسے ثقہ اور معتبر قرار دیتے ہیں اور بعض نامعتبر بعض حضرات کو اس کا تجربہ ہے۔ اور بعض حضرات دوسروں کے فیصلے کو دیکھتے ہوئے ایک فیصلہ دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں طبقوں میں سے کسی کو مجرم قرار نہیں دے سکتے۔ لیکن یہ صورت دوسروں کو بھی فیصلے کا حق باقی رہے گا۔

لیکن آج کے دور میں ہمارے علماء اپنی کم علمی کے باعث۔ حدیث، فقہ، تفسیر اور دیگر مضامین کی تمام روایات پر آنکھیں بند کر کے ایمان لے آتے ہیں۔ اور جو شخص بھی کسی ثقہ یا پرفتن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، علم الروایہ اور علم الدرایہ کے ذریعہ بحث کرتا ہے۔ وہ یا تو منکر حدیث قرار دیا جاتا ہے۔ یا خارجی۔ حالانکہ یہ تمام فنون محدثین کرام نے اسی لئے وضع کئے تھے کہ روایات کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھتے رہو، اور صدیل اس پر عمل ہوتا رہا ہے۔ اور دیگر ممالک اسلامیہ میں آج بھی اس پر عمل ہو رہا ہے۔ لیکن ہندوستان میں یہ ایک زبردست جرم بن چکا ہے۔ کیونکہ ہمارے علماء ان فنون سے خود ناواقف ہیں اور وہ ہرگز یہ برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں کہ ان کی ذات پر لاعلمی کا الزام قائم ہو۔ اس لئے ان حضرات کی لابی نے متفقہ طور پر یہ فیصلہ کر رکھا ہے کہ جہاں بھی کوئی ناک والا نظر آئے، اسے دنیا میں نکو بنا دو۔ جس کے نتیجے میں وہ ہماری جانب انگلی نہ اٹھا سکے۔ اور ہماری دکانداری علی حالہ قائم رہے۔

یہ امور میں اس لئے بیان کرنے پر مجبور ہوا۔ کہ ایک زمانہ میں جب مودودی صاحب کے خلاف کفر کی مشینیں کام کر رہی تھیں، اور ان کے بارے میں مختلف الزامات قائم کئے جا رہے تھے۔ تو میں نے ان الزامات کو کلی طور پر قبول نہیں کیا۔ تو مجھ پر مودودیت کا فتویٰ چسپاں کیا گیا۔ حالانکہ مودودی جماعت مجھے اپنا سب سے بدترین مخالف تصور کرتی تھی۔ جب میں نے پیر کالونی میں درس قرآن کا سلسلہ شروع کیا تو چونکہ وہ ایک اہل حدیث کے گھر

اللہ میں ہوتا تھا۔ اس لئے مجھ پر ایک بہت بڑے شیخ الحدیث نے جواب مرحوم ہو چکے ہیں۔  
غیر مقلد ہونے کا فتویٰ جاری کیا۔ حالانکہ اُسی دور میں غیر مقلدین اور غریبائے اہل حدیث  
نے میری تقاریر سن کر مجھے وکیل الیٰ حنیفہ کا خطاب دیا۔

موجودہ دور میں بعض حضرات نے صرف اس بنا پر کہ میں نے بعض داستانوں اور روایات  
پر جرح کی ہے مجھے منکر حدیث قرار دیا۔ اور ایک اور شیخ الحدیث نے فرمایا کہ حبیب الرحمن  
کا نلال شخص سے دوستانہ ہے اور وہ خارجی ہے۔ لہذا حبیب الرحمن بھی خارجی ہے حالانکہ  
اس خارجیہ کے مسئلہ میں میری ان حضرات سے کافی تیز گفتگو ہو چکی تھی جن پر خارجیہ کا  
الزام ہے۔ اب میں نہیں جانتا کہ میں کیا ہوں، اس کا فیصلہ تو قارئین کرام ہی کر سکیں گے کہ میں  
واقعاً کیا ہوں۔ ہاں یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ میں کسی صحابی کی شان میں گستاخی برداشت  
نہیں کر سکتا اور نہ کسی ایسی روایت کو قبول کرنے کے لئے تیار ہوں کہ جن میں صحابہ کرام کی  
جانب ایسی باتیں منسوب کی گئی ہوں کہ جن سے ان کی اُس عظمت پر فرق آتا ہو جو قرآن نے  
ان کے متعلق بیان کی ہے۔ میں صحابہ کو تاریخ یا روایات کے آئینہ میں دیکھنے کے لئے تیار  
نہیں۔ میں تو انہیں قرآن کے آئینہ میں دیکھتا ہوں جو ان کے فضائل سے معمور ہے۔

موجودہ علماء کا علمی مقام یہ ہے کہ ایک صاحب نے میرے سامنے موضوعات کبیر  
کو موضوعات شریف سے تعبیر کیا۔ اور فرمانے لگے یہ روایت موضوعات شریف میں پائی  
جاتی ہے۔ حالانکہ موضوعات کبیر ملا علی قاری کی وہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے مشہور  
عام روایات کو نقل کر کے ان کا جھوٹا اور موضوع ہونا ثابت کیا ہے۔ غالباً ان حضرات نے  
اس کتاب کا صرف نام ہی سنا تھا کبھی زیارت شریف نصیب نہیں ہوئی تھی۔

اکثر بڑے بڑے علماء جو شیخ الحدیث کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ وہ متعدد جگہ حوالہ  
میں لکھتے ہیں کہ اس حدیث کو ابن ابی عدی نے روایت کیا ہے۔ حالانکہ وہ اپنی کتاب میں صرف  
وہ روایات نقل کرتے ہیں جنہیں وہ قابل اعتقاد تصور نہیں کرتے۔ جو بھی روایت وہ پیش

کرتے ہیں۔ وہ ان کے نزدیک قطعاً صحیح نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس روایت کو پیش کر کے ثبات کرنا چاہتے ہیں کہ فلاں ماوی ہمارے نزدیک ضعیف ہے۔ اور اس کی وجہ یہ منکر روایت ہے۔ جب علماء کی لاعلمیت کا یہ حال ہو تو عوام بے چاروں کا کیا حشر ہوگا؟ اسی وجہ سے میں عوام کو قابض مواخذہ تصور نہیں کرتا۔ اصل مجرم تو ہمارے نام نہاد علماء ہیں۔

اب آئیے۔ اُس اصل حدیث کی جانب جس کے باعث ہمارے علماء کو مغالطہ واقع ہوا۔ اور جس کی وجہ سے حضرت فاطمہؓ کو سیدۃ النساء اہل الجنة قرار دیا گیا۔ یہ حدیث بخاری و مسلم میں پائی جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جب علامات شروع ہوئی۔ تو ازواج مطہرات ہر وقت آپ کے پاس رہتیں۔ اور ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے جدا نہ ہوتیں۔

ایک دن آپ کو دیکھنے کے لئے فاطمہؓ آئیں۔ فاطمہؓ کی چال ڈھال بالکل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ تھی۔ آپ نے جب انہیں دیکھا تو رجاء کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ اور ان کو دائیں یا بائیں جانب بٹھالیا۔ پھر ان سے کچھ سرگوشی فرماتے رہے جس پر حضرت فاطمہؓ رونے لگیں۔ آپ نے پھر دوبارہ سرگوشی فرمائی تو فاطمہؓ ہنسنے لگیں۔ میں نے اپنے دل میں خیال کیا کہ آج آپ نے اپنی ازواج کو چھوڑ کر بیٹی سے ایسی کیا خاص بات کی ہے۔ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کھڑے ہو گئے۔ تو میں نے فاطمہؓ سے سوال کیا۔ تمہاری حضور سے کیا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ انہوں نے جواب دیا میں حضور کا راز انشاء نہیں کر سکتی۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہو گئی، تو میں نے فاطمہؓ سے کہا کہ میرا تم پر حق ہے (یعنی ماں ہونے کا) لہذا تم سے حضور نے جو گفتگو کی تھی، وہ بیان کرو۔ انہوں نے فرمایا اب کوئی حرج کی بات نہیں۔ حضور نے مجھ سے پہلی بار فرمایا تھا کہ جبریل مجھ سے ہر سال ایک بار قرآن آورد کر دیتے، اور اس سال مجھ سے دوبارہ قرآن کا ورد کر دیا ہے۔ لہذا میں مجھنا

ہوں کہ میری موت قریب آگئی ہے۔ ثواب تو اللہ سے ڈرا اور صبر کر۔ میں اس پر رونے لگی۔  
 جب آپ نے میری یہ حالت دیکھی، تو آپ نے مجھ سے دوبارہ سرگوشی فرمائی۔ اور فرمایا  
 اَمَّا تَرْضٰی اَنْ تَكُوْنِ سَيِّدَةً کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو مومنین  
 نَسَاءُ الْمُؤْمِنِیْنَ اور سیدۃ نساء کی عورتوں کی سردار ہو۔ یا اس امت  
 ہذہ الامۃ کی عورتوں کی سردار ہو۔

میں اس بات پر ہنسنے لگی۔ مسلم ج ۲ ص ۲۹۰

بخاری میں آخری الفاظ یہ ہیں۔  
 اَمَّا تَرْضٰی اَنْ تَكُوْنِ سَيِّدَةً کیا تو اس پر راضی نہیں کہ تو خفّی عورتوں  
 نَسَاءُ اَهْلِ الْجَنَّةِ اور نساء المؤمنین کی سردار ہو، یا مومنین عورتوں کی۔  
 المؤمنین۔ بخاری ج ۱ ص ۵۱۲۔

یہ ہے۔ وہ اصل حدیث جسے پیش نظر رکھتے ہوئے ہمارے علماء نے حضرت  
 غاطمہ کو سیدۃ نساء اہل الجنۃ کے خطاب سے نوازا۔ حالانکہ راوی اول تو خود شبہ میں مبتلا  
 ہے کہ آپ کے الفاظ کیا تھے۔ پھر بخاری کے الفاظ جدا گانہ ہیں۔ امہ مسلم کے جدا گانہ۔ بہر صورت  
 ان تین خطابات میں سے، یعنی سیدۃ نساء اہل الجنۃ، سیدۃ نساء المؤمنین اور سیدۃ نساء  
 بذہ الامہ، صرف ایک خطاب تھا جو راویوں کو یاد نہیں رہا۔ اور جب راویوں کو خود ہی شک  
 ہو رہا ہے۔ تو کسی ایک خطاب کو صحیح ماننے کی کیا دلیل ہے؟

صحیح بخاری امہ صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ حضرت جبرائیلؑ ہر سال کتابا  
 قرآن نازل ہو چکا ہوتا اس کا رمضان میں حضور سے ایک بار ورد کرتے لیکن آخر سال  
 جس میں آپ کی وفات ہوئی دوبارہ ورد فرمایا۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۴۲۸

گویا یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو کسی سے مخفی ہو۔ بلکہ اسے ہر کوئی جانتا تھا۔ اور حضور  
 متعدد مواقع پر اس کا اظہار فرما چکے تھے کہ اب میں اللہ تعالیٰ سے ملاقی ہونے والا ہوں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر بھی آپ نے اس کا اظہار فرمایا۔ لہذا یہ کوئی مانکی بات نہیں رہی تھی۔ اور آخری رمضان میں جہاں آپ نے دوبارہ ورد فرمایا تھا۔ وہاں آپ نے بیس دن کا اعتکاف بھی فرمایا تھا اور تراویح کی ابتدا بھی کی تھی۔ لہذا ایسی بات نہ تھی جو حضرت فاطمہؓ سے مخفی رہی ہو۔ رہ گیا خطابات کا مسئلہ، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد صحابہ کے مناقب بیان فرمائے، اور ان کی دینی یا اخروی فضیلت کا اظہار فرمایا۔ انہیں رخصتے الہی اور جنت کی بشار دی۔ لیکن ان حضرات کے سلسلہ میں کسی موقع پر بھی آپ نے اخفا سے کام نہیں لیا۔ آخر حضرت فاطمہؓ کی فضیلت بیان کرنے میں ایسی کون سی رکاوٹ پیش آرہی تھی جو آپ نے خلاف معمول اخفا سے کام لیا؟ اور اس میں ایسی کیا خاص بات تھی جو وفات رسول تک ظاہر نہیں کی جاسکتی تھی؟ یہ کوئی علم باطن کا مسئلہ نہ تھا، جسے ظاہر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اور حضرت فاطمہؓ جھوٹ بھی نہ بول سکتی تھیں، جس کے کھل جانے کا احتمال ہو۔

جہاں تک اس کے راویوں کا تعلق ہے تو اس واقعہ کو ام المومنین حضرت عائشہؓ سے مسروق نقل کر رہے ہیں۔ اور مسروق سے اسے شعبی نے نقل کیا ہے۔ یہ دونوں حضرات تابعی ہیں، ان حضرات کی ذات پر کسی نے کلام نہیں کیا۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ان حضرات کی ذات شک و شبہ سے بالا ہے۔ لیکن شعبی سے اس واقعہ کو نقل کرنے والا فراس بن یحییٰ ہے۔ فراس بن یحییٰ۔ یہ ہمدان کا باشندہ ہے۔ کوفہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ ذہبی لکھتے ہیں۔ کہ اسے متعدد ائمہ حدیث نے ثقہ قرار دیا ہے۔ لیکن امام یحییٰ بن سعید القطان نے اس کی ایک حدیث کو منکر قرار دیا۔ میزان ج ۲ ص ۲۴۳

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں یہ صدوق (سچا) ہے۔ لیکن اسے وہم ہوتا ہے۔ تقریباً ۲۶۴  
اصول حدیث جاننے والے اس بات سے خوب واقف ہیں کہ جب کسی راوی کو معتبر قرار دیا جاتا ہے تو اس کے لئے درجات کے لحاظ سے مختلف الفاظ کا استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً حادق، حجة، ثبت، ثقہ، ثقہ دوبار، ثقہ ایک بار اور صدوق وغیرہ۔ ان میں سب سے کم درجہ



کا لفظ صدوق ہے۔ ابن حجر نے فراس کے لئے یہی لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ ایسے راوی پر لولا جاتا ہے جس کے ناقابل اعتبار ہونے کا کوئی ثبوت موجود نہ ہو۔ لیکن اُس پر اطمینان بھی نہ ہو۔ ایسے شخص کی روایت شہادت کے طور پر تو قبول کر لی جاتی ہے۔ لیکن اسے ہرگز حجت تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس فراس کا انتقال ۱۲۹ھ میں ہوا۔

فراس تک اس روایت کا ہر راوی ہر زمانہ میں ایک ایک شخص رہا ہے۔ یعنی ام المؤمنین سے مسروق کے علاوہ اسے کوئی روایت نہیں کرتا۔ مسروق سے شعبی کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ اور شعبی سے فراس کے علاوہ کوئی روایت نہیں کرتا۔ اور یہ ایرانی النسل ہے۔ گویا دوسری صدی کی ابتداء تک اس روایت کو ایک ایک شخص کے علاوہ کوئی نہ جانتا تھا۔ ہاں فراس سے اسے دو شخص نقل کر رہے ہیں۔ زکریا بن ابی زائدہ۔ اور ابو عوانہ۔

ان کا شمار کوفہ کے اہل سنت علماء میں ہوتا ہے۔ حافظ ابن حجر زکریا بن ابی زائدہ: فرماتے ہیں۔ یہ ثقہ ہیں حافظ الحدیث ہیں۔ لیکن ان میں تدلیس کا مرض ہے۔ تقریب ص ۱۰۰

امام ذہبی فرماتے ہیں۔ یہ صدوق ہیں۔ مشہور ہیں اور حافظ ہیں۔ امام شعبہ امام بخاری القطان اور ابو یوسف نے اس سے احادیث روایت کی ہیں۔ امام احمد فرماتے ہیں یہ ثقہ ہے۔ اس کی حدیث شیریں ہوتی ہے۔ یحییٰ بن معین کا قول ہے کہ یہ صالح ہے (یہ بھی صدوق کے ہم پلہ ہے) البوزرعی کہتے ہیں کچھ کچھ اچھا ہے۔ لیکن شعبی کی روایات میں اکثر تدلیس سے کام لیتا ہے۔ ابوحاتم کا قول ہے کہ اس کی حدیث میں کمزوری ہوتی ہے۔ ابوداؤد کہتے ہیں ثقہ ہے۔ لیکن تدلیس سے کام لیتا ہے۔ میزان ج ۲ ص ۷۳۔ لکھتے ہیں اس کا انتقال ہوا۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم لکھتے ہیں۔ زکریا بن ابی زائدہ۔ ہر ان کا باشندہ ہے۔ ابوی اعمی کا غلام تھا۔ یہ شعبی اور ابواسحاق الہمدانی سے روایت کرتا ہے۔ یحییٰ بن سعید القطان فرماتے ہیں۔ اس میں کوئی برائی تو نہیں۔ لیکن یہ اسماعیل بن خالد حبشہ نہیں ہے۔ امام احمد

کا قول ہے کہ یہ ابواسحاق سے جو روایات نقل کرتا ہے۔ وہ کمزور ہوتی ہیں۔ امام ابو حاتم رازی فرماتے تھے اس کی حدیث کمزور ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ تدلیس سے کام لیتا ہے۔ ابو زرہ کہتے ہیں۔ یہ بہت تدلیس کرتا ہے۔ الجرح والتعديل ج ۳ ص ۵۹۴

تدلیس کے معنی میں عیب چھپانا۔ یہ محدثین کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے تدلیس مراد یہ ہوتی ہے کہ درمیان سے راوی گرا کر روایت کو اس سے اوپر کے راوی کی جانب منسوب کر دیا جائے۔ اور ایسے الفاظ میں روایت کو بیان کیا جائے کہ دوسرے کو یہ احساس نہ ہو کہ درمیان سے راوی گریا ہے۔ اس عیب کا نام تدلیس ہے۔ اور جو شخص یہ حرکت کرتا ہے اسے مدلس کہتے ہیں۔ جو افراد اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں وہ درمیان سے ضعیف راوی کو گرا دیتے ہیں۔ اور اس طرح اس کے ضعف کو چھپاتے ہیں۔ یہ عیب زکریا میں بے پناہ پایا جاتا ہے۔

گویا اس روایت کے دور راوی ایسے ہوئے جن پر کلی اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ایک فراس بن یحییٰ جو دم کا شکار ہے۔ اور دوسرا زکریا جو تدلیس کے مرض میں مبتلا ہے۔ زکریا سے اس روایت کو نقل کرنے والا فضل بن دین ہے۔

**فضل بن دین:** اس کی کنیت ابو نعیم ہے۔ اور یہ کنیت ہی سے مشہور ہے۔ حافظ ذہبی فرماتے ہیں۔ یہ حافظ الحدیث ہے حجت ہے۔ لیکن شیعہ تھا۔ اگرچہ غالی شیعہ نہ تھا۔ اور صحابہ کو گالیاں نہ دیتا تھا۔ امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔ جب یہ ابو نعیم کسی شخص کی تعریف کرے اور کہے کہ یہ ایسا اور دلیسا ہے اور بہت اچھا آدمی ہے تو سمجھ لو کہ وہ ضرور شیعہ ہے۔ اور جب کسی کی برائی کرے کہ فلال شخص مجنی ہے۔ تو وہ ضرور اہل سنت ہے۔ اس کا انتقال ۲۱۹ ہوا۔ میزان ج ۳ ص ۳۵۸

واللعن علی من تبعہ الا علی اہل بیتہ یہاں جو اس کا قاتل تھا کہ ایماں وہ مرحومہ: لانے کے بعد کسی عمل کی کوئی ضرورت نہیں اللہ کی رحمت سے

سب بخشے جائیں گے۔ متقدمین علماء نے اس فرقہ کو گمراہ قرار دیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ جسے بہ نام کرنا ہوتا اسے مرجع کہہ دیا جاتا۔ جیسے عبدالقادر جیلانی نے غنیۃ الطالبین میں مرجعہ کو گمراہ قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ ابو حنیفہ بھی مرجع تھے۔

لیکن سب سے مرجع اس شخص کو کہتے ہیں جو تمام صحابہ کو حق پر سمجھتا ہو۔ اور حضرت علیؓ کے مخالفین کو باغی اور گمراہ قرار نہ دیتا ہو۔ اس لحاظ سے امام ابو حنیفہ اور بڑے بڑے ائمہ پر مرجع ہونے کا الزام لگایا گیا، بعد کے علماء سبائیوں کی اس چال کو نہ سمجھ سکے۔ اور انہوں نے یہ کیا! امر ہی صرف دہشتی شخص ہے جو اعمال کا منکر ہو۔ حالانکہ امام محی بن معین نے شیعوں کے متبادل میں اہل سنت کو مرجع قرار دیا ہے۔

آدم بر سر مطلب۔ بخاری میں یہ روایت ان ہی راویوں کے ذریعہ مروی ہے اور سیدۃ نسار اہل الجنہ کے الفاظ اسی روایت میں پائے جاتے ہیں اور مسلم کی روایت میں نہیں پائے جاتے۔ کیونکہ اس میں کوئی شیعہ راوی نہیں۔ اور بخاری کا استاد فضل بن دین شیعہ ہے۔ گویا یہ ساری کرم فرمائی اسی ابو نعیم کی ہے۔

اب رہ گیا مسلم کی روایت کا مسئلہ۔ مسلم میں یہ روایت فراس سے ابو عوانہ کے ذریعہ مروی ہے۔

ابو عوانہ : اس کا نام وضاح بن عبداللہ الواسطی ہے۔ یہ اپنی کثرت سے مشہور ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ ثقہ ہے ثبت ہے۔ تقریب ص ۳۶۹۔

ذہبی لکھتے ہیں اس کے ثقہ ہونے پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کی لکھی ہوئی روایات بہت عمدہ ہوتی تھیں۔ ہاں ابو حاتم رازی فرماتے ہیں۔ جب یہ اپنے حافظہ سے روایات بیان کرتا ہے تو غلطیاں کرتا ہے۔ میزان ج ۲ ص ۳۴۴۔

گویا ابو عوانہ، ذکر بابن ابی نائدہ سے کسبِ سند و اعلام سے محال ہے۔ اب رہا ابو کامل کا مسئلہ۔

اس کا نام فضیل بن حسین ہے۔ ابن حجر کہتے ہیں یہ حافظ الحدیث  
**ابو کامل المحمدری:** ہے ثقہ ہے۔ ۲۳۶ میں اس کا انتقال ہوا۔ تقریباً ۲۶۹۔

عبدالرحمان بن ابی حاتم رازی لکھتے ہیں کہ امام احمد کا قول ہے کہ ابو کامل حدیث پر گہری  
 نظر رکھتا ہے۔ اور نہایت قابل اعتماد ہے۔ زبردست عقل کا مالک ہے۔ جب تک  
 کوئی اُس سے سوال نہیں کرتا۔ کلام نہیں کرتا۔ علی بن المدینی فرماتے ہیں۔ ابو کامل ثقہ ہے  
 الجرح والتعديل ج ۷ ص ۷۷

ہم نے قارئین کے رد و رد بخاری و مسلم کے تمام راویوں کا حال پیش کر دیا ہے۔ اُن  
 میں سے ہر ایک کے بارے میں محدثین کی جو آراء تھیں وہ بھی قارئین کے رد و رد پیش کر  
 دیں۔ اب قارئین خود فیصلہ فرمائیں کہ اس حدیث میں بخاری کے راوی زیادہ معتبر ہیں یا  
 مسلم کے راوی۔ محدثین کے اقوال سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے کہ مسلم کے راوی اس حدیث  
 میں زیادہ معتبر ہیں۔ اور بخاری کی روایت کسی صورت میں اس مقام پر مسلم کی روایت کے  
 مقابلہ میں صحیح قرار نہیں دی جاسکتی۔ اور مسلم کی روایت میں سیدۃ النساء اہل البیت کا خطاب موجود  
 نہیں۔ یہ الفاظ ابو نعیم فضل بن دین نے روایت کئے ہیں اور وہ شیعہ ہے۔ لہذا اُس نے  
 یہ الفاظ بڑھا کر اپنے مسلک کا پرچار کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اصل واقعہ کے آخری  
 حصہ میں فراس بن یحییٰ الہمدانی نے تحریف کر کے واقعہ کی نوعیت کو تبدیل کر دیا۔ اور فراس  
 ایسا راوی ہے جو دونوں کتابوں کی سند میں پایا جاتا ہے۔ اور لقبول حافظ ابن حجر یہ کام چلاؤ انسان  
 ہے۔ اور دم کا شکار ہے۔ دراصل محدثین نے اسی دم کے باعث کہ یہ دم کا شکار ہے اس  
 پر کوئی خاص جرح نہیں کی۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اسے کوئی دم نہیں تھا۔ بلکہ احادیث میں  
 تحریف کر کے اسے دم کہہ کر دیا تھا۔ اور چونکہ نسلا یہ ایرانی تھا۔ اس لئے یہ  
 اس کا نام بھی تحریف کا ہی ہے۔ یعنی تحریف کا ہی ہے۔ اور اس کا ثبوت خود بخاری و مسلم

ام المؤمنین فرماتی ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہؓ کو بلوایا۔ اور اُن سے کچھ راز داری کے ساتھ گفتگو کی۔ جس پر فاطمہؓ رونے لگیں پھر آپ نے کچھ گفتگو کی تو فاطمہؓ ہنسنے لگیں۔ ام المؤمنین فرماتی ہیں میں نے فاطمہؓ سے سوال کیا کہ ایسی راز داری کی کیا خاص بات تھی؟ کہ پہلے تم روئیں، پھر ہنسن۔ انہوں نے جواب دیا حضور نے جب پہلی بار سرگوشی فرمائی تھی، تو آپ نے مجھے اپنی موت کی خبر دی تھی جس پر میں رونے لگی۔ آپ نے دوبارہ سرگوشی کی اور فرمایا۔ تو میرے گھڑالوں میں سب سے پہلے مجھ سے ملے گی۔ جس پر میں ہنسنے لگی۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲۔ ج ۲ ص ۶۳۵۔ مسلم ج ۲ ص ۲۹۔

یہ حدیث پہلی حدیث کے قطعاً خلاف ہے۔ اس کے آخری جزئیہ میں خوش ہونے کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ میرے گھڑالوں میں تو سب سے پہلے مجھ سے ملے گی۔ گویا خوش ہونے اور ہنسنے کی وجہ خطابات نہیں۔ بلکہ یہ وجہ ہے کہ والد سے جو جدائی ہے وہ بہت مختصر ہے اور ملاقات کے لئے طویل عرصہ انتظار کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اور اس روایت کی سند میں کوئی قابل اعتراض راوی بھی نہیں ہے۔

اس صورت میں صرف دو ہی فیصلے ممکن ہیں کہ یا تو پہلی حدیث کو قبول کرتے ہوئے اس کا رد کیا جائے۔ یا اسے قبول کرتے ہوئے پہلی کا رد کیا جائے۔ دونوں کو قبول کرنا ہرگز ممکن نہیں۔ اور اس حدیث کے روات پہلی حدیث سے زیادہ معتبر ہیں۔ اور اس کی سند میں نہ کوئی شیعہ ہے اور نہ کوئی مدلس۔ بلکہ پہلی حدیث کے تین راوی ایرانی النسل ہیں۔ دو اگرچہ عربی النسل ہیں لیکن کوفہ کے باشندہ ہیں۔ جب کہ اس حدیث کے اکثر راوی مدنی ہیں۔ اسے ام المؤمنینؓ سے نقل کرنے والے عروہ ہیں جو حضرت زبیر بن العوام کے صاحبزادے اور ام المؤمنینؓ کے بھانجے ہیں۔ پہلی حدیث میں مسروق اور شعبی قابل اعتراض نہیں لہذا یہ ساری حرکت فراس بن یحییٰ کی ہے۔

عروہ کے واقعہ کی تائید ایک اور حدیث سے بھی ہوتی ہے جو عائشہؓ بنت طلحہ بن عبد اللہ

نے ام المؤمنین سے نقل کی ہے۔ ام المؤمنین فرماتی ہیں کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم علات میں مبتلا ہوئے تو فاطمہؓ آئیں، اور حضورؐ سے لپٹ گئیں۔ حضورؐ کا پیار لیا۔ اور جب سر اٹھایا تو دہری تھیں۔ پھر دوبارہ حضورؐ کو چپٹ گئیں۔ تو دوبارہ جب سر اٹھایا تو ہنس رہی تھیں۔ جب حضورؐ کی وفات ہو گئی۔ تو میں نے فاطمہؓ سے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے فرمایا۔

اخبِرْنِي اِنَّهُ مَيِّتٌ بِوَجْعِهِ      آپ نے بتایا تھا کہ میری اس مرض  
هَذَا فِيكَ يَتِمُّ اَخْبِرْنِي      میں موت واقع ہوگی تو میں رونے لگی۔  
اِنِّي اَسْرِعُ اَهْلَهُ لِحَقْوَابِهِ      دوبارہ آپ نے بتایا کہ تو مجھ سے سب  
ترمذی ج ۲ ص ۲۵      سے پہلے ملے گی۔ میں اس پر خوش ہوئی۔

اتفاق سے یہ واقعہ مورخ بلاذری نے اشرف الانساب میں ابن عباسؓ سے بھی اسی صورت میں نقل کیا ہے۔ گویا جو واقعہ عروہ نے بیان کیا ہے اس کی دو شہادتیں موجود ہیں۔ اور پہلے واقعہ کی کوئی شہادت موجود نہیں۔ اور اس روایت میں کچھ ایسے اور پورے جاتے ہیں جو قطعاً خلاف عقل و نقل ہیں۔

۱۔ باپ کے مرنے کا غم خطابات سے ہرگز دور نہیں ہوتا۔ جس پر انسان خوش ہو یاں کا باہمی کوئی تعلق نہیں۔ یہ بات انسانی فطرت کے قطعاً خلاف ہے۔

۲۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی علات حضرت میمونہؓ کے گھر سے شروع ہوئی اور آپ ازواجِ مطہرات کی باری پوری کرتے رہے۔ لیکن ہر جگہ یہی دریافت کرتے رہے کہ میں کل کہاں گزاروں گا۔ جس سے ازواجِ مطہرات یہ سمجھیں کہ حضورؐ زندگی کے بقیہ ایام ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے یہاں گزارنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے حضورؐ کو اس کی اجازت دی۔ حضورؐ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت اسماءؓ بن زید اور حضرت فضلؓ بن عباس کے سہارے ام المؤمنین کے گھر پہنچے۔

گویا ام المؤمنین کے یہاں آنے کے بعد حضورؐ کی ایسی حالت نہیں رہی تھی کہ خود سے چل سکیں اور قرآن کی روایت یہ ظاہر کر رہی ہے کہ حضورؐ کھڑے ہو گئے۔ یہ واقعہ قطعاً خلاف عقل و

نقل ہے جب کہ عائشہ بنت طلحہ کا بیان یہ ہے کہ فاطمہؓ آتے ہی حضور کو چپٹ گئیں۔ یہ بات عین فطرت انسانی کے مطابق ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ حضور اُس وقت کھڑے ہونے کے لائق نہ تھے۔

۳۔ عائشہ بنت طلحہ، ابن عباسؓ اور عروہ کی روایت میں یہ کہیں موجود نہیں کلام المؤمنین نے حضرت فاطمہؓ سے اسی وقت وجہ دریافت کی ہو۔ اور موقعہ و محل کے لحاظ سے اسی وقت یہ سوالات قطعاً مناسب بھی نہ تھے جب کہ فراس کی روایت میں یہ سوال بھی ہے اور پھر انکار بھی ہے۔

۴۔ فراس کی روایت میں ام المؤمنینؓ کی جانب یہ الفاظ منسوب کئے گئے ہیں کہ آج آپ نے اپنی ازواج کو چھوڑ کر بیٹی سے کیسی سرگوشی کی؟ یہ الفاظ انتہائی لغوی ہیں۔ اس لئے کہ ہر انسان بیوی سے جداگانہ نوعیت کی گفتگو کرتا ہے۔ اور بیٹی سے جداگانہ نوعیت کی کوئی یہ سوکن کا مسئلہ نہ تھا جو یہ الفاظ ام المؤمنینؓ کی جانب منسوب کئے گئے۔

۵۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی چار صاحبزادیاں تھیں۔ حضرت زینبؓ، حضرت رقیہؓ، حضرت ام کلثومؓ اور حضرت فاطمہؓ۔ لیکن بقیہ صاحبزادیوں کو اس طرح نظر انداز کیا گیا۔ گویا وہ حضوری اولاد ہی نہ تھیں۔ جب کہ حضرت زینبؓ اور حضرت رقیہؓ نے اسلام کی خاطر نذر اہل مصائب برداشت کئے۔ حتیٰ کہ حضرت رقیہؓ نے اسلام کی خاطر حبشہ، ہجرت کی۔ لیکن انہیں کوئی خطاب نہیں دیا گیا۔ اور نہ انہیں سیدۃ النساءؓ بنایا گیا۔ یہی تو ایک سبائی حربہ ہے کہ اہل سنت کی توجہ کو حضور کی بقیہ اولاد سے ہٹا کر صرف حضرت فاطمہؓ کی جانب مبذول کر دیا جائے۔ تاکہ آل رسول کے معاملہ میں کوئی دوسرا شریک مناسب نہ آسکے۔ اور جب وہ خود نگاہوں سے اوجھل ہو جائیں گی تو اُن کی اولاد کا مسئلہ بھی باقی نہ رہے گا۔

یہ تمام بحث تو میثانہ نقطہ نگاہ سے کی گئی تھی۔ اور اس کا مقصود صرف اتنا تھا کہ حضرت فاطمہؓ سیدۃ النساءؓ نہیں۔ لیکن اب ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پھر سیدۃ النساء کون ہیں۔ اس سلسلہ

میں ہم سب سے اول قرآن پر غور کرنا چاہتے ہیں۔ پھر احادیث کی جانب رجوع کریں گے۔  
ارشاد الہی ہے۔

وَمَنْ يَقْنُتْ مَلَكَتْ لَهُ رَسُولُهُ وَتَعْمَلْ صَالِحًا  
تُؤْتَهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ  
وَأَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيمًا  
اور تم میں سے جو اللہ اور رسول کی تابعدار  
رہے گی۔ اور نیک عمل کرتی رہے گی ہم  
اسے دہرا اجر دیں گے۔ اور ہم نے  
ان ازواج مطہرات کے لئے عمدہ  
رزق تیار کر رکھا ہے۔

○ - الاحزاب -

اس آیت کریمہ میں ازواج مطہرات کے لئے ایک خصوصی اعلان تو یہ کیا گیا ہے، کہ ہم  
نے اُن کے لئے عمدہ رزق تیار کر رکھا ہے۔ ظاہر ہے کہ رزق کریم تو اسی وقت حاصل ہوگا۔  
جب اُس سے قبل مغفرت حاصل ہوگی، اور جنت ملے گی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان ہر دو امور  
کا تذکرہ اس لئے نہیں فرمایا۔ اس لئے کہ ہر دو امور رزق کریم کا لازمہ ہیں۔ اور ملزوم بغیر لازم کے  
حاصل نہیں ہوتا۔ لہذا لازم کو ترک کر کے ملزوم کو ذکر کیا کہ ہم نے ان کے لئے عمدہ رزق تیار کر  
رکھا ہے، یعنی یہ لوازمات کہ اُن کی مغفرت کر دی گئی۔ اور ان کو جنت اور رضائے الہی بھی  
حاصل ہے۔ یہ تو انہیں خود بخود حاصل ہیں۔ اسی لئے صرف آخری جزئیہ کا تذکرہ کیا۔

پھر اس امر کے اعلان کے لئے۔ مضارع کے بجائے ماضی کا صیغہ استعمال کیا۔ یعنی  
جس چیز کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ وہ اس حد تک یقینی ہے۔ گویا کہ انہیں وہ پہلے ہی حاصل ہو  
چکی ہے۔ لہذا یہ تصور کہ کسی وقت اُن سے یہ مقام چھینا بھی جاسکتا ہے۔ جیسا کہ بیانیوں  
کا عقیدہ ہے۔ اس امکان کو بھی ماضی کا صیغہ لاکر ناممکن بنا دیا۔

جب ہم اس رنگ میں سورہ احزاب کی ان آیات پر غور کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے متعدد  
بار، ازواج مطہرات کو یا انصار البنی کہہ کر خطاب کیا۔ لیکن پورے قرآن میں کسی مقام پر بھی یا بنی  
البنی کہہ کر حضور کی صاحبزادیوں کو کسی مقام پر نہ مخاطب کیا گیا۔ اور نہ کسی جگہ اُن کی فضیلت کا ذکر



کیا گیا۔ یہ امر خود اس کی دلیل ہے کہ اس امت کی عورتوں میں ذکر کے قابل صرف ازواج مطہرات تھیں۔ اور اگر کوئی اور عورت اس مقام کو پہنچتی تو اس کا ذکر بھی ضرور کیا جاتا حالانکہ سابقہ امتوں میں سے مریم بنت عمران اور آسیہ امراء فرعون کا ذکر کیا گیا۔ ازواج مطہرات کی فضیلت کے لئے صرف یہی ایک دلیل کافی ہے۔

اس طرزِ مخاطب سے یہ بات خود بخود ثابت ہوگئی کہ ازواج مطہرات کے بارے میں یہ دعویٰ کہ وہ جنتی ہیں یقینی ہو گیا۔ بلکہ اس کا منکر قرآن کا منکر اور کافر ہوگا۔

قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ انسانی معاشرہ میں کسی کو بلند مقام پر سرفراز فرمائے اور ایسے اشخاص کو لوگوں کی راہنمائی پر مامور فرماتا ہے۔ تو چونکہ دنیا بھلائی اور برائی بس اُن کی اقتدا کرتی ہے۔ اُن کی برائی صرف ان ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی۔ اسی طرح اُن کی نیکی صرف اُن کی ذات تک محدود نہیں ہوتی۔ بلکہ اُن کا ہر قول و عمل قوم کے بنانے اور بگاڑ کا سبب بھی بنتا ہے۔ اسی لئے جب وہ برائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو انہیں اپنی سزا کے علاوہ دوسروں کے بگاڑ کی بھی سزا ملتی ہے۔ اور اچھے اعمال پر دوسروں کی نیکیوں کا بھی اجر ملتا ہے۔ اس طرح اُن کے عذاب میں بھی اضافہ ہوتا ہے اور اجر میں بھی۔ سورۃ بنی اسرائیل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا جاتا ہے۔

وَلَوْ لَا اَنْ تَبْتَئَاكَ لَقَدْ	اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ
كَيْذَتْ تَرْكُنُ اِلَيْهِمْ شَيْئًا	بھی کچھ نہ کچھ جھک جاتے۔ تو اُس
قَلِيلًا اِذَا ذَقْنُكَ ضِعْفَ	صورت میں ہم آپ کو دنیا میں دو گنا
الْحَيَاةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ	مزا چکھاتے اور مرنے کے بعد بھی۔
ثُمَّ لَا تَجِدُكَ عَلَيْنَا	پھر آپ ہمارے مقابلہ میں کوئی مددگار
نَصِيرًا	نہ پاتے۔

جس طرح اس مقام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اس اصول کو بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح ازواجِ مطہرات کے لئے بھی اسی اصول کی وضاحت کی گئی۔ ارشاد ہوا۔  
 وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ لِيُحِبِّهِ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَيَعْمَلْ صَالِحًا  
 تَوَفَّيْنَاهَا أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَ  
 أَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا  
 كَرِيمًا  
 اور تم میں سے جو اللہ اور اس کے  
 رسول کی تابعدار رہے گی۔ اور نیک  
 عمل کرتی رہے گی۔ ہم اسکو دوگنا اجر  
 دیں گے اور ہم نے ان ازواج کے  
 لئے عمدہ رزق تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت نے یہ ثبات کیا کہ جس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت کے مقابلہ  
 میں ہر عمل پر دُہرا اجر ملتا ہے۔ اسی طرح ازواجِ مطہرات کو بھی تمام امت کے مقابلہ  
 میں دُہرا اجر عطا ہوگا۔ جب کہ تمام صحابہ کرام اور تمام صحابیات میں سے کسی کے لئے بھی کوئی  
 مقام پر اس اصول کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اس طرح ازواجِ مطہرات کے ساتھ اس اصول کو  
 بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کو بقیہ تمام امت سے نہ صرف ممتاز کر دیا بلکہ  
 یہ بھی ثابت کر دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواجِ مطہرات تمام امت  
 کی راہنمایاں ہیں۔ اور اُن کی اقتدا امت پر لازم ہے۔

اس سے یہ امر بھی ظاہر ہو گیا کہ کوئی اتنی خواہ کتنا بھی عمل کرے۔ اور خواہ وہ کتنا ہی  
 بلند مقام کیوں نہ حاصل کرے۔ وہ ہرگز ہرگز بھی ازواج کے مقام کو نہیں پاسکتا۔ اس لئے  
 کہ جو عمل ابو بکرؓ و عمرؓ و عثمانؓ و زیدؓ و عقیلہؓ و رقیہؓ انجام دیں گی تو انہیں اکبر اجر ملنا ہے۔ اور وہی عمل اگر  
 عائشہؓ اور ام حبیبہؓ انجام دیں تو انہیں دُہرا اجر ملنا ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں طبقوں کے  
 اجر میں دگنے کا فرق ہوگا۔ جس کا نتیجہ یہ خود بخود ظاہر ہو جاتا ہے کہ کوئی اتنی ازواجِ مطہرات  
 کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ امامت و ولایت کے عہدے پر کیوں نہ سرفراز ہو۔  
 اس طرح اسی ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مطہرات کو امت پر دو قسم کی فضیلتیں  
 عطا فرمادیں۔

یہ بھی ایک تسلیم شدہ امر ہے کہ اگر ایک شخص کو ایک سال عمل صالح کی توفیق حاصل ہوتی ہے۔ اور دوسرے کو دو سال تو ہرگز یہ دونوں نہ دیں۔ اسی قانون کی نگاہ میں مساوی ہو سکتے ہیں اور نہ اخروی قانون میں۔ اسی وجہ سے جو حضرات فتح مکہ کے بعد ایمان لائے وہ سابقین اولین کے مقام کو حاصل نہیں کر سکتے۔ اب اگر دو شخص ایک ساتھ اسلام لائے اور حضور کی حیات میں ہر کاذبیر میں برابر کے شریک رہے۔ لیکن ایک فرد واحد حضور کی وفات کے چھ ماہ بعد انتقال کرتا ہے۔ اور دوسرا سینتالیس سال بعد۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ دوسرا فرد کے سینتالیس سال کے اعمال پہلے فرد سے کہیں زیادہ ہوں گے۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ دونوں ہم عمر ہیں۔ لیکن حضرت فاطمہؓ نے حضور کی وفات کے چھ ماہ بعد انتقال فرمایا۔ یعنی ۱۱ سال کے آخر میں جب کرام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی وفات رمضان ۱۱ھ میں ہے تو یہ دونوں کس طرح مساوی ہوں گی۔

جب یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی کہ ان درجاتِ مطہرات کے لئے ہر عمل پر دگنا اجر ہے تو ان کو اہل بری اور اہل ایمانی کا مقام خود بخود حاصل ہو گیا۔ اور راہبر اور راہنما کا مقام پیر و کار اور مقتدی سے بلند ہوتا ہے۔ مقتدی اور پیر و کار خواہ کتنا ہی بلند مقام پر کیوں نہ فائز ہو جائے۔ وہ اس فضیلت کو حاصل نہیں کر سکتا جو مقتدا کو حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ اسے جہاں اپنے عمل کا اجر ملے گا۔ وہاں اسے مقتدی کے اعمال کا بھی اجر ملے گا۔ اور اُس کے مقام کا کیا کہنا جو پوری امت کا مقتدا ہو۔ جو شخص کسی مقتدی کو مقتدا پر فضیلت دیتا ہے وہ نہ صرف شریعت کا مذاق اڑاتا ہے۔ بلکہ دنیاوی اصولوں کو بھی پامال کرتا ہے۔ قاعدہ ہے الفضل لا یمتقدم۔ فضیلت تو تو پہل کرنے والے کو حاصل ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ اصول بیان کرنے کے بعد اس سے جو نتیجہ برآمد کیا ہے۔ اس کی خود ہی اپنے کلام میں وضاحت فرمائی ہے۔ ارشاد ہوا۔

يُنِسَاءُ النَّبِيِّ لَسُنُنٌ كَاَحَدٍ اے نبی کی بیویوں تم دنیا کی کسی عورت

مِّنَ النِّسَاءِ اِنَّ التَّقِيْنَ كَرِهَتْ  
 کي طرح نہیں ہو بشرطیکہ تقوی اختیار کرو  
 جب حضور کی کوئی زوجہ محترمہ دنیا کی کسی عورت کے مثل نہیں ہو سکتی۔ تو دنیا کی کوئی عورت  
 بھی ان کے مثل نہیں ہو سکتی۔ خواہ وہ عورت بذات خود کتنے ہی اعلیٰ مقام پر کیوں نہ فائز ہو۔  
 کیونکہ جس طرح کوئی پیروکار مہمدا کے مساوی نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح کوئی راہنما پیروکار کے مساوی  
 نہیں ہو سکتا کیونکہ ہر دو صورت میں مہمدا کے مقام پر حرف آتا ہے۔ لہذا یہ دونوں ہرگز مساوی  
 نہیں ہو سکتے۔ کجی کہ مقتدی اور پیروکار کو۔ اور مقتدا پر فضیلت دیدی جائے۔ ایسے شخص  
 کو دنیا پاگل کہے گی۔ اس امر کو کہ ازواج مطہرات کو اقتدا اور راہبری کا مقام حاصل ہے۔ حضرت  
 ابو موسیٰ اشعری ان الفاظ میں واضح فرماتے ہیں۔

ما تشکل علینا اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ  
 جب بھی صحابہ کرام پر کسی مسئلہ میں  
 کوئی دشواری پیش آتی تو ہم حضرت  
 وسام حدیث قطف سالنا عائشہ سے دریافت کرتے۔ اور ان  
 عائشہ الاوجدنا منہ علما کے پاس اس مسئلہ کا علم موجود ہوتا۔  
 ترمذی ج ۲ ص ۲۵۱۔

یعنی صحابہ کرام کو جب بھی کسی مسئلہ میں دشواری پیش آتی تو یہ حضرات ام المؤمنین حضرت  
 عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان سے دریافت کرتے۔ اور کوئی مسئلہ ایسا نہ ہوتا جس  
 کا علم انہیں حاصل نہ ہو۔

اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ سابقہ امتوں میں سے مریم بنت عمران، آسیہ  
 امراۃ فرعون اور اس امت میں سے حضرت فاطمہؓ کو حضرت عائشہؓ یا امہات المؤمنین میں  
 سے کسی پر فضیلت حاصل ہے۔ وہ دوسرے الفاظ میں قرآن کا انکار کر رہا ہے۔ جب کہ قرآن  
 یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ اے نبی کی بیویو تم دنیا کی کسی عورت کے مثل نہیں ہو سکتیں، تو دنیا کی  
 اب کسی عورت کو ان کے مثل قرار دینا ہی ستاہ عظیم ہے۔ کجا کجا ان پر فوقیت دینا۔ اس کا تصور

بھی محال ہے۔

ہماری اس تحریر سے ہرگز یہ نتیجہ اخذ نہ کیا جائے کہ میں حضرت فاطمہؓ کی فضیلت کا منکر ہوں۔ حاشا وکلا۔ میں تو ہر اُس عورت کی فضیلت کا بھی قائل ہوں کہ جسے زندگی میں صرف ایک بار دیدارِ رسول حاصل ہوا ہو۔ کجا کہ حضور کی صاحبزادیاں، جو حضور کے جسم کا ایک حصہ ہیں۔ اُن کی فضیلت کے انکار کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ حضرت فاطمہؓ کو کسی قسم کی فضیلت حاصل ہے یا نہیں۔ اگر مسئلہ یہ ہوتا تو ہم سب سے اول حضرت فاطمہؓ کے دفاع میں قلم اٹھاتے۔ بلکہ مسئلہ صرف اتنا ہے کہ سب سے افضل عورتیں کون ہیں۔ اور سیدۃ النساء الاولیاءؓ یا سیدۃ النساء التوین بننے کی کون مستحق ہیں؟ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

کمل من الرجال کثیر ولہم	مردوں میں تو بہت کامل گزرے
یکمل من النساء غیر مریم	میں لیکن عورتوں میں مریم بنت عمران
بنت عمران واسیۃ امراۃ	اور آسیہ امراۃ فرعون کے علاوہ
فرعون وان فضل عائشۃ	کوئی کامل نہیں گزری۔ اور عائشہ کو
علی سائر النساء کفضل	تمام عورتوں پر ایسی ہی فضیلت حاصل
الشرید علی سائر الطعام	ہے۔ جیسے شریہ کو تمام کھانوں پر۔
بخاری ج ۵ ص ۲۵۳	
نسائی ج ۲ ص ۷۷	

اس حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اولیٰ آسمانیہ کی نفی فرمائی۔ کہ عورتوں میں دو عورتوں یعنی مریم بنت عمران اور آسیہ امراۃ فرعون کے علاوہ کوئی کامل نہیں ہوئی اس فرمان سے تمام عورتیں خارج ہو گئیں لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام عورتوں سے حضرت عائشہؓ کو مستثنیٰ کر کے انہیں تمام عورتوں پر فضیلت دے دی۔ اس بات کو یہ عورتوں

کے کمال کا ذکر کر کے پھر حضرت عائشہؓ کو مستثنیٰ قرار دینا۔ اور پھر انہیں جہاں کی عورتوں پر فضیلت دینا خود اس امر کا بین ثبوت ہے کہ اصل مقام فضیلت تو حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے۔ یہ مقام کسی کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ اب بقیہ عورتوں کے لئے دو ہی مقام ہیں۔ یا تو وہ مریم بنت عمران اور آسیہ کے درجہ میں ہوں گی۔ یا ان سے کچھ کم ہوں گی۔ کیونکہ نال کے درجات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لیکن مریم اور آسیہ کوئی قوم کی راہنما اور راہبر نہیں۔ ان کے بارے میں قرآن نے یہ دعویٰ کیا کہ انہیں ان کے اعمال پر دگنا اجر دیا جائے گا۔ نہ انہیں کسی نبی کی زوجیت کا فخر حاصل ہے۔ اور نہ انہیں کوئی علمی فخر حاصل ہے۔ لہذا ان امور میں تمام ازدواج مطہرات ان پر فضیلت رکھتی ہیں۔

اسی طرح مریم اور آسیہ کو کسی نبی کی اولاد ہونے کا فخر حاصل نہیں جب کہ حضور کی صاحبزادیوں کو یہ فخر حاصل ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایک فضیلت کلی ہوتی ہے۔ وہ تو اول ام المؤمنین عائشہؓ اور ان کے بعد ازدواج مطہرات کو حاصل ہے۔ اور ایک فضیلت جزئی ہوتی ہے۔ ان میں متعدد عورتیں شریک ہیں۔ ایک لحاظ سے کوئی افضل ہے اور ایک لحاظ سے دوسری۔ اللہ تعالیٰ نے سابقہ آیت میں یہ اصول بیان فرمانے کے بعد کہ تم دنیا کی کسی عورت کی مثل نہیں ہو۔ کیونکہ تمہاری حیثیت ایک مقتدا اور راہبر کی ہے۔ تو ایک ماہ نامیں جو خوبیاں ہونی چاہئیں ان کی ازدواج مطہرات کو تلقین کرتا ہے۔ کہ تقویٰ اختیار کرو۔ کسی سے چالپوسی سے بات نہ کرو، جب بھی کوئی بات کرو تو بھلی بات کرو، زمانہ جاہلیت کی طرح باہر باز اوروں میں اترنا اور گھومتی نہ پھرو، اپنے گھر میں جم کر بیٹھو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ دو، مادر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ اس لئے کہ

انما یرید اللہ لیذهب	یقیناً اللہ یہ ارادہ رکھتا ہے کہ اے
عماکم الربیب	اہل بیت تم سے ہر قسم کی انگلی
و یطہرکم تطہیرا	کر دے۔ اور تمہیں پورے پورے طور پر پاک کر دے۔

یعنی اے اہل بیت اللہ تعالیٰ تمہیں پورے طور پر پاک کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ تم سے ہر قسم کی جسمانی و روحانی گندگی دور ہو جائے۔

یہ تمام مضمون ازواج مطہرات کے سلسلہ میں چل رہا ہے۔ سیاتیوں کا جب کچھ اور بس نہ چلا تو روایات وضع کر کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ یہاں اہل بیت سے مراد حضرت علیؑ، حضرت فاطمہؑ اور ان کی اولاد ہے۔ جس کے نتیجہ میں ہمارے علماء بھی اس پر دوپگینڈے سے متاثر ہوئے۔ اور یہ بھی نہ سوچا کہ اہل بیت کے وہی معنی ہیں جو ہماری زبان میں اہلیہ اور اہل خانہ کے ہیں۔ اور بیٹی، داماد اور نواسے اہلیہ نہیں ہوا کرتے۔ اور مرد تو اہلیہ بن ہی نہیں بن سکتے۔

ہمارے علماء نے یہ بھی نہ سوچا کہ یہ ایک طویل آیت کا آخری ٹکڑا ہے۔ اور اس آیت میں خطاب ازواج مطہرات کو کیا گیا ہے۔ تو اس کا دوسروں سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ اور ابھی مضمون پورا بھی نہیں ہوا۔ اسی لئے اگے ارشاد فرماتے ہیں۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي  
بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ  
وَالْحِكْمَةِ

تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں کی جاتی ہیں۔ ان کا ذکر کرتی رہا کرو۔

یعنی ایک مقتدا ہونے کی حیثیت سے تمہارا کام کتاب اللہ کی تلاوت اور خیر کی باتیں ہونی چاہئیں۔

یہاں بیت کی جمع۔ بیوت کا لفظ ذکر کیا۔ اس سے قبل کی آیت میں بھی جمع کا لفظ ذکر کیا تھا۔

وَقُرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ

اور اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو۔

یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ اس آیت میں جن عورتوں کا ذکر ہے۔ وہ متعدد گھروں میں رہتی تھیں۔ نہ کہ ایک گھر میں۔ اور حضرت علیؑ ان کی نہ وجہ محترمہ یعنی حضرت فاطمہؑ کا صرف ایک

ہی گھر تھا۔ جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہرزوجہ اپنے اپنے گھروں میں جدا گانہ رہتی تھیں۔ اور ان سب کو یا سار البنی کے الفاظ سے مخاطب کر کے سب کو اہل بیت البنی قرار دیا۔ ہماری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ تمام مفسرین اس پر تو متفق ہیں کہ اس آیت کا مصداق ازواج مطہرات ہیں۔ لیکن پھر بھی منبر پر چڑھ کر روایات کے ذریعہ سبائی پر دیگنڈے میں منہمک رہتے ہیں۔ اس کام کے لئے یہ حضرات ایک حدیث کسار (یعنی چادر والی روایت) پیش کرتے اور اس کے ذریعہ قرآن کی تاویلات کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں قرآن ثانوی درجہ رکھتا ہے جو تاویل کا محتاج ہے۔ لیکن داستان اور کہانی خواہ کسی طرح بھی اُن تک پہنچے یہ اُس پر فوراً ایمان لے آتے، اور اس کا چرچا شروع کر دیتے ہیں۔ غالباً اسی لئے امام مسلم نے اپنی صحیح کو اس حدیث سے شروع کیا۔

کفی بالمرء کذباً ان آدمی کے جھوٹا ہونے کی دلیل کے  
یحدث بكل ما طور پر میری کافی ہے کہ وہ برہنہ برہنی  
سمیع - بات بیان کرے۔

ان کی صورت حال وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی بیان کی ہے۔ ارشاد ہے۔

وَمِنْهُمْ أُمِّيُونَ لَا يَتْلُونَ  
الْكِتَابَ إِلَّا أَمَانِيَّ وَإِنْ  
هُمْ إِلَّا يَخْشَوْنَ ۝

ان میں کچھ لوگ ان پڑھ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ کتاب میں کیا ہے۔ یہ لوگ تو صرف خیالات کی پیروی کرتے ہیں۔

حالانکہ وہ حدیث کسار ایک منکر روایت ہے۔ انشاء اللہ ہم پھر کسی موقع پر اس پر تفصیلی

گفتگو کریں گے۔

یہاں مسئلہ زیر بحث یہ ہے کہ سیدۃ النساء کون ہیں۔ اس جگہ ہم فاروقین کے سامنے ایک

ادب آیت پیش کرنا چاہتے ہیں۔ ارشاد الہی ہے۔

وَمَا كَانَ لَكُمْ أَنْ اور تمہارے لئے یہ مناسب نہیں کہ تم



تَوَدُّوْا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَلَا اَنْ  
تَنْكِحُوْا اَمْرًا وَّاجَهً مِنْ بَعْدِہٖ  
اَبَدًا اَمَّا اِنْ ذَلِكُمْ كَانَ عِنْدَ  
اللّٰهِ عَظِيْمًا

رسول اللہ کو ایذا دو، اور زنان کی ازواج  
سے ان کے بعد کبھی نکاح کر دو۔ کیونکہ  
اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی  
بات ہے۔

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد ازواج مطہرات سے شادی  
کرنے کی ممانعت کی گئی۔ اور اس کی وجہ یہ بیان فرمائی گئی کہ نکاح ثانی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
کی اذیت کا سبب ہوگا لیکن حضور کی صاحبزادیوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی قانون بیان  
نہیں فرمایا۔ اور نہ صاحبزادیوں سے نکاح میں اذیت رسول ہے۔ بلکہ اگر ان سے نکاح میں اذیت  
رسول ہوتی تو حضور ان کا کبھی زندگی میں نکاح نہ فرماتے۔

اب حضور کا اپنی صاحبزادیوں کا خود دوسروں سے نکاح کرنا۔ اور اللہ تعالیٰ کا لوگوں کو منع کرنا  
کہ آپ کی ازواج سے نکاح نہ کیا جائے اس امر کا ثبوت ہے۔ کہ ازواج مطہرات، صاحبزادیوں  
کے مقابلہ میں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہیں۔ کیونکہ یہ نکاح ایذا رسول کا سبب ہے۔ اس سے  
یہ امر خود بخود ثابت ہو گیا کہ ازواج مطہرات کی شان میں گستاخی، ان کی ہتک عزت اور ان  
کے مقام کو گرانا ایذا رسول کا سبب ہے۔ اور وہ ہر شے حرام ہے جو ایذا رسول کا سبب ہو  
کیونکہ ارشاد الہی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ  
رَسُوْلَہٗ لَعَنَہُمْ شَیْءٌ فِی الدُّنْیَا  
وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَہُمْ عَذَابًا  
عَظِیْمًا

یستینادہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول  
کو ایذا پہنچاتے ہیں تو ان پر اللہ دنیا  
اور آخرت میں لعنت بھیجتا ہے۔ اور  
ان کے لئے عذاب عظیم تیار کر رکھا ہے۔

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ازواج مطہرات کو چھوڑ کر اگر کوئی شخص کسی اور کو اذیت  
پہنچانے تو بہر شک وہ گناہگار ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس پر اللہ کی لعنت نازل نہیں ہوتی۔

اسی لئے آگے ارشاد ہے:-

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ  
وَالْمُؤْمِنَاتِ بَغْيًا وَكَفْرًا  
فَقَعُوا فِي الْحَرِّ مُخْلِطِينَ  
رِثْمًا يُرْتَبَتُونَ  
اور وہ لوگ جو مومن مردوں اور عورتوں  
کو بغیر کسی برائی کے ایذا پہنچائیں۔ تو  
انہوں نے بہت بڑا بہتان اور کھلا جھوٹ  
اٹھایا ہے۔

مومنین و مومنات کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے نہ تو لعنت کا ذکر فرمایا۔ اور نہ اس امر کا  
اظہار فرمایا کہ ان کے لئے عذاب عظیم ہے۔ یہ اس امر کا ثبوت ہے کہ ازواج مطہرات کا مقام تمام  
مومنین و مومنات سے بلند و بالا ہے۔

اب اگر کوئی شخص اس فرق کو ختم کرنا چاہے یا ان پر کسی اور کو فضیلت دے تو وہ  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچا رہا ہے۔ اور وہ اللہ کی نظروں میں ملعون ہے۔ اور  
اس سے بڑھ کر ایذا کیا ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک مقام بلند عطا فرمایا تھا اور ان کے  
لئے آیہ تطہیر نازل کی گئی تھی اب اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ آیہ تطہیر میں ازواج مطہرات  
داخل نہیں، یا داخل تو ہیں۔ لیکن اور بھی اس مقام میں ان کے ساتھ شریک ہیں۔ وہ شخص  
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اذیت پہنچا رہا ہے۔ اور ازواج مطہرات کو بھی۔ اور اللہ کی  
نظروں میں ایسا شخص ملعون ہے۔

اب ازواج مطہرات کی ایک اور فضیلت بھی ملاحظہ ہو ارشاد الہی ہے۔

النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ  
مِنَ النَّفْسِ وَأَمْرٍ وَاجِبَةٍ  
أَمَّا هَٰؤُلَاءِ  
بنی مومنین کی جانوں کے ان سے بھی  
نیا دہ حق دار ہیں۔ اور بنی کی بیویاں ان  
کی مائیں ہیں۔

یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مسلمانوں سے اور مسلمانوں کا جو حضور سے تعلق ہے وہ  
تمام دیگر تعلقات سے ایک بالا تر اور جدا گانہ حیثیت رکھتا ہے۔ دنیا کا کوئی تعلق اور کوئی رشتہ

اس تعلق سے مناسبت نہیں رکھتا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کے درمیان ہے۔ آپ مسلمانوں کے لئے اُن کے والدین سے بڑھ کر شفیق و رحیم اور اُن کی ذات سے بھی بڑھ کر اُن کے خیر خواہ ہیں۔ ان کے بیوی، بچے، اور ماں باپ انہیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہیں دین سے بے راہ کر سکتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ خود غرضی برت سکتے ہیں۔ مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے حق میں صرف دہری بات کریں گے۔ جس میں اُن کی دین و دنیا کی نلاح ہو، اور جب صورت حال یہ ہے تو مسلمانوں پر یہ لازم ہے کہ اپنی جان و مال، والدین، اولاد اور تمام دنیا سے زیادہ آپ کو محبوب رکھیں۔

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو امت پر یہ مرتبہ حاصل ہوا۔ تو آپ کی ازواج کو بھی یہ مرتبہ دیا گیا کہ انہیں پوری امت کی مائیں بنا دیا۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کے باپ اور ازواج مطہرات امت کی مائیں قرار پائیں۔ اس طرح ازواج مطہرات کی اطاعت فرمانبرداری، محبت اور تعظیم و تکریم قیامت تک تمام مسلمانوں پر فرض کر دی گئی۔ اور ان کے ساتھ نکاح ماؤں کی طرح حرام کر دیا گیا۔ مسلمانوں پر ان کے سلسلہ میں وہ تمام حقوق لازم ہو گئے جو اولاد پر ماں کے ہوتے ہیں۔

اس طرح تمام صحابہ اور تمام صحابیات اہبات المؤمنین کی اولاد ہوئے اور اولاد پر ماں کی تعظیم و تکریم، اطاعت و فرمانبرداری اور ان کے حق میں دعائے خیر لازم ہوتی ہے۔ ماں پر اولاد کے لئے یہ امور فرض نہیں ہوتے۔ لہذا حضرت فاطمہؓ، حضرت علیؓ اور تمام صحابہ پر اندھے قرآن اہبات المؤمنین کی تعظیم و تکریم اور اطاعت فرض ہوئی۔ لیکن اہبات المؤمنین پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا۔ اور ماں یا مادہ اولاد سے بڑھ کر ہر تلبے۔ کیونکہ کوئی بیٹی یا کوئی بیٹا ماں کے برابر نہیں ہو سکتا۔ لہذا اہبات المؤمنین کے مقابلہ میں یہ دعویٰ کہ حضرت فاطمہؓ سیدۃ النساء اہل الجنۃ ہیں۔ جہاں قرآن کا صریح متذکرہ ہے۔ وہاں اس دعویٰ سے وہ تمام اصول بھی ختم ہو جاتے ہیں جو اولاد، اور ماں کے سلسلہ میں قائم کئے گئے ہیں۔ اسی طرح حدیث کسار کو پیش کر کے اولاد

کو ماؤں کے برابر درجہ دینا۔ یہ سب ازواجِ مطہرات کی صریح تویہن ہے۔

اس کے پس پردہ وہ بغضِ کار فرما ہے جو سبائیوں کو ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے ہے کیونکہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد انہوں نے سب سے قبل قصاص عثمانؓ کا دعویٰ کیا۔ اگر وہ یہ دعویٰ نہ فرماتیں تو قصاص عثمانؓ کا مسئلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتا۔ اور سبائیوں کی سازش کارگر ہو جاتی۔ اور ہمیشہ کے لئے اہل عرب ان ایرانی اور یحوی سازشوں کی غلامی میں چلے جاتے۔ ام المؤمنینؓ نے اس کے لئے بند باندھنے کی کوشش کی اور ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ان کے بعد امیر معاویہؓ ان سازشوں کے مد مقابل آگئے۔ اور پوری ایک صدی تک امت ان کی غلامی سے محفوظ رہی۔ لہذا یہ طبقہ ام المؤمنینؓ پر تبرک کو ایک لازمہ دین تصور کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے کیا عقائد ہیں۔ اس کا ایک خاکہ ابو منصور احمد بن ابی طالب طبرسی کے الفاظ میں ملاحظہ ہو جو اس نے کتاب الاحتیاج میں لکھا ہے۔ اور شیعوں کے مشہور ترجمہ قرآن جو ترجمہ مقبول دہلوی سے مشہور ہے اس میں بھی پایا جاتا ہے۔ طبرسی کا بیان کہ ہے کہ حضور نے حضرت علیؓ سے فرمایا۔

یا ابالحسن ان هذا الشرف	اے ابوالحسن یہ شرف تو ہمارے لئے
باق ما رونا علی طاعة	اسی وقت تک قائم رہے گا جب تک
اللہ تعالیٰ فایتھن عصمت	اللہ کی اطاعت کرتے رہیں۔ تو میری
اللہ تعالیٰ بالخروج علیک	جو یحوی تیرے خلاف بغاوت کر کے
فطلقها من الانزواج واسقطها	اللہ کی نافرمانی کرے۔ اسے تو طلاق
من شرف امہات	دیدنا۔ اور اسے اس شرف سے محروم
المؤمنین۔	کر دینا۔

ایک معمول سے معمول، اور گھٹیا سے گھٹیا انسان سے بھی یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنی ذات کے بعد بھی وہ اپنی بیوی کو طلاق دینے کی فکر کرے گا۔ اور دنیا سے رخصت ہونے

دقت اپنے داماد کو یہ اختیار دے جائے گا کہ اگر کبھی تیرا اس کے ساتھ جھگڑا ہو، اور وہ تیری مدد مقابل بن کر کھڑی ہو جائے تو تو اسے طلاق دیدینا اور اسے ام المؤمنینؓ کے شرف سے محروم کر دینا۔

اُن کا عقیدہ یہ ہے کہ جب اُن کے مفروضہ مہدی عالم وجود میں آئیں گے تو وہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو زندہ کریں گے۔ اور اُن پر زنا کی حد قائم کریں گے۔ گویا کہ انہیں یہ بھی قبول نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس الزام سے کیسے بری کر دیا۔ اور چونکہ حضرت علیؓ نے حضور کو یہ رائے دی تھی کہ آپ عائشہؓ کو طلاق دیدیں، اور وہ حضور نے قبول نہیں فرمائی تھی۔ لہذا ان سبائیوں نے طلاق کا اختیار حضرت علیؓ کے سپرد کر دیا۔ اور چونکہ حضرت علیؓ اتنی طاقت نہ رکھتے تھے کہ وہ لاکھوں بیٹوں کی موجودگی میں ام المؤمنینؓ پر حد جاری کر سکیں۔ لہذا اس کام کے لئے ایک مفروضہ مہدی تراشا گیا۔ اور اسے اُس دقت تک کے لئے غائب کر دیا گیا جب تک حالات اُن کے لئے سازگار نہ ہو جائیں۔ ہماری نظر میں معینی حالات کو سازگار بنانے اور عربوں کو مٹانے کی فکر میں مبتلا ہیں اور اسی لئے وہ خود کو نائب امام غائب بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ تو یہ اعلان فرما رہا ہے کہ ازواج مطہرات کو جو اہیات المؤمنین قرار دیا گیا اور حضور کی وفات کے بعد اُن سے جو نکاح کو حرام قرار دیا گیا اس کی اہم وجہ یہ ہے کہ اس میں لائے رسول ہے۔ اور حضور کو اذیت پہنچانے والا ملعون ہے۔ اور اس کے لئے عذاب عظیم تیار ہے۔ کوئی ان سبائیوں سے دریافت کرے کہ بعد میں جب ام المؤمنینؓ کو طلاق دی جائے گی۔ تو کیا اُس سے اذیت رسول واقع نہ ہوگی۔ اور حضرت علیؓ نے ام المؤمنینؓ کو طلاق کب دی تھی؟ کس کے رو برو دی تھی اور پھر اس کا کیا رد عمل ہوا تھا؟ ذرا ان باتوں کا ثبوت بھی پیش کر دیجئے۔ اگر ہم ان کی اس منطق کو قبول بھی کریں تو اس سے تو یہ ثابت ہو گا کہ یہ جوابل بیت کی محبت کا ڈھونگ رچاتے پھرتے ہیں، اُن کے دلوں میں گھر کے مالک کی عزت و ناموس کا کچھ بھی پاس نہیں، یہ محبت کے پر وے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی بغض رکھتے ہیں۔

اور قرآن سے تو بغض ان کا اظہار من الشمس ہے۔ ان کا تمام مذہب، بغض عمر، بغض عائشہؓ اور بغض معاویہؓ کے ارد گرد گھومتا ہے۔ یہ ہر اس شخص سے بغض رکھتے ہیں جو ان حضرات کی محبت میں مبتلا ہو..... ہمارے نزدیک انہیں تو ایرانی ہونے کے ناطے، اسلام، قرآن اور تمام اہل عرب سے بغض ہے۔

قرآن جالیئے اُس اصل مولیٰ کے۔ جس نے ان دشمنان اسلام کا جواب بھی قرآن میں پیش کر دیا۔ اسی سورہ احزاب میں ارشاد ہے۔

لَا يَحِلُّ لَكَ الْيَسَاءُ مِنْ  
بَعْدُ وَلَا أَنْ تَبَدَّلَ  
بِهِنَّ مِنْ أَزْوَاجٍ  
لَوْ أَتَّجَبْتَ حَسَنُهُنَّ  
ان ازدواج کے بعد تیرے لئے کوئی  
اور عورت حلال نہیں۔ اور نہ آپ  
ان ازدواج میں سے کسی کو تبدیل کر سکتے  
ہیں۔ خواہ کسی کا حسن آپ کو تعجب  
میں ڈال دے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک مرد اور خاوند ہونے کے لحاظ سے یہ حق حاصل تھا کہ آپ اپنی کسی زوجہ کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری عورت سے نکاح کر لیں، لیکن اللہ تعالیٰ کو ان ازدواج مطہرات کی ادا ایسی پسند آئی کہ آپ کو مزید نکاح کی ممانعت بھی کر دی گئی۔ اور آپ سے طلاق کا حق بھی سلب کر لیا گیا کہ آپ انہیں تبدیل بھی نہیں کر سکتے۔ جب آپ ہی کو طلاق دینے کا حق باقی نہ رہا۔ تو آپ نے حضرت علیؓ کو یہ حق کیسے دے دیا، انسان کسی کو وہی چیز عطا کرتا ہے جو اس کے اختیار میں ہو، اور جو چیز انسان کے اختیار ہی میں نہ ہو اسے دینے والا اور لینے والا دونوں ہی احمق تصور کئے جاتے ہیں۔ طبری وغیرہ نے یہ روایت وضع کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کی نظروں میں نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کوئی حیثیت ہے، اور نہ حضرت علیؓ بھی۔ ان لوگوں کو حضرت علیؓ یا ان کی اولاد سے کوئی محبت ہے بھی نہیں۔ یہ لوگ تو ان حضرات کو اکہ کار کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

اس موقع پر اہانت رسول کے لئے ایک اور کہانی بھی وضع کی گئی۔ کس فتح مکہ کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ام ہانیؓ کو پیغام نکاح دیا۔ اور انہوں نے بچوں کی موجودگی کا سامنا کر کے انکار کر دیا۔ اگر واقعہ ایسا ہوا تھا تو اس سے بڑھ کرام ہانیؓ کی بدقسمتی کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ حالانکہ یہ داستان صرف اس لئے وضع کی گئی ہے کہ آپؐ نے عالم شباب میں ام ہانیؓ کے لئے ابوطالب کو پیغام نکاح دیا تھا۔ اور اس نے حضور کو محتاجی کا طعنہ دے کر انکار کر دیا تھا۔ اس کی بلیا پوتی کے لئے جہاں معراج کی داستان تیار کی گئی۔ وہاں یہ داستان بھی وضع ہوئی۔ حالانکہ آپؐ اور پر قرآن کی آیت کا مطالعہ کر چکے ہیں کہ آپؐ کو مزید نکاح کی اجازت نہیں رہی تھی۔ اور یہ ممانعت عمق القضاہ کے بعد جب آپؐ نے حضرت میمونہؓ سے نکاح فرمایا تھا نازل ہوئی تھی اور عمرہ القضاہ میں واقع ہوا۔ گویا یہ روایت وضع کر کے یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی قرآن پر عمل نہ فرماتے تھے۔ اور اس سے قبل جب آپؐ کو مزید نکاح کی اجازت حاصل تھی تو وہ بھی ایک شرط کے ساتھ مشروط تھی اور وہ شرط یہ تھی۔

مگر وہ عورت آپ کے ساتھ ہجرت کرے  
إِلَّا هَاجَرْنَ مَعَكَ  
کہ اُس عورت نے ہجرت کی ہو، اور فتح مکہ کے بعد ہجرت باقی نہیں رہی تھی۔ اور ام ہانیؓ فتح مکہ کے بعد اسلام لائیں۔ ایسی صورت میں آپؐ قرآن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے انہیں پیغام نکاح کیسے دے سکتے تھے؟

یہ ممکن ہے کہ ایسا ہوا ہو کہ ام ہانیؓ نے آپؐ سے درخواست کی ہو، اور آپؐ نے اُس سے انکار فرمادیا ہو جس سے ظاہر ہے کہ سبائیوں کو تکلیف پہنچنا یقینی ہے۔ امام ترمذی نے اس کہانی کو نقل کر کے لکھا ہے۔

هذا حديث غريب لا نعرفه  
یہ حدیث غریب ہے۔ ہم اس کے  
الامن هذا الوجه۔  
علاوہ اس کی کوئی اور سند نہیں جانتے

امام قرطبی اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ امام ابن العربی کا قول ہے کہ یہ روایت انتہا سے زیادہ ضعیف ہے۔ تفسیر قرطبی ج ۷ ص ۵۲۸۔ اس کا راوی سدی ہے جو مشہور کذاب اور سبائی ہے۔ توجب تک آپ کے لئے نکاح حلال تھے۔ اس وقت بھی عورت کا ہابجرہ ہونا شرط تھا اور ام ہانیؓ کو کجا بنوا شتم خاندان کی کوئی عورت بھی ہابجرہ نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی زوجیت میں کوئی ہاشمیہ عورت نہ آسکی۔ غور فرمائیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس پر کن لطیف پیرایوں میں تبر کیا جاتا ہے۔ اور کس طرح اُس پر سونے کے ورق چڑھا جاتے ہیں حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کے تبر کو سمجھنا ہمارے علمائے کبار کے لئے ممکن بھی نہیں۔ یہ تو اسی صورت میں ممکن ہے کہ پہلے تو وہ روایت پرستی کے مرض سے نجات حاصل کریں قرآن و رجال، اصول حدیث، جرح و تعدیل اور مذہب شیعہ کا گہری نظر سے مطالعہ کریں۔ جب تک وہ ان امور کو نہیں اپنائیں گے۔ اُس وقت تک وہ قدم قدم پر سبائیت کے جال میں پھنستے رہیں گے۔

یہ تو وہ آیات کریمہ تھیں جن سے تمام ازواج مطہرات کا مقام ظاہر ہوتا تھا۔ اور جن کی رو سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ تمام ازواج مطہرات سیدات النساء ہوں گی۔ لیکن ان تمام میں بھی آخر کسی نہ کسی کو خصوصی مقام حاصل ہوگا۔ درمیان مضمون میں ہم پہلے یہ بیان کر چکے ہیں کہ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو تمام جہاں کی عورتوں پر فضیلت حاصل ہے۔ اور اس سلسلہ میں ایک حدیث بھی پیش کر چکے ہیں۔

لیکن ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کا سب سے بڑا مقام یہ ہے کہ جب ان پر مہمت لگائی گئی۔ اور مشورہ دینے والوں نے طلاق کے مشورے دیئے تو ان کی برائت میں سورہ ناز کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں۔ جو ان کے رتبہ اور فضیلت کا ذکر ہر مومن کی زبان پر جاری رہے گا۔

یہ ام المؤمنین ہی کی ذاتِ بابرکت ہے۔ کہ جن کی وجہ سے امت پر تحیم کی آسانی پیدا ہوئی۔



زنا کی حد نافذ ہوئی۔ حد قذف کا حکم نافذ ہوا۔ جن لوگوں نے آپ پر تہمت لگائی تھی قرآن نے انہیں جھوٹا قرار دیا۔ اور یہ حکم دیا کہ کبھی ان کی شہادت قبول نہ کی جائے۔ اور یہ لوگ فاسق ہیں۔ اس سے یہ اصول سامنے آیا کہ جو شخص ام المؤمنین کی ذات اقدس پر حرف گیری کرتا ہو۔ وہ مرد و الشہادت ہے۔ اور از روئے قرآن کاذب اور فاسق ہے۔ سبائی اس آیت میں اپنا چہرہ دیکھ لیں۔ لیکن دیکھ کیسے لیں گے انہیں تو سورۃ نور کے نام سے بھی چڑھے۔ وہ تو اہل سن کے پجاری ہیں۔ اُن کا نور سے کیا واسطہ۔ اسی لئے محدثین کسی رافضی کی روایت قبول نہیں کرتے کیونکہ روایت حدیث بھی ایک شہادت ہے اور وہ از روئے قرآن مرد و الشہادت ہیں۔

اللہ تعالیٰ ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کی برارت ظاہر کرتے ہوئے مضمون کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔

الطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ	پاک عورتیں پاک مردوں کے لئے
لِلطَّيِّبَاتِ هَذَا الَّذِيكَ مُتَبَرِّعُونَ	اور پاک مرد پاک عورتوں کے لئے
مِمَّا يَفْعُلُونَ ۝ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ	یہ لوگ عوام کے اخترا سے بیزار ہیں۔
وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ۝	ان کے لئے مغفرت اور عمدہ رزق ہے۔

چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم روئے زمین پر سب سے پاکیزہ تر ہستی ہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کی زوجیت کے لئے ایک پاکیزہ ہستی کو منتخب فرمایا۔ اور یہ بھی اشارہ کیا کہ پاکیزہ مردوں کے لئے پاک دامن عورت ہونی چاہیے، اسی طرح پاک دامن عورت کے لئے پاک دامن مرد۔ آخر میں ارشاد فرماتے ہیں۔ لوگ جو بہتان تراشی کر رہے ہیں۔ اُس سے حضور اور آپ کی زوجہ کی ذات پاک ہے۔ ان حضرات کے لئے مغفرت اور رزق کریم ہے۔

اگرچہ یہ افترام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے لئے تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس سے نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر حرف اُٹا تھا اور آپ کی ذات پر حرف آنے کا مطلب یہ تھا کہ شان رسالت ہی ختم ہو کر رہ جاتی۔ اسی لئے آج تک سبائی ام المؤمنین پر یہ الزام لگاتے ہیں۔ تاکہ شان رسالت ختم ہو، اگرچہ اپنی تعادیر میں اس کا کھل کر اظہار نہیں کرتے۔ لیکن اس سلسلہ میں اُن کا جو عقیدہ ہے وہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔

اس آیت میں جہاں افترا پر دازی کا رد کیا گیا۔ وہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو طیب اور ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو طیب قرار دیا گیا۔ پھر اُن کے لئے مغفرت اور رزق کریم کا اعلان کیا گیا۔

ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کے علاوہ کوئی صحابیہ ایسی نہیں جس کی وجہ سے قرآن میں آیات نازل ہوئی ہوں۔ دنیا کی تمام عورتوں میں سے صرف دو عورتیں ایسی ہیں جن کی قرآن نے برارت ظاہر کی۔ ایک حضرت مریم۔ اور ایک حضرت عائشہؓ اور دونوں کو قرآن نے صدیقہ ثابت کیا۔ دونوں پر یہودیوں نے الزام قائم کئے۔ اور آج تک دونوں کے معاملہ میں دو فریق روئے نہیں ہو سہو دیہیں۔

تمام یہودی حضرت مریمؑ پر اہتمام لگاتے ہیں اسی طرح یہودیوں کی روحانی نسل یعنی مجوسی اور منافقی ام المؤمنین پر الزام لگاتے ہیں۔ اس طرح دونوں میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ لیکن حضرت مریمؑ کی برارت ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف ایک جملہ پر اکتفا فرمایا۔

وَأَمَّا صِدْقَةٌ - اور ان کی والدہ سچی ہیں

جب کہ ام المؤمنین کی برارت میں پورے چار کوغ نازل فرمائے۔

متقدمین علماء اہل سنت کو اس سے انکار نہیں کہ تمام ازواج مطہرات میں سب سے

افضل مقام ام المؤمنین حضرت عائشہؓ کو حاصل ہے۔ اور اہمات المؤمنین تمام امت پر فضیلت رکھتی ہیں۔ انہیں چھوڑ کر کسی اور کو سیدۃ النساء وغیرہ کہنے کا مطلب صاف طرد

پر یہ ہے کہ منافقین ان کو اُن کے مقام سے گرانا چاہتے ہیں۔ ہمارے علماء اگر قرآن پر غور کریں تو انہیں واضح طور پر یہ نظر آئے گا کہ متعدد ازواج مطہرات کی موجودگی میں لفظ اہل جو واحد کا صیغہ ہے استعمال کر کے ام المؤمنینؓ کی جانب اشارہ کیا گیا۔ مثلاً ارشاد ہے۔

وَإِذْ غَدَوْتَ مِنْ أَهْلِكَ      اور جب آپ اپنی بیوی کے پاس سے  
تَبَوَّئِ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ      صبح صبح نکلے۔ اور مسلمانوں کو مورچوں  
لِلْقِتَالِ۔      پر بٹھارہے تھے۔

تمام مفسرین متفق ہیں کہ یہاں اہل سے مراد ام المؤمنین حضرت عائشہؓ ہیں۔ اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہے۔

وَأَمْرًا هَلَكًا بِالصَّلَاةِ      اور آپ اپنی بیوی کو نماز کا حکم دیجیے  
وَأَصْطَبِرْ عَلَيْهَا ط۔      اور خود بھی اس پر ثابت قدم رہئے

یہ طریقہ صرف اس لئے اختیار کیا گیا۔ تاکہ حضرت عائشہؓ کی فضیلت اور فوقیت ظاہر کی جائے۔ جس طرح قرآن میں جگہ جگہ حضور کو مخاطب کیا جاتا ہے۔ اور مراد امت ہوتی ہے۔ اسی طرح اس آیت میں ذکر حضرت عائشہؓ کا کیا گیا۔ اور مراد تمام ازواج ہوئیں۔

ہم جب کتب احادیث کو دیکھتے ہیں تو کوئی کتاب ایسی نظر نہیں آتی جو ام المؤمنین کے فضائل سے خالی ہو۔ اُن میں سے چند روایات ہم تاریخین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ تاکہ جو لوگ روایت پرستی کے مرض میں مبتلا ہیں کچھ ان کی تسکین کا سامان بھی ہیا ہو سکے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ مردوں میں تو بہت کامل گزرے ہیں۔ لیکن عورتوں میں دو ہی کامل گزری ہیں۔ مریم بنت عمران۔ اور آسیہ امراۃ فرعون۔ اور عائشہؓ کو تمام عورتوں پر اسی طرح فضیلت حاصل ہے۔ جس طرح ثرید کو تمام کھانوں پر۔ بخاری ج ۱ ص ۵۲۲۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۳۔ نسائی ج ۲ ص ۴۴

اس حدیث سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اصل کامل عورتیں تین ہیں اور ان میں سب سے بڑا مقام حضرت عائشہؓ کا ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں میں نے خود حضور کو فرماتے سنا ہے کہ عائشہؓ کو تمام عورتوں پر ایسی فضیلت حاصل ہے۔ جیسے شریک کو تمام کھانوں پر۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۴۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲۔ نسائی ج ۲ ص ۴۴۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۵۱۔

عروۃ بن الزبیر کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض الموت میں بھی مختلف ازواج کے پاس ان کی باری کے لحاظ سے جاتے تھے۔ لیکن ہر جگہ یہی سوال فرماتے ہیں کہ میں کل کہاں گزاراں گا۔ کل کہاں گزاراں گا۔ کیونکہ آپ حضرت عائشہؓ کے گھر جانا چاہتے تھے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں جب میری باری کا دن آیا تو حضور کو سکون و اطمینان حاصل ہو گیا۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲۔ ج ۲ ص ۶۴۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر زوجہ کے یہاں یہی فرماتے کہ میں کل کہاں گزاراں گا تاکہ میری باری جلدی آجائے۔ جب میری باری آئی تو اللہ تعالیٰ نے میرے سینے اور میرے گلے کے درمیان آپ کی روح قبض فرمائی۔ مسلم ج ۲ ص ۲۸۶۔ بخاری ج ۲ ص ۶۴۔

گویا اللہ تعالیٰ کی رضایہ تھی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے آخری ایام ام المؤمنین کے پاس گزاریں۔ اسی لئے آپ کی وفات ام المؤمنین کی باری کے دن، ان کے گھر میں۔ اور ان کے سینہ سے گلہ کر ہوئی۔ اور ان کے حجرہ مبارک میں دفن ہوئے۔ یہ ام المؤمنین کی ایسی صفت ہے جو قیامت تک قائم رہے گی۔ آج دنیا جسے گنبد خضرا سے تعبیر کرتی ہے۔ وہ دراصل حجرہ عائشہؓ ہے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ وفات کے وقت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میرے سینہ سے ٹیک لگاتے ہوئے تھے۔ اور میں آپ کو چیلنے ہوئے تھی اور آپ فرما رہے تھے۔

اللهم فی الرفیق الاعلیٰ اے اللہ رفیق اعلیٰ مجھے بلا لیجئے

۱۱ المؤمنین کا یہ بھی بیان ہے کہ صحابہ کرام حضور کی خدمت میں تحائف بھیجتے جب حضور میرے یہاں مقیم ہوتے۔ اور اس سے اُن کی غرض حضور کی خوشنودی ہوتی تھی۔ سلم ج ۲ ص ۲۸۵  
 حتیٰ کہ ایک باریقیہ ازواج مطہرات کو اس کی شکایت پیدا ہوئی۔ انہوں نے حضرت فاطمہؓ کو اپنا وکیل بنا کر حضور کی خدمت میں روانہ کیا۔ ام المؤمنین فرماتی ہیں میں اس وقت حضور کے ساتھ ایک چادر میں لیٹی ہوئی تھی۔ فاطمہؓ آئیں، اور اجازت طلب کی۔ آپ نے انہیں اجازت دی۔ انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ مجھے آپ کی ازواج نے بھیجا ہے۔ وہ آپ سے ابو قحافہ (ام المؤمنین کے دادا) کی بیٹی کے سلسلہ میں آپ سے عدل کی طالب ہیں۔ آپ نے اُن سے فرمایا۔

الست تحبین  
 کیا تو اُس سے محبت نہیں کرتی جس  
 ما احب۔ سے میں محبت کرتا ہوں۔

انہوں نے عرض کیا کیوں نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔

فاحبینی ہذا۔ تو تو اس سے محبت کر

انہوں نے واپس جا کر ازواج مطہرات کی خدمت میں تمام کیفیت بیان کی انہوں نے اصرار کر کے حضرت فاطمہؓ کو دوبارہ بھیجا چاہا تو انہوں نے جواب دیا۔

واللہ لا اکلمہ فیہا ابدا۔ اللہ کی قسم میں تو اُن کے سلسلہ میں

سلم ج ۲ ص ۲۸۵۔ لسانی ج ۲ ص ۴۶ کبھی آپ سے کلام نہ کروں گی۔

ازواج مطہرات نے ام المؤمنین ام سلمہؓ کو آگے کیا۔ اور انہیں حضور کے خدمت میں بھیجا۔ انہوں نے جب حضور کے رد برویہ دعویٰ پیش کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا۔

یا ام سلمۃ لاتؤذینی فی اے ام سلمہ مجھے عائشہ کے بارے

عائشۃ فانہ واللہ ما میں اذیت نہ پہنچا۔ کیونکہ اللہ کی قسم

اتانی الوحی فی لحاف امراة تمیں سے عائشہؓ کے علاوہ کسی کے  
منکن الاهی۔ نسائی ج ۲ ص ۲۰۰ لحاف میں میرے پاس وحی نہیں آتی

ترمذی ج ۲ ص ۲۵۰

اسی لئے ام المؤمنین حضور کی محبوبہ کہلاتی تھیں۔ اور اسی لحاظ سے اُن کا لقب حب  
رسول اللہ ہے۔ لیکن اس حدیث سے چند امور نئے ثابت ہوئے۔

۱۔ اگر حضور کسی زوجہ کے پاس لیٹے ہوتے تو وحی نہ آتی تھی۔ لیکن جب حضرت عائشہؓ  
کے پاس لیٹے ہوتے تب بھی جبرائیلؑ وحی لے کر آتے۔ یعنی وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم  
ہی کو محبوب نہ تھیں، بلکہ اللہ کو بھی محبوب تھیں۔

۲۔ ام المؤمنین کے سلسلہ میں کسی قسم کی گفتگو بھی حضور کی اِذا کا سبب تھی۔

۳۔ حضور نے حضرت فاطمہؓ کو ام المؤمنین سے محبت کا حکم دیا۔ لیکن جو گروہ حب فاطمہؓ  
کے نعرے لگاتا پھرتا ہے اور بغض عائشہؓ میں مبتلا ہے اس لحاظ سے اسے حضرت فاطمہؓ سے  
بھی بغض ہے۔ اور حضورؐ سے بھی بغض ہے۔ کیونکہ جسے حضور اور حضرت فاطمہؓ سے محبت ہوگی  
اسے یقیناً حضرت عائشہؓ سے بھی محبت ہونی چاہیئے۔

حضرت عائشہؓ کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دن مجھ سے فرمایا۔ یہ  
جبرائیلؑ موجود ہیں اور تمہیں سلام کہہ رہے ہیں۔ ام المؤمنین نے جواب دیا۔ وعلیہ السلام ورحمۃ  
اللہ وبرکاتہ۔ یا رسول اللہ آپ وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھ سکتی۔ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲  
مسلم ج ۲ ص ۲۸۵۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۵۰۔

حضرت عمرو بن العاص کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے غزوہ ذات السلاسل  
کا امیر بنا کر بھیجا۔ جب میں اس غزوہ سے فتح پا کر واپس آیا۔ تو میں نے آپؐ سے دریافت کیا کہ  
آپ کو لوگوں میں سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپؐ نے فرمایا عائشہؓ۔ میں نے عرض  
کیا میری مراد مردوں سے ہے؟ آپؐ نے فرمایا عائشہؓ کا آپ ترمذی ج ۲ ص ۲۵۰۔

اس کی تائید میں ترمذی نے حضرت انس کی ایک اور حدیث پیش کی ہے۔ جس کے الفاظ میں کہ حضور سے دریافت کیا گیا کہ یا رسول اللہ آپ کو سب سے زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے فرمایا عائشہؓ، لوگوں نے سوال کیا کہ مردوں میں سب سے زیادہ محبوب کون ہے آپ نے فرمایا اس کا باپ۔ ترمذی ج ۲ ص ۵۱۔

جب ہم ام المؤمنین کی علمیت پر نظر ڈالتے ہیں تو کتب احادیث اور کتب تاریخ سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آتی ہے کہ ام المؤمنین فقہ، حدیث، تفسیر، ادب، لغت، تاریخ و فرائض، جابست، علم الانساب اور فن خطابت کی اتنی زبردست ماہرہ تھیں کہ دنیا کی عورتوں میں ان کی نظیر پیش کرنا محال ہے بلکہ چند صحابہ کو چھوڑ کر وہ تمام صحابہ سے بھی زیادہ علمیت رکھتی تھیں۔ امور خانہ سے متعلق تمام مسائل ان ہی کی ذات پر ختم ہوتے ہیں۔ حدیث و فقہ کے بنیادی اصول انہوں نے وضع کئے۔ اور عربی ادب پر ایسے نکات بیان کرتیں کہ بڑے بڑے عرب انکشت بہ نذل رہ جاتے۔

حتیٰ کہ حضرت طلحہ بن عبید اللہ کے صاحبزادے موسیٰ کا بیان ہے کہ میں نے ام المؤمنینؓ سے زیادہ فصیح گفتگو کرنے والا کوئی نہیں دیکھا۔ ترمذی ج ۲ ص ۵۱۔  
یہ ان کے فن خطابت ہی کا نتیجہ تھا کہ قصاص عثمانؓ کے سلسلہ میں تمام اہل مکہ ان کے ساتھ ہو گئے۔ اور جب بصرہ پہنچیں تو ایک ہی تقریر پر تمام اہل بصرہ ان کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اگر آج کل کے سیاست دانوں کی طرح وہ کوئی سیاسی دورہ کر لیتیں تو شاید ہماری تاریخ کا کچھ اور ہی رخ ہوتا۔

ام المؤمنین کے فضائل کے سلسلہ میں اگر تمام احادیث اور تمام تاریخی واقعات پیش کئے جائیں تو اس کے لئے ایک ضخیم جلد و مکار ہوگی۔ لہٰذا ہم صرف ان چند احادیث ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہم نے اس مضمون کی ابتداء میں دعویٰ کیا تھا کہ سبائی اور مجوسی جو حضرت فاطمہؓ کے

فضائل بیان کرتے، اور انہیں سیدۃ النساء اہل الجنۃ یا سیدۃ النساء المؤمنین قرار دیتے ہیں۔ یہ صرف ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ اس سے مراد انہی فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہرگز نہیں۔ بلکہ فاطمہ بنت اسد مراد ہیں۔ جو حضرت علی کی والدہ ہیں۔ اگر ہمارے سنی بھائیوں کو اس واقعہ پر یقین نہ آئے تو ملا باقر مجلسی کے الفاظ میں ان کے خیالات ملاحظہ فرمایا کیجئے۔ وہ حضرت علیؑ کی دلدت کا حال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عباس دینید بن قضیب کہتے ہیں کہ جب فاطمہ دعا سے فارغ ہوئیں کہ ہم نے دیکھا کہ دیوار خانہ کعبہ شگافتہ ہوئی اور فاطمہ داخل خانہ کعبہ ہوئیں۔ اور ہماری آنکھوں سے غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد دیوار حبشی تھی حکم خدا ویسی ہو گئی۔ ہم نے چار دروازہ خانہ کعبہ کھولیں۔ بہت زور کیا۔ مگر دروازہ خانہ کعبہ نہ کھلا۔ معلوم ہوا کہ یہ رازہ خدائی ہے۔ پس فاطمہ تین روز کعبہ میں رہیں۔ اہل مکہ اس واقعہ کو بچہ و بازار میں نقل اور عورتیں گھروں میں اس کا تذکرہ اور چرچا کرتی تھیں۔

جب چوتھا دن ہوا۔ جس جگہ سے دیوار خانہ کعبہ شق ہو گئی تھی۔ اس جگہ سے پھر شق ہو گئی اور فاطمہ بنت اسد باہر چلی آئیں۔ اسد اللہ الغالب علی بن ابی طالب کو گود میں لئے ہوئے تھیں۔ پس کہا۔

اے گروہ مردم۔ حق تعالیٰ نے اپنی خلق سے مجھے برگزیدہ کیا۔ اور زنان برگزیدہ پر جو مجھ سے پہلے ہو چکی میں مجھے فضیلت دی۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ نے آسیہ دختر مزاحم کو برگزیدہ کیا۔ اور آسیہ عبادت پوشیدہ حق تعالیٰ اس جگہ جہاں عبادت سزاوار نہ تھی۔ مگر در حالت ضرورت یعنی فرعون کے گھر میں کیا کرتی تھیں۔ اور مریم بنت عمران کو حق تعالیٰ نے برگزیدہ کیا۔ اور ولادت عیسیٰ کو ان پر آسان کیا۔ اور جنگل میں درخت خشک کو حرکت دی۔ اور رطب تازہ مرہم کے لئے درخت سے گرائے۔

اب حق تعالیٰ نے ان دونوں عورتوں سے برگزیدہ کیا۔ اور زنان برگزیدہ



جو مجھ سے پہلے ہو چکی ہیں مجھے فضیلت دی..... اس لئے کہ مجھ سے خانہ کعبہ برگزیدہ حق تعالیٰ میں فرزند پیدا ہوا اور میں تین روز اس خانہ محترم میں رہی۔ طعام و میوہ ہائے بہشت کھائے۔ اور جس وقت میں نے چاہا باہر آؤں جب کہ اپنے فرزند کو ہاتھوں میں لئے ہوئے تھی۔ ایک ہاتھ غیب نے عالم غیب سے مجھے آواز دی۔

کہ اے فاطمہ! ایسے فرزند برر گوارا کا نام علی رکھنا۔ کیونکہ میں خداوند علی اعلیٰ ہوں۔ اور علی کو میں نے اپنی قدرت و عزت و جلال سے پیدا کیا۔ اور اپنی عدالت سے اسے حصہ کامل بخشا ہے اور اس کا نام میں نے اپنے نام سے مشتق کیا ہے۔ اس کو اپنے آداب حسنیہ میں سے تادیب کی ہے۔ اور اپنے امور اس کو تفویض کئے ہیں۔ اور میں نے اس کو اپنے علوم مخفی پر مطلع کیا ہے۔ وہ میرے خانہ محترم میں پیدا ہوا ہے۔ جلال العیون ج ۱ ص ۲۸۵

اس کہانی کی رو سے فاطمہ بنت اسد تمام جہاں کی عورتوں پر فضیلت رکھتی تھیں۔ بعثت رسول سے قبل ان کے پاس وحی آئی۔ اور اللہ تعالیٰ ان سے بلا واسطہ ہم کلام ہوا ہمارا نزدیک یہ شرف دنیا کی کسی عورت کو حاصل نہیں۔ اور چونکہ خود ان پر وحی آتی رہی لہذا انہیں حضور پر ایمان لانے کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن مجبور ہو کر فتح مکہ کے بعد اسلام لائیں۔ اور یہ سب مراتب اس لئے حاصل ہوئے کہ ان کے یہاں بچہ خانہ کعبہ میں پیدا ہوا۔ گویا فضیلت و مراتب کا دار و مدار کعبہ میں پیدا ہونے اور پیدا کرنے پر موقوف ہے۔ نہ کہ ایمان اور اعمال صالحہ پر۔

علی اعلیٰ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت علیؑ کو اپنی قدرت کاملہ سے پیدا کر کے انہیں علوم مخفی (علم باطن) پر مطلع کیا۔ اور انہیں اپنے تمام امور تفویض کر کے خود گوشہ نشین ہو گیا۔ اب دنیا میں جتنے بھی کام انجام پا رہے ہیں وہ حضرت علیؑ انجام دے رہے ہیں۔ غالباً اسی لئے انہیں مولیٰ کا خطاب دیا گیا۔ اور اسی لئے مولیٰ علیؑ مدد کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔ اور چونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت حضرت علیؑ کی تخلیق کے بعد حاصل ہوئی۔ اس لحاظ

سے آپؐ کو نبوت عطا کرنے والے بھی علی ہیں۔ اور حضرت علیؑ نے علم باطن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل نہیں کیا۔ بلکہ وہ تو حضورؐ کی بعثت سے قبل ہی علوم باطن براہ راست اللہ تعالیٰ سے حاصل کر چکے تھے۔ حضورؐ سے اُن کا بولتعلق ظاہر کیا جاتا ہے۔ وہ تو بطور یقینہ ہے۔ ورنہ ان کے عقیدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول بنانے والے بھی علیؑ ہیں۔

جب کعبہ کی پیدائش سے یہ تمام کمالات حاصل ہوتے ہیں۔ تو یہ کمالات حضرت حکیم بن حزام کو بھی حاصل ہونے چاہئیں جو حضرت علیؑ کی پیدائش سے چالیس سال قبل فی الحقیقت کعبہ میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن ان کا تصور صرف یہ تھا کہ وہ عرب کی برگزیدہ ترین بستی کی اولاد نہ تھے۔ اور سیاتیوں کے نزدیک عرب کی برگزیدہ ترین بستی ہاشم بن عبدمناف تھے۔ اہل سنت نے زبردستی حضورؐ کو بنادیا۔ اور ہاشم برگزیدہ بستی اس لئے تھے۔ کہ حضرت علیؑ کا پدی نسب نامہ اُن سے ملتا تھا اور ان کی ماں فاطمہ بنت اسد بھی ہاشم کی اولاد تھیں۔ جب کہ حضورؐ کی والدہ کا ہاشم سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی جانب ہم کچھ اشارات شہر باتوں کی کہانی میں کر چکے ہیں۔ گویا یہ سارا کھیل اس پر موقوف ہے کہ باپ اور ماں دونوں جانب سے ہاشم سے تعلق پیدا ہو، اور اس طرح خاندانیت کا وہ چکر وجود میں آجائے جو ایرانیوں میں ہمیشہ سے چلا آ رہا تھا کہ اگر ساسانی خاندان کا کوئی بادشاہ مر جاتا اور شاہی خاندان کا کوئی مرد باقی نہ بچتا تو حکومت عورت کو دی جاتی۔ اور اگر وہ بھی کوئی موجود نہ ہوتی تو یہ تلاش کیا جاتا کہ مملکت ایران میں کوئی شخص ایسا موجود ہے جو پدری یا مادری سلسلہ سے اس کا تعلق ساسانی خاندان سے جا کر ملتا ہو، تو اسے بادشاہت مل جاتی۔ حتیٰ کہ اسلام کے ایک ہزار سال بعد جب عباس صفوی نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ساسانی نسل سے تعلق رکھتا ہے تو وہ گڈ ریٹے سے بادشاہ بن گیا۔ موجودہ دور کے بادشاہ کا بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ ساسانی النسل ہے۔ موجودہ انقلاب کے پس پردہ کہیں یہ ساسانی خاندان کا جھگڑا تو نہیں کہ صفوی خاندان کے بارے میں یہ ثابت ہو گیا ہو کہ وہ ساسانی النسل نہیں۔ اور خمینی کا رشتہ ساسانی

خاندان سے ملتا ہو؟

جس طرح ساسانی خاندان ان کے یہاں قابلِ فخر ہے۔ اسی طرح خالص ہاشمیت بھی قابلِ فخر ہے۔ بشرطیکہ وہ ابوطالب اور فاطمہ بنتِ اسد کی اولاد ہو۔ یعنی دراصل وہی خاندانیت کا چکر ہے جسے اب اسلام کا بادہ اوڑھا کر کبھی تشیع کے پیرویہ میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اسے پیری مریدی اور تصوف کا بادہ اوڑھا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں ارشاد فرمایا تھا۔

لا فخر بنی ہاشم علی بنو ہاشم کو غیر بنی ہاشم پر کوئی فخر حاصل نہیں

غیر بنی ہاشم

چونکہ اس وقت زیرِ بحث یہ مضمون نہیں۔ لہذا ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور آخر میں ام المومنین حضرت عائشہؓ کے سلسلہ میں منقطعِ گجراتی کی ایک نظم پیش کر کے اس پر مضمودِ ختم کرتے ہیں۔

سلام اے خانہ آرائے رسولِ دو جہاں تجھ پر

سلام اے جلوہ افروزِ حرمِ جاوداں تجھ پر

اب تک مل گئی تجھ کو سیادتِ حنفِ نبوی کی

کہ خبثت میں بھی تو ہوگی حرمِ محبوبِ یزداں کی

فلاح و خیر کی رشد و ہدایت کی امیں تو ہے

دلیل اس کی یہی کافی ہے ام المومنین تو ہے

کلامِ اللہ کی رو سے ہے صدیقہ لقبِ تیرا

نقطہ فرشی نہیں، عرشی بھی کرتیوں اوجِ تیرا

تیری پاکیزگی پر فطرت نے شہادت دی

تجھے عظمتِ عطا کی، عاقبتِ نجشی، فضیلت دی

اگر تیری سحر پر دریا پرداغ آجاتا  
خدا کا انتخابی فیصلہ مخدوش کہلاتا  
لب الہام سے پایا حمیرا کا لقب تو نے  
نہاں حق سے انعام جلیلہ پائے ہی تو نے

خدا نے لم نزل کا بار بار تجھ کو سلام آیا  
مبارک ہیں وہ لب جن پر ادب سے تیرا نام آیا

تیرا جو ہر تھا حق گوئی۔ تیرا شیوہ تھا حق بینی  
تیری فطرت حیا پرور، تیری خو عبیر آگینی

تیرا ہر اجتہاد افضل تیری ہر بات تابندہ  
تیری سیرت ہے قدوسی تیری توقیر پائندہ

شرف ترے دوپٹے نے یہ جنگِ بد میں پایا  
اے پریم بنا کر مخبر صادق نے ہسرایا

نباتِ ملتِ برفیا نے سیکھا علم دیں تجھ سے  
خدا راضی تھا، اور راضی تھے ختم المرسلین تجھ سے

ترا حجرہ امین خاص ہے ذاتِ رسالت کا  
بساطِ ارض پر ٹکڑا یہی ہے باغِ جنت کا

اسی حجرے میں اکثر وحی اتی نضرِ عالم پر  
تیرا حجرہ نہیں، احساں ہے تاریخِ آدمیت پر

اسی میں رحمۃ اللعالمین بہتے تھے، رہتے ہیں  
یہی حجرہ ہے، جس کو گنبدِ حضرا بھی کہتے ہیں

یہیں ہے حشر کے دن سرور کو من اٹھیں گے  
مگر تبتا نہیں اٹھیں گے، مع شیخین اٹھیں گے

وہی یحییٰ بن سے ارتقاے دین اکرام ہے  
 کہ ایک صدیق اکبر ہے تو ایک فاروق اعظم ہے  
 شفاعت کی اسی رحمت کہ سے سے ابتداء ہوگی  
 اسی پر استول کی مغفرت کی انتہا ہوگی!

تکلف برطرف، ملت کی سچی محسنہ تو ہے  
 ہمیشہ حق پر جو قائم رہی۔ وہ مومنہ تو ہے

ادب آموزانساں تھا۔ ہر انداز میں تیسرا  
 مسلم تھا صحابہ میں بھی فہم و فکر دیں تیسرا

تری فکر سا شرعی مسائل میں مُسلم تھی  
 نہ استنباط میں کم تھی۔ نہ استخراج میں کم تھی

کسے معلوم تو نے بسلاً فطرت سے کیا پایا  
 نگاہ پاک، قلب مطمئن، ذہن رسا پایا۔

تری عظمت کا اندازہ یہ دنیا کر نہیں سکتی  
 کہ ادراک حقیقت عقل تنہا کر نہیں سکتی

چمن بے دین کا قائم تو رنگ دبو بھی باقی ہے  
 کتاب اللہ جیٹک ہے، جہاں میں تو بھی باقی ہے

تیری قبرِ منور پر سلام آثارِ قدرت کے  
 تیری روح مقدس پر درودِ انوارِ جنت کے

فاخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

## جنت کے نوجوان

ہو سکتا ہے ہمارے تارکین کرام یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ جنت میں کیا بچے بھی ہونگے اور بوڑھے بھی۔ تو ہمارا جواب یہ ہے کہ جی ہاں جوان بھی ہوں گے اور بوڑھے بھی ہوں گے لیکن بچوں کی تلاش آپ کے ذمہ ہے۔

اگرچہ آپ حضرات کی طرح ہم بھی یہ پڑھتے اور سنتے آئے تھے کہ قیمت کے دن سب حضرات بغیر وارثی مورچہ کے نوجوانوں کی صورت میں اٹھیں گے یعنی حافظ شیرازی و شیخ سعدی کے مجربوں کی صورت میں کتابی حد تک تو یہ سب باتیں درست ہیں لیکن کہنے کی باتیں کچھ اور ہوتی ہیں اور کرنے کی کچھ اور اور فضائل کے سلسلہ میں ہم بکرم ہضم اور غیر ہضم پر عمل کرتے ہیں جو کچھ ملا جلتا ہے اسے ہم ہلاکم و کاست قبول کر لیتے ہیں کیونکہ ہم سنی ہیں بشکریہ ایمان لانا ہماری صفت خاص ہے حتیٰ کہ اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ اب ہمارے ذہن و دماغ سب سن ہو کر رہ گئے ہیں۔

پھر ہم میں ایک خاص مرض یہ بھی ہے کہ ہم حضرت علی اور ان کی اولاد کے سلسلے میں کافی وسیع القلب واقع ہوئے ہیں۔ ان حضرات کے بارے میں ہم رافضیت اور سبائیت کے دلدادہ ہیں حتیٰ کہ اگر کوئی صحیح روایت نظر نہیں آتی تو ہم پسید جھوٹ کو بھی سینے سے لگانے کے لئے تیار ہیں اور اگر وہ گپ حضور کی جانب منسوب ہو جائے تو پھر ہم عقل کو بھی طاق کی زینت بنا دیتے ہیں کیونکہ حضور کی نسبت سے گپ بازی ہمارا جزا ایمان اور کار ثواب بن چکا ہے اگر یہ کتب حدیث میں ہو تو کیا کہنے۔ پھر اگر اللہ نہ کرے صحاح ستہ میں سے کسی کتاب میں آجسے تو پھر تو اگر آسمان سے فرشتہ بھی اتر کر اس کی تردید کر لے گا تو ہم اسے بھی جھٹلا دیں گے کیونکہ ان کتابوں کے بارے میں شک کرنا کفر ہے اگر ان کی صحت میں شک کیا جائے گا تو ہمارے علمائے دین اور بزرگان امت معصوم کیسے ثابت ہوں گے؟ اور چونکہ ہم تشیع اور تصوف کے بھی پروردہ ہیں اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے آئمہ معصومین کی طرح ہمارے یہاں بھی معصومین کی ایک فوج ہونی چاہیے امامیہ نے بارہ کے عدد پر اس لئے اکتفا کی کہ وہ متلیل تعداد میں ہیں اور ہم تو انشاء اللہ

نیا پرچہ آئے ہوئے ہیں۔ اس لئے ہمارے یہاں ان کی تعداد کم از کم بارہ لاکھ ہونی چاہیے۔  
اب ذرا مشاہدہ کیجئے کہ جنت میں جو ان اور بوڑھے کیسے بنتے ہیں

روایت یہ کی جاتی ہے کہ حضرت ابوسعید خدری کا بیان ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ  
لحم نے ارشاد فرمایا کہ حسن و حسین جو ان اہل جنت کے سردار ہوں گے۔ ترمذی نے یہ روایت  
یان کر کے اسے حسن صحیح کہا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہمارا مولوی پختہ عقیدت کے ساتھ برہم نمبر  
موجود کو اس کی تلاوت کرتا رہا ہے کہ ہر سخی بچے کو یہ کلمہ کی طرح یاد ہو جائے۔

اگر فی الواقع یہ درست ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ حضورؐ کے صاحبزادے ابراہیم  
جو ۶۰ ماہ کی عمر میں انتقال فرما گئے تھے وہ جنت میں دودھ پیتے بچوں کے سردار ہوں گے۔  
ایسوں کا انتظام ہمارے ملاؤں کے ذمے.... دیکھیں اس سلسلہ میں کب تک روایات وجود  
پس آتی ہیں۔ آمد برہم مطلب ترمذی کی اس حدیث کے سلسلہ میں ہمیں چند اشکالاں پیش  
وئی انھیں رفع کر سکے۔

۱۔ جس وقت حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا، کیا یہ دونوں حضرات فوجوان تھے؟ حالانکہ مشہور  
تاریخ کی رو سے ان حضرات کی عمر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے وقت چھ سات سال  
تھی اور ہماری تحقیق کی رو سے دو تین سال تھی۔ کیا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسی لالچنی بات  
فرما سکتے تھے؟

۲۔ کیا آپ کو اس بھی علم نہ تھا کہ بچہ کسے کہتے ہیں اور جو ان کسے کہتے ہیں۔  
۳۔ یا ہمارے علماء کے نزدیک پانچ سال کی عمر میں بچہ بالغ ہو جاتا ہے جیسے لڑکی ۱۵ سال کی عمر میں  
۴۔ ہمارے علماء کے بقول سبھی فوجوان ہوں گے۔ ان میں حضرات حسنینؑ کے والد محترم حضرت  
علیؑ، چچا حضرت جعفرؑ اور حضرت ابو بکرؓ و عمرؓ بھی ہوں گے۔ کیا یہ دونوں بچے ان حضرات کے بھی  
سردار ہوں گے۔ موقع کر جواب دیجئے۔

کیونکہ اگر آپ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہمیں یہ حضرات ان کی ماتحتی سے خارج ہوں گے تو اس  
روایت میں کوئی لفظ ایسا نہیں پایا جاتا جس سے وہ مستثنیٰ قرار پائیں۔

۵۔ انبیاء کرام علیہم السلام بھی فوجوان ہوں گے اس روایت کی رو سے حضرات حسنینؑ کو انبیاء

کا بھی سروار ہونا چاہیئے۔

شاید اہل سنت حضرات اس سے واقف نہ ہوں کہ سبائوں کے نزدیک امام کا تقاسم انبیاء سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ اسی لئے امام کے ساتھ علیہ السلام لکھا جاتا ہے۔ ان کے نقطہ نگاہ سے یہ نسبت بالکل درست ہے اور ان کی کتابوں میں پائی جاتی ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ سبائوں کی اختراع ہو۔ اور ہم نے راویوں پر اندھا اعتماد کر کے اسے قبول کر لیا ہو؟

ترمذی نے اس روایت کو دو سندوں سے نقل کیا ہے لیکن دونوں سندوں میں یزید بن ابی زیاد الکوفی شیعوں میں موجود ہے۔ حقیقتاً یہ وہ شخص ہے جس نے سیاہ جھنڈوں کی روایت وضع کر کے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور ان کے شاگردوں کی جانب منسوب کی۔ یہ روایت ہماری کتاب "ظہور مہدی" میں ملاحظہ فرمائیے۔

ذہبی کہتے ہیں کہ کوفہ کے مشہور علماء میں اس کا شمار ہوتا ہے حافظ اس کا اگرچہ خراب تھا ترمذی مسلم ابو داؤد، نسائی اور ابن ماجہ نے اس سے روایات لی ہیں۔ یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔ یہ قوی نہیں اس کی روایت حجت نہیں بشعبہ نے اگرچہ اسے ثقہ قرار دیا دیا ہے لیکن امام ابن المبارک فرماتے ہیں اس کی روایت زمین پر دسے مارد۔

امام دیکھ فرماتے ہیں اس نے ابراہیم کے واسطے سے حضرت عبداللہ بن مسعود سے جھنڈوں والی روایت نقل کی ہے کہ مشرق کی جانب سے سیاہ جھنڈے ظاہر ہوں گے۔ ان کے ساتھ امام مہدی ہوں گے۔

امام احمد فرماتے ہیں! اس کی حدیث ردی ہوتی ہے! اور سیاہ جھنڈوں والی روایت بالکل رقی ہے! ابو اسامہ کہتے ہیں کہ اگرچہ یہ چھاپس متین بھی کھائے گا تب بھی میں اسے سچا نہ مانوں گا نیز ابن ابی حاتم نے امام احمد کا قول نقل کیا ہے۔ اس کی حدیث کچھ نہیں۔ اس کا حافظ خراب ہے یحییٰ بن معین کہتے ہیں۔ اس کی روایت حجت نہیں۔ ابو حاتم کہتے ہیں یہ قوی نہیں۔ ابو زرہ کہتے ہیں یہ کوفہ کا باشندہ ہے مکرور ہے۔ اس کی حدیث حجت نہیں! میں اس کا انتقال ہوا البحر والمعدیل ۲۶۵ ہمارے نزدیک حافظ کی خرابی ایک غلط فہمی ہے بلکہ یہ ایک ہر تقیہ باز انسان تھا کیونکہ یہ خاص رافضی تھا جس کا اندازہ قارئین کو آئندہ صفحات میں ہوگا۔



اسی مضمون کی ایک روایت ابن ماجہ میں ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضرت حسنینؓ نوجوانانِ بنت کے سردار ہوں گے۔ اور ان کے والد ان سے بہتر ہوں گے۔ ابن ماجہ مترجم ج ۱ ص ۱۷۱  
لیکن اس روایت کا راوی ثعلبی بن عبد الرحمن ہے حافظ ذہبی نے اس کا جو خاکہ کھینچا ہے ہم وہ قارئینِ کرام کے سامنے پیش کئے دیتے ہیں۔

ثعلبی بن عبد الرحمن الواسطی۔ اس کی روایات ابن ماجہ میں پائی جاتی ہیں۔ دارقطنی کہتے ہیں  
ضعیف ہے کذاب ہے ابو حاتم کہتے ہیں۔ متروک الحدیث علی بن المدینی کہتے ہیں۔ یہ احادیث وضع کرتا تھا  
عقیسی نے امام ابو داؤد سجستانی سے نقل کیا ہے کہ یحییٰ بن معین سے اس بارے میں سوال کیا  
نیا فرمانے لگے۔ اس کی سب سے بہتر حالت تو موت کے وقت تھی جب اس سے یہ کہا گیا کہ تو  
لہ سے استغفار کیوں نہیں کرتا؟ تو جواب میں کہنے لگا مجھے اللہ سے مغفرت کی امید نہیں کیونکہ  
میں نے حضرت علیؓ کی فضیلت میں لڑنے احادیث وضع کی ہیں۔ میزان ج ۳ ص ۱۲۹

ابن ابی حاتم کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔ فرمایا  
ضعیف الحدیث ہے۔ اس کی روایت کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ اور ایک بار فرمایا متروک الحدیث  
ہے۔ الجرح والتعديل ج ۸ ص ۳۳۲

قارئینِ کرام خود فیصلہ کر لیں کہ ایک شخص خود اقرار کر رہا ہے کہ میں نے نبی کریم  
صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پر جھوٹ بولا ہے اور لڑنے احادیث وضع کر کے میں نے حضور کی  
جانب منسوب کی ہیں جن میں سے ایک یہ سید شباب اہل الجنۃ والی کہانی ہے پھر بھی ہمارا مولوی ہر جمعہ  
اس کی تلاوت ضروری سمجھتا ہے کیونکہ اہل سنت والجماعت میں جتنا تشیع پھیلا ہے وہ سب  
پیروں ائملاؤں کے ذریعہ ہی پھیلا ہے۔ انھوں نے شیعوں کے لئے ہر اول دستہ کا کام انجام دیا ہے  
یہی وجہ ہے کہ آج ہم بجا حافظہ تو سنی ہیں لیکن بجا حافظہ عقیدہ بڑی حد تک شیعہ ہیں اللہ تعالیٰ  
ہمیں ہر بلا سے محفوظ رکھے۔

اس مضمون کی ایک روایت ذہبی نے میزان میں ابو ہریرہؓ سے نقل کر کے ایسے منکر  
وارد نامے کیونکہ اس کا ایک لڑی محمد بن مروان اللہ علیہ عجول ہے۔

## جنت میں بوڑھے بھی ہونگے

جب جنت میں جوان موجود ہوں گے تو عقل کا تقاضا یہی ہے کہ وہاں بوڑھے بھی ہونے چاہئیں خواہ شریعت پکار پکار کر کہے کہ جنت میں سب نوجوان بن کر داخل ہوں گے۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جان بوجھ کر حشمت پوشی کر لیں۔ اور دیسے بھی یہ بات خلاف عقل معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہم بہت سے کایا پلٹ نسخوں کا تجربہ کر چکے ہیں۔ لیکن بوڑھا بوڑھا ہی ہوتا ہے۔ لہذا ہمارے کرم فرماؤں نے جنت میں بوڑھے بھی ہٹیا کر دیئے ہیں۔ بلکہ ان کی سیادت و قیادت کا فیصلہ بھی کر دیا گیا ہے اور یہ سب روایت و حدیث کے پردے میں کیا گیا ہے۔ آئیے امام ترمذی کی زبانی یہ داستان سنیں۔

عن علی بن ابی طالب قال کنت مع رسول صلی اللہ علیہ وسلم اذ طلع ابو بکر وعمر۔ فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہذا ان سید الکھول اهل الجنة من الاولین والآخرین الا النبیین والمرسلین لا تخبرہما یا علی۔ ترمذی ج ۲ ص ۲۹۹

”حضرت علیؓ فرماتے ہیں میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ سامنے سے ابو بکرؓ و عمرؓ آگئے۔ آپؐ نے فرمایا یہ دونوں جنت میں تمام اولین و آخرین میں جتنے بوڑھے گزرے ہیں سب کے سردار ہوں گے، بجز انبیاء و رسل کے“

یہ بھی خوب ہے کہ ابو بکرؓ و عمرؓ کی ذات کا مسئلہ سامنے آیا تو انبیاء و رسل خارج کر دیئے گئے۔ اور جب حشمت کا معاملہ آیا تو یہ بات گول کر دی گئی۔۔۔ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی۔ پھر ہر دو روایت سے یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ جو انوں کی صف میں داخل ہوں گے یا بوڑھوں کی صف میں۔ ابو بکرؓ و عمرؓ کی نیابت قبول کر لیں گے یا اپنے صاحبزادگان کی۔ اس کا فیصلہ موجودہ شیوخ الحدیث کے ذمے ہے۔

اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہے کہ حضورؐ نے حضرت علیؓ کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ ان دونوں

و مطلع ذکر نما۔ اس کی وجہ کا علم تو علم سینہ بسینہ کے ماہرین ہی کو ہو گا لیکن ان ہی کے پوتے  
 بن العابدین نے یہ راز اذہنی پر چھپا کر دیا جس کی ہمیں بھی اطلاع مل گئی۔ ورنہ ہم اس علم سے  
 عروم ہو جتے۔ اور حضرت علیؑ نے یحییٰ راز اپنے پوتے زین العابدین کے کان میں ان کی پیدائش  
 سے قبل ہی پھونک دیا تھا کیونکہ ہم از روئے تاریخ صرف اتنی بات جانتے ہیں کہ حسن سال حضرت  
 ملیؑ کی شہادت ہوئی۔ اسی سال زین العابدین پیدا ہوئے لیکن شاید وہ پیدائشی دل ہوں۔  
 یہ بھی غنیمت ہے کہ امام ترمذی نے خود ہی ضعیف کہہ دیا۔ اور فرمایا اس کا ایک راوی  
 ولید بن محمد المعقری ضعیف ہے لیکن یہ روایت اور سند سے بھی مروی ہے حضرت انسؓ اور حضرت  
 بن عباسؓ سے بھی یہ روایت مروی ہے۔ پھر امام ترمذی نے دوسری سند پیش کر کے اس پر  
 خاموشی اختیار کی اور حضرت انسؓ کی حدیث پیش کر کے اسے حسن فرمایا۔

بالفاظ دیگر امام ترمذی یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اگر اس روایت کی ایک سند ضعیف  
 ہے تو دوسری تو قابل قبول ہے۔ اور پھر حضرت انسؓ کی حدیث ہے جو حسن ہے وہ بھی اس کی تائید  
 کر رہی ہے لہذا یہ روایت قابل قبول ہے۔ بہر صورت جنت میں بوڑھے پیدا کرنے ہی ہوں گے۔  
 آخر ان کا بھرم کیسے پورا کیا جائے گا لیکن ہم نے جب اوپر سے نیچے تک ان روایات کا مطالعہ  
 لیا تو چند عقے کھل کر سامنے آئے۔

- ۱۔ جس روایت پر ترمذی نے خاموشی اختیار کی۔ اس میں ایک مشہور کذاب اہل ارضی موجود ہے
- ۲۔ جس روایت کو حسن قرار دیا ہے ماہرین رجال نے مردود قرار دیا ہے۔ اسی لئے ذہبی  
 میزان میں جگہ جگہ لکھتے ہیں کہ ترمذی جس روایت کو حسن کہیں ہرگز دھوکہ نہ کھائے۔ اس کی  
 کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔

۳۔ ہر سند روایات میں یقین دہندہ حضرت علیؑ سے ہو رہی ہے اور ان میں یا علیؑ کہہ  
 کر خطاب کیا جا رہا ہے جو خطرے کی ایک گھنٹی ہے۔ ملا علی قاری موضوعاً کہیں نہیں لکھتے ہیں۔  
 وقد قال بعض المحققون ان وصایا علی المصدرة بیلہ الذاء کلھا موضوعۃ غیر قولہ علیک  
 الصلوۃ والسلام یا علی ات منی بمنزلہ ہادون من موسیٰ الا انہ لامنبی بعدی موضوعات



ابن عدی نے اس کی چار روایات نقل کر کے انہیں منکر قرار دیا جن میں سے ایک یہ مذکور روایت ترمذی نے پہلی روایت حضرت علیؑ کی جانب منسوب کر کے اس کو ضعیف قرار دیا تھا۔ لیکن اس کی ایک اور بھی سند پیش کی تھی جس پر سکونت اختیار کر لیا تھا۔۔۔ اس دوسری سند میں حضرت علیؑ کا مشہور ساتھی حارث بن عبد اللہ الاور موجود ہے۔

حارث الاور۔ یہ کوذ کا باشندہ ہے۔ حضرت علیؑ اور حضرت عبد اللہ بن مسعود سے احادیث روایت کرتا ہے۔ اس کا شمار اصحاب علیؑ میں ہے۔

امام شعبی کہتے ہیں میں گواہی دیتا ہوں کہ حارث کذاب ہے۔ ابراہیم نخعی کا قول ہے کہ لوگ اسے جھوٹا کہتے ہیں ابواسحاق صبیعی بھی اسے جھوٹا سمجھتے ہیں۔ ثاری ابو بکر بن عباس کہتے ہیں یہ کوئی پسندیدہ آدمی نہیں تھا۔

عبد الرحمن بن مہدی نے اس کی روایت قبول نہیں کی۔ کسی نے عیسیٰ بن معین سے کہا کہ یہ حضرت علیؑ کا شاگرد ہے۔ فرمایا ضعیف ہے۔ ابن حینم کہتے ہیں کذاب ہے۔ ابو حاتم فرماتے ہیں یہ قوی نہیں ضعیف الحدیث ہے۔ اس کی روایت حجت نہیں ہو سکتی۔ الجرح والتعديل ۳ ص ۹۰ ذہبی لکھتے ہیں یہ حارث ہمدان کا باشندہ تھا۔ کوذ میں سکونت اختیار کی تھی۔ اس کا شمار بڑے درجہ کے تابعین میں ہے لیکن ضعیف ہے۔

مغیرہ کا بیان ہے کہ حضرت علیؑ کا اگر کوئی شاگرد ان سے روایت نقل کرتا ہے تو اسے سچا نہیں سمجھا جاتا۔ ابن المدینی کہتے ہیں کذاب ہے جریر بن عبد الحمید کا قول ہے کہ یہ ایک ذلیل انسان ہے۔ نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں ضعیف ہے۔

ابن عدی کہتے ہیں اس کی عام روایات درست نہیں ہوتیں۔ امام شعبی فرماتے ہیں اس امت میں جتنا جھوٹ حضرت علیؑ کے نام سے بولا گیا اتنا کسی کے نام سے نہیں بولا گیا۔ ابن سیرین کہتے ہیں حضرت علیؑ کے نام سے جتنی بھی روایات مروی ہیں سب جھوٹ ہیں۔

بنا رکھا بیان ہے کہ عبد الرحمن بن مہدی اور یحییٰ بن سعید کے سامنے حارث کی چالیس روایات پیش کیں۔ انہوں نے سب قلم پھیر دیا۔

حمزہ الزلیات کا بیان ہے کہ مرۃ الہمدانی نے حارث سے کوئی رفض کی بات سنی تو وہ بڑھ کر گھر میں گئے۔ اور تلواریٹھا لائے۔ لیکن یہ خطرہ محسوس کر کے بھاگ گیا۔

ابن حبان کہتے ہیں یہ غالی درجہ کا شیعہ تھا۔ حدیث میں ردی تھا۔ تمام علماء کا ار کے صنف پر اتفاق ہے۔ شیعہ میں اس کا انتقال ہوا۔ اس کی روایت ترمذی ابو داؤد انس اور ابن ماجہ میں پائی جاتی ہے۔ میزان ج ۱ ص ۴۳۵ مقدمہ مسلم ج ۱ ص ۱۵۷

بخاری نے کتاب الضعفاء میں اسے ہتمم کہا ہے۔ الضعفاء الصغیر للبخاری ص ۲۰ شانی لکھتے ہیں یہ قوی نہیں۔ کتاب الضعفاء للنسائی ص ۲۹

غیرہ کا بیان ہے کہ جب تک حضرت علیؑ سے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے شاگرد حدیث روایت نہ کریں اس وقت تک روایت کو قبول نہ کرو۔ واللہ ان اصحاب علیؑ کو قتل کرے کہ انہوں نے بڑے علم کو اپنے جھوٹ سے تباہ کیا۔ مقدمہ مسلم ص ۲۰

## حضرت معاویہؓ کیلئے بددعا

قارئین کرام۔۔۔ ہم نے سطور بالا میں آپ حضرات سے وعدہ کیا تھا کہ ہم یزید بن ابی زیاد کی ایک اور کہانی آپ کو سنائیں گے جس سے آپ حضرات کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ یہ کون ذات شریف ہیں۔۔۔ ما شاء اللہ یہ پورے حضرت ہیں۔ اور ماہر تفتیہ ہیں۔ آپ بھی وہ روایت سن لیجئے کیونکہ نقل کفر کفر نہ باشد۔ ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ سبائیوں کو چوہ یزید سے بہت پیار تھا اس لئے یہ حضرت اپنے آپ کو یزید سے موسوم کیا کرتے تھے۔

روایت کچھ اس طرح ہے کہ حضرت ابو بزرہؓ اسہلی فرماتے ہیں کہ ایک بار حضرت معاویہؓ اور حضرت عمر بن العاصؓ کا گانا گایا ہے تھے حضورؐ نے جو ان کی آواز سنی تو فرمایا۔ اے اللہ تو ان دونوں کو خوب اچھی طرح فتنہ میں مبتلا کر۔ اور انہیں اچھی طرح آگ میں جھونک دیا (اللہ) یہ روایت امام ذہبی نے اس یزید کی پول کھولتے ہوئے ذکر کی ہے اور اس روایت کو منکر قرار دیا ہے۔ اس روایت کو زہد نے سہمان بن عمرؓ سے نقل کیا ہے۔ یہ سلیمان بن عمرؓ کو کون حضرت یزید

ان کا خاک بھی ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

سلیمان بن عمرو النخعی۔ اس کی کمینیت ابو داؤد ہے یہ اپنے دور کا مشہور کذاب ہے امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں میں اس کے پاس گیا تو مجھ سے حدیث بیان کرنے لگا کہ مجھ سے یزید بن ابی حمیب نے بیان کی میں نے سوال کیا آپ کی اس سے کہاں ملاقات ہوئی تھی دیکھو سلیمان کو ذکا باشندہ اور یزید بن ابی حمیب مصر کے باشندہ تھے، بولا۔ اے احمق میں بات کہنے سے قبل اس کا جواب تیار کر لیتا ہوں۔ میری اس سے ملاقات باب الا لبواب پر ہوئی تھی یعنی آبنائے ہر مزید۔ امام احمد فرماتے یہ احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ یحییٰ کا قول ہے کہ یہ وضع حدیث میں مشہور زمانہ ہے بلکہ اس سے بڑھ کر کوئی کذاب نہیں گزرا۔

بخاری کہتے ہیں متروک الحدیث ہے قتیبہ اور اسحاق کہتے ہیں کذاب ہے۔ یزید بن ہارون کا قول ہے کہ اس کی روایت بیان کرنا حلال نہیں۔

ابن عدی کہتے ہیں اس پر سب کا اتفاق ہے کہ حدیث وضع کیا کرتا تھا۔

ابن حبان نکتے ہیں کہ یہ بعد از کا باشندہ تھا ظاہر میں بہت نیک تھا لیکن بر ملا احادیث وضع کرتا تھا۔ دراصل یہ ایک پہنچا ہوا صوفی تھا۔ سلوک کی منزلیں طے کر رہا تھا اس لئے ہر جھوٹ حلال تھا۔ منکر تقدیر تھا۔

ابوالحسین الراوی کا بیان ہے کہ میں نے عبد المجبار بن محمد سے اس کے بارے میں سوال کیا فرمانے لگے رات کو لمبی لمبی نمازیں پڑھتا۔ اور دن میں اکثر روزے رکھتا۔

بخاری کتاب الضعفاء میں نکتے ہیں کہ یہ مشہور کذاب ہے قتیبہ اور اسحاق بھی اسے کذاب کہتے ہیں۔ حاکم نکتے ہیں یہ اپنے زہد و عبادت کے باوجود احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ شریک بن عبد اللہ النخعی جو کوفہ کا ایک شیعوں ہے وہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ یہ ہمارے چچا کا بیٹا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جھوٹ بولتا ہے۔ میزان ج ۲ ص ۲۱۶

ابوزر عہ رازی فرماتے ہیں یہ سلیمان تو اللہ کا ایک عذاب ہے الجرح والتعديل ج ۴ ص ۱۳۲  
خو۔ ایک راوی شیعہ اور دوسرا صوفی۔ یہ تو یزید بن ابی زیاد کا اس روایت میں استاد کے شاگرد کا بھی کچھ حال سن لیجئے کیونکہ یہ جہنمی روایت یزید سے اس نے نقل کی ہے

ان حضرت کا اسم گرامی محمد بن فضیل بن غزوان ہے۔

محمد بن فضیل بن غزوان بہت مشہور مستی ہیں۔ امام احمد اور اسحاق بن راہویہ ان کے شاگردوں میں داخل ہیں۔ تمام کتب صحاح میں ان کی روایات موجود ہیں بقول ذہبی حدیث کی اچھی معرفت رکھتے تھے۔

یعنی بن معین کہتے ہیں ثقہ ہے۔ احمد کہتے ہیں اس کی حدیث اچھی ہوتی ہے لیکن شیعہ ہے۔ ابو داؤد کہتے ہیں یہ تو آگ لگانے والا شیعوہ ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں بعض محدثین اسے حجت نہیں سمجھتے نسائی کہتے ہیں اس کی روایت میں کوئی حرج نہیں میزان ج ۳ ص ۹۔ ابو زرہ رازی فرماتے ہیں سچا ہے اہل علم میں سے ہے۔

حاصل کلام یہ کہ اس روایت کے دوروی شیعوہ اور ایک کذاب زمانہ۔ اس پر تمام اہل سنت کا اتفاق ہے کہ روایت موضوع ہے اور اغلب گمان یہ ہے کہ سلیمان بن عمرو نے وضع کی ہوگی لیکن یہ بھی تو ممکن ہے کہ بعد کے ان سب ایوتوں نے وضع کر کے اس بے چارے سنی کی جانب منسوب کر دی ہو۔ لیکن ابن عدی اور ذہبی کی تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کا مجرم یزید بن ابی داؤد کو قرار دیا ہے کیونکہ اس کے ترجمہ میں اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

خواہ کچھ بھی ہو ہمارے مولوی کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ یزید بن ابی داؤد افضی ہے۔ مسلم، ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور احمد نے روایات لی ہیں لہذا اب وہ ہمارے سر کا تاج ہے۔ اور اس کی ہر کجی اس ہمارا ایمان ہے۔

افسوس اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

اللھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ۔ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ